

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

جنوری 2018

نگران اعلیٰ
معراج رسول

قیمت
70/=
روپے

سالانہ
نمبر



مدیر اعلیٰ
عذر اور رسول

مدیرہ
نائب مدیر
یمنی احمد
اظہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

بھنور

محمد یاسر اعوان

ایک نظر کی محبت اور عمر بھر
کی رفاقت کا انوکھا قصہ

انشائیہ

جون ایلیا

قانون سازی اور قانون کی
پابندی پر ایک صاحب نظر کا اظہار

اک دور تھا

ڈاکٹر ساجد امجد

ماضی کا آئینہ - باختیار اور بے اختیار
انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

بیمار ذہن

سلیم انور

مغرب سے در آمد شدہ
ایک حیرت کی مختصر روداد

گریبان

مرزا امجد بیگ

خود غرضی کی لاٹھی سے منزل تلاش
کرنے والے بھٹکے ہوؤں کا قصہ

بیچ کا آدمی

ڈاکٹر شیر شاہ سید

سچاؤں کے روپ میں غموں
کے سودا گروں کی بے بسی کا المیہ

مدد

شرعباس

خوش اخلاقی سے دل جیتنے والے
ایک عقلمند انسان کی کامیابی کا راز

عکس

محمد الیاس

ویرانوں کو بسانے والے
ایک خطی کا دلی انقلاب

درماندہ

ناہید سلطان اختر

بل بل بدلتے رستے اور خزاں رسیدہ موسموں
میں عمر تمام کرنے والی ایک حسینہ کی داستان

امید نو

مظہر سلیم ہاشمی

امید نو..... ایک ایسا مضبوط سہارا بن
گئی کہ لڑکھڑاتے قدموں میں مضبوطی آگئی

محفل شعرون

قارئین

آپ کے ہاتھوں بھی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

چاندی کا چھگن

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ایک معمولی سی سرماش کی
غیر معمولی اور خطرناک آزمائش

وقت

حسامیٹ

ایک عزم بازی گر کی بازی گری..... سنسنی
خیز واقعات پر تمل ایک در با طویل داستان

حضرت موسیٰ

رضوانہ ساجد

مصر کی سرزمین پر فرعون
سازشیں اور پیغمبر کے معجزات کا احوال

سنکی

شاگر لطیف

اپنی دانست میں ذرا سی خطا کا
خطرناک اتمام لینے والے ایک سنکی کا قصہ

کترین

ارارہ

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیف، چٹکے،
اقتباسات، مسکرائشیں اور تہنیتیں سب کچھ آپ کے لیے

قانون

”تم باہر تو جا رہے ہو مگر تمہیں کسی نے اغوا کر لیا تو.....“
”ہوں..... میں باہر تو جا رہا ہوں مگر مجھے کسی نے اغوا کر لیا تو..... مجھے کسی نے اغوا کر لیا تو.....“

”مگر تم مجھے خواجوا دہلا تے رہتے ہو۔“
”میں خواجوا دہلا تا رہتا ہوں..... تمہیں مقدس صحیفوں کی قسم، کیا تم یہ بات دل سے کہہ رہے ہو؟“
”تو پھر تم بھی میرے ساتھ چلو۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں..... مگر ہم دونوں کو اغوا کر لیا گیا تو.....؟“
”ہاں یہ تو ہے۔ اگر ہم دونوں کو اغوا کر لیا گیا تو..... تو پھر؟“

”تو پھر یہ کہ باہر تو جانا ہی ہوگا، ہم اندر کب تک رہ سکتے ہیں؟ باہر ہی تو ساری زندگی ہے۔ باہر ہی تو سب کچھ ہے۔ ہمارے نام اور ہماری پہچان بھی تو باہر ہی ہے اور یہ کہ تم بھی تو میرے باہر ہی ہو..... میں بھی تو تمہارے باہر ہی ہوں..... میرے اور تمہارے سانس بھی تو باہر ہی ہیں۔“

”میرے بھائی! آخر ان بستیوں کو ہو کیا گیا ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جو نہ جانے کہاں سے یہاں آ گئے ہیں؟ بہت سے لوگوں نے اسی بستی میں ہوش سنبھالا ہے، کوئی بتائے کہ یہ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں.....؟“

”یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ باہر سے آئے ہیں؟ کہیں یہ لوگ ہمارے اور تمہارے اندر سے تو نہیں نکل آئے؟“
”ہاں، ایسا ہو تو سکتا ہے کہ یہ لوگ ہم ہی میں سے برآمد ہوئے ہوں..... اور ایک دوسرے کو خود ہی اغوا کر لیتے ہوں مگر پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہوتا تھا مگر اب بھی..... لیکن اب تو یہ روز کا معمول بن گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ یہ گلیاں، یہ ٹرے، یہ راستے، یہ شاہراہیں اور یہ بستیاں اتنی ہلک اور مہیب کیوں ہو گئی ہیں؟ ہم نے تو ان بستیوں کو بڑے چاؤ سے بسایا تھا، ہم نے تو اپنے مسکنوں کو اجاڑ کر ان بستیوں کو اپنا مسکن بنایا تھا..... تو پھر یہ بستاں ہمارے حق میں اتنی نامہرباں کیوں ہو گئی ہیں؟ میرا نام زید ہے، میں اردو بولتا ہوں اور میں اس بستی میں غیر محفوظ ہوں۔ میرے ایک اور دوست کا نام عثمان بلوچ ہے، وہ بلوچی زبان بولتا ہے۔ اردو بھی جانتا ہے، وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ میرا اپنا ایک آدمی ہے، اس کا نام نذیر لغاری ہے، وہ باغیچہ کے شہر کار بننے والا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔ اور میرا ایک یار ہے افتخار جالب، جو پنجابی اور اردو میں لکھتا ہے۔ اسی بستی میں رہتا ہے اور وہ بھی اس بستی میں غیر محفوظ ہے۔“

”مگر پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اب ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پہلے اگر ایسا ہوتا بھی تھا تو بہت کم ہوتا تھا۔“

”سننا چاہتے ہو.....؟ یہ قانون کی شکست ہے۔ یہ قانون کی بے حرمتی ہے اور یہ قانون کی معزولی ہے۔“

”ہیں..... قانون کو کس نے معزول کیا؟ قانون کی اس نے بے حرمتی کی؟“

”قانون کو کس نے معزول کیا، قانون کی کس نے بے حرمتی کی..... میرے بھائی! کیا تم یہ بات بھی نہیں جانتے؟ یہ بات تو کریم سبزی فروش بھی جانتا ہے اور یہ بات تو خلیفہ مجید کے اکھاڑے کے پٹھے بھی جانتے ہیں..... اور یہ بات تو توجیب تراش بھی جانتا ہے۔ کیا میں اس سے آگے بھی کچھ کہوں؟ یہ بات تو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو حکومت کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قانون بنایا اور اب جو فرق پڑا ہے، وہ یہ ہے کہ عام آدمیوں نے بھی قانون سے کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ جب تک قانون بنانے والے قانون کا احترام نہیں کریں گے تو بستیوں اور شہروں کے عام لوگ بھی اس کا احترام نہیں کریں گے۔ حکمرانوں سے کہو کہ وہ عام آدمیوں سے یہ سمجھوتا کریں کہ جو قانون ہم نے بنایا ہے، ہم بھی اس کا احترام کریں گے اور تم بھی اس کا احترام کرو گے..... اور اگر نہیں تو نہیں، ہرگز نہیں۔ اگر عام آدمی کو قانون کا پابند بنایا گیا تو پھر خاص آدمیوں کو بھی اس قانون کی پابندی کرنی پڑے گی۔ اگر قانون کی دوطرفہ رعایت نہیں کی گئی اور اس کی حرمت کو برقرار نہیں رکھا گیا تو پھر ان بستیوں میں جنگل کے درندے ہی آ کر آباد ہوں گے۔“



Poora Pakistan Raha Hai Bol Hashmi Ispaghool

روزانہ ہاشمی اسپغول
قدرتی فائبر کا استعمال رکھے
✓ معدے کو صاف
✓ بلڈ شوگر کا لیول برقرار
✓ کولیسٹرول کو کم اور دل کو صحت مند
✓ قبض سے دور اور نظام ہضم کو درست

Daily Lo Fit Raho

www.hashmisurma.com HashmiSince1794

Benchmark.pk



عزیزان من!
السلام علیکم!

قارئین! سالِ مبارک جنوری 2018ء کا شمارہ حاضر خدمت ہے۔ پچھلا سال اور خصوصی طور پر اس کے آخری چھ سات ماہ ادارے نے شدید مالی دباؤ میں گزارے اور اس کا واحد سبب عالمی مارکیٹ میں نیوز پرنٹ کی قلت اور گرانی رہی۔ صورت حال جوں کی توں چل رہی ہے جس کے نتیجے میں پرچے کی قیمت میں مجبوراً اضافہ کرنا پڑ رہا ہے۔ امید ہے کہ ہمارے محترم قارئین اس ناگزیر اضافے کو قبول کرتے ہوئے تعاون جاری رکھیں گے۔ کسی عجیب بات ہے ہم اور آپ تو خلوص و پیار کی ڈور سے بندھے ہیں..... ایک دوسرے کا اتنا خیال رکھتے ہیں..... ایک دوسرے کی مشکلات کا بھی اندازہ اور احساس کر لیتے ہیں، جانے کیوں یہ دل، یہ ادراک اور یہ فہم و فراست جن کے مزاج کا لازمی حصہ ہونا چاہیے، وہی لوگ اس شعور سے لاطعلق کیوں برتے ہوئے رہتے ہیں اور ان کی گہری نگاہیں اور حساس دل ان مسائل کا ادراک کیوں نہیں کر پاتے جن سے بے چارے محصور عوام ہمیشہ سے دوچار رہتے آ رہے ہیں..... کیوں اس ملک میں امن و سکون، خوشحالی اور بے فکری کی فضا قائم نہیں ہو پاتی..... ایک مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ اچانک دوسرے کی ہاؤس شروع ہو جاتی ہے۔ ارے ارے آپ پریشان نہ ہوں جناب..... ہم ملکی حالات کے تشبیہ و فراز کے بارے میں ہی بات کر رہے ہیں اور بااختیار طبقے کی حیات کا ہی رونا رور ہے ہیں..... اور دل سے دعا کرتے ہیں کہ نیا سال گزشتہ سال کے لگائے ہوئے زخموں پر شاید مرہم بن کر آئے اور ہمارے دلوں کو بھی یہ سکون آ جائے کہ اب گھستاؤں کی ہر پالی اور پھولوں کی لالی کو کوئی اندیشہ زوال نہیں ہے..... (آمین ثم آمین) اور انہی نیک تمناؤں کے سہارے ہمیں بھی اپنی گل و گلزار محفل کی کچھ خبریں چاہیے..... تو پھر چلیے نیک کام میں دیر کیسی۔

ایمانے زار شاہ آزاد کشمیر سے۔ ”نومبر کی ٹھنڈی ہوائی سردی میں سسپنس تک رسائی کے لیے کیا پاؤں پیلنے پڑے یہ ایک الگ داستان ہے..... بات تو اتنی ہی ہے ہم سسپنس کے بحر میں کھو چکے ہیں۔ ٹائٹل پر ہنسی مسکراتی خاتون نے مزاج پر خوشگوار اثر ڈالا..... پھر مشرقی ٹیچ! سسپنس کے اتنے پیارے ٹائٹل والی لڑکی کو پتا نہیں ٹھنڈ کیوں نہیں لگ رہی..... یا ٹائٹل والی کبھی سویٹر شال کا استعمال نہیں کرتی؟ اشفاق شاہین بہت شکریہ..... اب آتے رہیں گے ہم..... پرویز لانگاہ۔ آپ نے بھی سسپنس میں اسٹری دے دی زبردست..... لیکن پاکستان آتے ہی آپ کے پیچھے کون لگا ہوا تھا جو اتنا بھاگ بھاگ کر تہرہ لکھا..... ازین خان آپ کے تہرے کو پڑھ کر ہم نے بھی تمام کہانیوں کے آپسچو پر نظر کر مائی.....! کافی باریک بین ہیں آپ..... نظریں تلاشتی رہیں اپنے نام کے دیدار کو مگر کہیں نام و نشان نہ ملا..... اس بار امید ہے ہمیں بھی شامل کر کے محفل کو مزید رونق بخشیں گے! ”رنگ آساں“ کی دوسری قسط شاعر رہی..... اہل ڈاونز..... راکاشی قبیلے کے پراسرار آدم زادوں کی آمد..... دوسرا اربابہ کی ریحان و شاہ زمان کے ساتھ شمولیت..... نہ جانے کیوں شاہ زمان کی طرح ہمیں بھی اس کی طرف سے کھٹکا ہی لگا ہوا ہے..... کب رنگ دکھا جائے کیونکہ عورت، گرگٹ اور آسان کے رنگ بدلتے دیر نہیں لگتی..... انتہائی سسپنس خیز قسط رہی..... رابرٹ جیسے خود سراسر احسان فراموش انگریز کو اچھا سبق سکھایا جانا چاہیے اب..... اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ ٹھکست کی فتح میں مغل سر نے اعتقاد کمال کیا نور، ہمت، جدوجہد کی مثال۔ کوشش، کوشش اور محنت..... وہ کہتے ہیں ناگرتے ہی ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔ نور اس کا عملی نمونہ ثابت ہوئی۔ پنجاب کے علاقوں کی منظر نگاری اور ثقافت و روایات کے استخراج نے بھی کہانی کو چار چاند لگا دیے۔ آپ کی اگلی کہانی کی منتظر ہیں ہم۔ حسام بٹ نے وقت کو اگلے گیسٹ میں لگا کر ذرا تیز رفتاری دکھائی ہے۔ وہ پراسراری لڑکی کی خون کا لقیقہ ڈیلینا کی ہی ہے۔ جس بیچ پر اسد علی سوچوں کے کھڑے دوڑا رہے ہیں بھی ٹھیک اسی گینڈی پر چل رہے ہیں۔ اسکل اینڈ یونز والے اسے آسانی سے کیسے بخش سکتے ہیں۔ آسانی کیا مشکل سے بھی نہیں بخش سکتے! آخری سطور پر ہارٹ بیٹ 140 کی رفتار سے دوڑنے لگی تھی۔ کیا ہونے والا ہے اب۔ تیسری کوشش میں بے کے زخمی ہونے سے جینی کی آنکھوں سے دھول ہٹی جبکہ ناک تلے میں شروع سے ہی زلّی کی طرف ہمارے ٹھک کا دائرہ پھیل گیا تھا لیکن بیماری کی آڑ میں صاف بچا رہا۔ قاتل کوئی سراغ تو چھوڑ ہی جاتا ہے، جلد یا بدیر قدرت اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے لیکن ایسی معاشرتی پس ماندگی کے نتیجے میں ہونے والی لرزہ خیز وارداتوں سے جھرمجری آ جاتی ہے کہ ہمارے خونی رشتے بھی اتنے ناقابلِ بھروسہ ہوتے جا رہے ہیں۔ داستان کو تو اپنی سائیکو تھراپی خود ہی انجام دینے والے کی کہانی تھی۔ تشہ خواہشات کو کہانی میں ڈھال کر تسکین حاصل کرنا تو اس سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کیا لکھاریوں میں بھی یہ فیکٹر کوئی رول پلے کرتا ہے جیسے داستان گو والے محترم میں تھا؟ خود کردہ میں باپ کی اپنے بیٹے کی بھلائی میں جان گنوا دینا اثر انداز تحریر بھی۔ انشورس کمپنوں نے نا بھی مطلب انسان کے مرنے کو بھی سوال لاکھ کر دیا ہے۔ قصہ حضرت یوسف علیہ السلام اختتام کو پہنچا۔ قصص الانبیاء کا ایک بہترین قصہ جسے کئی بار پڑھنے کے بعد بھی پھر سے دلی عقیدت سے پڑھا۔ ویلڈن۔ سلگتے چنار کشمیر کے موضوع پر لکھی گئی ایک اور دل نکار تحریر چنار ہوں یا لوگ دونوں ہی سلگ کر ختم ہو رہے ہیں۔ ہر روز تازہ بہتا خون بھی ان کا حوصلہ پست نہیں کر سکتا۔ نہ جانے کب کشمیری اس ظلم و بربریت سے نجات حاصل کر کے آزاد فضا میں سانس لیں گے، مظہر سلیم ہاشمی تبادلوہ والا کشمیر نہایت بے خوف تھا۔ بابا۔ مختصر کاوشات میں وسیم بن اشرف کی جیون دان اچھی لگی۔ دوست ہو تو ایسا! مات تو فنی سی لگی..... نہ سرنہ پیر..... مجموعی طور پر اس بار

سپنس نے ہمارے پیسے پورے کر دیے! گڈ کوئنگ۔“

فاروق انجم ساحلی کاتمبرہ لاہور سے۔ ”اس بار ڈاکر صاحب نے مصورانہ مہارت کا اچھا نمونہ پیش کیا۔ سسپنس کا ٹائٹل محسوس رنگ اور متاثر کن تھا۔ لڑکی کی تصویر خدو خال کی نزاکت، والہانہ جذبات اور ادائے دلربا کا حسین مرقع تھی۔ بیک گراؤنڈ کلر ملکیک بھی خوب صورت تھی۔ خطوط کی محفل بھر پور اور دلچسپ تھی۔ خط شائع کرنے کا شکریہ، نوشت اتحاد اچھی تاریخی کاوش اور مات نئے انداز اور ثقافت اسلوب میں لکھی گئی جذبات کے اظہار کی منفرد کاوش تھی۔ ہوشیاری کا اختتام خوب تھا۔ ناک تلے ذہانت سے بھر پور واقعہ اور سراغ رسی کی عمدہ کامیابی تھی۔ رنگ آساں اور وقت حقائق اور ہنگاموں سے بھر پور اچھے انداز میں آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ جیون دان میری دانست میں اس ماہ کی بہترین کہانی ہے۔ اسلوب معیاری، واقعہ معنویت سے بھر پور بعض جگہ مکالموں نے ادبی معیار کو چھو لیا۔ خود کردہ، تبادلوہ، حضرت یوسف، ٹھکست کی فتح بھی اچھی تحریریں ہیں۔ سلگتے چنار زبردست مطالعہ ہے۔ سسپنس کی بادشاہت برقرار ہے۔ (بہت شکریہ جناب..... آپ کی تحریریں ابھی زیرِ غور ہیں۔)“

مرزا طاہر الدین بیگ، میر پور خاص سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”ڈمبر کا شمارہ اور آپ کے خط نے اور پرانے جلوہ افروز ہیں۔ محمد صفدر صاحب، رومی صاحب اچھے اور شاندار تہرے کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے۔ ملک صفدر حیات صاحب کی ناک تلے نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہی رو داد اس سے پہلے بھی آ چکی ہے۔ (واقعات ملتے ملتے ہوں تو ایسا ہی لگتا ہے مگر کہانی تو مختلف ہوتی ہے)۔ ابتدا اور اختتام دونوں کہانیاں زبردست۔ تیسری کوشش اور داستان گوا اچھی تحریریں تھیں۔ (انتانتہر تہرہ.....؟)“

اشفاق شاہین، لاہور سے شامل محفل ہیں۔ ”سسپنس اس بار بھی بروقت مل گیا۔ سرورق غیر حقیقی سا لگا۔ چوڑیاں پہنے کچھ سوچتی حسینہ ایک آنکھ نہ بھائی۔ جون ایلیا کے انٹائیٹل ”مژدہ“ پر پہنچے۔ یہ الگ بات کہ مژدے میں دکھائے گئے خواب اور وعدے بھی غیر حقیقی ہی لگے۔ دوستوں کی محفل میں پہنچے، حکیم رضا شاہ نقوی کرسی صدارت پر براجمان تھے، ایک خوب صورت تہرے کے ساتھ۔ زرین آفریدی، عبد الجبار رومی، محمد خواجہ اور صفدر معادیہ کے تہرے بے مثال ٹھہرے۔ پرویز لانگاہ کی آمد بہت بھلی لگی۔ رفاقت، اور یس خان، ایم سخاوت، عبدالغفور، انجم فاروق اور اوشا راٹھی کی شرکت نے بھی محفل کو چار چاند لگا دیے۔ چلتے ہیں تہرے کی طرف۔ سب سے پہلے وقت سے دو دو ہاتھ کیے۔ علی کے نام اربوں کی جائیداد اکل سلطان کی طرف سے ملی۔ اسد ہنود امریکا جانے کی تیاریوں میں مصروف ہے اور ادھر ڈیلینا لگتا ہے کہ کراچی پہنچ چکی ہے۔ اس دفعہ قسط سی رہی۔ ٹھکست کی فتح، طاہر جاوید مغل کے کیا کہنے، کیا خوب لکھتے ہیں۔ ہاں پورا گاؤں زبردستی برات لے کر رات کے وقت پہنچا تو یہ ذرا نامناسب اور غیر حقیقی لگا۔ ہو سکتا ہے ایسا ہونا ہو بھی۔ نور کا کردار بہر حال لازوال رہا۔ اس کے سپنے بھی پورے ہوئے اور فتح نے اس کے قدم چومے۔ مسلسل جدوجہد کی ایک عظیم داستان تھی، بہترین۔ ”رنگ آساں“ فی الحال تو اپنا رنگ نہیں جھاسکی۔ پروفیسر ہنری کی تحقیق، سازش سے آگاہی بے کاری لگی، اب تک۔ ہاں شوکی کا کردار کافی دلچسپ اور گارشا کا بھی۔ انمول جڈے اور دوستی پر مبنی ”جیون دان“ وسیم بن اشرف نے بہت خوب لکھی اور دوستی کا حقیقی مطلب بھی بتا دیا۔ ”ناک تلے“ ملک صفدر حیات، یا تو یہی ریڈیٹ ہوئی ہے اور اگر نہیں ہوئی تو اندازہ ہو گیا تھا کہ قاتل کون ہے۔ مظہر سلیم ہاشمی کا ”تبادلوہ“ مختصر لیکن دلچسپ، پسند آیا۔ اختصار اعوان کی ”سلگتے چنار“ بھی بہت اچھی لگی۔ محفل شعر و سخن میں انتخاب بہت عمدہ رہا، خصوصاً اوشا راٹھی شاہین تبسم اور شاہدہ جنید کا انتخاب بے مثال ٹھہرا۔ تمام احباب کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔ (آپ کو بھی مبارک ہو)۔“

عبد الجبار رومی انصاری، تصویر کشی سے تہرہ کر رہے ہیں۔ ”حسین خیالوں کی منظر کشی کرتا ڈاکر اکل کا ٹائٹل بہت ہی اچھا لگا اور جون ایلیا کا مژدہ اس سے بھی بڑھ کر اچھا لگا جو ایک مٹھی مٹی لے کر غریب عوام پر تجربے کرتے حکمرانوں کو آنکھیں کھولنے کے لیے دکھا رہے ہیں کہ وہ کر لیں اپنی جو من مرنیاں کرنی ہیں۔ عوام کا جو خون چھڑتا ہے چھڑ لیں۔ آخر تو اس مٹی میں ہی مل جاتا ہے، ہے کوئی اس مژدے کو کھینچنے والا اس کی گہرائی میں اترنے والا اور پھر کر ڈوں لوگوں کے سامنے سرخرو ہونے والا یقیناً وہی اللہ کے دربار میں بھی کامیابی سے سرخرو ہوگا۔ 2017ء کو اللہ حافظ کہتا ادارہ بھی بس یادوں میں رہ جائے گا اور ملک کی بے حال صورت حال پر ہر ماہ کی طرح کڑھتا ہوگا گرجائے گا اور ہاں امیدوں کے چراغ جلا جائے گا سو ایسی امید پر ہم بھی تمام دوستوں کو نئے سال کی مبارک باد پیش کرتے ہیں اور یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ خدا کرے تیری ارض پاک پر اترے، وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو۔ حکیم سید محمد رضا شاہ نمبروں تہرے کے ساتھ حاضر، مبارک ہو۔ دوسرے نمبر پر زرین خاں آفریدی بھی لا جواب تہرے کے ساتھ عمدہ رہیں۔ اشفاق شاہین صاحب دنیا ہے ہی ممکن بھی یہاں تو کبھی وہاں، بس کسی سے تعلق نہ ڈٹوئے موت سے پہلے۔ عمدہ تہرہ ہے۔ رابعہ آفرین ویکم، خیال آرائی اچھی ہے۔ عبدالغفور ساغر کی کوشاوی کی مبارک ہو۔ شامل محفل محمد خواجہ نے بھی اچھا لکھا۔ ایم سخاوت کرنا ہی اور محمد ادریس خان بھی زبردست رہے۔ محمد صفدر معادیہ بھائی خود تو ہر محب وطن ہی عمدہ کرداروں میں ڈھلا ہوا ہے لیکن کوئی ایسا راہنما بھی تو آئے نا جو آتے ہیں سب سے پہلے خود کا نعرہ لگاتے ہیں تو دوسروں کا درد کیا محسوس ہو؟ خودی سے باہر نکلیں تو بڑے راہنما بنیں۔ پرویز احمد، محمد زریان سلطان اور اوشا راٹھی بھی دیوالی کے تہوار میں چمکتی دکھی عمدہ تہرہ لیے حاضر تھیں، مبارک ہو۔ اور وہ حمر کے اوقات میں مغفرت طلب کرتے ہیں۔ حضرت یوسف کے بھائی بھی اپنی غلطیوں پر نادم ہوئے تو مغفرت کے طالب ہوئے اور پھر ان سب پر اللہ کی ایسی رحمت ہوئی کہ حضرت یوسف کے ساتھ ان سب کی زندگی بھی باغ و بہار بن گئی اور ان کی نسل بھی بڑھتی چلی گئی۔ عمدہ تحریر، عمدہ قصہ، دل و جان میں ایمان کی تازگی بھر گیا۔ خوب صورت اور ایمان افروز تحریر لکھنے پر رضوانہ ساجد کو بہت بہت مبارک ہو اللہ ان پر رحم فرمائے اور لمبی زندگی عطا فرمائے۔ نوشت اتحاد میں بھان مٹی نے اپنی سازش تو آگے نہ بڑھائی لیکن محبت میں جان دے دی۔ اتحاد برقرار رہا اور عادل شاہ نے رام راج کو طے شدہ معاہدہ پامال کرنے پر خوب خوب سزا دی۔ تاریخ کے ابواب میں نوشت اتحاد عمدہ رہی۔ اس دفعہ حسام بٹ کی وقت کی



رفقار ذرا دیکھی رہی مگر اینڈ پریڈیٹیا کا آنا علی کے لیے سنسنی خیز ثابت ہو رہا ہے۔ لگتا ہے وقت تو اپنی چال دیکھی رکھے گی لیکن پہل بہت بچائے گی۔ شکست کی فتح میں آخر میں النور نے میدان مار لیا اور وہ بھی صرف کھیل کا میدان ہی نہیں اپنی عزت اور وقار کو بچانے کے لیے معاشرے کے ناسوروں کے ارادوں کو بھی خاک میں ملادیا اور اپنے خاندان کو بچا کر ہر محاذ پر فتح سے ہمکنار ہوئی تو واقعی بہادر رہی تھی اور ذوالقرنین کی محبت بھی رنگ لائی۔ نور کی خاطر اس میں بھی بدلاؤ آ گیا۔ طاہر جاوید کی کہانی بہت پسند آئی۔ رنگ آسمان میں علی رحمان اور زمان کا کردار کشمیری مجاہدین جیسا ہے۔ اکل ہنری اصول پسند ہیں اور شوکی کی وفاداری کے قائل بھی ورنہ شوکی اور رابرٹ میں تو خوب ٹھن گئی ہے اور رابرٹ کے منظر سے ہٹنے کے آثار نظر آ رہے ہیں دوسری طرف ریتا بھی رابرٹ سے متنفر ہو کر لگتا ہے شوکی کے کندھے پر سر رکھنے آئی ہے مگر یہ بات آگے چل کر کھلے گی کہ کیا ہوتا ہے۔ اسے آرا راجپوت کی کہانی زبردست ہے۔ ناک تلے میں زلفی نے اپنے ہی بھائی کو موت کے کھٹ اتار دیا اور پولیس کی تشکیک جیڈ اور فیضی کے گرد گھومتی رہی۔ زلفی پہلے بتا دیتا کہ خالدہ میری پسند ہے تو شاید آفتاب شادی سے ہی انکار کر دیتا۔ خیر ہونی تو ہو کر ہی رہتی ہے ناک تلے بھی اچھی رہی۔ مسٹر فرد نے بیوی کو چھوڑ کر زندگی کو ترجیح دی بھلا انہیں جیون دان کا کیا پتا جو ایک لڑکی کو چھوڑ کر دوسری تیسری اور کئی لڑکیوں سے بے تکلیف ہوتے ہیں اور بیوی بھی ان کے لیے کلب کی لڑکی سے زیادہ نہیں۔ جیون دان تو راجہ نے نبھایا دونوں پر چڑیوں پر علی لکھ کر دوست کو بچا گیا۔ وسیم بن اشرف کی کہانی بہت عمدہ رہی۔ بارون کر و نیو فر کو دور حرف بھیجو اس پر۔ مات میں نمبروں کی نیٹ محبت بھی اسے رلا گئی۔ ناہید سلطان اختر کی کہانی دلچسپی سے بھرپور بہت اچھی لگی۔ چنار سنگتے ہی رہے۔ نوشی اور جاذب کی دوستی نکاح میں بندھ گئی لیکن سنگتے چناروں کے درمیان ہر آہٹ ان کے لیے موت کا پیام ثابت ہوتی رہی مگر اس دوران بھی جاذب نے کئی ہندوستانی فوجیوں کو جنم واصل کیا اور پھر نوشی اور جاذب بھی آزادی کے لیے قربان ہو گئے۔ سمندر دیکھنے کی چاہ میں مریخ پر جا پہنچا واقعی اسی لیے تو کہتے ہیں جتنو جو کرے وہ چھوئے آسمان، عمدہ تحریر۔ محفل و شعر و سخن سے باسط ولید الرحمن، نوشہ نگار اور تانیہ خورشید کے شعر اچھے لگے اور کترنوں میں جاوید اختر رانا اور وزیر محمد خان چھائے رہے۔“

رمضان یا شا کا خط کلشن اقبال کراچی سے۔ ”دسمبر 2017ء کا سسپنس مل گیا، گیٹ اپ بہت اچھا تھا، فہرست بھی حسب معمول، انشائیہ بھی فکر انگیز تھا۔ پچھلے ماہ بیماری کی وجہ سے محفل میں حاضر نہ ہو سکا معذرت۔ اس ماہ بھی حالت صحیح نہیں ہے اس لیے پرچہ پڑھ نہیں پایا۔ تمبرہ بھی نہیں لکھوں گا۔ (اللہ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے)۔ البتہ ایک نیا مضمون روانہ کر رہا ہوں وہ ہے سال 2017ء میں اول نمبر پر آنے والے خطوط کا ذکر، شاید اہل محفل کو اور دیگر قارئین کو لطف آ جائے۔ جنوری 2017ء کے خطوط کی محفل میں صدارت کی کرسی پر تشریف رکھا ہے رحیم یار کے رانا بشیر احمد ایاز صاحب اور فردی 2017ء میں لاہور سے نفاشاہ نے محفل لوٹ لی۔ مارچ میں ایک محترمہ بلقیس خان نے فتح کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اپریل 2017ء کو سسپنس کی مستقل قاریہ محترمہ طاہرہ گلزار صاحبہ محفل کے سنگھاسن پر براجمان تھیں۔ مئی میں لاہور سے عامر خان سند نشین ہوئے۔ جون 2017ء کو چارسدہ سے دوست محمد تشریف لائے اور کرسی صدارت پر بیٹھ گئے۔ جولائی میں شیخ پورہ کے پائندہ خان مہمان خصوصی تھے۔ اگست میں بہاولپور کے عادل عباسی اول نمبر پر آئے۔ ستمبر 2017ء کو پشاور سے محترمہ ڈاکٹر نائلہ نصر تشریف لائیں اور چھانکیں۔ اکتوبر 2017ء کو دوسری بار بلقیس خان نے میلا لوٹ لیا۔ نومبر کو محفل میں تشریف لائے ہیں عبدالجبار رومی انصاری صاحب اور انہوں نے صدارت سنبھال لی۔ دسمبر 2017ء کو محترم جناب حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی صاحب سنگھاسن پر براجمان ہوئے۔ (بہت خوب آپ کی یہ کاوش بھی بہت ہے ہمارے لیے)۔“

بابر عباس، فضل عباس، کھاریاں سے شریک محفل ہیں۔ ”سرجی امید کرتا ہوں میں رب کریم کی عظیم اور بابرکت ذات سے جو غفور و رحیم بھی ہے اور نہایت رحم والا ہے جو جبار بھی ہے اور قہار بھی۔ جس نے اتنی پیاری اور خوب صورت کائنات میں ہم جیسے گونا گوں کو پیدا کیا کہ آپ اور سسپنس کے دیگر اراکین خیریت سے ہوں گے۔ (جی بالکل خیریت سے ہیں)۔ سرجی سسپنس کا نیا شمارہ جو ماہ دسمبر کی شکل میں 2017ء کا آخری شمارہ تھا۔ 19 نومبر کو اپنا دیدار کرواتے ہوئے اس طرح ہاتھ میں آچھیسے کسی ایمان دار افسر کے ہاتھ اس کی تنخواہ آتی ہے۔ کہانیوں کی فہرست چیک کرنے پر پتا چلا کہ فہرست میں تو نئے اور پرانے لکھاریوں کی قومی اسٹیج لگی ہوئی ہے۔ کبھی ایک وقت وہ تھا کہ کہانیوں کی یہ فہرست نجی الدین نواب مرحوم، کاشف زبیر مرحوم، مختار آزاد مرحوم، عبدالقیوم شاد مرحوم، محمود احمد مودی اور بہت سے دوسرے خوب صورت ناموں سے جگمگ کرتی تھی۔ (جی بالکل درست فرمایا آپ نے اسی لیے تو ہم نے سسپنس کلاسک کے عنوان تلے اپنے انہی محبوب نڈکاروں کو خراج تحسین پیش کرنے کا سلسلہ شروع کرنے کا سوچا ہے)۔ جون ایلیا صاحب بھی ہم میں نہیں ہیں مگر اپنے زبردست انشائیہ چھوڑ گئے ہیں۔ مژدہ بھی ان کی ایک زبردست تخلیق تھی۔ سرجی! آپ نے میڈم نور جہاں کا یہ گانا تو سنا ہی ہوگا جا اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے سو جا..... جو جی حکمران آتا ہے ہم پر بجلی کے نام پر حکومت کرتا ہے۔ اب کی بار جو شمارہ آ رہا ہے وہ 2018ء کا پہلا شمارہ ہے یعنی نئے سال کا پہلا شمارہ۔ نئے سال کی آمد آمد ہے، سواس پرمسرت اور خوب صورت موقع پر آپ کو اور سسپنس کے دیگر اراکین کو میری طرف سے نئے سال کی خوشیاں مبارک ہوں۔ خدا کرے یہ نیا سال ہمارے ملک کے لیے اور ملک میں رہنے والوں کے لیے خوب صورت اچھا ثابت ہو۔ خدا کرے آنے والا سال استحکام پاکستان کا سال ثابت ہو۔ خدا کرے آنے والا سال پاکستان کو کرپشن سے پاک کر دے۔ خدا کرے آنے والا سال ہمارے ملک کے سیاستدانوں کو غش و شعور کی آگہی دے۔ آئیے ہم سب مل کر دعا کریں آنے والے سال میں ہمارا پیارا سسپنس، جاسوسی، سرگزشت اور پاکیزہ معراج رسول صاحب کے یہ چاروں ستون مزید ترقی کرتے ہوئے مزید بلندی کی طرف جائیں۔ (آمین)۔ کرسی صدارت اس بار ہمد ویرینہ عمران خان نیازی کے شہر میا نوالی سے جن کا تعلق جناب حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگ جگمگ کر رہے تھے! محترم شاہ جی ایک ماہ کے لیے کرسی صدارت مبارک ہو۔ کرسی پر ذرا دھیان سے بیٹھنا ہے یہ نہ ہو کوئی ٹانگ کھینچ لے۔ ویسے بھی ٹانگ کھینچنے میں ہم پاکستانی بڑے ماہر ہیں۔ بہر حال خط بہت خوب صورت اور پیارا تھا۔ عبدالجبار رومی صاحب اور ساتھ میں انصاری بھی لگا لیا ہے



بھیا جی کیا چکر ہے۔ عبدالغفور خان صاحب شادی کی مبارک باد قبول کریں۔ خدا کرے یہ شادی آپ کو اس آجائے۔ (آمین)۔ محمد خواجہ صاحب اللہ تعالیٰ آپ کا ڈپریشن ختم کرے یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہر ایک کا مسئلہ ہے ہر کوئی حکومت کی جان کو رو رہا ہے۔ اہم سہادت کرنا ہی صاحب! معراج رسول کے لگائے ہوئے چاروں پھول زبردست خوشبودے رہے ہیں۔ پرویز احمد لاٹکا صاحب ہم پاکستانی قوم چھٹیوں پر بہت خوش ہوتی ہے۔ ایک وہ وقت تھا سسپنس کا آغاز دی گریٹ رائٹر جناب عزت مآب نجی الدین نواب صاحب کی لافانی تحریر دیوتا سے ہوا کرتا تھا پھر وقت نے ایسی مار ماری کہ نجی الدین نواب صاحب رہے نہ ایم اے راحت نہ سلیم فاروقی نہ ہی کاشف زبیر اور نہ ہی مختار آزاد اور پھر رنگ آسمان نے اپنا رنگ بدلا سسپنس اور جاسوسی میں نئے نئے لکھاری سامنے آنے لگے۔ خیر اس بار سسپنس کا آغاز اے آرا راجپوت کی تخلیق رنگ آسمان سے ہوا۔ رنگ آسمان کی اٹھان بتاتی ہے کہانی آگے چل کر مزید گھرے گی۔ شاباش اے آرا راجپوت صاحب۔ وقت وقت کی بات ہے۔ حسام بٹ صاحب وقت کے ساتھ ساتھ بہتر ہوتے جا رہے ہیں مگر حسام بٹ صاحب اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ وقت کی کہانی کو تیز کیا جائے۔ وقت بہت سلوجا رہا ہے خدا اور وقت کا حال آتش نشاں کی طرح مت کریں۔ تاریخ کے جھروکوں سے ڈاکٹر ساجد احمد کی تحقیق نوشت اتحاد ڈاکٹر صاحب کی طرح خوب صورت تھی آخری صفحات پر اس شخص کی کہانی جو لفظوں کا جادو گر ہے جو الفاظ کے چناؤ پر مکمل دسترس رکھتا ہے، الفاظ جس کے سامنے یہی کہتے ہیں کیا حکم ہے میرے آقا..... ہماری آن سسپنس کی شان جناب طاہر جاوید مغل صاحب تالیاں۔ ارے دوستو طاہر جاوید مغل صاحب کے لیے تالیاں ہی بجا دیں۔ کیا کہانی آخری صفحات پر دی ہے۔ شکست کی فتح مغل اعظم صاحب یقین کریں زبردست اور بہترین تحریر تھی۔ یہ سسپنس کے آخری صفحات پر ادارہ سسپنس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ قارئین کو ہمیشہ زبردست اور باذوق کہانیاں پڑھنے کو دیتے ہیں۔ کس کس کہانی کا نام لوں۔ بہر کیف طاہر جاوید مغل صاحب آپ کے الفاظ میں جادو ہوتا ہے جو قارئین کو اپنے سحر میں بکڑ لیتا ہے۔ ملک مفدر حیات کی ڈائری سے اس بار ناک تلے لے کر آئے، اس بار کہانی سوسو ہی گئی۔ باقی کی کہانیاں بھی اپنی معیار کے مطابق ٹھیک ہی تھیں۔ منظر امام صاحب کی بہر حال کمی محسوس ہوئی۔ (آپ کا محبت بھرا تمبرہ حاضر ہے۔ اب تو آپ خوش ہیں نا؟)

دوست محمد پشاور سے تمبرہ کر رہے ہیں۔ ”پیارا سسپنس 17 تاریخ کو ملتا پیاری اور ناٹھوں کے آپریشن کی وجہ سے سسپنس سے تھوڑا دور رہا۔ بیماری میں خود سے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی صحت یاب ہوں گا تو سب سے پہلے سسپنس ڈائجسٹ کو ہاتھ لگاؤں گا۔ (بہت افسوس ہوا آپ کی بیماری کا جان کر..... اللہ آپ کو مکمل صحت یابی سے نوازے۔ سسپنس سے آپ کی محبت کا بے حد شکریہ)۔ شکر ہے کہ خدا کو ہم پر رحم آیا اور بارش برس گئی اور اسموگ کا خاتمہ ہوا ویسے یہ سب ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ ٹائٹل پر حیدر منہ میں انگلی دبائے ایسے خوش نظر آ رہی ہے جیسے اس نے کوئی اچھی خبر سنی ہو۔ ویسے بہت خوب صورت اور دیدہ زیب ٹائٹل تھا۔ ویلڈن ڈاکٹر انگل۔ جون ایلیا صاحب کی فلسفیانہ باتیں سمجھنے کے لیے تھوڑا بڑا دماغ درکار ہے۔ انسان ایسا ہی ہے۔ تھوڑا سا ہاتھ میں کچھ ہو تو زمین پر بڑا اکڑ کر چلتا ہے لیکن تھوڑی سختی اور پریشانی آئے تو سب اکڑ نکل جاتی ہے۔ انگل آپ نے بڑی اچھی باتیں کی ہیں۔ مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ کے ہم اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہم تنگ آ گئے ہیں۔ خدا ہی ہمارے ملک کا حامی و ناصر ہو۔ آئین۔ اس کے بعد ہم گئے دوستوں کی محفل میں۔ ویسے یارا نے محفل میں جتنے بھی دوست ہیں یہ سب اپنے گھر کے افراد لگتے ہیں۔ اس دفعہ صدارت کی کرسی حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی کے حصے میں آئی۔ بہت مبارک ہو۔ کافی اچھا تمبرہ آپ کا۔ ویسے حکیم صاحب اگر آپ طب کے شعبے میں ہیں تو بیمار یوں کے بارے میں اچھے مشورے بھی ارسال کیا کریں۔ زرین خان آفریدی کا تمبرہ بھی کافی شاندار تھا۔ ویسے آفریدی بھائی میں آپ کا تمبرہ بھی کافی شوق سے پڑھتا ہوں۔ اشفاق شاہین، رومی انصاری، رابعہ آفرین، محمد خواجہ، ادریس احمد خان، محمد مفدر معادیہ، ریاض بٹ محمد زرین سلطان اور اوشا راٹھی کے تمبرے بھی بہت شاندار تھے۔ ڈاکٹر ساجد احمد کی نوشت اتحاد پڑھی۔ عائشہ کے انجام سے بہت دکھ ہوا۔ وہ لا لچ نہ کرتی تو ایسے حالات سے بچتی۔ کیا زندگی تھی ان لوگوں کی جو ہر وقت ایک دوسرے کے لیے کھانا کھودتے تھے۔ ہر وقت محل میں اور محل سے باہر سازشیں بنتی رہتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اچھی کاوش۔ ڈاکٹر صاحب کے قلم میں بھی وہی کاٹ اور وہی منظر نظر آتا ہے جو الیاس بیتا پوری مرحوم کے قلم میں تھی۔ محمد یاسر اعوان کی ہوشیاری پڑھی۔ ایک ہمدرد خاتون ڈاکٹر کریسٹ اور اس کی بیوی کے چنگل میں پھنس گئی تھی لیکن جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ ڈاکٹر کریسٹ جیسے انسان سچا کے روپ میں درندے ہوتے ہیں۔ محمد یاسر اعوان صاحب آپ آگئے اور چھا گئے۔ مات ناہید سلطانہ اختر کچھ عجیب سی کہانی، کہانی پڑھ کر احساس ہوا کہ یہ عشق و فیرہ کے کھیل، ہم غریبوں کی بس کی بات نہیں ہے۔ آج کل ہر انسان اتنا معروف ہوتا ہے کہ عشق کے لیے ٹائم کہاں۔ وسیم بن اشرف کی جیون دان میں دوستی کی ایسی تصویر دیکھی تو بہت حیران ہوئے۔ راجر کی علی کے لیے آخری وقت تک قربانی ہمیشہ یاد رہے گی۔ ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ تیسری کوشش خوریر ریاض صاحب کی گزارے لائق تھی۔ میرے فیورٹ ملک مفدر حیات کی ناک تلے پڑھی۔ سچ کہتے ہیں دنیا میں ساری جنگیں زن زور اور زمین کے لیے ہوتی ہیں۔ آفتاب کا خون اپنے ہی بھائی زلفی نے کیا تھا اور بیچارے جاوید عرف جیڈ اور فیضی مفت میں خوار ہوئے۔ داستان گو میں علی اختر صاحب نے کچھ مختلف پیش کیا۔ ویسے وہ زمانہ کیا جب لوگوں کے پاس ٹائم ہی ٹائم تھا اور وہ ایسے ہی بزرگوں کی داستانیں سنا کرتے تھے۔ آج کل انٹرنیٹ کے دور میں لوگوں کے پاس ٹائم کہاں۔ (بالکل درست فرمایا آپ نے..... مگر داستان گوئی کی انفرادیت اور سحر انگیزی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا)۔ شرمعاس صاحب نیا موڈ لے کر آئے۔ ایک اچھی کہانی اینڈنگ اس میں دلچسپی موجود تھی۔ تلاش میں بابر نعیم صاحب ہمیں کہاں لے گئے ہم تو سمجھے کہ بیچارہ لڑکا شاید سمندر دیکھنے کی خواہش لیے کلفٹن کے ساحل پر جائے گا لیکن وہ تو مریخ کا باشندہ نکلا۔ حسام بٹ صاحب کی وقت مخصوص رفقا کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور آگے جا کر مزید دلچسپی پیدا ہوگی۔ ایک بات کی خوشی ہوئی کہ علی کو اپنی ماں مل گئی اور وہ اپنے دشمنوں سے اب بدلہ ضرور لے گا۔ خود کردہ میں ایک بار پھر مشرقین کی ہوشیاری کا کام کر گئی۔ سلیم انور کی مختصر لیکن اچھی کہانی تھی۔ مظہر سلیم ہاشمی کی تھوڑا پسند نہیں آئی معذرت۔ رضوانہ ساجد کا حضرت یوسفؑ کا ایمان افروز واقعہ اختتام کو پہنچا۔ حضرت یوسفؑ نے جو خواب دیکھا تھا خدا نے اس کو سچ



کردیا اور اپنے باپ حضرت یعقوبؑ سے بھی ملوادیہ۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی شکست کی فتح پڑی۔ طاہر صاحب کا نام ہی کافی ہے۔ شکست کی فتح میں ایک لڑکی کی ہمت کی کہانی وہ بیان کرتے ہیں کہ جو ہمت کرتا ہے اس کا صلہ وہ ضرور پاتا ہے۔ نور نے بھی آخری وقت تک ہمت کی اور اس کا صلہ اس کو مل گیا اور ذوالقرنین جیسا باکر دار انسان بھی اس کو مل گیا۔ طاہر انکل کی سسپنس میں سلسلے دار کہانی شائع ہونی چاہیے۔ محفل شعر و سخن میں اوشارا مٹی، زرین آفریدی، عنبرین ناز اور سائرہ نواب کے اشعار پسند آئے۔ کتریں بھی بہت اچھی تھیں۔ مجموعی طور پر دسمبر کا شمار بہت زبردست تھا۔ خدا آپ کے ادارے کو اسی طرح روشن رکھے۔ آمین۔“

محمد رفاقت کا واہ کینٹ سے تبصرہ۔ ”ماہ دسمبر کا شمار ہاتھ میں ہے۔ اس میں اپنے خط کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ محترم آپ نئے لکھنے والوں کو خوش آمدید کہتے ہیں ویسے میں آپ کا رسالہ سسپنس ڈائجسٹ بہت عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ خط پہلی بار لکھا اور وہ آپ نے شائع کر دیا جس کے لیے میں آپ کا اور آپ کی تمام ٹیم کا بہت بہت شکر گزار ہوں۔“ آپ کے خط میں جو لوگ بھی لکھتے ہیں اس سے رسالے کی بہتری کے ساتھ ساتھ ہمیں دوسروں کے خیالات کا بھی پتا چلتا ہے۔ سب سے پہلے ملک صفدر حیات صاحب کی کہانی ناک تلے جرم کی تفتیش پر بات کروں گا کہ ان کے کارنامے بہت ہی شاندار ہیں۔ ان کی تحریر پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تفتیش کرنا کوئی ان سے کیسے۔ مشکل سے مشکل جرم کو بھی یہ بے نقاب کر دیتے ہیں۔ جناب کی خدمت میں آپ کو بہت بہت مبارکباد دیتا ہوں۔ ویلڈن محترم ملک صفدر حیات نوشت اتحاد بہت اچھی کہانی تھی جس میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، اس میں مصنف نے حق ادا کر دیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام بہت اچھی رہی۔ باقی کہانیوں میں داستان گو، نیاموڑ، تلاش، وقت، خود کردہ تبادله اگرچہ چھوٹی کہانی تھی مگر اچھی تھی۔ حنفہ، ہوشیاری، مات، رنگ آسمان، جیون دان، تیسری کوشش، سب ہی کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اور ان میں سلگتے چنار، شکست کی فتح نے بھی دل خوش کر دیا۔ محفل شعر و سخن کے ساتھ ساتھ کتریں بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ میری طرف سے سب لکھنے والوں کو بہت بہت مبارک ہو۔“

اور لیس احمد خان، ناظم آباد کراچی سے شامل محفل ہیں۔ ”ماہ دسمبر کا سسپنس بہترین سرورق کے ساتھ جس میں ذکر صاحب کی کاوشوں کا حصہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ بہت اچھے انداز میں بنایا گیا تھا۔ انشائیہ بھی متاثر کن تھا۔ ناموں کی محفل میں سر فہرست حکیم سید رضا شاہ نقوی نظر آ رہے تھے مبارکباد۔ دیگر دوست بھی بھرپور حاضری لگا رہے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی ”نوشت اتحاد“ پڑی۔ تاریخ کے درپچوں سے آگاہی حاصل ہوئی۔ ”ہوشیاری“ بھی اچھی تحریر تھی۔ دوسری ”مات“ جو ناہید سلطانہ اختر کی کہانی تھی واقعی لفظوں میں بحر پھونک دیتی ہیں ناہید سلطانہ اختر صاحبہ۔ رنگ آسمان اے آرا چوت کی خوب صورت کہانی ہے۔ آگے بھی دلچسپی جاری رہے گی۔ جیون دان واقعی دوستی ہو تو ایسی ہو جیسی راجر نے علی کے لیے اپنا کر کے دوستی کی لاج رکھی لی۔ جان بھی دوست پروردی بہت خوب تیسری کوشش بھی بہتر کہانی تھی داستان گو بھی پڑا کہانی تھی۔ اشعار کی محفل میں منتخب اور اچھے شعروں نے مزہ دیا۔ نیاموڑ اور تلاش بھی اچھا تاثر دیتی کہانیاں تھیں۔ پھر وقت پڑی جس کا انتظار رہنے لگا ہے اور بے حد پسند ہے۔ کامیابی سے جاری ہے۔ خود کردہ میں ایک چھوٹے سے نکتے نے جس کی طرف دھیان نہیں جاسکتا تھا مگر ذہین سراغ رساں نے ذہانت سے کیس حل کر لیا۔ دلوں کو تسخیر کرنے اور ایمان کی روشنی بکسیر نے والی داستان یوسف علیہ السلام اختتام کو پہنچی۔ امید ہے آئندہ بھی دیگر نئیوں کے واقعات بھی اتنی ہی تفصیلات کے ساتھ پڑھنے کو ملیں گے اس کے بعد سلگتے چنار پڑی جو کشمیر جنت نظیر خطے کے پس منظر میں لکھی گئی۔ حنفہ نے بھی متاثر کیا کہ سراغ رساں نے وطن دوستی کا ثبوت دیا۔ شکست کی فتح طاہر جاوید مغل صاحب کی خوب صورت ترین کہانی تھی۔ کترنوں نے بھی لطف دیا۔“

رانا بشیر احمد ایاز کی رحیم یار خان سے آمد۔ ”کچھ گردش زمانہ اور کچھ غم جاناں! یہ وہ عوامل ہیں جن کی وجہ سے ہم محفل دوستان سے دور ہوئے۔ سب سے پہلے تو تمام دوستوں اور اسٹاف کو سال نو مبارک ہو۔ ایک سال پہلے 2017ء کی مبارکباد اور آپ کو اب 2018ء کی مبارکباد دیتے ہیں۔ دعا ہے کہ آنے والا سال سب کے لیے خوشیوں سے بھرپور ہو خاص طور پر وطن عزیز کے لیے سلامتی اور امن کا پیغام لائے۔ اس دفعہ کرسی اقتدار پر حکیم سید محمد رضا صاحب براجمان تھے بہت دلکش اور جامع تبصرہ تھا حکیم صاحب کا، مبارکال۔ زرین آفریدی مہمانوں میں مصروف رہنے کے باوجود بھی سسپنس سے جڑی رہیں۔ اچھا تبصرہ تھا۔ عبدالبجبار رومی انصاری نے بھرپور تبصرے کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کورنگی سے محمد خواجہ صاحب کافی طویل عرصے بعد تشریف لائے۔ خواجہ صاحب کافی ڈپریشن نظر آئے۔ کے ایکٹرک نے بہت ظالمانہ سلوک کیا ان کے ساتھ اس وجہ سے خواجہ صاحب کا تبصرہ بھی کافی اداس اور بو جھل سا تھا۔ خواجہ صاحب اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔ باقی محمد صفدر معاویہ بھائی کا تبصرہ رنگ محفل تھا۔ بہت عمدہ جناب۔ کہانیوں میں سلسلے مغل اعظم کی شکست کی فتح پڑی۔ دوسرے حصے کا بے چینی سے انتظار تھا جو ختم ہوا۔ نور نے ہمیشہ دوسروں کی باتیں سنیں لیکن اپنے شوق کو نہ چھوڑا۔ کھا پری برادری نہایت ضدی ثابت ہوئی۔ نشوونگی نے ہر دفعہ نور کو شکست دی لیکن اس طوفانی رات میں نور نے جو ریس جیتی اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ قاری ذوالقرنین بھی اپنی محبت میں ڈنار ہا اور گوہر مراد حاصل کر لیا۔ آخر میں نور نے نشوونگی کو بھی شکست فاش دے دی۔ ویلڈن مغل اعظم صاحب۔ وقت میں اسد علی کی پھرتیاں جاری ہیں۔ کہانی ابھی تک چند کرداروں کے گرد گھومتی نظر آ رہی ہے۔ کہانی کا نیچو بالکل ست چل رہا ہے۔ ڈیلفینا کی متوقع آمد نے کچھ دلچسپی لینے پر مجبور کیا ہے۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ منظر سلیم ہاشمی کی تحریر تبادله، کہانی کم اور مکالمہ زیادہ تھی۔ رنگ آسمان ایک دلچسپ اور منفرد انداز کی کہانی ہے جو کہ قیام پاکستان کے دور کی ہے۔ ایک طرف مجاہدین کی جدوجہد اور دوسری طرف مکار ہندوؤں کی چالیں، شوکت، رینا کو پسند کرنے لگا ہے مگر اربث راستے کا پتھر بن گیا ہے۔ گارشا شوکت کے پیچھے نہادھو کر پڑ گئی ہے۔ اریہ علی ریحان اور شاہ زین کے لیے فیبی امداد کے طور پر سامنے آئی ہے۔ شامل لاج کی وجہ سے حرام موت مارا گیا۔ وسیم بن اشرف کی جیون دان نہایت اثر انگیز رہی۔ راہرنے دونوں پر چیخوں پر علی کا



نام لکھ کر بہت بڑی قربانی دے دی۔ واقعی وہ لوگ بہت عظیم ہوتے ہیں جو دوسروں کی خاطر اپنا جیون دان کر دیتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کا آخری حصہ پڑھ کر کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ رضوانہ ساجد کی بہت اچھی کاوش، ویلڈن۔ ملک صفدر حیات آخر کار حسب سابق ناک تلے سے قاتل کو پکڑنے میں کامیاب رہے۔ واقعی زر، زن اور زمین بہت بڑا اقتدار ہے۔ زلفی نے خالدہ کی خاطر اپنے سگے بھائی کی جان لے لی۔ اللہ معاف کرے ایسی محبت سے۔ سلگتے چنار مقبوضہ کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی ایک دل گداختزیر تھی۔ جاذب اور نشین بہت جدوجہد کے بعد آخر آزاد سرزمین پر جان دے دی۔ اقوام متحدہ اور تمام عالمی ادارے جو انسانی حقوق کے نام نہاد ٹھیکیدار ہیں ان کو شرم آنی چاہیے۔ بھارت کی ہٹ دھرمی کو لگام دینا چاہیے۔ محفل شعر و سخن میں سائرہ نواب، محمد صفدر معاویہ، نوشہہ گلزار، وجاہت علی کے اشعار بہترین رہے۔ اب اجازت چاہیں گے لیکن ادارے سے ایک دو درخواستیں ہیں کہ ”سسپنس کلاسک“ کا سلسلہ جلد از جلد شروع کیا جائے اور خواجہ غریب نواز حضرت معین الدین چشتی اجمیری کے بارے میں تحریر شامل کی جائے۔ (آپ کی فرمائش انشاء اللہ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے)۔“

زاہد احمد شادمان ٹاؤن کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ”ہماری اکتوبر کے سرورق پر تنقید کام کر گئی ہے اور سادگی ایسی ہے کہ اس پر مرثیے کو جی چاہتا ہے۔ بہر حال ذکر صاحب آپ کو بھی نہیں پتا کہ آپ نے یہ سادہ سا شاہکا بنا کر کس محبت کی دردناک کہانی کو یاد دلادیا ہے مجبور یوں کی بیہوش چڑھی ہوئی محبت کی قربانی کو یاد دلادیا ہے۔ اے کاش حال ہی یاد رہے کہ ماضی کو بھول جاؤں میں۔ بے شک مرثیہ یہ ہے کہ جس مٹی سے انسان بنا ہے اسی مٹی میں اسے جانا ہے پھر بھی وہ اسی پر اکڑ کر چلتا ہے۔ حکمران طبقے کی مثال لے لیں جس عوام سے یہ ووٹ لیتے ہیں انہی پر ظلم کے پہاڑ توڑتے ہیں، بے تحاشا مہنگائی کرتے رہتے ہیں۔ پیٹرول مصنوعات اور پیٹرول کے ریٹ تو ہر ماہ بڑھاتے ہی رہتے ہیں چونکہ یہ عالم اور بے رحم لوگ پاکستان کو چھوڑ کر باہر کے ملکوں میں علاج کراتے ہیں آنے جانے علاج معالجے کے ہماری اخراجات محصور عوام پر ٹیکس لگا کر مہنگائی کر کے اور پیٹرول پر پیسے بڑھا کر پورے کرتے ہیں اور اربوں کھریوں کی مٹی لائڈ رنگ الگ ہے جبکہ ان کو پتا ہے کہ اسی مٹی میں انہیں دفن ہوتا ہے لیکن عوام کو لوٹنے ٹھوٹنے اور ان کا تیل نکالنے سے باز نہیں آتے اور یہ اس ساری لوٹ مار کو لوٹ کھسوٹ مٹی لائڈ رنگ جو کہ اربوں کھریوں کی ہے جمہوریت اور ملک کی ترقی کا نام دیتے ہیں۔ ہمارے ملک خداداد پاکستان میں 21 کروڑ تیل کے کنوے پاکستانی غریب اور متوسط عوام کی شکل میں موجود ہیں جن کا روزانہ دن رات میں مختلف قسم کے ٹیکس لگا کر اور مہنگائی کر کے تیل نکالا جاتا ہے اور عوام اچھے وقت کی آس میں مجبور ہیں اور سسک رہے ہیں۔ اپنی محفل میں پہنچے تو.... آپ کا حکومت پر تبصرہ بھی پسند آیا۔ بے شک میں اور ہم سب آپ سے متفق ہیں، حکیم رضا شاہ صاحب کو کرسی صدارت پر پایا بہت اعلیٰ تبصرہ ہے حکیم صاحب کے دل میں مسلم امہ کے لیے بہت درد ہے۔ اس مرتبہ بھی میرا تبصرہ لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن ایک تو سرورق نے بہت متاثر کیا اور دوسرے اشفاق شاہین بھائی نے بھی میرے تبصرے کی تعریف کی اور صفدر معاویہ بھائی نے میرے مرحوم بیٹے کے سلسلے میں مجھے مبرکی تلقین کی اور اس کے نعم البدل کی جو آپ نے عدا دی۔ بھائی مبارک ہو آپ کی دعا پہلے ہی قبول ہو چکی ہے اور آپ کے بھائی یعنی میرے گھر میں خوشخبری ہے۔ اللہ نے ہم میاں بیوی کی سن لی ہے۔ نوشت اتحاد کو پڑھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ ماضی میں بھی مسلمانوں میں اتحاد نہیں تھا اور حال میں تو بہت زیادہ اتحاد کا فقدان ہے۔ داستان یوسف علیہ السلام جب بھی ہم پڑھتے ہیں تو اسی دور میں کھوجاتے ہیں اور اس کے طلسم سے ہم بڑی ہی مشکل سے نکل پاتے ہیں اور حقیقی پھر بھی رہ جاتی ہے فیاض علی کے بیٹے زلفی نے اس کی ناک تلے بڑے بھائی آفتاب کو ایسے ٹھکانے لگایا کہ ملک صاحب بھی پوری کہانی میں چکر کر رہ گئے لیکن فتح تو ملک صاحب ہی کی ہوئی تھی۔ ویلڈن۔ ملک صاحب کی یہ رو داد پڑھ کر ہمیں ہائیل اور قاتیل کی کہانی یاد آگئی بے شک اللہ قادر مطلق ہے وہ بعض اوقات شکست کو بھی فتح میں بدل دیتا ہے۔ نور کی شکستوں کو بھی اس نے بڑی بڑی فتوحات میں بدل دیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر کسی کو کوئی نہ کوئی صلاحیت ودیعت کرتا ہے اور اللہ کو اس کی اس صلاحیت سے کام بھی لینا ہوتا ہے لہذا نور کی دوڑنے کی صلاحیت کو ٹیکہ دے میں لینا اور اس کی مخالفت کرنا گویا اللہ عزوجل کی مخالفت کرنا ہے۔ نور کا باپ بھی ایک جاہل انسان تھا ایسے لوگ نہیں جانتے کہ حدود و قیود میں رہتے ہوئے اسلام نے بھی ہر کمیل کی آزادی منصف نازک کو دی ہے جبکہ اس کے بڑے بھائی اور نور کے تایا ابو واقعی دین سے واقف روشن خیال اور عظیم انسان تھے بہر حال ذوالقرنین کی محبت اور چاہت رنگ لائی۔ ویلڈن مغل صاحب۔ رنگ آسمان بھی جنگ آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی رو مانس مار دھاڑ اور سسپنس سے بھری ایک دلچسپ داستان لگتی ہے۔ اے آرا چوت صاحب اس داستان میں دو مختلف کہانیاں اور کرداروں کو ایک ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ دونوں کہیں جا کر مل جائیں۔ واقعی یہ سلسلہ سسپنس اور ایکشن سے بھرپور لگتا ہے۔ راجپوت صاحب داد کے مستحق ہیں۔ وقت گزرتا جا رہا ہے، ہم تو سوچ رہے تھے اسد صاحب جب پاکستان پہنچیں گے تو بہت مار دھاڑ ہوگی کیونکہ ان کے دشمن جوان کے والد کی شکل و شبہت کی وجہ سے ان کو پہچان جائیں گے اور ان کی والدہ دشمن کی قید میں ملیں گی۔ لیکن ہمارے سارے اندازے غلط ہو گئے۔ بہر حال سلطان صاحب کی وفات کا بڑا دکھ ہوا اور کہانی اب ڈھیلے ڈھالے انداز میں چل رہی ہے۔ ہاں آخر میں کچھ پھل ہوئی ہے۔ شاید ڈیلفینا پہنچ گئی۔ اب اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ خود کردہ خود کشی کی وہ مثال ہے جو مغرب میں ایک باپ نے اپنے بیٹے کے لیے کی لیکن سُر میں ہومز شرلاک ہومز بن کر معاملے کی تہنک پہنچ گیا۔ سلیم انور صاحب کی مغرب سے منفرد دریافت ہے۔ تبادله سیزیمین کی باتوں سے بچنے کے لیے بہت ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ بہت ہی کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ سیدھے سادھے لوگوں کو یہ بد معاش خوب گھماتے ہیں سادہ لوگوں کو غفلت دی اور چالاکی سکھانے کے لیے اچھی تحریر ہے سلگتے چنار بھی اس جنت نظیر وادی کی ایک کہانی ہے ایسی کہانیاں وہاں پر بکھری پڑی ہیں۔ مسلمان ظلم کا شکار ہیں وہاں پر۔ تلاش بے چارہ مرتخ کا بچہ بابر نعیم صاحب نے مرتخ کے بچے کو دنیا کے سمندر ڈھونڈنے پر لگا دیا۔ عجیب و غریب اداس کر دینے والی کہانی ہے۔ مجھ سے اس کہانی کی تعریف نہیں ہوگی دل عجیب سا ہو رہا ہے یہ بے چارے بوڑھے اور بیٹا بڑے لوگ اپنے دلوں میں اپنے بچوں کی بے اعتنائی کی داستانیں چھپائے پھرتے پھرتے داستان گو بن جاتے ہیں اور اپنے جیسے بوڑھوں اور ساتھیوں میں مل کر اپنے غم کی داستانیں سناتے ہیں اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ ناہید صاحب کی مات کچھ



کچھ بور کچھ مختصر اور ایک فارمولا کہانی ہے۔ جیون دان بھی قربانی کی ایک مثال راجر نے اپنے دوست علی کے لیے جان کی قربانی دی اور آنکھوں کو اٹکبار کر دیا۔ وسیم صاحب کی اچھی کاوش ہے۔ باقی مغرب سے در آمد تیسری کوشش نیا موڑ بھی مناسب ہی تھیں اور تمام دوستوں کے تبصرے عمدہ اور لا جواب ہیں۔ کترنیں اور اشعار بھی عمدہ ہیں۔“

✽ ڈاکٹر عبدالقدیر، سیالکوٹ سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”میری طرف سے نیا سال مبارک۔ میں اس رسالے کا بہت پرانا قاری ہوں اور اکثر اس کا مطالعہ کرتا ہوں مگر تبصرہ پہلی دفعہ بھیج رہا ہوں میرے خیال میں ملک کے سب سے اچھے ڈائجسٹ آپ کے اسی ادارے کے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بہت زیادہ کامیابی نصیب فرمائے۔ (بہت شکریہ جناب)۔ قارئین کے خطوط پڑھنے کے بعد آخری صفحات کی کہانی ملک مصدحیات یا مرزا احمد بیگ کی کہانی، انبیاء علیہ السلام یا ولی اللہ کی کہانی ضرور پڑھتا ہوں۔ ادارے سے گزارش ہے کہ ملک صاحب اور بیگ صاحب کا ناکامی کا بھی کوئی واقعہ شائع فرمایا کریں۔“

✽ محمد صفدر معاویہ، خانوالہ سے شریک محفل ہیں۔ ”2017ء کا آخری شمارہ 16 نومبر کو صدر بازار پشاور سے جا کر وصول کیا۔ سرورق کو ایک درباری ماڈل سے آویزاں کیا گیا خاص طور پر آنکھیں دلکش حسین ساچرہ اور خوب صورت سی ڈی زلیں اور ہاتھ میں خوب صورت چوڑیاں اور ہی سماں پیش کر رہی تھیں۔ محترم جون ایلیا صاحب کے مژدہ میں حقیقت ہماری باتیں پڑھیں جو سید عادل پر اثر کرتی ہیں آپ کا ادارہ پڑھا سال 2017ء بھی اپنے اختتام کو پہنچنے والا ہے۔ یہ سال بھی خود کئی دلا سے دیتے ہی گزر گیا حکومت کے وعدے بس یہ کہ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے آخر کبھی نہ کبھی نہیں تو جواب دینا ہی پڑے گا یہ لوگ اتنی دولت کا کیا کریں گے جو آتی ہی دوسروں کے کام ہے۔ حرام کمانے والا کم ہی اس میں سے کھا سکتا ہے۔ کھاتے ہیں مال مفت دل بے رحم۔ قائد اعظم محمد علی جناح کا احسان ہم کیا ہماری تسلیں تک نہ اتار پائیں گی دینا واڈیا کو اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے آمین۔ دوستوں کی محفل میں آئے تو میاں والی سے حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی بہت ہی بہترین تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت سنبھالے ہوئے تھے، مبارک ہو بہت اچھا لکھا آپ نے۔ زرین خان آفریدی کا تبصرہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ اشفاق شاہین کی بھی بہت عمدہ آمد۔ انصاری بھائی بھی محفل میں اپنے رنگ بکیر رہے ہیں۔ رابعہ آفرین آپ کو ویکلم آپ کا تبصرہ بھی ٹاکس ہے۔ عبدالغفور خان بھی مختصر نامے کے ساتھ شریک محفل۔ محمد خواجہ صاحب تو چھانگے بس بھائی اللہ ہم کو ہر لمحے کی زمین آئے سے بچائے۔ ایم سخاوت کی اچھی تبصرہ نگاری۔ اور بس احمد خان، محمد رفاقت، انجم فاروق ساحلی، ریاض بٹ، پرویز احمد، محمد زرین سلطان اور اوشا راہی کے تبصرے بھی میٹ رہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شکست کی فتح پڑی نور نے آخر کار وہ کارنامہ انجام دیا جس نے اس کے والد اشفاق کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ دھر ڈالقرین نے اپنی محبت پالی۔ نور نے شادی سے پہلے اپنی ساری کشتیاں جلا دیں تو شوہر نامہ دار نے بنوا دیں بہت ہی پیارا اینڈ تھا۔ ہوتا کیوں نہیں لکھی جو مغل صاحب نے تھی۔ اے آراجوت کی رنگ آساں پڑی۔ بہت خوب ایک طرف گوروں والا قصہ تو دوسری طرف مجاہدین والا کارنامہ دونوں بہت خوب جارہے ہیں۔ شوکی کا کردار بھی بہترین ہے۔ ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد احمد کی نوشتہ اتحاد پڑی۔ پہلے تو آپس کی لڑائی پڑھ کر بور ہی ہو رہا تھا، پر آخر میں دل خوش ہو گیا۔ ہمیں اب اسی اتحاد کی ضرورت ہے۔ محمد یاسر اعوان ہوشیاری اچھی رہی۔ کلیر اسکے ذہن نے کیس کو صحیح حل کیا پر خود مرتے مرتے ہنسی۔ ناہید سلطانہ اختر کی مات بھی عمدہ ہے۔ یہ عشق بری بلا ہے بس خدا بچائے۔ وسیم بن اشرف کی جیون دان میں راجر کی علی کے لیے دی گئی قربانی قابل رشک ہے۔ تنویر ریاض کی تیسری کوشش بھی اچھی رہی۔ ملک مصدحیات کی ناک تلے واقعی زرین زمین انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ زلفی نے ایک لڑکی جو اس کی بھائی ہے اس کے لیے اپنے بڑے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خود کو نسا اس کو حاصل کر لیا۔ خود دنیا میں خوار اور آخرت میں تو حساب دینا ہی دینا ہے۔ علی اختر کی داستان گوبھی اچھی رہی۔ پتا نہیں کیوں لوگ اپنے بوڑھے ماں باپ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ میں تو بوڑھوں کی محفل میں شوق سے جاتا ہوں جہاں ایک زندگی کی گہرائی اور مطلب سمجھ آتا ہے اور بہت سی کام کی باتیں۔ محفل شعر و سخن عمدہ رہی۔ شرمعاس کی نیا موڑ انٹرنٹنگ اسٹوری تھی۔ بابر نعیم کی تلاش بھی اچھی رہی۔ وقت پڑی جو بہترین طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اب ڈیلی کی آمد نے پہل چا دی ہے۔ اگلی قسط کافی دھواں دار ہوگی۔ سلیم انور کی خود کردہ بھی عمدہ تھی۔ منظر سلیم ہاشمی کی تبادلہ کافی مزیدار تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا آخری حصہ پڑھا۔ نبی نرم دل اور مصمم ہوتے ہیں وہ کب بدلہ لیتے ہیں۔ اللہ پاک نے اپنے نبی کو مشکلات کے بعد ایک طاقتور بادشاہ بنایا۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ مہربانی والا معاملہ کرتا ہے۔ افتخار احوان کی سگتے چنار بہت عمدہ تحریر تھی۔ کشمیر کے منظر نامے پر لیکن آخر میں اینڈ دکھی کر گیا۔ شاہ زین رضوان کی حنفہ بھی اچھی رہی۔ باقی کترنوں نے بھی بہت مزہ دیا جس میں لطیفے اور بہت معلوماتی باتیں ہوتی ہیں۔“

✽ ریاض بٹ، حسن ابدال سے شریک محفل ہیں۔ ”سال 2017ء کا آخری شمارہ میری نظروں کے سامنے ہے۔ اس بار سرورق کی حسینہ کی مسکراہٹ جاندار ہے۔ شاید یہ سندیہ دے رہی ہے کہ انشاء اللہ نیا سال بہتری لے کر آئے گا۔ ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ نیا سال ملک پاکستان کے بانیوں کے لیے آسودگیوں، فرحت اور خوشحالی لے کر آئے آمین لیکن جون ایلیا صاحب کا انشائیہ کوئی اور پیغام دے رہا ہے کہ جو کچھ ہمارے سیاستدان کر رہے ہیں ان سے خیر کی امید نہیں۔ کیونکہ وہ عرصہ دراز سے یہی وتیرہ اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ ہمیشہ سے عوام کو نئے خواب دکھاتے ہیں لیکن ان خوابوں کی تعبیریں بڑی بھیانک اور باغ اجڑے ہوئے ہوتے ہیں ہم پھر بھی دوبارہ ان پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ خیر ان خیالات کا ذہن سے جھٹکن بھی ممکن نہیں۔۔۔۔۔۔ محفل میں پہنچے تو مدیر اعلیٰ صاحبہ بھی یہی بات سمجھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جناب حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی کرسی صدارت مبارک ہو۔ آپ کا تبصرہ بہت اعلیٰ ہے۔۔۔۔۔۔ سیر حاصل تبصرہ ہے۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ زرین خان آفریدی بہن آپ کا تبصرہ بھی خوب ہے۔ اشفاق شاہین بھائی کیسے ہیں۔ آپ کو میں داد دوں تو یہ میری کم ظرفی ہوگی۔ آپ باقاعدگی سے سسپنس سے رشتہ جوڑے ہوئے ہیں اور دریا کو کوڑے میں بند کرنے کا فن جانتے ہیں۔ میرا تبصرہ آپ کو پسند آیا، مہربانی۔ اگلا خط ہے، جناب عبدالجبار رومی صاحب کا۔ ہمیشہ کی طرح خوب صورت تبصرہ ہے۔ سرورق کی حسینہ کی



تعریف بھی خوب کی ہے۔ رابعہ آفرین بہن خوش آمدید۔ جب آپ نے لبوں کا قفل کھول ہی دیا ہے تو دوبارہ یہ قفل نہیں لگانا۔ عبدالغفور خان بھائی شادی خانہ آبادی مبارک ہو۔ خوش رکھو اور خوش رہو۔ محمد خواجہ کی حاضری بھی اچھی لگی۔۔۔۔۔۔ ایم سخاوت اور بس احمد خان، محمد صفدر معاویہ، پرویز احمد لانگا کے خطوط بھی قابل قدر اور قابل تعریف ہیں محمد رفاقت صاحب محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا خط بھی اچھا ہے لیکن ذرا مختصر ہے۔ بھائی زرین سلطانہ بھی کبھی والی بات ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے اس بات کی میں بھی تائید کرتا ہوں کہ ہمارے دل پسند پرچے میں نئے لکھنے والوں کو بھی جگہ مل رہی ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد احمد کی تاریخ کے اوراق سے کشید کردہ کہانی نوشتہ اتحاد کا ذکر ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب بڑی گہرائی میں جا کر پراثر الفاظ کا سہارا لے کر لکھتے ہیں۔ منظر نگاری بھی خوب کرتے ہیں۔ انسان کہانی میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ واقعی اتفاق و اتحاد میں بڑی برکت ہے۔ یہی اتفاق و اتحاد اگر آج کے مسلمانوں میں ہو جائے تو تاریخ بدل سکتی ہے۔ ہوشیاری محمد یاسر اعوان کی ایک چونکا دینے والی کہانی ہے۔ قتل کی منصوبہ بندی تو بڑے اچھے طریقے سے کی گئی تھی لیکن گھڑیاں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اگرچہ کلیر اسکے ایک حماقت یہ ہوئی کہ اس نے دو قاتلوں کے سامنے راز افشا کر دیا لیکن اس کی زندگی باقی تھی اس لیے استقبالیہ پر بیٹھنے والی لڑکی اچانک آگئی جس سے کلیر اس کی زندگی بچ گئی۔ مات ناہید سلطانہ اختر کی مختصر لیکن ایک اچھی تحریر ہے۔۔۔۔۔۔ خاص کر یہ فقرہ بہت کچھ کہ گیا کہ ہم غریبوں کے بچے عشق میں امیروں کے بچوں سے مات کھا جاتے ہیں۔ اس کے بعد پہنچے ملک مصدحیات صاحب کی تفتیشی کہانی ناک تلے تک۔ کہانی حسب سابق بہت اچھی ہے واقعی زن زور اور زمین ہی جرم کو جنم دیتی ہیں۔ اس کے لیے ازل سے قتل ہوتے آئے ہیں اور ابد تک یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ مجھے نہ جانے کیوں شروع میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ قاتل زلفی ہے۔۔۔۔۔۔ بہر حال کہانی عبرت اثر ہے۔ تنویر ریاض کی تیسری کوشش بھی زر کے گرد گھومتی کہانی ہے جس نے متاثر کیا۔ داستان گوبھی اختر کی کہانی نے رلا دیا۔۔۔۔۔۔ جب ہم جیسے بوڑھوں کی بات سننے والا کوئی نہ ہو تو تنہائی کا ناک چمن اٹھائے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ اب یہ بوڑھے درخت ہی تو ہیں جو سہارا بنے ہوئے ہیں۔“

✽ محمد خواجہ، کورنگی کراچی سے شامل محفل ہیں۔ ”دسمبر 2017ء کے خٹک موسم میں بہترین سرورق کے ساتھ نمودار ہوا۔ دوشیزہ کی شرمیلی مسکراہٹ بہت بھلی محسوس ہوئی۔ جون ایلیا کا مژدہ بہت دل سوز اور انتہائی با معنی ہے۔ مٹی کی ساری صفات اور حقیقتیں واضح طور پر پیش کر دیں۔ افسوس کے ساتھ ہماری مٹی میں ایسا کیا ہے جو بھی اس مٹی پر اقتدار حاصل کرتا ہے وہ اس مٹی کا قرض بھول جاتا ہے۔ جب تک وہ تباہ کاریاں بچاتا ہے جب تک منوں مٹی اس پر نہ پڑ جائے۔ جو حالات اس وقت عوام الناس اپنی مجبوری اور بربادی میں گزار رہے ہیں۔ ہر طرف تاریکی صرف ایوانوں اور حکمرانوں کے ہاں بہت روشنی۔ یہ اللہ ہی کی رحم دلی ہے کہ پاک سرزمین آباد ہے۔ غریبوں اور لاچاروں کی دعا ہے۔ دوستوں کی محفل میں سرفہرست جناب حکیم سید محمد رضا شاہ کا خط ہے، مبارک ہو۔ اچھا لکھتے ہیں تبصرہ بھی مختصر لیکن جامع انداز میں۔ نوشتہ اتحاد، ڈاکٹر ساجد احمد قدیم تاریخ میں جا کر ایسے فن پارے لاتے ہیں نہ صرف، معلوماتی، دلچسپ اور بصیرت آمیز بڑی عمدہ تحریر ہے۔ دکن کی تاریخ بہت ہی دلچسپ رہی اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میرے آباؤ اجداد کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ ہوشیاری، مغربی معاشرے کی بد اعمالیاں اور مجرمانہ چالاکیوں پر مبنی کہانی ایک بزرگ خاتون نے صرف گھڑی کی آواز کو ذہن میں رکھ کر مجرم میاں بیوی کے جرم کا پردہ فاش کیا اور اپنی خود کی جان بچائی اچھی کہانی۔ مات، ایک اوسط طبقے کے باپ جو اپنے 5 عدد بیٹوں کے ساتھ دوست بن کر زندگی کے مزے لیتا ہے مگر غلطی سے ایک بیٹا امیر لڑکی سے عشق کر بیٹھتا ہے۔ باپ کے دوستوں کی طرح بیٹے سے مذاکرات اچھے لگے لیکن آخر میں غریب کی امیر سے مات ہوگئی۔ رنگ آساں، بڑی دلچسپ اور تیز رفتاری سے دو کہانیاں ایک ساتھ چل رہی ہیں۔ انگریزوں کے غاصبانہ قبضے کے وقت کی کہانی۔ کوئی بھی قوم ہو رنگ نسل الگ لیکن انسانی نفسیات اور جذبات، سب میں یکساں۔ دوسرا حصہ بھی بہت مزے دار رہا۔ کہانی کے لوازمات میں قاری ڈوب جاتا ہے اور احساسات کی گری کو خود بھی محسوس کرنے لگتا ہے۔ جیون دان، دو دوستوں کی پر خلوص محبت پر مبنی داستان جو آج کل ہم کو اپنے معاشرے میں نظر نہیں آتی۔ ایک دوست نے قربانی کی وہ مثال قائم کی کہ جان پر کھیل کر اپنے دوست کو زندگی دے دی۔ ناک تلے، ملک مصدح جیسے تھانے دار کی لا جواب کارکردگی۔ قاتل گھر میں اور تلاش باہر لیکن جرم جرم ہے پھر ملک صاحب جیسا آخر ان کا ہاتھ مجرم کی گردن پر جا پڑا۔ ملک کے گاؤں میں زن، زر، زمین میں ایسے مجرمانہ اور چالاکی سے کھیل کھیلے جاتے ہیں حیرانی ہے۔ ماحول پانی نقشہ کشی۔ ایسا لگتا ہے کوئی فلم چل رہی ہے۔ بہت عمدہ کہانی۔ داستان گو اور نیا موڑ، چھوٹی چھوٹی کہانیاں اچھی تاثر انگیز ہیں۔ وقت، بہت دلچسپی اور چابکدستی سے حسام بٹ نے کہانی کی ترتیب لکھی۔ ایک پر عزم لڑکے کی بڑی آنکھیں زدہ زندگی کے واقعات جو امریکا سے پاکستان تک مارا مارا پھر رہا ہے۔ اس کی منزل اور تلاش کا حیرت انگیز اور پرخطر سفر۔ بہت اچھی قسط وار کہانی۔ حضرت یوسف انتہائی معلوماتی تحریر۔ قدرت پیغمبروں کو بھی کیسے کیسے امتحانات میں ڈالتی ہے لیکن استقام اور انعام بھی بہت خوب دیتی ہے۔ ہم بے مبر اور کمزور انسان ہیں جو چھوٹی چھوٹی مشکلات پر بھولا جاتے ہیں لیکن حضرت یوسف اور یعقوب علیہ السلام کی داستان دل کو گرماتی ہے اور حوصلہ بخشتی ہے۔ سگتے چنار، وہی داستان مسلسل کشمیر پر ہندوستان کے مظالم اور غاصبانہ قبضہ۔ ہم نے جنگیں لڑیں۔ وہاں کے مجاہدین شہید ہوتے رہے ہیں لیکن معلوم نہیں اتنے عرصے میں نتیجہ کچھ نہ نکل سکا۔ واقعی انگریزوں کی ذہانت لڑاتے جاؤ۔ شکست کی فتح، حطاہر جاوید مغل کو اللہ نے ایسا لکھنے کی طاقت عطا کی ہے کہ تحریر میں جادو بھر دیتے ہیں۔ شروع میں کہانی بس معمولی سی لگی لیکن جوں جوں آگے بڑھی بیشی اثر انگیز ہوتی گئی۔ خاص کر دوسری اور آخری قسط ایک سبق ہے۔ بچوں کے ٹیلنٹ اور جذبہ شوق کو دبا کر اپنی مرضی ان پر مسلط نہ کی جائے۔ اگر ان کے ذہن اور جذبے کو تقویت دی جائے تو ایک دن وہ ایک عظیم کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ اشعار کی محفل نگہ سے کی طرح ہے، کترنیں رسالے کا حسرت ہیں۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے
راحیلہ شفیق، سندھی ہوٹل نیو کراچی، شفیق حسین سندھی ہوٹل نیو کراچی، عاصم رحمان ملتان، غزل مشتاق حیدر آباد۔ ناہید یوسف، اسلام آباد۔
مہتاب احمد حیدر آباد۔ مباحر، کراچی۔ فیاض احمد، فیصل آباد۔ ناصر محمود، جھنگ سٹی۔

اک دور تھا

ڈاکٹر احمد

دور چاہے جتنے بھی گزر جائیں بات ہمیشہ کسی ایک ہی دور کی ہوتی ہے۔ بہر حال یہ بھی ایک ایسا ہی دور گذرا تھا برائی جب اچھائی کے مدمقابل آکر اسے طرح طرح سے الجھا کر اپنے مقاصد سے ہٹا رہی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ حضرت شاہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی پیش گوئی کہ ”حق دار کو حق ضرور ملے گا اور بادشاہت تمہارا انتظار کر رہی ہے“ نے اتنی تیزی سے اپنا سفر مکمل کیا کہ محمد تغلق کی وفات کے بعد جب فیروز شاہ بادشاہ بنا تو دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے اور انہی سازشیوں کے درمیان قتلغ خاں کا بھی ایک ایسا ہی کردار تھا، جب اس پر برائی آئی تو اس کا سازشی ذہن مختلف تدبیروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ کس طرح وہ اپنی نفرت کی آگ کو کس پانی سے بجھائے... مختلف معرکہ آرائیوں کے دوران بھی وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ منزل دور ہے مگر اوجھل نہیں۔ لیکن سلطنت کے اسرار و رموز اس ولی کی پیش گوئی کے حصار میں اپنا حق ادا کرتے رہے اور شاہی تخت پر بیٹھنے والے اپنی ذمہ داریاں نباہتے رہے۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

تمام حالات سے آگاہ کیا وہ ایسا طیش میں آیا کہ قریب رکھا شیئے کا گلدان اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

”دانت کا درد نکالے بغیر نہیں جائے گا۔ ہمارے گجرات جانے کا بندوبست کیا جائے۔“ ان خبروں نے گردش کی تو اس کے ایک امیر قتلغ خاں کی وفاداری نے جوش مارا۔ بھول گیا کہ وہ کس نازک مزاج کی دلدار کی لیے جا رہا ہے۔

”یہ فسادات اتنے اہم نہیں۔ حضور کے جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ حضور کی راہبری اور حوصلہ افزائی سے خود مجھ میں اتنی ہمت و جرأت پیدا ہو گئی ہے کہ اس فتنے کو بہ آسانی رفع کر کے دشمنوں کو کفر کردار تک پہنچا سکتا ہوں۔“

”بہت خوب! تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ان فتنوں پر قابو پانے کا اہل نہیں؟“

”خدا نہ کر دے، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ ان چھوٹے چھوٹے معاملات کو رفع فرمائیں گے تو رعب شاہی جاتا رہے گا۔ یہ اندیشہ بھی ہے کہ دہلی میں آپ کی غیر حاضری کہیں دیگر خوابیدہ فتنوں کو بیدار نہ کر دے۔“

”میرے امراء کا تصور یہی ہے کہ وہ خود کو مجھ سے زیادہ عقل مند سمجھنے لگے ہیں۔ میں نے آپ کو دیوگیر کا صوبہ دار بنا کر بھیجا تھا۔ آپ کے کارکنوں نے وہاں غبن کیا اور آپ انہیں روک نہیں سکے۔ میں نے آپ کو واپس بلا لیا۔“

دہلی کے آئکن میں دھوپ کی جگہ خبریں اتر رہی تھیں۔ خبریں بھی ایسی کہ رعب شاہی کے خیمے جھلنے لگے۔ بے خونی ایسی بڑھ گئی کہ دہلی میں تو نہیں مگر دہلی سے باہر کے احکام شاہی پاؤں کی مٹی بن گئے۔ غلام سرکشی پر اتر آئے، امیران خود مختاری کے خواب دیکھنے لگے۔ قصور ان کا بھی نہیں تھا، بادشاہ کے مظالم اور غلط فیصلوں نے سب کی چھتیں چھلنی کر دی تھیں۔ فتنوں اور بغاوتوں نے راہ دیکھ لی تھی۔ بادشاہ چونکھی لڑائی لڑ رہا تھا۔ ایک جگہ کی بغاوت کو کچلتا تھا تو دوسری جگہ بغاوت کے جھنڈے لہرانے لگتے تھے۔ ایک طرف کی آگ پر پانی ڈالتا تو دوسری طرف شعلے بھڑک اٹھتے تھے۔ سازشوں کے دروازے بند کرتا تھا اور اس کے لیے بے دھڑک خون بہاتا تھا تو ظالم کہلاتا تھا۔ خانقاہیں لرزہ بر اندام تھیں، مشائخ خاموش تھے، علمائے زبائیں بند کر لی تھیں۔ اس کی نازک مزاجی ایسی بڑھ گئی تھی کہ اپنے حق میں بھی کسی کا مشورہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔

اس ماحول میں اور خبروں کے اس انبار میں ایک خبر ایسی آئی کہ بادشاہ کے ہوش اڑ گئے۔ خبر یہ تھی کہ اس کا ایک وزیر ملک مقبول خان جہاں جو گجرات کا وزیر مقرر کیا گیا تھا، صوبے کا خزانہ لے کر دہلی کی طرف آ رہا تھا۔ ان اطراف میں جو امیران صدہ تھے سب نے مل کر اس کا مال و متاع لوٹ لیا۔ یہ خبر جلد ہی مجسم ہو کر اس کے سامنے آ گئی۔

خان جہاں اسی حالت میں بادشاہ سے ملا اور اسے



کوئی سزا نہیں دی۔ آپ مجھے میری بزدلی کا طعنہ دینے آئے ہیں۔ آئندہ مجھے کوئی مشورہ نہ دیجیے گا۔“

تسلخ خاں اٹھے قدموں لوٹ تو آیا لیکن نفرت اور غصے سے بھرا ہوا اپنے مکان تک پہنچا۔ دوسرے دن وہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کی خانقاہ میں بیٹھا تھا۔ اسی وقت فیروز شاہ تغلق بھی وہاں پہنچ گیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ خود وہاں آیا تھا یا تغلق خاں کے کہنے پر آیا۔ فیروز شاہ تغلق، چراغ دہلوی کا مرید تھا لہذا خانقاہ میں آتا ہی رہتا ہوگا لیکن اس وقت کی بات اور تھی۔ تغلق خاں بادشاہ کے مظالم اور اپنی پتہ سار ہاتھ پھروہ اچانک اپنے مطلب پر آ گیا۔

”اگر آپ محمد شاہ تغلق کے ہاتھوں دہلی کی بربادی روکنا چاہتے ہیں تو اس کی موت کی دعا فرمائیے۔“

”کسی کی موت کی دعا مانگنا فقیروں کو زیب نہیں دیتا۔ میں صرف یہ دعا کر سکتا ہوں کہ ملک ہندوستان کو اس کے مظالم سے نجات ملے۔“ حضرت چراغ دہلوی نے فرمایا۔

”یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کی بادشاہت ختم ہو اور اس کی جگہ کوئی اور تخت نشین ہو جائے۔“

”شاید ایسا ہی ہو۔“

”فیروز شاہ آپ کے سامنے تشریف فرما ہیں۔ بادشاہ کے چچا زاد بھائی ہیں۔ ان کا حق ہے کہ باگ ڈور سنبھالیں۔“

”اگر حق ہے تو حق دار کو حق ملے گا۔“

”مگر کب؟ میری جو بے عزتی ہوئی ہے مجھ سے اب صبر نہیں ہوتا۔“

”بے صبری اچھی چیز نہیں ہوتی۔ جاؤ اب اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔“

تسلخ خاں ابھی اپنے مکان تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ دربار سے اس کا بلاوا آ گیا۔ وہ... ڈر گیا کہ کیا معاملہ ہوا ہے جو اسے طلب کیا گیا ہے۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوا اور دربار میں پہنچ گیا۔ محمد شاہ تغلق ابھی خلوت گاہ سے باہر نہیں آیا تھا اور شاید دربار میں آنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ... برسرِ دربار اس کا بیان پڑھ کر سنایا گیا۔

”السلطان الجاہد ابوالفتح محمد شاہ السلطان ابن تغلق شاہ اطراف گجرات کے فسادات کی بیخ کنی کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ حضور کی غیر موجودگی میں نیابت غیبت کی ذمہ داری ملک فیروز شاہ، برادر سلطان انجام دیں گے اور مدد و تعاون کی ذمہ داری ملک کبیر کے سپرد ہوگی۔“

مبارک باد کی آوازیں بلند ہوئیں۔ تسلیخ خاں خاموش تھا۔ اسے شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ ”حق دار کو حق ملے گا۔“ فیروز شاہ نے تخت شاہی پر قدم رکھ دیا۔ کیا خراب محمد شاہ تغلق بھی واپس نہ آ سکے۔ خدا نے اس کے ہاتھوں فیروز شاہ کو اس کا نائب بنا دیا ہے۔ بادشاہ بھی بن ہی جائے گا۔“

اتنے میں شور مچا کہ بادشاہ برآمد ہوا چاہتا ہے۔ محمد شاہ تغلق ہاتھی پر سوار ”کوٹھک ہمایوں“ سے باہر آ کر روانہ ہوا اور پندرہ کوس کے فاصلے پر سلطان پور کی طرف روانہ ہوا جہاں ایک بڑا لشکر اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

گجرات کے معاملات درست کرتے ہوئے ا۔ سے تین برساتیں گجرات میں گزارنا پڑیں۔ پہلی برسات تو اس نے معاملات درست کرنے اور لشکر کو مستعد کرنے میں گزاری۔ دوسری برسات کرنال کے قلعے کے قریب گزاری جہاں ایک غلام طشی اپنے لشکر کے ساتھ چھپا ہوا تھا۔ وہ گجرات کے معاملات کو نادرست کرنے کا بھی مرکزی کردار تھا۔

کرنال کے مقدم نے جب سلطان کے لشکر کی بڑی تعداد اور بہادری دیکھی تو اس نے چاہا کہ طشی کو زندہ پکڑ کر سلطان کی خدمت میں پیش کر دے۔ طشی کو جب اس راز کی اطلاع ہوئی تو وہاں سے بھاگ گیا اور ٹھٹھہ چلا گیا۔

برسات ختم ہونے پر سلطان نے کرنال کو فتح کر لیا اور اس طرف کے ساحلی علاقے اور جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ ان علاقوں کے رانا اور مقدم درگاہ سلطانی میں حاضر ہوئے، اپنی اطاعت کا اظہار کیا اور خلعت و انعام حاصل کیا۔

تیسری برسات میں بادشاہ کرنال سے پانچ کوس کے فاصلے پر موضع گونڈل میں جا کر ٹھہرا۔

اس رات سخت بارش ہوئی۔ ندی نالے ایک ہو گئے۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی اور اندر بادشاہ کے قریب اس کا مورخ ضیا الدین برنی بیٹھا تاریخ میں گزرے عظیم حکمرانوں کے قصے اسے سنارہا تھا۔ اچانک بادشاہ کو کچھ خیال آیا اور اس نے بات کو درمیان سے کاٹ کر ضیا الدین سے پوچھا۔

”آپ نے تاریخ کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ اب جو میں آپ سے پوچھنے والا ہوں، کسی تاریخ میں میرے سوال کا جواب بھی لکھا؟“

”فرمائیے۔“

الک حور تھا

”میری سلطنت کے ہر عضو میں طرح طرح کے امراض پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر ایک مرض کا علاج کیا جاتا ہے تو دوسرا مرض بڑھ جاتا ہے۔ اس کا علاج بھی کسی کتاب میں لکھا ہے؟“

”ایک تاریخ میں لکھا ہے کہ اگر کسی حکمران سے اس کی رعیت نفرت کرے اور ملک میں سرکشی اور بغاوت پھیل جائے تو بادشاہ کے لیے چارہ کار یہی ہے کہ بھائی یا اپنے بیٹے کو جانشین کر دے اور خود گوشہ نشین ہو جائے۔ اگر وہ مستحکم حکومت چھوڑنا مناسب نہ سمجھتا ہو تو ان باتوں سے دور رہے جو رعایا میں نفرت کے جذبات کو اجاگر کرتی ہیں۔“

بادشاہ اس نصیحت کو غور سے سنتا رہا اور پھر اس کی خود سری عود کر آئی۔

”میرا نہ کوئی بیٹا ہے جو جانشینی کے فرائض انجام دے اور نہ میں خود ملکی سیاست سے دور ہو سکتا ہوں۔ پرانے زمانے کی رعایا فرمانبردار تھی۔ اس کے اعمال و اقوال میں شرافت تھی لیکن اس دور میں اچھائیاں برائیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ لہذا مجھے مجبوراً مخلوق خدا کے خون سے ہولی ٹھیننی پڑنی ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں وہ کروں گا جو میری تلوار چاہے گی۔“

اس صاف جواب کے بعد ضیا الدین برنی نے وہاں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور بادشاہ سے اجازت لے کر اٹھ گیا۔ وہ بہ مشکل اپنے خیمے تک پہنچا ہوگا کہ بادشاہ نے اسے پھر طلب کر لیا۔ اسے ہر وقت کی ہم نشینی نے بادشاہ کا مزاج آشنا کر دیا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ بادشاہ کو صحیح مشورہ کس قدر ناگوار گزرنے لگا ہے اور وہ ابھی ابھی نہایت تلخ مشورہ دے کر اٹھا تھا لیکن جان بھی جائے تو وہ حاضری سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ڈرتے کانپتے خیمہ شاہی تک پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھی کہ اس سے پہلے احمد ایاز اور ملک مقبول نائب وزیر ممالک بادشاہ کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔

”ضیا الدین! دہلی سے ایک بری خبر آئی ہے۔ ملک کبیر رحلت کر گیا ہے۔“

”حق تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے۔“

”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں ایک مرض کا علاج کرتا ہوں تو دوسرا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔“

”موت اور زندگی پر کس کو اختیار۔“

”میں دہلی کی طرف سے بہت فکر مند ہو گیا ہوں۔“

”آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ شہزادہ ملک فیروز وہاں

آپ کی نیابت کے لیے موجود ہیں۔“

”اسی کی طرف سے تو فکر مند ہوں۔ فیروز شاہ، شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی سے بیعت ہے۔ شیخ نصیر سے جو میرے تعلقات ہیں ان سے آپ واقف ہیں۔ دیگر مشائخ بھی مجھے پسند نہیں کرتے۔ ملک کبیر کی موجودگی میں وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے لیکن اب وہ نہیں رہا تو سازشیں شروع ہو گئی ہوں گی۔ فیروز شاہ ان کے ہاتھ کا کھلونا بن جائے گا۔ سب مل کر اس کی بادشاہت کی راہ ہموار کریں گے۔ میں نے دیوگیری کی مہم سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ گجرات کی آگ بھی ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ طشی ٹھٹھہ کی طرف بھاگ گیا ہے۔ میرے یہاں سے ملتے ہی وہ پلٹنے میں دیر نہیں کرے گا۔ بغاوت کے شعلے پھر بھڑک اٹھیں گے۔ میں دہلی کی طرف عازم سفر ہو جاتا لیکن میں ٹھٹھہ جانے کا قصد کر چکا ہوں۔“

”آپ کے دہلی جائے بغیر بھی حالات درست ہو سکتے ہیں۔“

”تمہارے پاس اگر کوئی نسخہ ہے تو بیان کرو۔“

”جان کی امان پاؤں تو عرض کروں؟“

”ہم نے تم پر ہمیشہ بھروسہ کیا ہے۔“

”اگر آپ کو ملک فیروز شاہ کی جانب سے کھٹکا ہے یا حضرت چراغ دہلوی کی جانب سے اندیشہ ہے تو انہیں پہلی فرصت میں یہاں طلب فرمائیے اور دہلی کا انتظام سنبھالنے کے لیے یہاں سے دو قابل بھروسہ امراء کو دہلی بھیج دیجیے۔ اگر وہاں سازشیں ہو رہی ہیں تو ملک فیروز کی غیر موجودگی میں پنپ نہیں سکیں گی۔ چراغ دہلوی بھی وہاں موجود نہیں ہوں گے۔ ملک فیروز اپنے ساتھ جو لشکر لائے گا، وہ بھی آپ کے لیے تقویت کا باعث بنے گا۔“

محمد تغلق کچھ دیر اس مشورے پر غور کرتا رہا اور پھر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے دونوں امراء کی طرف امید افزا نظروں سے دیکھا۔

”ضیا الدین برنی کے تجربے نے نہایت مؤثر حل ڈھونڈ نکالا ہے۔ لشکر میں میرے نزدیک تم سے زیادہ کوئی بھروسے کے لائق نہیں لہذا میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ دہلی پہنچو۔ فیروز شاہ اور چراغ دہلوی کو ہمارے پاس روانہ کر کے خود انتظام سنبھال لو۔ ہمیں مشائخ کی جانب سے ہمیشہ کھٹکارہتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی مزاحم ہو تو خون بہانے سے گریز نہ کرنا۔ ملک مقبول! ہمیں تمہاری بہادری پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ ہم نے جو تمہیں خان جہاں کا لقب دیا

الک حور تھا

الک حور تھا

رنگ لانے والی تھیں۔“

”کیسی سازشیں؟“

”وہ فیروز شاہ کو بادشاہ کی جگہ تخت پر بٹھانا چاہتے تھے۔“

”فیروز شاہ ہی کیوں؟“

”اس لیے کہ فیروز شاہ کا تعلق خاندان شاہی سے

ہے۔ وہ آسانی سے اس کا حق ثابت کر سکتے تھے اور اس لیے بھی کہ فیروز شاہ ان سے بیعت ہے اور وہ اسے بہت

چاہتے ہیں۔ فیروز شاہ اگر بادشاہ بن جاتا تو اصل بادشاہت شاہ نصیر ہی کی ہوتی۔“

”میں نے تو یہ سنا ہے کہ شاہ نصیر کی خانقاہ میں آپ کا

آنا جانا بھی بہت رہا ہے ان دنوں۔“

”میں صرف اس لیے جاتا تھا کہ شاہ نصیر کو سمجھاؤں

لیکن وہ ہر مرتبہ یہی کہتے رہے کہ فیروز شاہ کی قسمت میں

بادشاہت لکھی جا چکی ہے۔ انہوں نے مجھ سے میرے لشکر

کی مدد بھی مانگی چاہی لیکن میں نے انکار کر دیا۔“

”آپ نے انکار کیوں کر دیا؟ فائدہ تو آپ کا بھی تھا۔“

”شاہ نصیر مراقبوں پر یقین رکھتے ہیں لیکن میں

سلطنت کے اسرار و رموز سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم تھا

کہ اس کے نتیجے میں خوں ریزی ہوگی اور میں یہ خوں ریزی

نہیں چاہتا تھا۔“

”امراء تو تمہارے بارے میں کچھ اور بتا رہے ہیں۔“

”لوگ تو جانے کیا کیا کہتے ہی ہیں۔ مجھ سے تو چند

امراء نے یہ بھی کہا تھا کہ سلطان نے فیروز شاہ کی تخت نشینی

کے لیے وصیت کر رکھی ہے۔“

”ان امراء میں سے کسی کا نام بتا سکتے ہو۔“

”آپ نے تو انہیں گوندل بھجوا دیا ہے۔ ویسے آپ

یقین کریں مجھے کسی پر یقین نہیں۔ میں سلطان کا وفادار ہوں

اور رہوں گا۔ آپ یہ بھی تو سوچیں کہ سلطان کو مجھ سے کوئی

خطرہ ہوتا تو وہ مجھے بھی گوندل بلوا سکتے تھے۔“

”سلطان کی باتیں وہ جانیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا

ہوں کہ اب میں آ گیا ہوں۔ کسی سازش کو پہنچنے نہیں دوں گا۔“

”مجھے آپ اپنے ساتھ دیکھیں گے۔“

☆☆☆

فیروز شاہ اور شاہ نصیر کے گوندل پہنچتے ہی بادشاہ نے

تیاری کا حکم دے دیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کے حضور

پیش ہوتے بادشاہ بیمار پڑ گیا۔

فیروز شاہ یہاں آ کر سخت پریشان تھا۔ اس کی سمجھ

میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے قیدی بنا کر لایا گیا ہے یا بادشاہ نے

ہے اس کی لاج رکھنا۔“

”حضور کی کرم نوازی ہم دونوں کے لیے ہمیشہ

اطمینان کا باعث رہی ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ آپ نے ہم پر

بھروسہ کیا۔ ہم صبح ہوتے ہی دہلی روانہ ہو جائیں گے۔“

”صبح کا انتظار کیوں؟“

”جیسا آپ کا حکم۔ ہم ابھی روانہ ہوئے جاتے ہیں۔“

☆☆☆

ملک کبیر کے انتقال کی خبر سننے ہی قتلخ خاں کو میدان

ہموار نظر آیا۔ وہ تین سال سے نفرت کی جس آگ میں جل

رہا تھا اس آگ کے شعلے ٹھنڈے ہوتے نظر آنے لگے۔

ایک بغاوت اور سہی۔ اگر اس وقت فیروز شاہ اپنی

بادشاہت کا اعلان کر دے تو دہلی میں اس کا راستہ روکنے

والا کوئی نہ ہوگا۔ دہلی کے امراء، مشائخ، مولوی، سب محمد

شاہ تعلق کے خلاف ہیں۔ خود چراغ دہلوی فیروز شاہ کے

تخت نشین ہونے کی بشارت دے چکے ہیں۔ یہ شاید انہی کی

دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ فیروز شاہ کے تخت نشین ہونے کے

سامان مہیا ہو گئے ہیں۔

ملک کبیر کی تدفین ہو چکی تھی۔ امراء کبار نیز شاہ

کو گھیرے ہوئے تھے اور طرح طرح کے مشورے گوش

گزار کیے جا رہے تھے لیکن قتلخ خاں کسی اور ہی دھن میں

تھا۔ اس وقت بھی وہ حضرت چراغ دہلوی کی خانقاہ میں بیٹھا

ہوا تھا۔

”حضرت! اس وقت سلطان ہزاروں میل دور بیٹھا

ہوا ہے۔ ہم اس وقت فیروز شاہ کی بادشاہت کا اعلان

کر سکتے ہیں۔ تمام علما اور مشائخ فیروز شاہ کے حق میں ہیں۔

سب ہمارا ساتھ دیں گے۔“

”سلطان کے امراء اب بھی سلطان کا ساتھ دیں گے۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ میرا ذاتی لشکر سب سنبھال لے گا۔“

”ابھی وقت نہیں آیا۔ ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔

تخت والا خود اسے تخت پر بٹھائے گا۔“

”حضرت! میں اس فقرے کا مفہوم نہیں سمجھا۔“

”قدرے انتظار کرو۔ سب سمجھ میں آ جائے گا۔“

یہاں سے اسے خاطر خواہ جواب نہ ملا تو فیروز شاہ

سے براہ راست ملنے کی تدبیر کی لیکن مایوسی نے یہاں بھی

اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ فیروز شاہ بھی اس کے جال میں

پھنسنے والا نہیں تھا۔

”قتلخ خاں! سلطان میرے محسن ہیں۔ میں ان کے

خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور اگر سوچ بھی لوں تو

میرا یہ قدیم بغاوت میں شمار ہوگا اور اس بغاوت کے الزام

میں مجھے قتل بھی کرایا جاسکتا ہے۔ سلطان کے امراء اب بھی

ان کے ساتھ ہیں۔ میرے شیخ (چراغ دہلوی) کا بھی یہی

حکم ہے کہ پردہ غیب سے ابھی کچھ اور ظہور میں آنے والا

ہے، میں انتظار کروں۔“

قتلخ خاں وہاں سے اٹھ آیا۔ اس کا ذہن تدبیروں

سے خالی نہیں تھا۔ وہ اب بھی سوچ رہا تھا کہ اپنی نفرت کو کس

پانی سے بجھائے۔

ابھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ محمد شاہ تعلق کے

بھیجے ہوئے دونوں امراء احمد ایاز اور ملک مقبول دہلی میں

داخل ہوئے اور آتے ہی تمام انتظامات اس طرح سنبھالے

کہ قتلخ خاں دیک کر گھر میں بیٹھ گیا اور اس وقت تو اس کے

ہاتھ پاؤں بالکل کٹ گئے جب چند امراء کو جو قتلخ خاں سے

قریب تھے، گوندل بادشاہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس نے

گھبرا کر شاہ نصیر چراغ دہلوی کی خانقاہ کا رخ کیا۔ وہاں

جاتے ہی اسے ایک اور خبر مل گئی۔

”شاہ نصیر اور فیروز شاہ دونوں کو گوندل طلب کر لیا گیا ہے۔“

قتلخ خاں کچھ دیر سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا اور پھر

شاہ نصیر سے مخاطب ہوا۔

”آپ بادشاہ کے حضور پیش ہونے، میرا مطلب

ہے گوندل جانے سے انکار بھی تو کر سکتے ہیں۔“

”بالکل کر سکتا ہوں لیکن اس صورت میں فیروز شاہ کو اکیلے

جانا پڑے گا۔ میں اس موقع پر اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔“

”فیروز شاہ بغاوت بھی تو کر سکتا ہے۔“

”کیا تم نے سنا نہیں کہ بادشاہ نے ان امیروں کو بھی

اپنے پاس بلا لیا ہے جن پر تم اثر انداز ہو سکتے تھے۔“

”حضرت! میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ محمد تعلق کی جگہ

فیروز شاہ بادشاہ بن جائے۔“

”ایسا ہی ہوگا۔ فیروز شاہ کی قسمت میں بادشاہت

لکھی جا چکی ہے۔ منزل دور ہے اور جھل نہیں ہو گئی۔“

خانقاہ سے نکلنے کے بعد قتلخ خاں کے پاس ایک ہی

راستہ رہ جاتا تھا، اس نے احمد ایاز سے ملاقات کی اور اپنے

آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لیے شاہ نصیر کی طرف

سے اس کے کان بھرے۔

”ہمارے تمہارے سلطان روشن ضمیر ہیں کہ شاہ نصیر

کو گوندل طلب کر لیا ورنہ چند ہی روز میں ان کی سازشیں

حسد

ایاز تھا تو غلام مگر اللہ نے اسے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کے کئی دشمن اور حاسد پیدا ہو گئے تھے۔ مگر سلطان محمود پھر بھی جتنا اعتماد ایاز پر کرتا تھا اتنا کسی اور پر نہیں کرتا تھا۔

ایک روز کسی درباری نے سلطان محمود سے سوال کیا۔

”جناب آپ ایک ادنیٰ سے غلام ایاز کو تیس امیروں

کے برابر کیوں سمجھتے ہیں؟ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک

ایاز میں تیس امیروں کی عظمت کیسے آئی ہے؟“

سلطان محمود خاموش ہو گیا اور وقت کا انتظار کرنے

لگا تا کہ اس درباری کے سوال کا جواب دے سکے۔ پھر

ایک روز وہ موقع آ ہی گیا تھا۔ سلطان محمود شکار کے

ارادے سے تیس امیروں کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف

نکلا۔ دور ایک قافلہ نظر آیا۔ ایک امیر کو حکم ملا کہ جا کر

معلوم کرو کہ یہ قافلہ کہاں سے آیا ہے؟

امیر نے حکم کی تعمیل کی اور واپس آ کر بتایا کہ قافلہ

شہر سے آرہا ہے۔ سلطان نے پھر پوچھا۔ قافلے کو جانا

کہاں ہے؟ وہ امیر نے نہ بتا سکا اس لیے اس نے یہ بات تو

قافلے والوں سے پوچھی ہی نہ تھی۔ ایک ایک کر کے تمام

امیروں کو قافلے کے پاس بھیجا گیا۔ سبھی نامکمل اور ادھوری

معلومات لائے، کوئی بھی مکمل معلومات لے کر نہ آیا تھا

سلطان محمود نے اپنے امیروں کو مخاطب کر کے کہا۔

”تم سب کو اعتراض تھا کہ میں نے ایاز کو تم سب

کے برابر درجہ کیوں دے رکھا ہے؟ اب اس کا جواب

سنو۔ ایاز کو میں نے تم سب سے چھپ کر قافلے کے

پاس بھیجا تھا۔ جن تیس سوالوں کے جواب تم تیس امیر

تیس چکروں میں لائے ہو۔ ایاز ایک ہی بار ان تیس

سوالات کے جوابات لے آیا تھا۔ اب تو تم لوگ سمجھ

گئے ہو گے کہ میں نے یہ مقام و مرتبہ ایاز کو کیوں دے

رکھا ہے؟“

سب امیر یہ سن کر شرمندہ ہوئے اور سلطان محمود

سے معافی کے خواستگار ہوئے اور بیک زبان بول اٹھے

”ہم بیشک ایاز کی برابری نہیں کر سکتے۔“

سبق: حسد بری شے ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔

اقتباس حکایات رومی اور سعدی

از ڈاکٹر تصدق حسین

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ



نئے سال کی دل ربا آہیں

جاسوسی کے شمارے کی بکھشائیں

اولین صفحات

مغرب کے پرفریب ماحول کی پروردہ.....
قتل کے ایک کیس نے ذہنوں کو الجھا رکھا تھا
امجد رئیس کے قلم سے سنسنی خیز تحریر.....

انکارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا
طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسر پیکار نوجوان کی سرگزشت.....
عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سورق کے رنگ

نئے سال کی جگمگاتی روشنیوں میں
تاریکیوں کا حصہ بن جانے والوں کی کہانی

سال نو کا آغاز اور محبتوں کا اہتمام
دوستوں اور دشمنوں کا ہولناک اختتام

جینی نکتہ جینی

کے کوئی اولاد نہیں، اس کا ولی عہد میں ہی ہوں۔
وہ اپنی سوچوں سے باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ
خیمے سے باہر آ چکا ہے۔ وہ نہ جانے کس وقت اٹھا اور خیمے
سے باہر آ گیا تھا۔

وہ باہر آیا تو یہ چہ میگوئیاں اس نے صاف سنیں کہ
بادشاہ کو کسی سازش کے تحت زہر دیا گیا ہے۔
”ممکن ہے یہ زہر اسی پھلکی میں ہو جو افطار کے وقت
اس نے بڑے شوق سے کھائی تھی۔“

”علما اور مشائخ سلطان کے خلاف ہو گئے تھے۔ یہ
سازش انہی کی طرف سے کی گئی ہوگی۔“
”اس سازش میں فیروز شاہ اور شاہ نصیر بھی شامل
ہو سکتے ہیں۔“

”کچھ بعید نہیں بھائی۔“

فیروز شاہ نے یہ باتیں سنیں تو واپس خیمہ شاہی میں
آ گیا۔ اسے ڈر ہوا کہ نہیں اس کا نائب ہو جانا ان باتوں کو
تقویت نہ دے۔

بادشاہ بدستور بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ فیروز شاہ
اس کے سر ہانے جم کر بیٹھ گیا۔ وہ کبھی بھی بادشاہ کے حق میں
نہیں رہا تھا لیکن اس وقت اسے اس پر رحم آ رہا تھا۔ ایسا جاہر
بادشاہ اس وقت کیسا بے بس ہے۔ اتنا بے بس کہ ایک بچہ
بھی آگے بڑھ کر اس کا گلا گھونٹ دے۔ میرے قتل کا ارادہ
کرنے والا میرے قہقہے اختیار میں ہے۔ میں چاہوں تو
ابھی اسے ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دوں لیکن وہ جیسا
بھی ہے، میرا بھائی ہے۔

بادشاہ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ کچھ
کہنے کے لیے اس کے لب ہلے لیکن آنکھیں پھر بند
ہو گئیں۔

فیروز شاہ اس کی تیمارداری میں دن رات ایک کر رہا
تھا۔ کئی دن ہو گئے تھے، بادشاہ کی حالت میں کوئی تبدیلی
نہیں آئی تھی۔ لوگوں کی تسلی کے لیے لشکر میں ہر روز کھلوادیا
جاتا تھا کہ سلطان تیزی سے صحت یاب ہو رہا ہے۔

اس وقت لشکر ایسا مستعد اور تیار تھا کہ اگر اسے حکم
دے دیا جاتا تو ایک روز میں ٹھٹھ پہنچ کر باغیوں کو گرکڑ ڈالتا
لیکن سلطان کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔

سلطان کا مرض روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ لشکر میں
سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی اس لیے کہ ان کی عورتیں اور
بچے ان کے ساتھ تھے اور دہلی سے ہزاروں کوس کے فاصلے
پر صحرا اور بیابان میں پڑے ہوئے تھے اور دشمن سے

ہوں، قیدی نہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ مجھے افطار کے لیے
اپنے خیمے میں بلاتا، اس کے برعکس اس نے یہ کہلوایا کہ وہ میرا
فیصلہ افطار کے بعد کرے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ روزے کی
حالت میں میرے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔ روزہ
کھولنے کے بعد میرے قتل کا حکم جاری کرے گا۔“
”اگر اسے تمہیں قتل کرانا مقصود ہوتا تو گوندل ہی میں
کر دیتا۔ یہاں تک کیوں لاتا؟ معاملہ کوئی اور ہے۔“
”مجھے قیدی بننا بھی منظور نہیں۔ اب بھی وقت ہے،
میں لشکر سے فرار ہو سکتا ہوں۔“

”جلدی مت کرو۔ معاملات ظہور میں آنے دو۔
بادشاہت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ دیکھو جس وقت بھی تمہیں
بادشاہت پیش کی جائے، عذر مت کرنا۔“

ادھر یہ بحث و تمحیص جاری تھی، دوسری جانب شاہی
باورچی خانے میں سلطان کے افطار کے لیے خور و نوش کے
سامان کی تیاری کی جارہی تھی۔ اس سامان میں ایک خاص
قسم کی مچھلی بھی تھی جو سلطان کو بہت پسند تھی۔

”مغرب کی نماز کی تیاری کرو۔ روزہ تو مجھے بھی
افطار کرنا ہے۔ اس کے بعد تمہیں سلطان کے حضور حاضر بھی
ہونا ہے۔ بادشاہت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

باجاماعت نماز کی ادائیگی کے لیے شخص تیار تھیں۔
سلطان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ وقت نکلے جا رہا تھا۔ اسی وقت
کسی نے آکر بتایا کہ افطار کرتے ہی سلطان کی طبیعت
بگڑ گئی۔ کھڑے ہونے کی طاقت بھی نہیں۔
شاہی حکیم خیمہ شاہی میں پہنچ گیا۔ باقی لوگ نماز میں
مشغول ہو گئے۔

نماز سے فراغت کے بعد فیروز شاہ، شاہ نصیر اور چند
لوگوں کے ہمراہ بادشاہ کے خیمے میں گیا۔ بادشاہ نیم غنودگی
کے عالم میں تھا۔ معلوم ہوا بادشاہ نے افطار کے وقت مچھلی
کھائی تھی۔ اس کے کھاتے ہی حالت بگڑ گئی۔ حکیموں کے
چہروں پر تشویش کے آثار صاف بتا رہے تھے کہ بادشاہ کی
حالت ٹھیک نہیں۔

فیروز شاہ اس وقت کسی اور ہی سوچ میں گم تھا۔ اس
کے شیخ نے اسے بادشاہت کی نوید دی تھی۔ اسے یہ بھی یاد
آیا کہ اس کے شیخ نے کہا تھا، سلطان نے جو کچھ سوچا ہے وہ
ہوگا نہیں۔ بادشاہ نے اگر میرے قتل کا ارادہ کیا تھا تو ظاہر
ہے وہ اس حالت میں احکام صادر نہیں کر سکتا۔ اگر اس
حالت میں اسے موت آگئی تو شیخ کا کہا درست ثابت ہوگا۔
اس کے بعد میری بادشاہت کو کوئی نہیں روک سکے گا۔ بادشاہ

کسی اندیشے کے تحت اپنے ساتھ رکھنے کے لیے بلایا ہے
البتہ شاہ نصیر نہایت مطمئن تھے۔

”کیا میں سمجھ لوں کہ میں بادشاہ کی قید میں ہوں؟“
”تم ایک ایسے قیدی ہو جسے بادشاہ بنانے کے لیے
بلایا گیا ہے۔“

”کیا آپ یہی سمجھتے ہیں؟“

”یہ دو سال پہلے کی بات ہے کہ سلطان نے تیری ولی
عہدی کا عندیہ دیا تھا۔ شاہی مورخ ضیا الدین برنی اس کا
گواہ ہے۔“

”دو سال بعد وہ اپنا فیصلہ تبدیل بھی تو کر سکتا ہے۔“
”تیری قسمت کے فیصلے تبدیل نہیں ہوں گے۔ تو
خاطر جمع رکھ۔“

سلطان کی بیماری کی وجہ سے روانگی میں کچھ تاخیر
ہوئی۔ صحت یاب ہونے کے بعد دیال پور، ملتان، اچہ اور
سیوستان سے کشتیاں ٹھٹھ کے لیے طلب کیں اور سلطان،
گوندل سے چل پڑا اور دریا کے کنارے آ گیا۔ لشکر
اور ہاتھیوں کے ساتھ دریا کو عبور کیا اور دوسرے کنارے پر
پہنچ گیا۔ اسی اثنا میں چغتائی مغلوں کے پانچ ہزار منگول
التون بہادر نامی سردار کی ماتحتی میں سلطان کی خدمت میں
پہنچ گئے۔ لشکر کی طاقت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

سلطان نے التون بہادر اور اس کے لشکر کے ساتھ
نہایت مہربانی اور نوازشیں کیں اور وہاں سے باغی طغی کی تیغ
کٹی کے لیے ٹھٹھ کی طرف روانہ ہوا۔

ٹھٹھ ابھی تیس کوس کے فاصلے پر تھا کہ عاصورہ محرم کا
دن آ گیا۔ سلطان تعلق نے اس روز روزہ رکھا اور ایک دن
کے لیے سفر موقوف کرنے کا حکم دیا۔ فیروز شاہ نے اس قیام
کو اپنے لیے غنیمت جانا اور حکم برداروں کے ذریعے اسے
اطلاع پہنچائی کہ فیروز شاہ لشکر میں حاضر ہے اور ملاقات
کا متنی ہے۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ سلطان روزے کی حالت میں تھا
لہذا اس نے حکم برداروں سے کہہ دیا کہ میں اس کا فیصلہ
افطار کے بعد کروں گا۔

اس کا اشارہ تو ملاقات کے فیصلے کی طرف تھا لیکن
فیروز شاہ نے کچھ اور ہی سمجھا۔ اس نے شاہ نصیر کے کندھے
پر اپنا سر رکھ دیا۔

”یا شیخ! بادشاہ نے میرے قتل کا فیصلہ کر لیا ہے۔“
”تمہیں یہ کس نے بتا دیا؟“

”حالات و شواہد نے۔ میں بادشاہ کا چچا زاد بھائی

نہایت قریب تھے۔ بھاگنا چاہتے تو واپسی کا راستہ تک معلوم نہیں تھا۔ اس وقت وہ بے چرواہے کی بھیڑوں کی طرح تھے۔ کرتے تو کیا کرتے۔ یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ اگر سلطان کی وفات ہوئی تو سب کی ہلاکت یقینی ہے۔ لشکر کے لوگ عورتوں اور مال کے لالچ میں آپس ہی میں لڑ پڑیں گے۔ بہت سے لوگ راستہ معلوم نہ ہونے کے باوجود بھاگ کھڑے ہوئے۔ خدا جانے اس بیابان میں بھوک پیاس سے مارے گئے یا کسی طرف نکل گئے۔

جب لشکر میں انتشار بہت بڑھ گیا تو لشکر میں موجود علماء مشائخ فیروز شاہ کی خدمت میں آئے اور اصرار کیا کہ وہ اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دے لیکن فیروز شاہ نے معذرت کر لی۔

”سلطان کی زندگی میں اپنی تخت نشینی کا اعلان کرنا بغاوت کے مترادف ہوگا اور میں اس الزام کے لیے تیار نہیں۔“

”ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔“

”تخت کے فیصلے علماء مشائخ کی مرضی سے طے نہیں ہوتے۔“

”اگر لشکر ہی میں بغاوت ہوگئی تو کیا کرو گے؟“

”آپ لوگوں کی یہی مرضی ہے تو میں اپنے شیخ سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی جواب دے سکوں گا۔“

”وہ بھی یہی مشورہ دیں گے۔ خلق خدا کی بہتری اسی میں ہے۔“

”اس کے بعد دیکھا جائے گا۔“

لشکر میں رات اتر آئی تھی۔ فیروز شاہ سلطان کے سرہانے بیٹھا تھا۔ شاہی حکماء کی جماعت ایک طرف بیٹھی تھی۔ طبیب خاص کی بے چینی دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ بار بار اٹھ کر سلطان کی نبض ٹٹولتا تھا اور پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ جاتا تھا۔ فیروز شاہ بھی کسی خیال سے پہلو بدل رہا تھا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔

”مجھے میرے شیخ نصیر چراغ دہلوی نے طلب کیا ہے۔“

”آپ جاسکتے ہیں لیکن محافظ دستہ آپ کے ساتھ جائے گا۔“

”میں قیدی نہیں ہوں۔“

”سلطان المجاہد نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ وہ بیمار ہو گئے۔ اس لیے لازم ہے کہ آپ پر نظر رکھی جائے۔“

”میں محافظ دستے کو اپنے ساتھ لے جانے پر تیار ہوں۔“

”پھر کوئی مضائقہ نہیں۔“ طبیب خاص نے کہا۔

دو شاہی محافظ اندر آئے اور فیروز شاہ کو لے کر چلے گئے۔ شاہی لشکر کے بالکل آخری کنارے پر چراغ دہلوی کا خیمہ تھا۔ یہاں بھی سخت پہرا تھا۔

فیروز شاہ کے ساتھ آئے ہوئے محافظوں نے فیروز شاہ کو اندر بھیج دیا۔ حضرت چراغ دہلوی مصلے پر تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور کچھ پڑھ رہے تھے۔ فیروز شاہ مصلے کے قریب ہی دوڑا نو بیٹھ گیا۔ چراغ دہلوی نے آنکھیں کھول دیں۔

”فیروز شاہ! کہو کیسے آنا ہوا؟“

”آپ سے مشورے کا طالب ہوں۔“

”کہو کیا پوچھنا ہے؟“

”لشکر کے ساتھ آئے ہوئے بعض مشائخ مجھ پر زور دے رہے ہیں کہ میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دوں۔“

”یہی لوگ بعد میں کہیں گے کہ تم نے بادشاہ کے مرنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔“

”لشکر میں سخت انتشار ہے۔ بغاوت کے آثار ہیں۔ انہیں روکنے والا کوئی نہیں۔“

”تم کیا کہتے ہو؟“

”میں آپ سے مشورے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے پھر آپ نے گردن اوپر اٹھائی اور فرمایا۔

”اپنے قدموں کو ابھی تخت سے دور رکھو۔ دیکھتے جاؤ، ابھی بہت کچھ ظہور میں آنے والا ہے۔“

”بادشاہ تو زندوں میں ہے نہ مردوں میں۔“

”فورا سلطان کے پاس پہنچو۔ جلدی کرو۔۔۔۔۔ جلدی کرو۔“

فیروز شاہ اس آواز سے ایسا گھبرا یا کہ فوراً باہر نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ محافظ اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔

خیمہ شاہی میں وہی ادا سی پہرا دے رہی تھی جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ رات بہت ہوگئی تھی۔ اس کے پہنچنے ہی حکماء کی جماعت اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

”اب آپ تشریف لے آئے ہیں۔ ہم کچھ دیر آرام کر لیں۔ اگر کوئی ضرورت پیش آئے تو باہر کھڑی جمعیت میں سے کسی کو بھیج کر بلوا لیجئے گا۔“

رات آہستہ آہستہ سفر کر رہی تھی۔ صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے کہ اچانک سلطان نے آنکھیں کھولیں اور فیروز شاہ کو بیٹھے دیکھا۔

”فیروز! میرے قریب آؤ۔“

”میں یہیں ہوں۔“

”اور قریب آ جاؤ۔“

فیروز شاہ اور قریب ہو کر بیٹھ گیا۔

”میری بات غور سے سنو۔ میرا وقت آ گیا ہے۔ میں یہ بات تمہارے علم میں لے آؤں کہ میں نے تین آدمیوں

الک حور تھا

کو اپنی ولی عہدی کے لیے منتخب کیا تھا۔ ضیا الدین برنی اس کے گواہ ہیں۔ ان تین آدمیوں میں سے ایک ملک مقبول تھا جو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ دوسرا احمد ایاز ہے مگر اب وہ ستر سال سے اوپر کا ہو گیا۔ اس سے یہ بار نہیں سنہیلے گا۔ تیسرے تم ہو۔ میں تم سے خوش بھی بہت ہوں کہ تم نے میری دیکھ بھال کی ہے۔ سب کو بلاؤ تاکہ میں تمہارا نام تحریر کرادوں۔“

فیروز شاہ خیمے سے باہر آیا تاکہ امراء کو جمع کرے اور وصیت کو تحریر میں لایا جاسکے۔

جب تک وہ خیمے میں واپس آتا، سلطان کی روح قفس غصری سے پرواز کر چکی تھی۔ امراء نامہ ارجع ہوئے مگر سلطان کو زندہ نہ دیکھ سکے۔

فیروز شاہ نے سلطان کی وصیت کا ذکر کیا۔ مورخ ضیا الدین برنی نے گواہی دی۔

”سلطان نے خود اپنی زندگی ہی میں چند سال کے لیے اپنے مقربین درگاہ میں سے تین اشخاص کو منتخب کر لیا تھا۔ ان کا مرتبہ تمام ملوک و امراء کے مقابلے میں زیادہ بلند کر دیا تھا اور ان کو اپنا ولی عہد اور اپنی بادشاہی کا مستحق بنا دیا تھا۔ ان تین اشخاص میں ایک ملک مقبول تھا جو سلطان کی زندگی میں وفات پا گیا تھا۔ دوسرا احمد ایاز تھا۔ اس کے بارے میں سلطان کو کہتے ہوئے خود میں نے سنا تھا کہ احمد ایاز کمزور ہو گیا ہے۔ اس کی عمر ستر سال سے اوپر ہو چکی ہے۔ اب وہ چلنے پھرنے اور گھوڑے پر سوار ہونے سے بھی معذور ہے۔ اب اگر وہ گوشہ گیر ہو کر شیخ نظام الدین کی خانقاہ میں بیٹھ جائے اور امور عقبی کی طرف توجہ کرے تو لوگوں میں اس کا احترام قائم رہے گا۔ مجھے یہ بات اس کے روبرو کہتے ہوئے شرم آتی ہے لہذا اگر وہ خود ہی اس کی درخواست کرے تو بہتر ہے۔ پھر میں دیوان وزارت ایسے لوگوں کے ذمے کر دوں گا کہ اس کے معاملات انجام پاتے رہیں گے۔“

”سلطان کے منتخب کردہ اشخاص میں تیسرے فیروز شاہ ہیں جو سلطان مرحوم کے چچا زاد بھائی بھی ہیں۔ سلطان مرحوم نے اپنے آخری وقت میں خاص طور پر ان کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔“

امراء کبار اس وقت تو خاموش رہے لیکن باہر نکل کر اس وصیت کے بارے میں بہت سوں کو شک ہوا۔

”اگر ملک فیروز کو ولی عہد مقرر کیا بھی تو اس کا نمبر تیسرا تھا۔ ابھی احمد ایاز زندہ ہے اور دہلی میں امور وزارت

اطوار اقوام

مختلف قوموں اور مختلف ممالک کے اطوار میں کس قدر فرق ہوتا ہے، آئیے دیکھیں۔

☆ برطانیہ اور ہالینڈ میں آستینیں چڑھانے کا مطلب کام کے لیے تیار ہونا ہے، جرمنی میں اس کا مطلب آرام کرنا اور پاکستان میں اس سے مراد لڑائی کے لیے تیاری سمجھی جاتی ہے۔

☆ امریکا کے دفاتر میں لوگ فون پر بات کرتے ہوئے پاؤں میز پر رکھ لیتے ہیں، جاپان میں اس کو انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے۔

☆ فرانس کے بعض علاقوں میں آپ کیفے میں اس وقت تک نہیں بیٹھ سکتے جب تک کہ آپ وہاں موجود ہر جاننے والے کے ساتھ ہاتھ نہ ملا لیں۔

☆ افغانستان میں سر راہ ملنے والے لوگ حال احوال پوچھنے میں پانچ منٹ لگاتے ہیں۔

☆ عرب ممالک میں آپ میزبان کے گھر میں چیزوں کو غور سے دیکھیں تو وہ خیال کرے گا کہ آپ کو ان چیزوں کی ضرورت ہے۔

☆ روس میں میزبان، مہمان کے مشروب کی مقدار اپنے مشروب کی مقدار جتنی رکھتا ہے ورنہ مہمان برا مانا جاتا ہے۔

☆ جب آپ ملاقات کے لیے مختلف لوگوں کو 4 بجے کا وقت دیں تو جرمن عین وقت پر پہنچیں گے۔ امریکن 15 منٹ پہلے، برطانوی 15 منٹ تاخیر سے اور اطالوی شاید ایک گھنٹا لیٹ پہنچیں۔

☆ بزنس میٹنگ کے سلسلے میں برطانوی لوگ کاروباری معاملات، کھانے پینے کے دوران میں طے کرتے ہیں۔ جاپانی کھانے کے دوران میں کاروباری گفتگو نہیں کرتے، جرمن کاروباری معاملات، کھانے سے پہلے طے کرتے ہیں۔ فرانسیسی پہلے کھاتے ہیں بعد میں کاروبار پر بحث کرتے ہیں۔

مرسلہ: قدیر، کراچی

انجام دے رہا ہے۔ ہمارا فیصلہ تو اس کے حق میں ہے۔“
یہ بحث اور طویل چھیٹی لیکن لشکر کی بگڑتی ہوئی صورت
حال نے سب کی توجہ دوسری طرف مبذول کر دی۔
سلطان کے انتقال کی خبر مشہور ہوتے ہی اس قدر
شور و غوغا بلند ہوا کہ روز وفات روز قیامت بن گیا۔ صدمہ
سلطان کی وفات کا نہیں، خوف اپنے لٹ جانے کا تھا۔ لشکر
میں خبر مشہور ہو گئی تھی کہ رات ہوتے ہی قرب و جوار کے
گاؤں والے اپنے گھروں سے نکل کر لوٹ مار چائیں گے
اور ہماری عورتوں اور کنیزوں کو لے کر بھاگ جائیں گے۔
لشکر کے سپاہیوں پر رات بھر خوف طاری رہا۔
ہتھیار سنبھالے آگے پیچھے دوڑتے رہے۔ آپس میں بھی
لوگ ایک دوسرے سے خوفزدہ تھے کہ کب کون کس پر حملہ
کر دے اور مال و اسباب لوٹ لے۔ دراصل یہ سپاہی مال
غنیمت کے لالچ میں یہاں تک چلے آئے تھے اور اب کوئی
جنگ نہیں ہونی تھی لہذا اسی فکر میں غلطاں تھے کہ لوٹ مار
کر کے دولت جمع کر لیں۔ ہر طرف مال و اسباب لوٹے
جانے کا ذکر ہو رہا تھا۔ پھیلتی ہوئی افواہیں جلتی پرتیل کا کام
کر رہی تھیں۔

لشکر کو یہاں دو دن رکتا پڑا۔ افراتفری بڑھتی ہی
جاری تھی۔ اس افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لشکر میں
شامل مغلوں نے لشکر کو لوٹنے کا ارادہ کر لیا۔
لشکر سے الگ تھلک التون بہادر کی سربراہی میں
آئے ہوئے چغتائی مغلوں کے خیمے نصب تھے۔ یہاں کوئی
شورش، کوئی انتشار نہیں تھا۔ ظاہر ہے انہیں سلطان کی موت
سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ آپس میں بھی کسی سے کسی کو کوئی
خطرہ نہیں تھا لیکن جب ایک رات گزر گئی تو التون بہادر یہ
سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ اگر سلطان کی
طرف سے آتا تو مال غنیمت کا حقدار ہوتا۔ اب تو اس کے
سپاہی تنخواہ کے بھی حقدار نہیں۔ وہ اپنے نقصان کی تلافی کی
تدبیریں سوچنے لگا۔

اس کے خیمے میں اس کے چند سردار جمع تھے اور
آئندہ کے لائحہ عمل پر اظہار رائے ہو رہا تھا۔ التون بہادر کا
خیال یہ تھا کہ ہم جس کی مدد کو آئے تھے، وہی نہیں رہا تو اب
ہمارا یہاں رہنا فضول ہے لیکن اس کے سرداروں میں سے
کچھ تذبذب کا شکار تھے اور دبے لفظوں میں اپنے عزائم
بیان کر رہے تھے۔

”اگر سلطان تغلق زندہ ہوتا اور ہم کسی جنگ میں
شریک ہوتے تو کیا ہم مال غنیمت کے انبار لے کر اپنے وطن

کو نہ لوٹ رہے ہوتے؟“
”بالکل ایسا ہی ہوتا لیکن اب صورت حال بدل گئی
ہے۔ اس نقصان کا مجھے بھی افسوس ہے لیکن اب کیا ہو سکتا
ہے۔“ التون بہادر نے کہا۔
”تغلق کے امیروں کے پاس بہت دولت ہے۔
شاہی خزانے میں بھی بہت کچھ ہوگا۔ اس پر اب ان کا نہیں
ہمارا حق ہے۔“

”تم کسی لوٹ مار کی بات کر رہے ہو؟“
”اپنا حق چھیننے کی بات کر رہے ہیں۔ سلطان تغلق
نے ہمیں بلایا تھا۔ ہم اپنی خدمات کا معاوضہ لے کر اپنے
وطن واپس جانا چاہتے ہیں۔“
”کیا یہ اتنا آسان ہوگا۔ تم صرف پانچ ہزار کی
تعداد میں ہو۔ دوسری جانب تغلق کا پورا لشکر ہے۔ وہ
سراسیمہ سہی لیکن جنگ کی نویت آئی تو وہ جنگ کرے گا۔“
”ہم کسی جنگ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم تو اچانک
ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔ شب خون کے سامنے بڑی بڑی
فوجیں پسپا ہو جاتی ہیں۔“

اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد التون
بہادر کے منہ میں بھی پانی آنے لگا۔ وہ عورتوں کا رسیا تھا اور
اسے یہ لالچ دیا جا رہا تھا کہ لشکر کے ساتھ عورتیں اور کنیزیں
بھی ہیں۔ ہم انہیں آپ کے قدموں میں لا کر ڈال دیں
گے۔ التون بہادر نیم رضا مند ہو گیا۔

التون بہادر کے خیمے کی پشت پر ایک مغل کان لگائے
کھڑا تھا۔ وہ ان سرداروں کے مابین ہونے والی پوری گفتگو
سن سکا لیکن اتنا ضرور سمجھ گیا کہ ہندوستان کے لشکر کو لوٹنے
کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اسی میں اس نے یہ بھی سن لیا تھا کہ
عورتوں اور کنیزوں کو اٹھانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اسے
دوسری عورتوں سے غرض نہیں تھی لیکن اسے ایک کنیز دردانہ کا
خیال ضرور آ گیا۔ یہ لڑکی لشکر میں شامل ایک امیر کی کنیز
تھی۔ اس مغل سپاہی کی نظر اس پر پڑ گئی تھی۔ گوندل سے
چلتے وقت دردانہ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور عجیب
اتفاق کہ ایک ہی ملاقات محبت میں تبدیل ہو گئی۔ اس
ویرانے میں جب لشکر نے پڑاؤ کیا تو دردانہ سے اس کی
ملاقاتیں تواتر سے ہونے لگیں۔ اس وقت جو اس نے یہ
باتیں سنیں تو دردانہ کا خیال آیا۔ اگر میری قوم نے لشکر پر
شب خون مارا اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا تو دردانہ خطرے
میں پڑ جائے گی۔ کیا خبر کس کے ہاتھ لگے۔ اس سے پہلے کہ
اسے کوئی نقصان ہو، میں اسے لے کر نکل جاؤں یا کم از کم

الٹ دوڑتا ہوں۔

اسے خبردار کر دوں۔ اس نے اپنا گھوڑا دردانہ کے لشکر کی
طرف دوڑا دیا۔

وہ نہ جانے کس ارادے سے آیا تھا۔ دیکھا تو وہ
فیروز شاہ کے خیمے کے سامنے کھڑا تھا۔ لشکر میں پھیلی
افراتفری صاف نظر آرہی تھی۔ لوگ خوفزدہ دکھائی دے
رہے تھے۔ اسے دیکھ کر مزید سہم گئے کہ یہ مغل یہاں کیا
کر رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے دیکھ کر تلواریں برہنہ کر لی
تھیں کہ ابھی سر قلم کر دیں گے۔ فیروز شاہ کے خیمے کے باہر
کھڑے پہرے داروں نے اسے روک لیا لیکن جب اس
نے بتایا کہ وہ ایک اہم پیغام لے کر آیا ہے تو اجازت لے
کر اسے اندر جانے دیا گیا۔

”سردار! میں ایک اہم خبر لے کر آپ کے پاس آیا
ہوں۔“ اس نے فیروز شاہ سے کہا۔

”کیسی خبر نوجوان؟“
”میری قوم کے افراد آج رات آپ کے لشکر پر
شب خون مارنے والے ہیں۔“
”مگر کیوں؟ تم لوگ تو ہماری مدد کو آئے تھے۔
ہمارے دشمن تو نہیں ہو۔“

”لالچ انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کوئی
جنگ ہوتی تو ہمیں مال غنیمت ملتا۔ ہم خالی ہاتھ نہیں جائیں
گے۔ تغلق کا خزانہ لوٹ کر جائیں گے۔ ان کی عورتیں
اٹھالیں گے۔“

”تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ چند افراد کی خواہش
کو تو خبر نہیں بنا رہے ہو؟“

”میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ ہمارے سردار،
التون بہادر کے خیمے میں بیٹھ کر یہی منصوبہ بنا رہے تھے اور
یہی باتیں ہو رہی تھیں۔“

”التون بہادر کیا کہہ رہا تھا؟“

”وہ شروع میں تو راضی نہیں تھا لیکن پھر خاموش ہو گیا
تھا۔ ویسے میں زیادہ باتیں سن بھی نہیں سکا۔“

”میں یہ پوچھنے میں حق بہ جانب ہوں کہ تم یہ خبری
کیوں کر رہے ہو؟ تمہیں ہم سے ہمدردی کیوں ہو گئی؟ کیا
تمہیں بھی تو کسی منصوبے کے تحت نہیں بھیجا گیا ہے؟“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ مخلوق خدا کا خون خواہ بھایا جائے۔“

”نوجوان! تمہارا لہجہ بتا رہا ہے کہ تم اصل بات نہیں
بتا رہے ہو۔ سچ بتاؤ تمہیں کس نے بھیجا ہے؟“

نوجوان مغل سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ غالباً وہ یہ
سوچ رہا تھا کہ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ فیروز شاہ کی

الٹ دوڑتا ہوں۔

آواز پھر گونجی۔

”سچ اگلتے ہو یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہیں قید میں
ڈال دوں۔“

فیروز شاہ کی آواز اتنی بلند ہو گئی تھی کہ اس کے محافظ
کوئی خطرہ محسوس کر کے اندر آ گئے۔ فیروز شاہ نے انہیں
واپس بھیج دیا اور نوجوان مغل کو بولنے پر مجبور کر دیا۔

”آپ کے لشکر میں میری ایک قیمتی چیز ہے جس کے
گم ہو جانے کا ڈر مجھے یہاں لے آیا ہے۔ اگر شب خون مارا
گیا یا ویسے ہی لوٹ مار ہوئی تو میرا نقصان ہو جائے گا۔“

”وہ چیز قیمتی بھی ہے اور تمہاری بھی ہے تو وہ ہمارے
لشکر میں کیوں ہے؟“

”اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ میری ہے۔ اس
وقت کسی اور قبضے میں ہے۔“

”نوجوان! تم یا تو کسی ذہنی فتنے میں مبتلا ہو یا مجھے
الجمانے کی کوشش کر رہے ہو۔ صاف صاف بتاؤ تم کہنا کیا
چاہتے ہو۔ اگر اس خبری کا معاوضہ چاہتے ہو تو وہ بھی بتا دو۔“
”معاوضہ سمجھ کر ہی وہ قیمتی چیز میرے حوالے
کر دیں۔“

”بے وقوف آدمی! مجھے معلوم تو ہوا اس قیمتی چیز کا نام
کیا ہے۔“

”دردانہ.....“ نوجوان مغل کے منہ سے بے اختیار
یہ نام نکل گیا۔

”یہ تو کسی لڑکی کا نام معلوم ہوتا ہے۔“
”جی ہاں۔“

”کون ہے یہ لڑکی اور کیا چاہتے ہو؟“
”پہلے آپ وعدہ فرمائیں کہ وہ لڑکی مجھے عطا
فرمادیں گے۔“

”ہم یہ وعدہ کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمیں کیا معلوم وہ کس
کی بیٹی ہے، کس کی کنیز ہے؟“

”آپ کم از کم یہ وعدہ فرمائیں کہ آپ میرے ولی
بن کر اس کے مالک سے بات کریں گے۔“

”کیا نام بتایا؟“

”دردانہ.....!“

”کیا دردانہ تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہو جائے گی؟“

”وہ تیار ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت
کرنے لگے ہیں۔“

”اچھا بتاؤ وہ ہے کون۔“

اس نوجوان نے تفصیل سے بتایا کہ وہ کون ہے اور

کس امیر کی کنیز ہے۔ فیروز شاہ نے مزید تصدیق کے لیے دردانہ کو بلوایا۔ اس نے بھی سر جھکا کر اقرار کر لیا کہ وہ اس نوجوان کی محبت میں گرفتار ہے۔ اب مرحلہ صرف یہ تھا کہ اس امیر سے بات کرنی تھی جس کی وہ کنیز تھی۔ اس نے نوجوان کو تسلی دی۔ ”میں اس کنیز کے مالک سے بات کروں گا اور جب تم اپنے وطن جانے لگو گے تو اس کنیز سے تمہاری شادی ہو جائے گی۔ ابھی سلطان کے انتقال کو ایک دن گزر رہا ہے۔ لشکر میں شادی کرتے اچھا نہیں لگے گا۔“

فیروز شاہ نہیں جانتا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ نوجوان کے جاتے ہی اس نے تمام امیروں کو جمع کیا۔ یہ موقع دردانہ کا ذکر چھیڑنے کا نہیں تھا۔ اس نے تو امیروں کو اس لیے طلب کیا تھا کہ شب خون کی اطلاع کی روشنی میں ان امیروں سے مشورہ کیا جائے۔ سب کی رائے یہی تھی کہ مغلوں کی فوج کو شاہی لشکر سے دور ہٹا دیا جائے۔

ان امراء کی موجودگی ہی میں فیروز شاہ نے مغلوں کے سردار التون بہادر کو طلب کیا۔ ”جیسا کہ آپ کو معلوم ہے سلطان محمد تغلق نے وفات پائی ہے۔ سلطان نے اپنی مدد کے لیے آپ کو بلایا تھا، اب نہ سلطان رہا نہ وہ ممکنہ جنگ جس کے لیے آپ کو بلایا گیا تھا۔ لہذا آپ کو اجازت ہے کہ جلد از جلد اپنے وطن کو روانہ ہو جائیں۔ لشکر سلطانی اب دہلی کی طرف واپس ہوگا۔ آپ لشکر کی روانگی سے قبل اپنے لوگوں کو لے کر لشکر سلطانی سے دور ہو جائیں تاکہ کوئی بد نظمی نہ ہو۔“

فیروز شاہ نے سب کے مشورے اور اتفاق رائے سے ملک التون بہادر اور ان کے امیران ہزارہ و امیران صده مع ان سواروں کو جو ان کے ہمراہ آئے تھے، ہر ایک کے مرتبے کے مطابق خلعت و انعامات دیے اور ساتھ ہی ان کو واپس جانے کی اجازت دے دی اور اس خیال سے کہ وہ لشکر میں کسی قسم کا ہنگامہ نہ کریں، مغلوں کو حکم دیا کہ وہ لشکر سلطانی کے روانہ ہونے سے پہلے ہی لشکر سے نکل کر دور چلے جائیں اور وہاں سے جلد از جلد اپنے وطن کی طرف روانہ ہو جائیں۔ التون بہادر نے اس فیصلے کو قبول کیا اور اپنے لشکر میں واپس چلا گیا کہ ضروری تیاری کے بعد روانہ ہو جائے۔

محمد تغلق کا ایک غلام نوروز گرگین اس گفتگو کو سن رہا تھا۔ اس کے دل میں نہ جانے کیا سوائی کہ اپنے خاندان

والوں کو ساتھ لے کر مغلوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اپنے خاندان والوں کو لشکر میں چھوڑا اور خود التون بہادر کے خیمے میں پہنچ گیا۔

”التون بہادر! سچ بتاؤ کیا یہاں آنے سے پہلے تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ مال غنیمت تمہارے ہاتھ آئے گا؟“

”بالکل سوچا تھا۔ ہر سردار ہر سپاہی اسی توقع پر اپنی جان ہتھیلی پر رکھتا ہے۔“

”پھر اب کیا ہوگا؟ اب تو جنگ نہیں ہوگی۔ تو کیا یونہی خالی ہاتھ واپس چلے جاؤ گے۔“

”ملک فیروز نے ہماری عزت افزائی کی ہے۔ ہمیں انعام و اکرام سے نوازا ہے۔“

”اس نے آپ کو بے وقوف بنایا ہے۔ تھوڑی سی رقم آپ کو دے کر خود پورے خزانے پر قابض ہو گیا ہے۔“

”وہ سلطان کا جانشین ہے۔ اس خزانے پر اس کا حق ہے۔“

”وہ خزانہ تمہیں بھی مل سکتا ہے۔ اگر تم اس خزانے کا ایک چوتھائی بھی مجھے دینے کا وعدہ کرو تو میں اس کی راہ بھاؤں۔“

”مجھے منظور ہے۔“

”بادشاہ کی موت سے شاہی لشکر بے سرو سامان ہو گیا ہے۔ سب کے دل پریشان ہیں۔ دہلی سے ہزاروں کوس دور ہیں۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی لڑنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ ابھی تک کوئی تخت پر نہیں بیٹھا ہے جو لوگوں کو مطمئن اور یکتا کرتا۔ ہر طرف بد نظمی ہے۔ کل لشکر دردانہ ہوگا۔ کسی بادشاہ کے نہ ہونے کے سبب تمام لوگ بے ترتیبی اور بے ڈھنگے پن سے روانہ ہوں گے۔ سلطان کی بڑی بہن ملکوں کی بیویوں کے ساتھ مل کر سفر کریں گی۔ اتنے زیادہ لوگ مع عورتوں اور بچوں کے اور کثرت مال و اسباب کے ساتھ جنگل اور ریگستان میں پھنس گئے ہوں جبکہ بادشاہ ان کے سر سے اٹھ گیا ہو اور دار الحکومت سے ہزار کوس کے فاصلے پر ہوں، پھر ہمیں نہیں ملیں گے۔ اس بے ترتیب لشکر پر اگر حملہ کر دیا جائے تو خزانہ اور لشکر میں شامل عورتوں پر بے آسانی قبضہ کیا جاسکتا ہے۔“

نوروز گرگین طرح طرح سے ترغیب دیتا رہا۔ التون بہادر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے ساز باز کر لی۔ اپنے سرداروں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کے سردار تو پہلے ہی ارادہ کر چکے تھے۔ اب نوروز کا سہارا ملا تو حملے کے لیے تیار ہو گئے۔

یہ رات خیریت سے گزر گئی۔ لشکر میں لوگ رات بھر جاگتے رہے تھے لیکن کوئی شب خون نہیں ہوا کیونکہ مغل لشکر کچھ فاصلے پر جا کر مقیم ہو گیا تھا۔

اگلے دن شاہی لشکر سیستان کی جانب روانہ ہوا۔ لشکر کا ہر گروہ بغیر سردار کے انتہائی بے ترتیبی اور بے ڈھنگے پن سے روانہ ہوا اور سفر کرنے لگا۔ کوئی شخص ایک دوسرے کی طرف متوجہ نہ ہوتا تھا۔ ایک شخص بات کہتا تھا، دوسرا اس پر کان نہ دھرتا تھا۔ سودا گروں کے قافلوں کی طرح غافل ہو کر چل رہے تھے کہ اچانک مغل لوٹنے کی تیاری کر کے سامنے سے آگئے اور ٹھٹھہ کے مفند پیچھے سے۔ لوگ لڑنے کے بجائے چیختے چلاتے لگے۔ مغلوں نے لوٹ مار شروع کر دی اور جو کچھ بھی ہوسکا عورتوں، کنیزوں، گھوڑوں، بیلوں، سواروں، خچروں اور اسباب میں سے لوٹ کر لے گئے۔ ٹھٹھہ کے مفند پیچھے سے خیمہ و خرگاہ پر ٹوٹ پڑے۔ لشکر کے آدمی سوار اور پیادے مرد اور عورتیں جگہ بہ جگہ کھڑے رہ گئے۔ اگر آگے کی طرف جاتے تھے تو مغل حملہ کرتے تھے اور پیچھے جاتے تھے تو ٹھٹھہ کے مفند لوٹ لیتے تھے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح یہ لٹا پٹا لشکر پہلی منزل پر پہنچا اور دریا کے کنارے مقیم ہو گیا۔

رات ہو گئی تھی۔ نیند کہیں پیچھے ہی رہ گئی تھی۔ ہر شخص جاگ رہا تھا۔ کہیں کہیں سے لوگوں کے رونے اور چیختے چلانے کی آوازیں خاموشی کو توڑ کر آگے بڑھ جاتی تھیں۔ ایسے میں دور کہیں گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ کچھ لوگ اس آواز پر چونک کر اٹھ گئے۔ تلواریں نیام سے باہر آگئیں۔ آوازیں بھی قریب پہنچ گئی تھیں پھر ایک سوار سامنے آ گیا۔

”میں مغل ضرور ہوں لیکن حملہ آور نہیں۔ مجھے فیروز شاہ تک پہنچا دو۔ میں اس کے نام ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔“ آنے والا چیخ چیخ کر آگاہ کر رہا تھا۔ لوگ اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ اس کے قریب نہیں جا رہے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اس کے دیگر ساتھی بھی یہیں کہیں ہوں گے۔ بہر حال کچھ لوگ تنگی تلواریں لے آگے بڑھے۔ وہ نوجوان اب بھی اعلان کر رہا تھا کہ وہ کسی برے ارادے سے نہیں آیا لیکن لوگ غصے سے پھرے ہوئے تھے۔ اسے گھوڑے سے نیچے گھسیٹ لیا گیا۔

”یہ کوئی اور جیس مغلوں کا جاسوس ہے۔“

یہ آوازیں کئی طرف سے بلند ہوئیں اور پھر تلواریں برسنے لگیں۔ وہ بے چارہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کا سر اتار لیا اور اپنا کارنامہ دکھانے کے لیے اس کے سر کو فیروز شاہ کے پاس لے گیا۔ فیروز شاہ کو اس نوجوان کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ یہ وہی مغل

الک حور تھا

نوجوان تھا جو ایک دن پہلے اس کے پاس آیا تھا اور دردانہ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔

اس وقت وہ کسی کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ یہ نوجوان مجھے میرا وعدہ یاد دلانے آیا تھا۔ دردانہ کو مجھ سے مانگنے آیا تھا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

”یہ ہمارا محسن تھا جسے تم نے مار دیا۔“

کسی کو یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ محسن کیوں تھا لیکن لشکر میں یہ خبر پھیل ضرور گئی کہ ایک نوجوان مغل مارا گیا۔ دوسرے دن کی صبح عجیب شور و غل سے بیدار ہوئی۔ دردانہ نام کی ایک کنیز نے زہر کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ اس کی خبر فیروز شاہ کو ملی تو اس کے پاس افسوس کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ خودکشی کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن فیروز شاہ سب سمجھ رہا تھا۔ اسے سب معلوم تھا لیکن وہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ خود کو قصور وار سمجھ رہا تھا کہ شاید اس نے دیر کر دی۔

لشکر نے پھر پڑاؤ اٹھایا۔ مغل اب بھی حملے کر رہے تھے لیکن لشکر کسی نہ کسی طرح دوسری منزل پر پہنچ گیا اور دریا کے کنارے قیام کیا۔ غارت گری انتہا کو پہنچ گئی تھی اور اب تو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر لشکر کے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تو اونٹوں پر لدا خزانہ غیر محفوظ ہو جائے گا۔ علماء، مشائخ اور دوسرے معتبر لوگ سر جوڑ کر بیٹھے اور اس صورت حال پر غور ہونے لگا۔

”یہ صورت حال صرف اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ ہمارا کوئی بادشاہ نہیں۔ اگر کوئی بادشاہ مقرر ہو جائے تو مغل بھی لوٹ مار سے باز آ جائیں گے اور لشکر کے لوگوں میں بھی نظم و ضبط پیدا ہو جائے گا۔“

”سوال یہ ہے کہ کسے بادشاہ مقرر کیا جائے؟ سلطان کی کوئی وصیت بھی سامنے نہیں ہے۔“

اسی وقت مورخ ضیا الدین برنی آگے بڑھا اور اس وصیت کا ذکر کیا جو بادشاہ نے اس کے سامنے بیان کی تھی۔ چند معتبر افراد نے بھی اس کی تصدیق کی۔

”سلطان نے اس وصیت کا ذکر فیروز شاہ کے سامنے بھی کیا تھا لیکن وصیت تحریر ہونے سے پہلے وہ ابدی نیند سو گیا۔“

”ہمیں آپ کی بات کا یقین ہے اور یوں بھی سلطان کا بھائی ہونے کی حیثیت سے وہ اس کا جانشین ہے۔ اب ہم ایک وفد کی صورت میں اس کے پاس جاتے ہیں اور اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کرے بلکہ اس کی رضا مندی کے بعد اس کی بادشاہت کا اعلان ہم خود

کریں گے۔“

مشائخ و علما ایک وفد کی صورت میں شاہی درگاہ میں گئے۔ طے یہی ہوا تھا کہ گفتگو کا آغاز شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کریں گے کیونکہ فیروز شاہ ان سے بیعت ہے، ان کا کہا ٹال نہیں سکے گا۔

حضرت چراغ دہلوی نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”ملک فیروز! تمہیں ایک نہیں تین اعزاز حاصل ہیں۔ تم سلطان مرحوم کے ولی عہد بھی ہو، وصی بھی اور سلطان کے چچا زاد بھی۔“

”مجھے ان اعزازات پر فخر ہے۔“

”پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ سلطان کے کوئی لڑکا نہ تھا جو اس کی جگہ تخت پر بیٹھ جاتا۔“

”اس حقیقت کو سب جانتے ہیں کہ سلطان لا ولد تھا۔“

”دہلی میں کوئی دوسرا شخص بھی ایسا نہیں کہ اس کو بادشاہی پر حق ہو اور اس کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔“

”یا شیخ! آپ نے بالکل درست کہا۔“

”منزل قریب ہے۔ تمہارے تخت شاہی پر جلوہ افروز ہونے کا وقت آ گیا ہے۔“

”یا مرشد! میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ جازو زیارت حرمین شریفین کے لیے نکلوں گا۔“

”اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے لیکن اس وقت تقاضائے وقت کچھ اور ہے۔“

اب دوسرے لوگوں کی بھی ہمت ہوئی۔ انہوں نے بہ یک آواز کہا۔

”خدا کے لیے اتنے بہت سے عاجز اور بے کسوں کی فریاد رسی کر اور تخت سلطنت پر بیٹھ جا اور ہم کو اور ہزاروں بے کسوں کو اور سارے لشکر کی عورتوں اور بچوں کو مغلوں کے ہاتھوں سے بچا اور دو لاکھ آدمیوں کی دعائیں حاصل کر۔“

فیروز شاہ کی تربیت علما و مشائخ کے درمیان رہ کر ہوئی تھی۔ وہ حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ حضرت شاہ نصیر الدین سے بیعت تھا جنہیں چراغ دہلوی کہا جاتا تھا لہذا اس کے دل میں علما و مشائخ کے لیے بے حد احترام تھا۔ وہ ان کی بات ٹال نہ سکا اور تخت شاہی پر جلوہ افروز ہو گیا۔

تخت نشینی کے دوسرے ہی روز اس نے لشکر کو باقاعدہ ترتیب دیا اور سفر شروع کر دیا۔

لشکر نہایت ترتیب سے روانہ ہوا تھا۔ اب لشکر میں ایک نیا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا چنانچہ جس طرف سے بھی مغل سوار لشکر کی طرف آتے وہ یا تو مارے جاتے یا گرفتار ہو جاتے اور قید

کر لیے جاتے لیکن ٹھٹھہ کے مفسدوں کا خطرہ اب بھی موجود تھا۔ فیروز شاہ نے بعض امراء کو لشکر کے عقب میں متعین کیا۔ ان امراء نے ٹھٹھہ کے مفسدوں پر جو پیچھے سے خیمہ و خرگاہ پر حملے کرتے تھے، غلبہ حاصل کر لیا اور ان مفسدوں میں سے چند کو تہ تیغ کیا۔ اس غلبے کی ہیبت سے ٹھٹھہ کے مفسدوں نے پیچھا کرنا چھوڑ دیا اور واپس لوٹ گئے۔

خطرہ اب بھی موجود تھا۔ اس خطرے کے مکمل سدباب کے لیے فیروز شاہ نے چند امراء کو حکم دیا کہ مغلوں پر حملہ کر کے ہندوستان سے ہمیشہ کے لیے بھاگ جانے پر مجبور کر دیں۔ ان امیروں نے مغلوں کو یہ موقع دیے بغیر کہ وہ آئیں اور لوٹ مار کریں، ان پر بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑے۔ جنگ ضرور ہوئی لیکن مغل بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ پہلے تیس چالیس کوس دور جا کر ٹھہرے اور پھر اپنے وطن واپس چلے گئے۔

فیروز شاہ متواتر کوچ کرتا ہوا سیوستان پہنچ گیا۔

☆☆☆

سلطان محمد شاہ تغلق کے انتقال کی خبر دہلی پہنچی تو قصر سفید میں زلزلہ آ گیا۔ ابھی تک احمد ایاز ہر سپاہ سفید کا مالک بنا ہوا تھا لیکن اب اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ ابھی نہیں تو چند ماہ بعد فیروز شاہ یہاں پہنچ جائے گا اور بادشاہت کا دعویٰ کرے گا۔ وہ خاندان شاہی سے تعلق رکھتا ہے اس لیے وہ اپنے دعوے میں حق بہ جانب ہوگا۔ اگر اسے دہلی تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ بات تو معقول ہے لیکن اس سے پہلے کوئی اور بھی انتظام کیا جائے۔ کیسا انتظام؟ یہ ابھی سوچنا چاہیے۔

بات ایسی تھی کہ وہ کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے چند مقرب امیر تھے جن سے وہ مشورہ کر سکتا تھا لیکن وہ ابھی خود کسی نتیجے پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسے قتلغ خاں کا خیال آیا۔ قتلغ خاں نے اس سے بھی کہا تھا کہ مجھے آپ اپنے ساتھ دیکھیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آیا کہ قتلغ خاں ان دنوں بیمار ہے۔ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود اس کے گھر جائے گا اور اس سے مشورہ کرے گا۔

وہ پاکی میں سوار ہوا اور قتلغ خاں کے مکان پر پہنچ گیا۔ یہ غیر معمولی بات تھی کہ احمد ایاز اسے دیکھنے اس کی بیمار پرسی کرنے اس کے گھر آیا تھا۔ قتلغ خاں کے ملازموں نے اس کی پشت پر تکیے رکھ کر اسے نیم دراز کر دیا۔ احمد ایاز اس کی خلوت گاہ میں داخل ہوا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔

الٹ دور تھا

”قتلغ خاں! تم نے کبھی مجھ سے کہا تھا، مجھے آپ اپنے ساتھ دیکھیں گے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں سلطان کے حکم سے دہلی آیا تھا اور تم مجھ سے ملنے آئے تھے۔“

”مجھے یاد ہے لیکن اب تو میں چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا ہوں۔ اب تو آپ صرف مجھے دیکھیں، اپنے ساتھ نہ دیکھیں۔“

”میں تم سے ایک مشورہ کرنے آیا ہوں۔ شاید تم نے بھی یہ سن لیا ہو کہ سلطان اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ انہوں نے ٹھٹھہ کے قریب وفات پائی ہے۔“

”یہ کیا خبر تم نے سنا دی؟“ قتلغ نے کہا اور اپنی پشت کے تکیے ہٹا کر سیدھا بیٹھ گیا جیسے اس کے بدن میں جان سی آگئی ہو۔ ”اس کا مطلب ہے اب ملک فیروز کو تخت تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ شاید میں اسی دن کے لیے زندہ تھا۔“

”قتلغ خاں! میں کچھ اور سوچ رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تم مجھے صائب مشورہ دو گے۔“

”فرمائیے اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ بادشاہت میرے اور تمہارے درمیان رہے؟“

”کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیں؟ اگر آپ نے ایسا کیا تو اسے کون تسلیم کرے گا۔ آپ کا یا میرا تعلق شاہی خاندان سے نہیں۔“

”اس کے علاوہ بھی ایک راستہ ہے۔ تمہارے گھر آتے ہوئے ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ اگر ہم کسی نابالغ بچے کو تخت پر بٹھادیں تو پس پردہ ہم ہی حکومت کریں گے۔“

”اسے کون تسلیم کرے گا کیونکہ سب جانتے ہیں سلطان کا کوئی لڑکا نہیں۔“

”جتنے امیر فیروز شاہ کے حق میں تھے، ان سب کو سلطان نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ یہاں جتنے امیر ہیں، وہ سب میرے حق میں ہیں۔ میں انہیں باور کرا دوں گا کہ یہ لڑکا سلطان تغلق کے کسی حرم میں سے ایک کا ہے۔“

”اس کے باوجود بھی میں تو یہی چاہوں گا کہ فیروز شاہ تخت نشین ہو۔“

”کیا تم یہ نہیں چاہو گے کہ وہ بچہ تخت پر بیٹھے اور ہم اور تم سلطنت چلائیں؟“

”شاید اب ایسا نہ ہو سکے۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں زندہ رہوں گا۔ کاش میں فیروز شاہ کو تخت نشین ہوتے ہوئے دیکھ

سکتا۔“ قتلغ خاں نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں جیسے وہ کہہ رہا ہو اب کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

احمد ایاز کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ قتلغ خاں کچھ کہے اور پھر اٹھ کر چلا آیا۔ اب اسے مقرب امراء کو اعتماد میں لینا تھا۔

☆☆☆

فیروز شاہ سیوستان میں تھا۔ گھوڑوں اور سواروں کو آرام دینے کی غرض سے چند روز قیام کا ارادہ کر چکا تھا۔ گھوڑوں کو وہاں کی مشہور چراگاہ ”چمر“ میں چرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور پھر مقامی لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔ گاؤں اور زمینیں جو کلیئہ منسوخ ہو گئی تھیں سب بحال کر دیں۔

سیوستان کے مزارات کی زیارت کی اور فقرا، مسافروں اور غربا و مساکین کو صدقات دیے۔ اسی دوران سیستان، عدن، مصر اور دوسرے علاقوں سے ایسے لوگ آئے جو مدتوں سے سلطان مرحوم کے احکامات کے منتظر تھے لیکن ان کی حاجت پوری کرنے کے لیے سلطان اب اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔ فیروز شاہ نے انہیں بھی مایوس نہیں کیا اور ہر ایک کو اندازے کے مطابق خرچ دے کر ان کے ملکوں کو روانہ کیا۔ لشکر کے عام لوگ بھی اس کی نوازشوں سے محروم نہیں رہے۔ ملوک و امراء، معارف و اکابر نے حلقہ میں انعامات حاصل کیے۔ علما و مشائخ کی خدمت میں فتوحات پیش کی گئیں۔

اس کی داد و دہش نے لشکر والوں کے دل جیت لیے۔ وہ اس کے ایسے مطیع ہوئے کہ جان دینے کو تیار تھے۔ فیروز شاہ کی دانش مندی سے ایک ایسا لشکر تیار ہو چکا تھا جو بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ لشکر میں اب کسی کو دہلی جانے کی جلدی نہیں تھی۔ جو کچھ وطن میں تھا سب یہاں میسر تھا۔ فیروز شاہ کی تخت نشینی ان کے لیے خیر و برکت کا باعث بن رہی تھی۔

ہر طرف سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد وہ متواتر کوچ کرتا ہوا بھکر پہنچا۔ یہاں کے لوگوں پر بھی نوازشیں کیں۔ وہاں کے بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی اور قدیم وظائف و انعامات از سر نو بحال کیے۔ برسوں بعد بھکر کے لوگوں کو اطمینان حاصل ہوا۔

وہ ہر علاقے کو اپنا مطیع بناتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بھکر سے روانہ ہو کر اسے ”اچھ“ کی طرف جانا تھا۔ اس کے فتح مند لشکر نے ابھی چند منزلیں ہی طے کی تھیں کہ دھول اور مٹی سے اٹا سفید جھنڈا اہراتا ایک سوار لشکر میں داخل ہوا۔ یہ سوار اس کے کہنے کے مطابق دہلی سے آیا تھا اور سلطان

فیروز شاہ سے ملاقات کا متمنی تھا۔ اسے غیر مسلح کر کے فیروز شاہ تک پہنچا دیا گیا۔

”مجھے قتل خاں امیر دہلی نے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط آپ تک پہنچا دوں۔“ یہ کہہ کر قاصد نے وہ خط اپنی پکڑی سے نکال کر فیروز شاہ کے حوالے کر دیا۔

”آگاہ ہو کہ احمد ایاز نے دہلی میں علم بغاوت بلند کر دیا ہے۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اس نے ایک چھ سات سالہ لڑکے کو لوگوں کے سامنے پیش کر کے یہ کہہ دیا ہے کہ یہ سلطان محمد تغلق کا بیٹا ہے اور اس مجہول النسب کو اس نے تخت پر بٹھا دیا ہے اور اس طرح دہلی کے رہنے والوں کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے، خصوصاً مجھے کہ میں ہمیشہ سے آپ کا مطیع و فرمانبردار رہا ہوں اور آپ کو تخت شاہی کا حق دار سمجھتا ہوں۔ بد بخت احمد ایاز میرے پاس بھی آیا تھا اور مجھے اپنے ساتھ ملانا چاہا تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ اب اس نے چند لالچی امراء کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے جو اس کے سامنے مردان شیر بن کر کھڑے ہوئے ہیں جن پر وہ اچھل رہا ہے۔

”میرے اور آپ کے مرشد حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی نے آپ کی بادشاہت کی نوید سنائی تھی۔ شاید وہ وقت آ گیا ہے۔ آپ کو اطلاع دینے کا مقصد یہ ہے کہ آپ جنگ کی تیاری کے ساتھ آئیے گا۔ شیخ زادہ بسطامی، ننھو سودھل اور بعض دوسرے لوگ آپ کے مقابلے پر آئیں گے۔

”آپ کہیں گے کہ میں کیوں بزدل بنا بیٹھا ہوں تو عرض یہ ہے کہ میں سخت بیمار ہوں۔ آخری سانس لے رہا ہوں۔ خدا مجھے آپ کے آنے تک زندہ رکھے اور میں آپ کو تخت شاہی پر جلوہ افروز دیکھوں۔ قاصد نے بتا دیا ہوگا کہ یہ خط میں لکھ رہا ہوں۔ اپنا نام جان بوجھ کر نہیں لکھا کہ اگر خط پکڑا جائے تو گم نام ہی رہے۔“ خط کیا تھا حیرتوں کا پہاڑ تھا جو اس پر ٹوٹ کر گر پڑا تھا۔ یہ خبر ہی ایسی تھی کہ اسے یقین ہی نہ آتا تھا۔ اس حرکت کو وہ احمد ایاز سے بعید سمجھتا تھا۔ اسی سال کا بوڑھا آدمی جو گھوڑے پر بھی سوار نہیں ہو سکتا۔ جس کی عمر خدا کو یاد کرنے کی ہے، بغاوت پر تل گیا ہے۔ اس نے اس خط اور اس بغاوت کو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن پھر بھی ضروری سمجھا کہ اپنے امراء کو طلب کر کے اس سانحے کی اطلاع دے۔

احمد ایاز کی بغاوت کا سن کر یہ امراء بھی حیرت زدہ رہ گئے۔

”سلطان محمد کے انتقال کے بعد اگر دہلی کی حکومت

کسی نا اہل کے ہاتھ میں آ جاتی تو احمد ایاز کا فرض تھا کہ وہ اس کے خلاف بغاوت کرتا کجا یہ کہ خود اس نے ایک بچے کو تخت پر بٹھا دیا۔“

”عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے اس کی عقل میں فتور آ گیا ہے یا پھر کسی مظلوم کی مدد اس کے حق میں قبول ہو گئی ہے اور اس کی موت قریب آ گئی ہے۔ وہ نہایت بدنامی کے ساتھ جان دے گا اور اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھودے گا۔“

”جب سرکاٹ دینے والی تلواروں کی بجلیاں چمکیں گی تو اس بوڑھے کا جسم روح سے خالی ہو جائے گا۔“ بعض امراء ایسے بھی تھے جو فکر مند ہو گئے تھے اور فیروز شاہ کو زبردست تیاری کے مشورے دے رہے تھے۔ بعض تو وہ بھی تھے جو کہہ رہے تھے بادشاہ کچھ دن یہاں رہ کر احمد ایاز کے مرنے کا انتظار کرے۔ فیروز شاہ نے ان امراء کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”احمد ایاز کا پیشہ فن تعمیر ہے۔ وہ میدان جنگ کا مرد نہیں۔ اس نے کبھی کمان ہاتھ میں نہیں پکڑی۔ کبھی بد مزاج گھوڑے پر سوار نہیں ہوا۔ اس نے وہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جو نہ اس کا کام ہے اور نہ اس کے باپ داداؤں کا۔ مجھے اس مغرور شخص کے خلاف لشکر اور جنگ کی تیاری کی ضرورت نہیں۔ وہ کون سا صف شکن اور صفر ہے کہ مجھے اس سے جنگ و جدال کے لیے لشکر کی ضرورت پڑے گی۔ جوں ہی میں شہر کے حوالی میں پہنچوں گا، وہ اپنا منہ کالا کر کے دوسرے دروازے سے باہر چلا جائے گا۔ میں اپنے چند شکوہ داروں کو بھیجوں گا کہ جا کر اس کو ڈولی سے نکال کر میرے سامنے لے آئیں۔ مجھے تو افسوس یہ ہے کہ اس نے اس بڑھاپے میں ایسی خیانت کی۔“

وہ نہایت اطمینان سے دیوال پور پہنچ گیا۔ دہلی سے برابر خبریں آرہی تھیں کہ احمد ایاز بغاوت کی آگ کو مشتعل کر رہا ہے۔ اس نے اپنے غلاموں کو سلطانی عہدے دے دیے ہیں اور اپنے اعوان و انصار میں شامل کر لیا ہے۔ امراء کو اپنے حق میں گرنے کے لیے شاہی خزانے کو بری طرح لٹا رہا ہے۔ شہر میں بھگوڑوں اور گنواروں کو قصابات سے بلوایا ہے اور ان کا نام لشکر رکھ دیا ہے۔

خواص و عوام سب اس سے روپے وصول کرتے ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں مگر جانتے ہیں کہ وہ ہلاکت کے کنارے پہنچ چکا ہے۔

شہر کے لوگ ڈر کے مارے احمد ایاز کا دم بھرتے ہیں لیکن دل ہی دل میں دعائیں بھی مانگ رہے ہیں کہ کب

الک دور تھا

سلطان فیروز دہلی پہنچتا ہے اور کب انہیں عذاب سے نجات ملتی ہے۔

دیوال پور سے چل کر وہ شیخ فرید الدین گنج شکر کے مزار کی زیارت کے لیے اجدوہن گیا اور اس بزرگ خانوادے کو جو اتر اور پریشان ہو گیا تھا، اس کو از سر نو منظم و درست کر دیا۔ اجدوہن کے باشندوں کو صدقات عطا کیے اور جن لوگوں کے متعلق اس نے سنا کہ ان کو نان یا وظیفہ ملتا تھا، اس کی تجدید کر دی۔ دیوال پور کے مشہور شہر سے دہلی تک ان تمام قصابات میں جو جو اس جانب واقع تھے، لوگوں کے حق میں وظائف و ادارت کے فرمان جاری کیے اور ہر قصبے میں فقراء و مساکین کو نقدی کی شکل میں صدقات ان کے علاوہ دیے۔

وہ ٹھٹھہ سے یہاں تک برابر یہ تاثر دیتا چلا آ رہا تھا کہ سلطان محمد تغلق کے برعکس وہ بزرگان دین کا احترام کرتا ہے۔ یہ تاثر دینا اس لیے ضروری تھا کہ سلطان محمد مشائخ کے خلاف تھا۔ اس کا چچا غیاث الدین حضرت نظام الدین اولیا کا سخت مخالف تھا اور ایک مرتبہ بنگال سے دہلی آتے ہوئے اس نے نظام الدین اولیا کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ میں بنگالہ سے دہلی پہنچوں تو آپ کو دہلی میں نہ دیکھوں۔ اب دہلی میں آپ رہیں گے یا میں اور اس کے جواب میں نظام الدین اولیا نے فرمایا تھا۔ ”ہنوز دلی دور است۔“ یعنی ابھی دلی دور ہے۔ اب فیروز شاہ تغلق یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے چچا زاد بھائی اور چچا کے برخلاف مشائخ کا احترام کرتا ہے۔ دلی کے مشائخ کو پیغام دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کی طرف سے بے خوف ہو کر عبادت الہی میں مصروف رہیں۔ یہ راہ ہموار کر رہا تھا کہ علما و مشائخ دہلی میں داخلے کے وقت مزاحم نہ ہوں۔ احمد یاز کے بجائے اس کا ساتھ دیں۔

اب فیروز شاہ کو دہلی تک پہنچنے کی یقیناً جلدی تھی۔ وہ منزل بہ منزل آگے بڑھتا رہا اور شیخ آباد پہنچ گیا پھر یہاں سے چل کر ایک مقام ہانسی پر آ گیا۔ گویا دہلی کے دروازے پر دستک دینے ہی والا تھا۔ احمد ایاز تک یہ خبریں پہنچیں تو اس پر گھبراہٹ طاری ہوئی لیکن اب بھی اپنی منطق پر قائم تھا۔ اس نے آخری داؤ چلا۔ اس نے چند معتبر علما کو اپنا اپنی بنا کر فیروز شاہ کی خدمت میں بھیجا جو یہ پیغام لے کر آئے۔

”حکومت کا آج بھی سلطان محمد تغلق کے خاندان سے تعلق ہے کیونکہ اس کا چھ سالہ بیٹا تخت پر بیٹھا ہے۔ اگر آپ حکمرانی چھوڑ کر سلطنت، محمد تغلق کے ولی عہد کے ہاتھ میں دے دیں اور خود صرف نائب کی حیثیت سے فرائض انجام دیں تو

میں راہ سے ہٹ جانے کو تیار ہوں۔ میں تو صرف خاندان تغلق کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہا ہوں۔“

اس پیغام کو پڑھ کر فیروز شاہ سوچ میں پڑ گیا۔ جب احمد ایاز اس قدر اصرار کر رہا ہے تو کہیں اس پیغام میں سچائی تو نہیں؟ کیا واقعی تخت پر بیٹھنے والا سلطان محمد تغلق کا بیٹا تو نہیں؟ اگر ایسا ہے تو احمد ایاز نہیں میں گناہ گار بن رہا ہوں اور کسی کا حق مارنے کے لیے دہلی پر چڑھ دوڑنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ اس نے مزید تحقیق کے لیے تمام اراکین سلطنت کو جمع کیا اور ان سے پوچھا۔

”آپ لوگ ہمیشہ مرحوم بادشاہ کے قریب رہے ہیں۔ میں تو لاعلم ہوں، آپ لوگ مجھے بتائیں کہ بادشاہ نے اپنا کوئی بیٹا چھوڑا ہے؟“

تمام امراء نے یک زبان ہو کر نفی میں جواب دیا۔

”بادشاہ کا کوئی بیٹا نہیں۔ اگر ہوتا تو بادشاہ آپ کے نام کی وصیت نہ کرتا جبکہ وہ آپ سے خوش بھی نہیں تھا لیکن اس نے یہی سوچا ہوگا کہ بیٹا نہ سہی لیکن آپ کی صورت میں سلطنت خاندان میں تو رہے گی۔“

دلیل مضبوط تھی۔ فیروز شاہ مطمئن ہو گیا۔ ان کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے علما کو طلب کیا تا کہ ان سے شرع کی روشنی میں فیصلہ لے اور پوچھے کہ شرعی طور پر اب اسے کیا کرنا چاہیے جبکہ ایک فریق یعنی احمد ایاز دعویٰ کر رہا ہے اور دوسرا فریق (اراکین سلطنت) اس دعوے کو ماننے کو تیار نہیں۔

اس کی بلائی ہوئی مجلس میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، مولانا کمال الدین سمانہ اور مولانا شمس الدین جیسے مشہور علما و مشائخ موجود تھے۔

”آپ لوگ مجھے بتائیں ولی عہد کا مسئلہ کیسے طے ہو؟“ ان لوگوں نے بھی امراء کے بیانات سے اتفاق کیا البتہ مولانا کمال الدین نے جواب میں فرمایا، جس کے ہاتھوں کام کا آغاز ہوا وہی کام کو انجام دے تو بہت ٹھیک ہے۔

فیروز شاہ نے اس جواب کو اپنے حق میں فتویٰ قرار دیا اور مطمئن ہو گیا کہ اس نے جس کام کا آغاز کیا ہے، اسے انجام تک پہنچانے میں وہ حق بہ جانب ہے۔

فیروز شاہ نے احمد ایاز کے قاصدوں کو گرفتار کر لیا۔ وہ اس وقت ہانسی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے لشکر آراستہ کیا اور دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ دہلی تھا کتنے قدم پر، اس کے لشکر کی دھمک دہلی تک پہنچ رہی تھی۔

ابھی وہ راستے میں تھا کہ احمد ایاز کے اکثر امراء جو احمد

ایاز کے اعوان و انصار ہو گئے تھے اور جو اس کی صلاح بندی کے لیے اس سے روپیہ بھی وصول کر چکے تھے، اپنے سروں کو ننگا کر کے اور پگڑیاں گلوں میں لپیٹ کر سلطان کے سامنے حاضر ہو گئے۔ ان میں شیخ زادہ بسطامی، نھو سودھل، حمام ادھنگ وغیرہ جیسے نامور امراء شامل تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے دم سے احمد ایاز کی حکومت چل رہی تھی اور جن کے بل بوتے پر اس نے بغاوت کا دم بھرا تھا۔ ان کے جاتے ہی وہ لشکر بھی جو قصبہات کے گنواروں پر مشتمل تھا منتشر ہو گیا۔ اب احمد ایاز بالکل بی بے آسرا ہو گیا۔ حرم سرا کی عورتیں تک اس پر لعنت بھیج رہی تھیں۔ دہلی کے عوام جن کی زبانیں خوف کے مارے خاموش تھیں، اب بھرے بازار میں اسے گالیاں بکتے تھے۔ کسی کو کسی کا خوف نہیں تھا۔ احمد ایاز کے ذاتی ملازم بھی اس کا کوئی حکم ماننے کو تیار نہیں تھے۔

خبریں برابر پہنچ رہی تھیں کہ فیروز شاہ دہلی کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اسے روکنے کے لیے ایک سپاہی بھی موجود نہیں۔ اس نے گھبرا کر ملک حسین مرزا کو اپنے گناہوں کی معافی کے لیے فیروز شاہ کے پاس بھیجا۔

فیروز شاہ نے اس کی معافی کے لیے شرط رکھی کہ وہ خود حاضر ہو اور معافی طلب کرے۔

”مجھے معلوم ہے بڑھاپے نے اس کے دماغ میں فتور ڈال دیا تھا لیکن میں اسے یونہی نہیں چھوڑ سکتا۔ رعب شاہی کا تقاضا ہے کہ وہ میرے سامنے حاضر ہو اور معافی طلب کرے تاکہ آئندہ کسی کو یہ جرأت نہ ہو جو اس نے کی۔“

اس شرط کے بعد احمد ایاز کے لیے اب فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے اس شرط پر عمل کرنا پڑا۔ اس نے پگڑی گردن میں لپیٹی اور اپنے منڈے ہوئے سر کو ننگا کر کے دہلی کی سڑکوں سے گزرا اور درگاہ فیروز شاہ میں حاضر ہو گیا۔ اس کے ساتھ بھی فیروز شاہ کا نہایت دلچسپ مکالمہ ہوا۔

فیروز شاہ نے اس سے پوچھا: ”نمک حرام، تجھ سے یہ کیا حرکت سرزد ہوئی۔ نمک کا حق ادا نہ کیا اور اپنے ولی نعمتوں کو پیٹھ دکھائی۔“

احمد ایاز نے جواب دیا۔ ”جب تک میرا اقبال بلند تھا میں ولی نعمتوں کے مزاج کے مطابق کام کرتا رہا۔ میرا نصیب مجھ سے پھر گیا تھا کہ مجھ سے ایسی حرکت سرزد ہوئی کہ بدنامی کے سوا کچھ نہ ملا۔ اب میں معافی کا طلب گار ہوں۔“

”تو کیا سمجھتا ہے، تجھے اتنی جلدی معافی مل جائے گی؟“

”میں جانتا ہوں تو سلطان تغلق نہیں سلطان فیروز شاہ ہے۔ تو کسی کے آنسو نہیں دیکھ سکتا اور دیکھ میری آنکھوں میں

آنسو ہیں۔ میرا چہرہ گرد سے اٹا ہوا ہے۔“

فیروز شاہ نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف اتنا کیا کہ کوتوال کو طلب کر کے احکام دے دیے۔

”احمد ایاز کو کسی جگہ لے جا کر قید کر دیا جائے۔“

اس کے ایک ساتھی ملک غیاث الدین کو جلاوطن کر کے سرہند بھیج دیا اور شیخ زادہ بسطامی کو حکم ہوا کہ وہ ہندوستان سے نکل جائے۔

دہلی انہی کچھ فاصلے پر تھا کہ چشم فلک نے عجب نظارہ دیکھا۔ کسی حملہ آور کو روکنے کے لیے فوجیں شہر سے باہر آتی ہیں یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ یہاں عوام اس کے استقبال کے لیے دوڑے چلے آتے تھے۔ خواص و عوام، علماء و مشائخ، صوفی، قلندر، دکاندار، سوداگر، صراف اور برہمن شہر سے جوق در جوق درگاہ میں حاضر ہوتے اور شرف خاک بوسی حاصل کرتے اور سلطان کی مخصوص نوازشوں سے مستفید ہوتے تھے۔

فیروز شاہ کی انھیال ہندو تھی اس لیے دہلی تک پہنچ کر بھی اسے یہ کھٹکا لگا ہوا تھا کہ شاید اکابرین سلطنت اور عوام اسے قبول نہ کریں لیکن ہانسی سے یہاں تک جس طرح اس کا استقبال ہوا، اس سے اس کی ہمت بڑھ گئی۔

دارالحکومت میں داخل ہوتے ہی اسے کوٹھک ہمایوں لے جایا گیا اور وہ تخت جمشیدی پر جلوہ افروز ہوا۔ اسی وقت دربار منعقد کیا اور احکامات جاری کیے۔

سلطان کے دارالحکومت میں داخل ہونے کے پہلے ہی دن فتنہ ختم ہو گیا۔ انتشار، بیجنتی میں بدل گیا اور بغیر اس کے کہ کسی کا ہاتھ خون میں آلودہ ہو یا کوئی جماعت اور خاندان تباہ ہو، سزائیں اور خوں ریزی ہو، امن قائم ہو گیا۔

بغاوتیں فرو کرنے کے لیے بڑی بڑی سختیوں سے کام لیا جاتا ہے لیکن یہاں کسی کوشش کے بغیر تمام امور جہاں بانی خود بخود ٹھیک ہو گئے۔ خواص و عوام کے دل مطمئن ہو گئے۔

عام لوگ اپنے کاروبار میں لگ گئے۔

امور مملکت چلانے کے لیے اس نے نئے عہدے دار مقرر کیے۔ شیخ صدر الدین کو شیخ الاسلام کا خطاب دیا۔

ملک قبول کو خان جہاں کے خطاب سے سرفراز کر کے وزیر مملکت بنایا۔ اسی طرح دوسرے لوگ خطابات اور عہدوں سے سرفراز ہوئے۔

ابھی وہ ان کاموں سے فارغ ہوا تھا کہ اسے یہ خبر ملی کہ لکھنوتی کے حاکم حاجی الیاس نے احمد ایاز کی بغاوت اور مرکز کے کمزور ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس علاقے پر

الک دور تھا

فائدہ قبضہ کر لیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک علاقے ترہٹ پر بھی لشکر کشی کی ہے اور وہاں کے ذمیوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ اس علاقے کی دلاتیوں کو خراب کر رہا ہے بغاوت کے نشے میں لوٹ مار کر رہا ہے۔ مسلمان اور دیگر رعایا سب ایک مصیبت میں مبتلا ہیں۔

یہ تخت سنبھالنے کے بعد پہلا امتحان تھا جو اسے درپیش تھا۔ رعب شاہی قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس بغاوت کو پوری سختی کے ساتھ کچل دے۔ اس نے اراکین سلطنت کا اجلاس طلب کیا اور یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا۔

”سلطان محمد تغلق کا پورا عہد حکومت ایسی ہی بغاوتوں کی نذر ہو گیا۔ سلطان ایک بغاوت کو کچلتے تھے تو دوسری جگہ سے اطلاع آ جاتی تھی۔ یہ تسلسل ان کی موت کے بعد ہی ختم ہوا مگر اب لگتا ہے کہ حاسدوں نے مجھے ناکام کرنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ اس کی پہلی مثال لکھنوتی کے حاجی الیاس کی صورت میں نظر آئی ہے۔ اگر ہم نے اسے نظر انداز کر دیا تو ہندوستان بہت بڑا ہے، دوسروں کی ہمتیں بھی دراز ہوں گی لہذا ہم بہادروں کا ایک لشکر لے کر لکھنوتی جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میری غیر موجودگی میں میری نیابت کے فرائض خان جہاں انجام دیں گے۔“

اسے تخت پر بیٹھے ایک سال ہوا تھا کہ اس نے خان جہاں کو کلی اختیار دے کر شہر میں چھوڑا اور خود ایک بڑے لشکر کے ساتھ لکھنوتی کا ارادہ کیا تاکہ حاجی الیاس کے مظالم کو دفع کرے جس نے اپنا خطاب شمس الدین اختیار کر کے پٹنہ کو آباد کیا اور بنارس تک اپنا دخل کر لیا تھا۔

متواتر کوچ کرتا ہوا وہ خطہ اودھ میں پہنچا۔ ہندوستان کے وہ تمام رائے، رانا اور مقدم جو فیروز شاہ کی تخت نشینی سے پہلے باغی ہو گئے تھے، اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ خوشی اور رغبت سے لشکر سلطانی کے پیچھے پیچھے لکھنوتی کی جانب روانہ ہوئے۔

یہ سب فیروز شاہ کی لشکر گاہ میں شامل ہوئے تو ایک عظیم لشکر جہاز تیار ہو گیا۔ اس نے اس کثیر جمعیت کے ساتھ دریائے سر جو عبور کیا۔

حاجی الیاس بھنگ کے نشے کا عادی تھا۔ اس وقت بھی وہ بھنگ پی کر لیٹا ہوا تھا۔ اس وقت کسی کو اس کے پاس آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ دو خدمت گار اسے پکھا جھل رہے تھے اور وہ کسی بات پر بے تحاشا قہقہے لگا رہا تھا کہ باہر کسی کے جھگڑنے کی آواز آئی جو اس کے قہقہوں میں

دب گئی لیکن اس کے خدمت گار چونکا ہو گئے۔

حاجی الیاس کا وزیر خاص اندر آنا چاہتا تھا اور

پہرے دار اسے روک رہے تھے۔

”تم لوگ بہت سر پر چڑھ گئے ہو۔ میں وزیر ہوں اور تم مجھ ہی کو اندر جانے سے روک رہے ہو۔“

”ہمیں جو حکم ملا ہے تو اسی کے مطابق عمل کریں گے۔“

”بات اتنی اہم ہے کہ حاجی حضور کو مطلع کرنا بہت ضروری ہے۔“

”اطلاع بعد میں بھی دی جاسکتی ہے۔“

”اس مملکت کا خدا ہی حافظ ہے۔“ وزیر موصوف نے کہا اور واپس پلٹ گیا۔

وہ واپس ضرور چلا گیا تھا لیکن ایک اور ترکیب اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ سیدھا سرلا دیوی کے پاس پہنچا اور اسے پوری بات بتائی۔

”اب تمہارے سوا کوئی نہیں ہے جو مجھے حاجی حضور تک پہنچا سکے۔“

سرلا دیوی نے ایک بھر پور انگریزی لی۔ ”میرے سوا حاجی الیاس کسی کی سنتا ہی کہاں ہے۔ چلو میں چلتی ہوں۔“

رہ تیار کھڑا تھا۔ وہ سوار ہوئی۔ محل کے دروازے پر اتری اور سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر پہنچ گئی۔ پہرے داروں نے اسے دیکھتے ہی راستہ دے دیا اور ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

حاجی الیاس ایک کونے میں بیٹھا تھا اور اس کے خدمت گار اسے لطیفے سنا کر ہنسا رہے تھے۔ سرلا دیوی پر نظر پڑتے ہی اس کے قہقہوں میں اضافہ ہو گیا۔

”تم خوب وقت پر آئیں۔ تم نہ آتیں تو میں بلانے ہی والا تھا۔“ حاجی الیاس نے کہا اور پھر اس کی نظروں پر پڑی۔

”تم میرا نشہ خراب کرنے کہاں سے آ گئے؟“

”حاجی حضور! بات ہی ایسی ہے کہ مجھے آنا پڑا۔“

”جلدی سے بتاؤ کیا بات ہے اور چلے جاؤ یہاں سے۔“

”فیروز شاہ کی فوجیں ہماری طرف بڑھ رہی ہیں۔“

”بڑھنے دو۔ ابھی تو ہم سرلا دیوی کے ساتھ ہیں۔“

”وہ دریائے سرو (سرجو) پار کر چکا ہے۔“

”ابھی اسے آنے میں دیر ہے۔ جب آئے گا تو مقابلہ بھی کر لیں گے۔“

”ہمیں شاید زیادہ وقت نہ ملے۔ ہمیں تیزی کرنی چاہیے۔“

اب سرلا دیوی بھی خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے بھی

سامنے ملاحظہ کے لیے پیش کیے گئے۔ دیکھنے والے ان کوہ پیکر ہاتھیوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ سلطان کے قیل بان اور مہات ایک زبان ہو کر کہہ اٹھے کہ اس قدر عجیب و غریب ہاتھی جن میں سے ہر ایک لوہے کا پہاڑ اور پتیل کا قلعہ معلوم ہوتا ہے، کسی کے عہد میں اور کسی علاقے سے بھی دہلی میں نہیں لائے گئے۔ فیروز شاہ نے ملاحظہ کے بعد فرمایا۔

”الیاس لکھنوتی کو ان ہاتھیوں ہی نے مصیبت میں مبتلا کیا ہے اور اس کے دل میں بادشاہی کا خبط سوار ہوا ہے۔ ان ہاتھیوں کے بل بوتے پر ہی لشکر دہلی سے جنگ کرنے کا خیال آیا تھا۔ اب یہ ہاتھی اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ اب وہ بھی کوئی بے ہودہ حرکت نہیں کر سکے گا۔ اب ہر سال تحفے اور نذریں بھیجا کرے گا۔“

”سلطان مکرم، وہ ایسا غیرت مند نہیں۔ وہ پھر کوئی نہ کوئی حرکت کرے گا۔“

”کرے گا تو ہم اس کا سر کٹنے کے لیے موجود ہیں۔“ فیروز شاہ نے حکم صادر کیا کہ جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں انہیں سالار لشکر کے سپرد کر دیا جائے اور ان کوہ پیکر ہاتھیوں کو دہلی روانہ کر دیا جائے۔

اس فتح کے دوسرے روز فتح مند لشکر فیروز شاہ کے امراء درگاہ سلطانی میں حاضر ہوئے اور التماس کیا۔

”حضور! ہمیں اجازت دیں کہ ہم اکدالہ کو جی بھر کے لوٹیں اور اپنا انتقام پورا کریں اور الیاس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندیں۔“

امراء نہایت غصے میں تھے لیکن فیروز شاہ نے نرم دلی کا مظاہرہ کیا۔

”وہ گروہ جس نے بغاوت کی تھی اور فساد کی جڑ تھا، اس میں سے اکثر لوگ جنگ میں ہلاک ہو گئے اور وہ سب ہاتھی جو الیاس کی بغاوت اور سرکشی کا باعث ہوئے تھے، ہمارے قبضے میں آ گئے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے ہمیں فتح بخشی ہے۔ ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ بارشوں کا زمانہ نزدیک ہے۔ اب ہمیں چاہیے کہ ہم سلامتی کے ساتھ گھروں کو لوٹیں۔ میں یہ مہم ملتوی کرتا ہوں۔ آئندہ سال اس سرکشی کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا۔“

فتح مند لشکر نے دہلی کی طرف مراجعت کی اور متواتر کوچ کرتا ہوا ترہٹ اور جگت میں پہنچا۔ فوری حکم جاری کیا گیا کہ جن غلاموں کو بھی اقلیم بنگال میں اپنے بھنے میں لیا گیا ہے، ان میں سے ہر ایک کو اسی جگہ آزاد کر دیں۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ فتح مند لشکر نے نہایت اطمینان سے دریائے سرو جو کو

تدو بالا کر دیں۔ سلطانی لشکر نے دریا عبور تو کر لیا تھا لیکن اس خیال سے حملہ کرنے سے گریز کر رہا تھا کہ قصور تو حاجی الیاس کا ہے لیکن اس کی سزا عام مسلمانوں کو بھگتنا پڑے گی۔ اگر کسی طرح الیاس اکدالہ سے باہر آ جائے تو عام مسلمان خون ریزی سے بچ جائیں گے اور صرف الیاس سے مقابلہ ہوگا۔ اس کا انتظام بھی بہت جلد ہو گیا۔ فیروز شاہ نے گندگی اور غلاظت سے گھبرا کر لشکر گاہ بدلنے کا فیصلہ کیا اور دوسری جائے قیام کی تلاش میں نکلا۔ حاجی الیاس بھنگ کے نشے اور طاقت کے گھمنڈ میں یہ سمجھا کہ فیروز شاہ واپس جا رہا ہے۔ اس کے مقرب بھی اسی کی طرح تھے۔ انہوں نے بھی کوئی تحقیق نہیں کی اور الیاس اپنے سواروں اور پیادوں کے ہمراہ اکدالہ سے باہر آ گیا تا کہ واپس ہوتے ہوئے شاہی لشکر پر حملہ کر دے۔ ہاتھیوں کی صف جنگل میں لشکر کے سامنے کھڑی کر دی۔ لشکر اسلام کی نظر باغی لشکر پر پڑی تو فتح و نصرت سامنے نظر آنے لگی۔

حاجی الیاس کا لشکر جوش حماقت میں اتنے قریب آ گیا کہ چند تیروں کا فاصلہ درمیان میں رہ گیا۔ بادشاہ نے اپنے چند دستوں کو حکم دیا کہ ان بد نصیبوں پر حملہ کر دیں۔ اس دستے نے پہلے حملے میں لکھنوتی کے لشکر کو جس کے دماغ میں غرور بھرا ہوا تھا شکست دے دی۔ حاجی الیاس بھاگ کر قلعے میں واپس چلا گیا۔ اب تو منظر یہ تھا کہ الیاس کے وہ سوار اور پیادے جو پیچھے رہ گئے تھے، سب کے سب مارے گئے۔ چشم زدن میں قتل شدہ سپاہیوں کے ڈھیر لگ گئے۔

بنگال کے مشہور پیادے جو برسوں سے خود کو ابوبنگال اور مرد کھلواتے تھے اور الیاس کے سامنے جاں بازی کا عہد کیا کرتے تھے، اب تلواریں زمین پر پھینک کر پیشانیوں زمین پر ملتے تھے۔ ابھی دن کا ایک بھی نہیں بچا تھا کہ سارا میدان لاشوں سے بھر گیا۔

فتح مکمل ہوئی تو فیروز شاہ نے تلوار نیام کی اور بارگاہ دولت میں نزول فرمایا اور لشکر کو بھی حکم ہوا کہ اپنی اپنی قیام گاہوں میں واپس چلے جائیں۔

وہ غلام، امراء اور سربراہ درددہ لوگ جو پکڑ لیے گئے تھے، ان کے ہاتھ گردن میں ڈال کر پیچھے کی طرف باندھ دیے گئے اور اسی حالت میں انہیں سلطان فیروز کے سامنے لایا گیا۔

وہ چوالیس ہاتھی جو پکڑے گئے تھے، سلطان کے

علاقے سے لکھنوتی اور پنڈوہ کی جانب روانہ ہو گیا ہے اور لشکر عظیم اس کے ساتھ ہے تو اس نے مقابلے کا خیال ایک مرتبہ پھر دل سے نکال دیا۔ اسے اپنی مسوت صاف نظر آئی۔ لگی تھی۔ سر لادیوی اسے اب بھی جنگ پر آمادہ کر رہی تھی لیکن سر لادیوی بھی اسے قائل نہ کر سکی۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ سر لادیوی کی کسی بات کو ٹال رہا تھا۔

”بے وقوف! اتنے بڑے لشکر سے مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ محل وقوع ہمارے حسب حال ہو۔ ہم یہاں سے اکدالہ چلے جاتے ہیں۔ اس کے ایک طرف دریا ہے اور دوسری طرف جنگلات ہیں۔“

اس نے سر لادیوی کو سمجھایا بجھایا اور اپنے لشکر کو ”اکدالہ“ کی طرف ہانک دیا۔ اکدالہ، پنڈوہ کے قریب ایک موضع تھا۔ یہاں ایک قلعہ بھی تھا جہاں وہ پناہ لے سکتا تھا۔

اس کا لشکر اور وہ خود وہاں جا کر چھپ گیا۔ وہ تو صرف اس لیے خوش تھا کہ سر لادیوی کے ساتھ ہے اور یہاں خلوت کے بہت مواقع ہیں۔ بھنگ کی بڑی مقدار بھی اس کے ساتھ تھی۔

وہ مطمئن تھا لیکن اس کے پیادوں اور سواروں کے بدن، جان سے خالی ہونے لگے تھے۔ یہ سوچ کر ہی وہ بے جان ہوئے جا رہے تھے کہ فیروز شاہ کے لشکر کا مقابلہ کیسے کریں گے۔

سلطان کا لشکر کوچ کرتا ہوا ترہٹ پہنچ گیا۔ رائے ترہٹ اور... اس علاقے کے دوسرے رانا اور زمیندار درگاہ میں حاضر ہوئے۔ تحفہ جات پیش کیے اور نوازشات حاصل کیں۔

سلطان پنڈوہ کی طرف چل دیا۔ حاجی الیاس اس سے پہلے ہی ”اکدالہ“ جا چکا تھا۔ اکدالہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برسات نزدیک تھی اور یہ علاقہ نشیب میں تھا۔ بارشوں میں یہاں پانی بھر جاتا تھا۔ الیاس نے یہی سوچا کہ یہاں اس کثرت سے مجھ پر پیدا ہو جائیں گے کہ بادشاہ کے لشکر کے لیے وہاں قیام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے گھوڑے ان چھروں کے کانٹے کو برداشت نہ کر سکیں گے اور وہ واپس چلا جائے گا۔

سلطانی لشکر پنڈوہ پہنچا اور وہاں سے اکدالہ کے جنگل میں نزول کیا۔ جنگل عبور کیا اور دریا کے کنارے قیام کیا۔ اب مسئلہ دریا کے عبور کرنے کا تھا۔ فیروز شاہ کا حکم ہوا کہ دریا ایک ساتھ عبور کیا جائے۔ اگر تھوڑے تھوڑے آدمی دریا پار گئے تو حاجی الیاس کے آدمی ہمیں تلواروں پر رکھ لیں گے۔ ہم ایک ساتھ پہنچیں اور اکدالہ پر حملہ کر کے اس کو

خطرے کا احساس دلایا۔ حاجی الیاس اب بھی بچاؤ کے راستے تلاش کر رہا تھا۔

”ابھی تو اسے رائے گورکھپور کا مقابلہ کرنا ہے۔ ہمارا اس کا سامنا تو بعد میں ہوگا۔“

”کیا ہم اس کے لشکر کا مقابلہ کر سکیں گے؟“

”وہ ٹھیک ہے، لوٹ مار کر کے چلائے گا۔ فی الحال ہم یہ کرتے ہیں کہ ”ترہٹ“ کے قلعے میں چلے جاتے ہیں۔ ترہٹ کے ارد گرد گھنے جنگل ہیں۔ فیروز شاہ ان جنگلوں سے سرکرا کر واپس چلا جائے گا۔“

جب تک فیروز شاہ نے اس طرف کا قصد نہیں کیا تھا، وہ بھنگ کے نشے میں اس سے مقابلے کی شہنی مارا کرتا تھا۔ اب اس نے مقابلے کے بجائے ترہٹ جانے کا قصد کر لیا۔ اپنے علاقے اور عوام کو بے آسرا چھوڑ کر ترہٹ کی طرف چلا گیا۔ اس کا خیال اب بھی یہی تھا کہ وہ ترہٹ جا کر وہاں کے جنگلات میں چھپ جائے گا اور فیروز شاہ لوٹ مار کر کے واپس چلا جائے گا۔

سلطانی لشکر گورکھپور اور کھروسہ کے علاقے میں داخل ہوا۔ یہ دونوں رائے خراج ادا کیے کرتے تھے لیکن اب برسوں سے باغی ہو چکے تھے اور خراج ادا نہیں کر رہے تھے۔ سلطانی لشکر کی ہیبت نے انہیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ مقابلے کی تاب کہاں تھی۔ گورکھپور کا مقدم اڈے سنگھ حاضر ہوا۔ بے اندازہ تحفہ جات پیش کر کے درگاہ کی خاک بوسی سے مشرف ہوا۔ رائے گورکھپور نے اپنے تحفوں میں ہاتھی بھی نذر کیے۔ بادشاہ نے اس پر نوازش کی اور چتر، تاج زریں اور جڑاؤ قبا اور گھوڑے عطا کیے۔ چند اور مقدموں کو بھی جو اس کی ولایت میں بلند مرتبہ حاصل کر چکے تھے اور رانا ہو گئے تھے، اس کے ساتھ ہی تختیں پہنائی گئیں۔

رائے کھروسہ نے بھی اپنی ولایت کی حیثیت کے مطابق تحفے پیش کیے اور اپنے مقدموں کے ساتھ مراسم خسروانہ سے مشرف ہوا اور خلعت حاصل کی۔

اس طرح یہ تمام رائے خلوص کے ساتھ درگاہ سلطانی کے حلقہ بگوش اور اطاعت گزار بن گئے اور لاکھوں کی تعداد میں چاندی کے تنکے جو گزشتہ سالوں کے بقیات تھے، خزانے میں داخل ہو گئے اور ان لوگوں نے آئندہ سالوں خراج کی معینہ رقم ادا کرنا منظور کر لیا۔

اس کے بعد یہ رائے اپنے سوار اور پیادوں کے ساتھ لشکر سلطانی کے ہمراہ لکھنوتی اور پنڈوہ کی جانب روانہ ہوئے۔ جب الیاس کو خبر پہنچی کہ لشکر سلطانی ان راؤں کے



مرحبا
SINCE 1975
قدرت کی حکمت

پھول پھول کا رس
مرحبا شہد میں گیا بس

MARHABA
NATURAL PRODUCTS

f /Marhabalaboratoriespk | www.marhaba.com.pk | UAN: 111-152-152

اسے اپنی بربادی یاد آئی۔ اس کا آدھے سے زیادہ لشکر کٹ چکا تھا۔ کئی امراء فیروز شاہ کے ساتھ مل گئے تھے۔ اس نے سرلادیوی کا سراپنی آغوش میں رکھا اور نشے میں ڈولتی آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔

”سرلادیوی! سب مجھے چھوڑ گئے۔ تم میرے ساتھ چلو گی؟“

”میں تو آپ کے ساتھ ہی ہوں مگر چلنا کہاں ہے؟“
”اب تو بس ایک ہی راہ ہے۔ اکدالہ چل کر وہاں کے جنگلوں میں بسیرا کروں اور تم میرے ساتھ ہو۔“

”مہاراج! ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہو؟“
”دیکھو، اس عیش و عشرت کی زندگی چھوڑتے ہوئے تمہیں بھی دکھ ہو رہا ہے۔ تم میرے ساتھ جنگل میں جا کر کیوں رہنے لگی تھیں؟“

”مہاراج! یہ تم نے کیا کہہ دیا۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
”آپ میری گردن بھی کاٹ دیں تو میں اف نہ کروں، جنگل تو پھر بھلی جگہ ہے۔“

”پھر تجھے انکار کیوں ہے؟“
”میں تو آپ کو اس لیے روک رہی ہوں کہ یہ کوئی علاج نہیں۔ کیا فیروز شاہ آپ کو وہاں تلاش نہیں کر سکتا؟ اگر اس سے بچنا ہی ہے تو کوئی اور طریقہ اختیار کیجیے۔“
”وہ طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟“

”ایک طریقہ ہے۔ آپ اس کے نام صلح کا پیغام بھیجیں۔“
”تیرا مطلب ہے کہ جس طرح پہلے اس کا باج گزار بن کر رہ رہا تھا، اسی طرح رہوں؟“

”کچھ دیر کے لیے ایسا ہی کرنا ہوگا۔ رائے گورکھپور کو دیکھو کس طرح اس نے اپنے قصور معاف کرا لیے۔“
”میں رائے گورکھپور نہیں ہوں۔“

”اگر فیروز شاہ کی سرپرستی آپ کو مل جائے گی تو رائے گورکھپور اور ارد گرد کے رانا آپ کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکیں گے ورنہ فیروز شاہ تو بعد میں آئے گا، یہ رانا آپ کو جینے نہیں دیں گے۔“

”میں پھر بھی فیروز شاہ سے صلح نہیں کروں گا۔“
”آپ یہی جانتے ہیں نا کہ لکھنوتی آپ کا ہواور مرکز سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو؟“

”ہاں!“

”پھر آپ ایک کام کیجیے۔ دکھاوے کے لیے فیروز شاہ سے صلح کر لیجیے اور اپنی مدد کے لیے ”مغلوں“ کو خط لکھیے۔ جس طرح محمد تغلق نے اپنی مدد کے لیے مغلوں کو بلایا

عبور کیا اور ظفر آباد میں داخل ہوا۔ فیروز شاہ نے یہاں دربار منعقد کیا۔ اس دربار میں اس نے ان راؤں اور مقدموں کا شکریہ ادا کیا جو اس کے ساتھ لکھنوتی اور پنڈوہ کی مہم پر گئے تھے اور انہیں اپنے علاقوں میں واپسی کی اجازت دے دی۔

اب سلطان کے ساتھ صرف وہ لشکر رہ گیا تھا جو وہ دہلی سے لے کر چلا تھا۔ اس لشکر نے کڑھ مانک پور کی حدود میں دریائے گنگا کو عبور کیا اور کڑھ مانک پور کے معارف و اکابر کو مراحم سلطانی سے نوازا۔ بہت سے لوگوں کو مراتب اور لشکر عطا کیے اور وہاں کے سادات، علماء، مشائخ اور دوسرے لوگوں کی درخواستیں منظور کی گئیں اور ان علاقوں کے فقرا و مساکین کو کثرت سے صدقات دیے۔

لشکر نے یہاں سے بھی کوچ کیا اور متواتر کوچ کرتا ہوا ”کول“ پہنچا اور اس علاقے کے قصبات کے فقراء و مساکین کو صدقات عطا کیے۔

لشکر سلطانی اپنی پوری کامیابی اور فتح مندی کے ساتھ مملکت کے دارالحکومت میں داخل ہوا۔ وہ ہاتھی اور گھوڑے جو لکھنوتی اور پنڈوہ کی فتح کے بعد شاہی کارخانوں میں داخل کیے گئے تھے ان سب کو دارالحکومت کے شارع عام میں لایا گیا اور شہر کے تماشا کی جن میں خواص و عوام، سیاہی، سوداگر سب شامل تھے لکھنوتی سے لایا ہوا مال غنیمت دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ عجیب جشن کا سماں تھا۔ ہر جگہ ضیافتیں ہو رہی تھیں اور گانے گائے جا رہے تھے۔ ہر کوچے میں ناچ گانے کی محفلیں منعقد ہو رہی تھیں۔

حکم شاہی ہوا کہ شہر کے عام باشندوں پر نوازش خسروانہ کے تحت چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی تھیلیاں جامع مسجدوں اور بڑی بڑی درگاہوں پر لے جانی جائیں اور دارالحکومت کے مستحق لوگوں میں تقسیم کی جائیں۔

فیروز شاہ کی ہیبت کے ڈنکے بجے تو حاجی الیاس کا پتا پانی ہو گیا۔ وہ اکدالہ میں کسی قیدی جیسی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ وہاں سے نکلا اور اپنے دارالحکومت پنڈوہ پہنچ گیا لیکن خطرے کی تلواریں اب بھی لٹک رہی تھیں۔ اسے اپنے جاسوسوں کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ خطرہ ابھی ٹل ضرور گیا ہے لیکن ختم نہیں ہوا۔ فیروز شاہ اگلی برسات میں لکھنوتی پھر آئے گا اور فیصلہ کن معرکہ برپا کرے گا۔

سرلادیوی اس کی منہ چڑھی تھی۔ جتنے مشورے کرتا تھا اسی سے کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔ جنگ کا پیالہ اس کے پاس رکھا تھا۔ نشہ جب ذرا گہرا ہوا تو

تھا، آپ بھی بلائیے۔ مغلوں کے آنے تک فیروز شاہ کو تحفے تحائف میں الجھائے رکھیے تاکہ اسے یہ احساس تک نہ ہو کہ آپ اس کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں۔ مغلوں کے آنے کے بعد فیصلہ کن جنگ کیجیے۔“

”مغل میری مدد کیوں آنے لگے؟“
”وہ تمہارے لیے نہیں اپنے لیے آئیں گے۔“
”کیا مطلب؟“

”کیا آپ کو یاد نہیں، جب فیروز شاہ سیوستان سے دہلی کی طرف آ رہا تھا تو مغلوں سے مدد بھیڑ ہوئی تھی۔ فیروز شاہ کے لشکر نے ہزاروں مغلوں کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ ملک التون بہادر اس نقصان کو بھولا نہیں ہوگا۔ اگر اسے یاد دلایا جائے اور دہلی میں لوٹ مار کا لالچ دیا جائے تو وہ ایک مرتبہ پھر دہلی کو سیوستان سمجھ لے گا۔“

جس دن یہ باتیں ہو رہی تھیں، اسی دن نوروز گرگین لکھنوتی پہنچا اور حاجی الیاس سے ملاقات کی۔ یہ وہی نوروز گرگین تھا جس نے فیروز شاہ سے بغاوت کی تھی اور محمد تغلق کی وفات کے بعد جب شاہی لشکر پریشان تھا، اس نے مغلوں سے ساز باز کر کے انہیں شاہی لشکر لوٹنے پر آمادہ کیا تھا۔ نوروز گرگین، مغلوں کی شکست کے بعد نہ تو مغلوں کے ساتھ جاسکتا تھا، نہ فیروز شاہ کے پاس آسکتا تھا۔ اس لوٹ مار میں کچھ دولت اس کے ہاتھ لگ گئی تھی، اسے لے کر اپنے اہل خانہ کے ساتھ بنارس آ گیا تھا۔ اس کے اندر کا شیطان جاگ اٹھا۔ اس نے حاجی الیاس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

”میں اس لیے تمہارے پاس نہیں آیا ہوں کہ دوسروں کی طرح تمہیں مایوس کروں۔ میں تو یہ بتانے آیا ہوں کہ آپ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر فیروز شاہ سے اپنا بدلہ لے سکتے ہیں۔“

”میں چاہتا تو یہی ہوں لیکن مجھ میں اب اتنی طاقت کہاں۔“
”فیروز شاہ اب اس طرف کا رخ کرے گا تو اگلی برسات کے بعد ہی کرے گا۔ اس دوران آپ اپنی طاقت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔“

”میرے خزانے میں تو اب اتنا بھی نہیں کہ کوئی بڑا لشکر جمع کر سکوں۔“

”آپ فیروز شاہ کے دشمنوں کو اپنا دوست بنا لیں۔ دکن میں حسن گنگوہی طاقتور حکمران ہے۔ اتنا طاقتور کہ محمد تغلق جیسا بادشاہ اس سے مقابلے کی جرأت نہیں کر سکا تھا۔ مغل بھی اب تک سیوستان کی خون ریزی نہیں بھولے ہوں گے۔ انہیں ہندوستان پر حملے کے لیے اکسایا جاسکتا ہے۔“

”میری ایک کنیز ہے سرلا دیوی۔ اس نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا کہ میں مغلوں سے مدد مانگوں لیکن میرے پاس کوئی ایسا آدمی نہیں جو ان چنگیز خانی مغلوں تک میری سفارش پہنچا سکے۔“

”یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ بس آپ کی رضامندی کی ضرورت ہے۔ آپ مجھے کچھ سرمایہ فراہم کر دیں تاکہ میں التون بہادر سے جا کر طوں اور میرے گھر والوں کے لیے سر چھپانے کا ٹھکانا فراہم کر دیں۔“

نوروز گرگین کی نیت میں اب بھی فتور تھا۔ اس نے حاجی الیاس کی دی ہوئی رقم کا کچھ حصہ اپنے اہل خانہ کے پاس چھوڑا، باقی رقم اپنی جیب میں رکھی اور انہیں سب کچھ سمجھا دیا۔

وہ لکھنوتی سے روانہ ہوا اور ہندوستان چھوڑ کر مغلوں کے پاس جانے کے بجائے دہلی کی راہ پکڑی۔ کام خطرناک تھا لیکن اسے اپنی چرب زبانی پر یقین تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ بھاری سامان ساتھ نہ تھا لہذا تیز رفتاری سے چلتا رہا۔ دہلی سے چند میل پہلے ٹھہر کر اس نے اپنا حلیہ تبدیل کیا۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ ایک تاجر نظر آ رہا تھا۔ وہ دہلی میں داخل ہو گیا۔ اس کے لیے نہ شہر دہلی نیا تھا، نہ اراکین سلطنت۔ وہ خان جہاں کے محل نما مکان کے سامنے کھڑا تھا اور باریابی کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ وہ عجیب شش و پنج میں مبتلا تھا۔ اگر اپنا بیچ نام بتاتا ہے تو ممکن ہے پھرے دار اسے یہیں دھر لیں۔ فرضی نام بتاتا ہے تو خان جہاں اسے کیوں اندر بلاتا۔

”اپنے مالک سے کہنا ایک شخص لکھنوتی سے آیا ہے اور آپ کے لیے خاص پیغام لایا ہے۔“

تیرنشانے پر لگا۔ خان جہاں لکھنوتی کے نام پر چونک اٹھا اور نوروز گرگین کو فوراً اندر بلا لیا۔ پہلی نظر میں اس کی وضع قطع دیکھ کر خان جہاں بھی اسے نہ پہچان سکا تھا لیکن جب نوروز گرگین نے اپنا نام بتایا اور خان جہاں نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔ خان جہاں چونکہ سیوستان میں بادشاہ کے ساتھ نہیں تھا اس لیے زیادہ نہیں جانتا تھا کہ نوروز نے وہاں کیا غداری کی تھی۔ اسے تو صرف یہ معلوم تھا کہ نوروز مغلوں کے پاس چلا گیا ہے۔ اب جو اسے سامنے دیکھا تو حیران رہ گیا۔

”نوروز! تم ہندوستان کب آئے؟“

”میں تو ہندوستان ہی میں تھا۔ یہ پوچھو دہلی کب کیوں آیا؟“

”ہمیں تو یہی معلوم ہوا تھا کہ تم نے شاہی لشکر سے

الٹ دور تھا

غداری کی اور مغلوں کے ساتھ مل گئے۔“

”سلطان کی وفات کے بعد لشکر والوں کی جان و مال کی ضمانت نہیں رہ گئی تھی اس لیے میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ لشکر سے نکل گیا تھا۔ اس سے آپ لوگوں نے یہ تاثر لیا ہوگا کہ میں مغلوں کے ساتھ مل گیا۔“

”جب ایسا نہیں تھا تو سلطان سے دہلی آ کر ملے کیوں نہیں؟ اتنا عرصہ کہاں گزرا؟“

”مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ فیروز شاہ سے آ کر ملتا۔ جس کا ساتھ مصیبت میں چھوڑ دیا، راحت میں کیا اس کے سامنے آتا۔ بنارس چلا گیا۔ وہیں منہ چھپائے پڑا رہا۔“

”اب کیوں چلے آئے؟“

”حاجی الیاس نے بنارس پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ مجھے اس کی رعیت میں رہنا گوارا نہیں تھا، کیا کرتا رہا تھا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ فیروز شاہ سے اس کی جنگ ہوئی اور اسے شکست ہوئی۔ دکھ مجھے یہ ہوا کہ فیروز شاہ اسے زندہ چھوڑ کر واپس آ گیا۔ میں اسے پھر فیروز شاہ کے مقابل لانا چاہتا تھا۔ بس یہی جذبہ مجھے اس کے پاس لے گیا۔ یہ جان کر کہ میں فیروز شاہ سے باغی ہو گیا ہوں، اس نے میری خوب آؤ بھگت کی۔ خان جہاں! اب میری بات غور سے سننا۔ میں نے حاجی الیاس کو یہ پٹی پڑھائی ہے کہ وہ دکھاوے کے لیے فیروز شاہ سے صلح کر لے۔ اس عرصے میں، میں اس کے لیے مغلوں سے مدد طلب کروں گا۔ جب مغل آجائیں گے تو تم دہلی پر چڑھ دوڑنا۔ میں اس سے یہی کہہ کر آیا ہوں کہ مغلوں سے بات کرنے کے لیے ہندوستان سے باہر جا رہا ہوں اور یہاں چلا آیا ہوں۔“

”مغل نہ آئے تو وہ اپنی کچھار سے نکلے گا کیسے؟“

”میں اتنا کچا نہیں ہوں۔ مجھے کیا کرنا ہے یہ بھی سوچ رکھا ہے۔ سلطان فیروز شاہ مجھے جب حکم دیں گے، میں حاجی الیاس سے کہوں گا کہ لکھنوتی سے نکلے۔ دہلی کے نزدیک دریا جتنا کے کنارے مغل موجود ہوں گے۔ ان کے ساتھ مل کر دہلی پر چڑھ دوڑنا۔“

”وہ اتنا بڑا قدم اٹھانے کو تیار ہو جائے گا؟“

”اس سے کوئی بات منوانے کے لیے ایک پیالہ بھنگ کافی ہوتا ہے۔“

خان جہاں نوروز کی چرب زبانی سے واقف بھی تھا اور اب اس کا مظاہرہ بھی دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے مصاحبوں میں ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ امور مملکت چلانے کے لیے صرف ملاحت کی نہیں سازشوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

نوروز کا دماغ اس معاملے میں بہت زرخیز تھا۔ خان جہاں نے سوچا اگر اس وقت نوروز پر احسان کر دیا جائے تو وہ زندگی بھر اس کا مطیع رہے گا بلکہ ہاتھوں میں کھیلتا رہے گا۔

”اب مرحلہ یہ ہے کہ تمہاری معافی کا اختیار نہ صرف سلطان مکرّم کو ہے۔ میں نے تو تمہاری باتوں کا یقین کر لیا، سلطان کو یقین کیسے دلایا جائے؟“

”اسی لیے تو میں کسی اور کے پاس نہیں گیا، سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”مجھے بھی بہت محنت کرنا پڑے گی۔ آپ کا قصور معمولی نہیں۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ مغلوں کو لوٹ مار کے لیے آپ ہی نے بھڑکایا تھا۔“

”غلط، بالکل غلط۔“

”یہ تو آپ کہہ رہے ہیں۔ بادشاہ کو یقین کیسے دلایا جائے؟“
”اس کے لیے میں سلطان کے پاس چلنے کو حاضر ہوں۔ انہیں یہ یقین میں دلاؤں گا۔“

”ابھی نہیں۔ پہلے میں ان کا دل صاف کر دوں تاکہ آپ کے لیے راہ ہموار ہو۔“

خان جہاں نے فیروز شاہ کے سامنے نوروز گرگین کا ذکر کیا اور یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ فیروز شاہ نے کسی خاص غصے کا اظہار نہیں کیا صرف اتنا کہا۔

”وہ وقت ہی ایسا تھا کہ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ ہم نے خود حجاز مقدس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا البتہ نوروز سے اتنی شکایت ضرور ہے کہ اس نے حق تک ادا کرنے میں دیر کی۔ ہماری تخت نشینی کے بعد بھی وہ حاضر نہ ہوا کہ ہم اس سے کوئی کام لیتے۔“

”وہ شرمندہ تھا بلکہ سنا تو یہی گیا ہے کہ اس نے مغلوں کو لشکر شاہی لوٹنے کا مشورہ دیا تھا۔“

”اس بارے میں وہ کیا کہتا ہے؟“

”وہ تو ظاہر ہے، انکار ہی کرے گا۔“

”اس کا انکار بھی درست ہے۔ انو اہوں کی کوئی حقیقت نہیں۔“

”وہ آپ سے ملاقات کا خواہاں ہے تاکہ معافی طلب کرے۔“

”اس سے کہو، وہ بے کھٹک ہم سے مل سکتا ہے۔“

خان جہاں نے اس ملاقات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور یہ ظاہر کیا جیسے اس نے فیروز شاہ کا غصہ کم کرنے میں خون پسینا ایک کر دیا ہو۔

”میں نے عتاب شاہی کو کم کرنے کے لیے ہر حربہ

استعمال کیا تب جا کر سلطان کا غصہ ٹھنڈا ہوا ہے۔“

”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

خان جہاں نے ملاقات کا اہتمام کر دیا۔ نوروز نے اس گستاخی پر معافی طلب کر لی کہ وہ لشکر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ فیروز شاہ نے جہاں اتنے لوگوں کو معاف کیا تھا، اسے بھی معاف کر دیا اور اسے خلعت و انعام دے کر رخصت کیا۔

نوروز بادشاہ کے علم میں بھی یہ بات لے آیا تھا کہ حاجی الیاس دکھاوے کے لیے صلح کے لیے ہاتھ بڑھائے گا اور تحائف روانہ کرے گا لیکن درپردہ وہ آپ کے خلاف مغلوں سے ساز باز کر رہا ہے۔

ابھی اس واقعے کو چند روز گزرے تھے کہ نوروز نے اپنے گھروالوں کو اپنے پاس بلا لیا کیونکہ اب اسے فیروز شاہ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا اور حاجی الیاس پر بھروسہ نہیں تھا۔

حاجی الیاس نے لکھنوتی کے چند سربراہ آوردہ لوگوں کے ہاتھ پیش قیمت تحائف اور ہدیے روانہ کئے اور صلح کی درخواست کی۔ بادشاہ نے ان تحفوں کو بہت خوشی سے منظور کیا اور اس کے عوض حاجی الیاس کو ترکی اور تازہ گھوڑے نیز ریشمی کپڑے روانہ کیے۔

نوروز کی بات سچ ثابت ہو گئی۔ فیروز شاہ کو بھی یقین آ گیا کہ نوروز نے ٹھیک کہا تھا۔ تحفے قبول اس لیے کر لیے کہ حاجی الیاس کو بھی یقین آ جائے کہ سلطان فیروز اس کے دام میں آ گیا ہے۔

اب انتظار اس کا تھا کہ نوروز کب مغلوں کی آمد کا جھانسا دے کر حاجی الیاس کو لکھنوتی سے باہر نکالتا ہے لیکن اس کا وقت ہی نہیں آیا۔ بادشاہ کے بھیجے ہوئے تحائف ابھی بہار ہی میں تھے کہ حاجی الیاس کے انتقال کی خبر آ گئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی جگہ اس کا بیٹا سکندر تخت نشین ہوا ہے جسے لکھنوتی کا حاکم مان لیا گیا ہے۔ بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ حاجی الیاس کو بھیجے گئے گھوڑے بہاری فوج کو دے دیے جائیں اور قیمتی تحائف شاہی دربار میں واپس کر دیے جائیں۔ یہ حکم دینے کے بعد بادشاہ شکار کے لیے دیباپور چلا گیا۔ مغل بھی شاید تاک میں لگے ہوئے تھے۔ بادشاہ ابھی شکار گاہ میں تھا کہ اسے خبر ملی کہ مغلوں کا ایک گروہ دیباپور کے نزدیک آ گیا ہے۔ بادشاہ نے ملک قبول کو سرزنش کے لیے روانہ کیا۔ ملک قبول ابھی منزل مقصود تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ مغل لوٹ مار کر کے فرار ہو گئے۔

یہ واقعہ معمولی تھا لیکن فیروز شاہ غور کرنے پر مجبور

ہو گیا۔ اس کا دھیان نوروز گرگین کی طرف گیا۔ نوروز نے اسے بتایا تھا کہ وہ حاجی الیاس سے یہ وعدہ کر کے آیا ہے کہ وہ بادشاہ فیروز شاہ سے دکھاوے کی صلح کر لے۔ اس دوران وہ مغلوں کو اس کی مدد کے لیے لے آئے گا۔ بادشاہ سوچ تو یہی رہا تھا کہ نوروز نے الیاس کو فریب دینے کے لیے یہ منصوبہ بنایا تھا لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے مغلوں کو واقعی بلا لیا ہو اور یہ تک بتا دیا ہو کہ وہ شکار کے لیے دیباپور جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی نوروز اسے قصور وار نظر آنے لگا۔ نوروز واقعی دہری چال چل رہا ہے۔

بادشاہ نے کسی پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ شکار گاہ سے واپس آنے کے بعد اس نے نوروز کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے۔

خان جہاں کو یہ گوارا نہیں تھا کہ نوروز جیسا کام کا آدمی قید ہو جائے۔ وہ موقع کی تلاش میں رہا۔

فیروز شاہ ایک سال پہلے لکھنوتی کی مہم ادھوری چھوڑ کر واپس آ گیا تھا کہ اگلی برسات کے بعد وہ پھر لکھنوتی آئے گا۔ درمیان میں حاجی الیاس نے صلح کا پیغام بھیج دیا تھا لیکن اب معاملہ وہیں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ حاجی الیاس مرچکا تھا اور اس کا بیٹا سکندر خاں اس کا جانشین ہو گیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ کی صلح پر قائم رہے۔ فیروز شاہ کو اپنی ادھوری مہم مکمل کرنی تھی۔ اس نے خان جہاں کو اپنا نائب بنا کر دہلی میں چھوڑا اور خود لکھنوتی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی خان جہاں نے نوروز کو قید خانے سے نکال کر اپنے پاس بلا لیا۔

”نوروز! تم مجھے سچ بتاؤ..... مغلوں کو دیباپور بلانے میں تمہارا ہاتھ تو نہیں؟“

”آپ نے خود دیکھا ہے کہ جب سے میں لکھنوتی سے آیا ہوں، ایک دن کے لیے بھی دہلی سے باہر نہیں گیا پھر میں کیسے مغلوں کو بلا سکتا ہوں؟“

”لکھنوتی سے آنے سے پہلے تم ہندوستان سے باہر گئے ہو۔“

”ایسا بھی نہیں ہے۔ میں سیدھا دہلی آیا تھا اور آپ سے ملا تھا۔“

”تمہیں معلوم ہے، حاجی الیاس کا انتقال ہو گیا ہے؟“

”مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں۔ اگر اس کا انتقال ہو چکا ہے تو یہ میرے حق میں دلیل ہے۔ اس کے انتقال کے بعد مغلوں کو بلانے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟“

”سلطان یہی سمجھتا ہے۔“

الک دور تھا

”افسوس کہ سلطان کا دل میری طرف سے صاف نہیں۔“

”سلطان کے ایک طرف فیصلوں سے میں بھی عاجز ہوں لیکن میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔“

”آپ اکیلے نہیں، میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔“

”میں آپ کے احسانات بھولا نہیں ہوں۔“

”اگر میں ایک احسان اور کر دوں؟“

”اگر آپ مجھ پر احسان نہ بھی فرمائیں تو بھی میں آپ کا مطیع رہوں گا۔“

”سلطان کی واپسی تک تم بظاہر قیدی ہو لیکن اپنے گھر میں رہو گے۔ سلطان کے واپس آنے کے بعد میں تمہاری صفائی پیش کروں گا اور تمہیں آزاد کر دوں گا۔“

”میں تو اس دن کے انتظار میں ہوں جب آپ مجھ سے کوئی کام لیں۔“

”وہ وقت بھی آئے گا۔ فی الحال تو تم اپنے بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں رہو۔“

فیروز شاہ دہلی سے نکلنے کے بعد ظفر آباد پہنچا تھا کہ برسات کا موسم شروع ہو گیا اور بارشیں بھی ایسی شدید ہوئیں کہ شاید ہی بھی ہوئی ہوں۔ اسے مجبوراً یہاں ٹھہرنا پڑا۔

بادشاہ نے اس موسم برسات کا فائدہ اٹھایا اور ایک پیغامبر چند ایلچیوں کے ہمراہ سکندر کے پاس بھیجا۔

یہ وفد پانچ ہاتھی اور دیگر تحائف لے کر واپس آیا لیکن یہ بھی بتا دیا کہ سکندر خاں خراج دینے کو تیار نہیں بلکہ خود مختار حاکم رہنے کا خواہاں ہے۔ تحفے تحائف بھیجنے کی بات اور ہے لیکن خراج ادا کرنے اور مرکز کا مطیع رہنے پر تیار نہیں۔

فیروز شاہ اس جواب سے قطعی متاثر نہ ہوا۔ اس نے برسات ختم ہونے کا انتظار کیا اور برسات ختم ہوتے ہی لکھنوتی کی طرف روانہ ہو گیا۔ سکندر خاں بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلا اور اکردالہ پہنچ کر قلعے میں روپوش ہو گیا۔

بادشاہ بھی حسب سابق اکردالہ پہنچا اور قلعے کو گھیر لیا۔

پرانی یاد تازہ ہو گئی۔ حاجی الیاس کا بھی اس نے اسی طرح گھیراؤ کیا تھا۔ پھر حاجی الیاس کسی غلط فہمی کے نتیجے میں قلعے سے باہر نکل آیا تھا اور نہایت خون ریز جنگ ہوئی تھی لیکن سکندر خاں نے ایسا نہیں کیا۔ جب محاصرے کو کئی روز گزر گئے اور شاہی لشکر میں واپسی کے آثار نظر نہ آئے تو اس نے اڑتالیس ہاتھی اور دیگر تحائف فیروز شاہ کی خدمت میں بھیجے اور صلح چاہی۔

”جب تک سکندر خاں خود ہمارے حضور پیش ہو کر صلح

تو قیری نہیں تھی بلکہ منشا یہ تھا کہ آپ سے تحریری صلح کی جائے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں کاتب کو بلوا کر شرائط تحریر کرادوں؟“

”مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہوگی۔“

سکندر خاں کی موجودگی میں صلح نامہ تحریر ہوا جس کے مطابق لکھنؤ کی آمدنی کا ایک مخصوص حصہ ہر سال بادشاہ کے حوالے کرنا مقرر ہوا۔ سکندر خاں نے ہمیشہ مطیع رہنے کا عہد کر کے دستخط کر دیے۔

بادشاہ نے اکدالہ سے جونپور کی طرف کوچ کیا۔ برسات شروع ہو گئی تھی۔ اس نے برسات کا پورا موسم یہیں گزارا۔ برسات کے بعد وہ بنارس تک گیا۔ راجہ مہاراجہ اور حاکم اس کی اطاعت کا دم بھرتے رہے۔ اس کے قدموں میں بیش قیمت تحفوں کے ڈھیر لگ گئے۔

بنارس سے واپسی میں اس کا گزر ایک مقام پدماونی سے ہوا۔ یہ جنگل خاص ہاتھیوں کے رہنے کا تھا۔ فیروز شاہ کو ہاتھیوں کے شکار کا خاص شغف تھا۔ اس جنگل کی بابت سن کر اس نے یہاں پڑاؤ ڈال دیا اور جنگل میں داخل ہو گیا۔ یہاں اس نے دو ہاتھیوں کو جان سے مار ڈالا اور تین تیش ہاتھیوں کو زندہ پکڑ لیا۔

لگا تار تین سال کی اس مہم جوئی کے بعد فیروز شاہ دارالسلطنت دہلی میں داخل ہوا۔ بادشاہ کے آجانے کے بعد فیروز گریں کو اپنی فکر ہوئی۔ خان جہاں نے اسے اس خیال سے دوبارہ قید خانے میں بھیج دیا کہ اگر بادشاہ کو اس کا خیال آ گیا اور وہ اسے دیکھنے پہنچ گیا تو سارا بھید کھل جائے گا۔ اس کام سے نمٹنے کے بعد وہ بادشاہ سے ملاقات کے لیے گیا اور تین سال میں اپنی کارگزاریوں سے بادشاہ کو آگاہ کیا اور موقع دیکھ کر فیروز گریں کا ذکر بھی چھیڑ دیا۔

”فیروز گریں بے چارہ ابھی تک قید میں ہے۔ اس کے لیے کیا حکم ہے؟“

”ہماری مصروفیات نے یہ موقع ہی نہیں دیا کہ ہم اس کے متعلق کچھ سوچتے۔ ہمیں از خود تحقیق کرنی چاہیے تھی۔“

”یہ خاکسار پوری تحقیق کر چکا۔ فیروز بے قصور نظر آتا ہے۔ اس نے حاجی الیاس کو فریب دینے اور اسے لکھنؤ سے یہاں تک لانے کے لیے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ مغلوں کو اس کی مدد کے لیے بلائے گا لیکن وہ یہاں چلا آیا تھا۔ وہ آپ کا وفادار ہے۔ دیباپور میں مغلوں کے حملے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔“

”اب نہ حاجی الیاس رہا، نہ سکندر خاں سے کوئی

خطرہ ہے تو فیروز گریں کو رہائی دے دو۔“

”حضور کے حکم کا منتظر ہوں۔“

”ہماری طرف سے تحریری حکم نامہ جاری ہو جائے گا۔“

فیروز گریں کو رہا کر دیا گیا۔ وہ اپنے گھر چلا گیا۔

اب اسے چھپ کر رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بادشاہ سے ملاقات کے لیے بھی گیا۔ اس کے عہدے اور مراعات میں اضافہ کر دیا گیا۔

فیروز کی بادشاہ سے قربتیں بڑھنے لگی تھیں۔ یہ بات خان جہاں کے لیے تشویش کا باعث بن رہی تھی۔ فیروز شاہ کی غیر موجودگی میں اس نے تین سال حکومت کی تھی۔ اسے اب بادشاہ کی موجودگی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے فیروز سے پہلی مرتبہ کوئی کام لینے کی کوشش کی۔

”فیروز! میں تم پر احسان نہیں جتا رہا ہوں لیکن میری مہربانیاں تمہیں یاد تو ہوں گی؟“

”میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ آپ خدمت کا کوئی موقع دیں۔“

”فیروز! یہ دور محمد تغلق کے دور سے بہت مختلف ہے۔ اس کے دور میں کوئی نہ کوئی بغاوت ہمیشہ ہوتی رہتی تھی اور تغلق ان بغاوتوں میں الجھا رہتا تھا۔ ان بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے اسے کہیں نہ کہیں جانا پڑتا تھا۔ فیروز شاہ ایسا خوش قسمت ہے کہ لکھنؤ کے سوا اسے کہیں بغاوت کا سامنا نہیں۔ میں چاہتا ہوں وہ زیادہ سے زیادہ دارالسلطنت سے باہر رہے۔ اس کی غیر موجودگی میں ہر امیر میرا غلام بنا رہتا ہے۔ اس کے آتے ہی سب آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔“

”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”تم اسے کسی مہم میں ایسا الجھا دو کہ وہ دہلی سے باہر چلا جائے پھر میں اس کا نائب اور وہ میرا نائب ہوگا۔“

”مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیں۔ میں کوئی ترکیب نکالتا ہوں۔“

فیروز کے زرخیز دماغ نے کئی ترکیبیں سوچیں اور پھر ایک کہانی سوچ کر خود انجام تک پہنچ گیا۔ وہ جب لکھنؤ سے دہلی کی طرف آ رہا تھا تو اس نے ایک ندی کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سنی تھیں۔ اس ندی کا مصروف بھی اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اگر بادشاہ کو اس کام پر لگا دیا جائے؟ اس خیال کے آتے ہی وہ ایک دن موقع دیکھ کر بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔ گفتگو کے دوران اس نے اس ندی کا ذکر چھیڑ دیا۔

الک حور تھا

”پدرو کے پاس ایک پہاڑ ہے جس سے پانی نکل کر دریائے ستلج میں گرتا ہے۔ دریائے سرستی کے کنارے ایک ندی بہتی ہے جسے ”اسلیہ ندی“ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ دریائے سرستی اور اسلیہ ندی کے درمیان ایک بڑا ٹیلا حاصل ہے۔ اگر یہ ٹیلا کھود ڈالا جائے تو اس ندی کا پانی سرستی میں گرے گا اور اس ندی کا سیلاب سرہند اور منصور پور کو سیراب کرتا ہوا سامنے تک پہنچ سکتا ہے۔ اس سے فصلوں کی سیرابی کا اندازہ لگائیے۔ لگان میں کتنی رقم خزانے میں آئے گی۔“

فیروز شاہ اپنے انتظامی امور میں اس بات کا خاص خیال رکھ رہا تھا کہ ملک میں نہروں کا جال بچھا دیا جائے۔ تپتے ریگستان اور اجڑا صحرا آباد ہو جائیں۔ پانی کی قلت سے بڑی تعداد میں جانور ہلاک ہو جاتے ہیں، ان کی زندگی کا سامان بھی ہو جائے اور فصلیں بھی اچھی ہوں۔ بنجر زمینوں کو پانی فراہم ہو۔ فیروز گریں کی زبانی اس پہاڑ کا علم ہوا تو وہ ”پدرو“ کی طرف چل پڑا۔ یہاں پہنچ کر اس نے حکم دیا کہ پچاس ہزار بیلدار جمع کیے جائیں جو اس درمیانی ٹیلے کو کھود کر ندی اور دریا کو باہم ملا دیں۔

حکم ملنے کی دیر بھی کہ کام شروع ہو گیا۔ کھدائی کے دوران آدمیوں اور ہاتھیوں کی ہڈیاں ملیں۔ عجیب بات یہ دیکھنے کو ملی کہ آدمیوں کے ہاتھ کی ہڈیاں تین گز لمبی تھیں۔ ان میں سے بعض تو پتھر کی ہو گئی تھیں اور بعض ہڈیاں اپنی اصلی صورت میں تھیں۔

ان ہڈیوں کی لمبائی دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ یہ کتنی قدیم ہیں۔ اتنی لمبائی کے آدمی تو لاکھوں سال پہلے ہی ہو سکتے تھے۔

بادشاہ نے سامنے کی حدود سے سرہند کو جدا کر لیا اور سرہند کے رقبے میں دس کوس زمین اور ملا دی اور ملک تمس الدین اور ضیا الدین کے ہاتھ میں وہاں کی عنان حکومت دے دی۔

سرہند میں اس نے ایک قلعہ بنوایا اور اس کا نام فیروز پور رکھا۔ پھر خود نگر کوٹ کی طرف چلا۔ فیروز گریں کو اس نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ اس موقع پر فیروز دارالسلطنت میں رہنا چاہتا تھا لیکن انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جب بادشاہ نگر کوٹ پہاڑ کی وادی میں پہنچا تو لوگ اس کی خاطر مدارات کے لیے برف لے کر حملہ ضر ہوئے۔ یہ دیکھ کر اسے اپنے آقا محمد تغلق کی یاد آ گئی۔ اس نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے فیروز گریں کو مخاطب کیا۔

”ایک وقت وہ تھا جب محمد تغلق کا اس طرف سے گزر

ہوا تو لوگ اس کے لیے برف کا شربت بنا کر لائے تو چونکہ میں موجود نہ تھا اس لیے سلطان نے اس شربت کو نہیں پیا تھا۔ اب تم ایسا کرو کہ لشکر کے ساتھ جتنی شکر ہاتھیوں اور اونٹوں پر لدی آئی ہے، اس کا شربت بنایا جائے اور اس کو برف میں ٹھنڈا کیا جائے پھر محمد تغلق کی یادگار کے طور پر ساری سپاہ کو یہ شربت پلایا جائے۔“

فیروز گریں نے ساقی گری کی اور پوری سپاہ میں شربت تقسیم کیا گیا۔

بادشاہ کے حکم سے نگر کوٹ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ راجا کو معلوم ہوا تو اسے اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ فیروز شاہ کے مقابلے پر آتا البتہ اتنی ہمت کی کہ اپنے درباریوں کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں آیا۔ بادشاہ نے بھی اس کے اظہار اطاعت کی قدر کرتے ہوئے رحم و کرم کی بارش کر دی۔

”نگر کوٹ“ کا نام محمد تغلق کی یادگار کے طور پر محمد آباد رکھ دیا گیا۔

اس نے نگر کوٹ کے مقام پر خاصا عرصہ گزارا۔ اپنے اس قیام میں اسے معلوم ہوا کہ نگر کوٹ کے بڑے بت خانے میں ایک ہزار تین سو قدیم کتابیں موجود ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں۔ وہاں کے پنڈت اور ہر ہنر مند کسی کو ان کتابوں کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے۔ فیروز شاہ نے چاہا کہ ان کتابوں تک پہنچے اور ان کے تراجم کرائے۔ اس نے راجا کو اپنے پاس بلوایا اور اس کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ سلطان کی بات سننے ہی راجا کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے فیروز شاہ نے اس کی گردن اتارنے کا حکم دے دیا ہو۔

”سلطان مہاراج! مجھے اتنے بڑے امتحان میں مت ڈالیں۔ یہ خزانہ میرا نہیں برہمنوں کا ہے اور وہ کسی بھی طرح ایک مسلمان کو وہاں تک جانے نہیں دیں گے۔“

”تم کیسے راجا ہو کہ تمہارا حکم بھی نہیں چلتا؟“

”معاذ دھرم کا ہے۔ اس سے بڑا فساد پھیل جائے گا۔“

”میری تلوار ہر فساد کو کچل دے گی۔“

”آپ کو کسی کے دھرم پر تلوار چلانے کا حق نہیں۔“

”آپ اس سے دور رہیں۔“

”علم و حکمت کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ جس طرح سمندر کی لہروں پر کسی کا حق نہیں ہوتا، اسی طرح کتابوں پر کسی ایک قوم کا حق نہیں۔ یہ سب کی ہیں۔ اس سے سب فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“

”یہ بات میری سمجھ میں تو آ سکتی ہے لیکن مندر کے

پجاری اسے نہیں سمجھیں گے۔ وہ اپنی جان دے دیں گے مگر ان کتابوں تک کسی کو نہیں پہنچنے دیں گے۔“

”میں وہ کتابیں مانگ نہیں رہا ہوں بلکہ ان میں سے کچھ کے تراجم کر کے اصل کتابوں کو مندر ہی میں رکھوا دوں گا۔“

”آپ نے مجھ پر رحم کیا اور مجھے راجا برقرار رہنے دیا لیکن آپ کے اس فعل سے میری پر جائے راجا نہیں رہنے دے گی۔“

”آپ برہمن عالموں کو میرے حضور پیش کیجیے۔ میں خود ان سے بات کروں گا۔“

”میں آپ کی خاطر یہ بھی کر دیکھوں گا مگر فائدہ کچھ نہیں۔“

راجا نے چند برہمن فاضلوں کو اس کے پاس بھیجا۔ اس نے ان پنڈتوں سے ان کتابوں کی قدامت اور ان کے موضوعات کی بابت دریافت کیا۔ ان پنڈتوں نے یہاں تک تو معلومات فراہم کر دیں لیکن جب سلطان نے اپنا منشا ظاہر کیا تو خاموشی کے سوا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ جب سلطان نے بہت اصرار کیا تو ان میں سے ایک نے نہایت گستاخ آمیز اور دلیرانہ جواب دیا۔

”تم بادشاہ ہو گے تو اپنی جگہ ہو گے لیکن ہم یہ کبھی نہیں دیکھ سکتے کہ تم ہمارے دھرم کو پلید کرو۔“

یہ سنتے ہی فیروز شاہ کا منہ سرخ ہو گیا لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔

”میں تمہارے مذہب میں دخل دیتا تو سب سے پہلے بت خانے کو سمار کرتا اور بتوں کو پاش پاش کر دیتا لیکن مجھے تو ان کتابوں سے سروکار ہے جو بند پڑی ہیں اور کسی کے کام نہیں آرہی ہیں۔“

”یہی ہمارے مذہب میں دخل دینے کی جسارت ہے۔ یہ کتابیں ہماری پوتر زبان میں ہیں۔ ہم کبھی نہیں چاہیں گے کہ ان کا ترجمہ مسلمانوں کی زبان فارسی میں کیا جائے۔“

”میں زبردستی بھی کر سکتا ہوں۔“

”تم پھر بھی ان کتابوں تک نہ پہنچ سکو گے۔“

”اب میں تمہاری بکواس زیادہ دیر تک نہیں سن سکتا۔ تم لوگ جاسکتے ہو۔“

وہ سب کے سب باہر نکلے اور فیروز شاہ کو تنہا چھوڑ گئے۔ ان کے جانے کے بعد نوروز گرکین اندر آیا۔ پھر کئی اور امراء بھی آگئے اور یہ طے ہوا کہ فی الوقت کتابوں کے مسئلے کو نہ چھیڑا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی بغاوت اٹھ کھڑی ہو۔

امراء اپنے اپنے خیموں میں جا چکے تھے۔ رات

ہو گئی تھی۔ فیروز شاہ نے سرہانے رکھی شمع گل کی اور نیکے پر سر رکھ دیا۔

ایک شخص نہایت خاموشی سے خیمے کے ایک حصے سے نکلا اور دبے پاؤں بادشاہ کے بستر تک پہنچ گیا۔ کمر سے تلوار نکھینچی۔ ہاتھ بلند ہوا لیکن رعب شاہی ایسا طاری ہوا کہ ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ آواز پھر بھی نہ ہوتی لیکن تلوار شیشے کی میز پر گر گئی۔ ایک چھنا کا ہوا جس میں شیشہ ٹوٹنے کی آواز بھی شامل تھی۔ بادشاہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے زور سے للکارا۔ ”کون ہے۔“ وہ شخص باہر کی طرف بھاگا لیکن کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی باہر کھڑے ہوئے محافظ اندر آگئے اور اس شخص کو دبوچ لیا۔ اتنی دیر میں فیروز شاہ سرہانے رکھی شمع کو روشن کر چکا تھا۔

محافظوں نے اسے سلطان کے سامنے پیش کر دیا۔

”کیا تو وہی نہیں ہے جو برہمنوں کے وفد کے ساتھ آیا تھا؟“

”ہاں میں وہی ہوں۔“

”تو اس وقت یہاں کیسے؟ کیا تجھے باہر کھڑے پھرے داروں نے نہیں روکا؟“

”سلطان مہاراج! اس میں ان محافظوں کا کوئی تصور نہیں۔ انہیں سزا نہ دیجیے گا۔ میں وفد کے ساتھ آیا تھا اور جب وفد یہاں سے روانہ ہوا تو میں یہیں چھپ گیا تھا۔“

”تیری نیت کیا تھی؟“

”سلطان مہاراج! میں آپ کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن آپ کی موت میرے ہاتھ سے نہیں لکھی گئی تھی۔ میرے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور اس کی آواز سے آپ کی آنکھ کھل گئی۔“

”تو مجھے کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ مندر میں رکھی کتابیں آپ تک پہنچیں۔“

”کیا تجھے یہ ڈر نہیں تھا کہ اگر تو پکڑا گیا تو تیرا سر اڑا دیا جائے گا۔“

”اپنا دھرم بچانے کے لیے یہ سزا معمولی ہے۔“

”تو کیا سمجھتا ہے، اب تیرا کیا حشر ہوگا؟“

”میں نے آپ سے کہہ دیا کہ جو سزا ہوگی معمولی ہوگی۔“

”ہم تیرے جذبے کی تعریف کرتے ہیں۔ اب ہم تجھے سزا بھی نہیں دیں گے اور مندر کی کتابوں کو بھی ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ تو خود کو آزاد سمجھ اور یہاں سے چلا جا۔“

دوسرے دن وہ شخص پھر آیا۔ اس کے کندھے پر

الک حور تھا

ایک بڑی گھڑی رکھی ہوئی تھی۔ وہ شاہی محافظوں سے سلطان فیروز شاہ تک پہنچنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی۔ محافظوں نے اسے پہچان لیا اور اندر جا کر فیروز شاہ کو اس کی بابت بتایا۔ فیروز شاہ کو بھی تعجب ہوا تھا کہ وہ شخص آج پھر کیوں آگیا جبکہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا تھا۔ اس نے اجازت دے دی۔

وہ شخص اندر آیا اور وہ گھڑی فیروز شاہ کے سامنے رکھ دی پھر اس گھڑی کو کھولا۔ اس میں کچھ کتابیں تھیں۔

”مہاراج! آپ نے جو مجھ پر مہربانی کی اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ میں اس احسان کا بدلہ اسی طرح چکا سکتا ہوں۔ یہ کچھ کتابیں ہیں جو آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ مندر میں بھی نہیں جاسکیں گے اور اگر جاسکیں گے تو بہت سی انسانی جانیں ضائع ہو جائیں گی۔ آپ یہ کتابیں لے لیں اور میری اس گستاخی کو معاف کر دیں کہ میں نے آپ پر حملہ کیا تھا۔“

”ہم تیری اس مہربانی کی قدر کرتے ہیں۔ ہم تجھے انعام و اکرام سے نوازیں گے۔“

”مجھ سے آپ کی محبت میں وہ پاپ سرزد ہوا ہے، میرے اس گناہ کو گنی ماں ہی پوتر کر سکتی ہے۔ میں انعام لے کر کیا کروں گا۔ مجھے اجازت دیجیے۔ ابھی مجھے دوسرے جنم کی تیاری بھی کرنی ہے۔“

بادشاہ اس اشارے کو سمجھ نہ سکا اور اسے جانے دیا۔ ابھی اسے گئے ہوئے چند گھنٹے ہی گزرے تھے۔ اطلاع یہ آئی کہ مندر کے اس حصے میں آگ لگ گئی جہاں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک برہمن جو اس وقت وہاں موجود تھا، کتابوں کے ساتھ جل کر خاکستر ہو گیا۔

یہ وہی شخص تھا جو بادشاہ کو چند نادر کتابیں دے کر گیا تھا۔ سلطان کی سمجھ میں اب آیا کہ اس شخص نے یہ کیوں کہا تھا کہ میرے گناہ کو گنی ماں ہی پوتر کر سکتی ہے۔ مجھے اجازت دیجیے ابھی مجھے دوسرے جنم کی تیاری بھی کرنی ہے۔

فیروز شاہ نے اپنے درباری شاعر اعز الدین خالد ثانی کو دہلی سے طلب کیا اور یہ کتابیں اس کے حوالے کر دیں کہ ان میں سے جو کتابیں لائق ترجمہ ہوں، ان کا ترجمہ کرایا جائے۔

عہد فیروز شاہی میں ان میں سے کچھ کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔

اعز الدین نے حکمت طبعی، شگون اور فال کی کتاب کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور اپنی اس تالیف کو ”دلائل فیروز

شاہی“ کا نام دیا۔

جب ٹکڑ کوٹ پر فیروز شاہ کے قدم اچھی طرح جم گئے تو اس نے سندھ کو فتح کرنے کی نیت سے ٹھٹھہ کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا۔

وہ ٹھٹھہ جانے سے پہلے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں پہنچ کر اس نے امراء کا اجلاس طلب کیا اور ان کے سامنے اپنا یہ ارادہ پیش کیا۔ خان جہاں اور دوسرے امراء نے اس کی مخالفت کی اور عرض کیا۔

”جام ٹھٹھہ کی صرف یہ خطا تھی کہ اس نے طغی نمک حرام کو پناہ دی تھی۔ اب جبکہ طغی کا قصہ پاک ہو چکا اور جام ٹھٹھہ حضور کا مطیع و فرمانبردار ہے تو ان حالات میں ٹھٹھہ پر فوج کشی کی ضرورت نہیں۔“

فیروز شاہ تغلق نے جواب دیا۔

”سلطان محمد تغلق میرا بھائی اور مربی تھا۔ وہ اپنی وفات سے پہلے جام کو سزا دینے کا پکا ارادہ کر چکا تھا لہذا میں کون ہوتا ہوں اسے معاف کرنے والا۔ اب جبکہ خدائے تعالیٰ نے مجھے اس کا جانشین بنایا ہے، اس کا انتقام لینا میرا فرض ہے۔“

امراء نے اس کا اصرار دیکھا تو وہ بھی خاموش ہو گئے۔ فیروز شاہ نے ایک مرتبہ پھر خان جہاں کو اپنا نائب بنا کر دہلی میں چھوڑا اور نوے ہزار سوار اور چار سو ہاتھی لے کر ٹھٹھہ کی طرف روانہ ہوا۔

ٹھٹھہ کی آبادی اس وقت دریائے سندھ کے دونوں جانب آباد تھی۔ ایک جانب جام آکر کا بھائی اور دوسری جانب جام آکر کے بھائی کا بیٹا جام بایینہ حکمران تھا۔

سلطان فیروز نے ٹھٹھہ کا محاصرہ کیا۔ جام بایینہ نے بھی فیروز شاہ کے حملے کی خبر سن کر ایک لشکر تیار کر لیا تھا اور مورچے تیار کر لیے تھے لہذا سلطان کے پہنچنے ہی جنگ شروع ہو گئی لیکن جلد ہی حالات کے تیور دیکھ کر قلعہ بند ہو گیا۔ تھوڑے عرصے تک تو سلطان نے قلعے کو گھیرے رکھا لیکن پھر فیروز شاہ کے لشکر میں قحط اور جانوروں کی بیماری پھیل گئی۔ غلے کی گرانی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ گرانی اس قدر بڑھ گئی کہ سارے لشکر میں مایوسی پھیل گئی۔ ادھر جانوروں کی بیماری سے تقریباً تین چوتھائی گھوڑے مر گئے۔ جام بایینہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا پھر اور ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ فیروز شاہ بھی جیسے تیسے مقابلہ کرتا رہا لیکن حالات صاف بتا رہے تھے کہ اس وقت ٹھٹھہ کو فتح کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس نے اپنے فوجی سرداروں سے مشورہ کرتے ہوئے کہا۔

”حالات اس درجہ خلاف ہیں کہ ہماری فتح ناممکن ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ اس وقت ہم گجرات کا رخ کریں اور آئندہ سال دوبارہ حملہ کریں۔“

تمام لوگوں نے اس سے اتفاق کیا۔

”جہاں پناہ کی رائے صائب ہے۔ گجرات میں ہماری فوج کو غلبہ اچھی طرح مل سکے گا اور فوج بھی آرام کر کے تازہ دم ہو جائے گی۔ ہماری واپسی سے مطمئن ہو کر اہل ٹھٹھہ مطمئن ہو کر غلے کی کاشت کی طرف زیادہ توجہ کریں گے۔ ہم عین ربیع کے موسم میں جبکہ غلہ کھیتوں میں کھلیاں ہوگا، ٹھٹھہ پر حملہ کریں گے اور ان لوگوں کے غلے پر بھی بہ آسانی قبضہ کر لیں گے۔“

فیروز شاہ کو یہ رائے پسند آئی اور لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا اور خان اعظم ظفر خاں کو اپنا قائم مقام بنا کر ٹھٹھہ کے اطراف میں چھوڑا۔

فیروز شاہ جب سندھ سے گجرات کی طرف جا رہا تھا تو قحط اور بھی بڑھ گیا۔ لشکر میں غلہ تقریباً ناپید ہو گیا۔ گھوڑوں کی وبائی بیماری بھی اور زیادہ ہو گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ غلہ نہ ملنے کی وجہ سے اہل لشکر مردار گوشت اور کچا چمڑا کھانے لگے۔ بڑے بڑے فوجی سردار گھوڑوں کے مرجانے کی وجہ سے پیدل چلنے پر مجبور ہو گئے۔

قحط اور وبا کی مصیبت کیا تم بھی، مزید ستم یہ ہوا کہ جن سندھی راہبروں کو ساتھ لیا تھا انہوں نے دھوکا دے کر سارے لشکر کو غلط راستے پر ڈال دیا اور ایک ایسے جنگل میں پہنچا دیا جہاں کا پانی اس قدر کھرا تھا کہ اگر اس کا قطرہ بھی زبان پر رکھا جاتا تو زبان ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی۔ سلطان فیروز نے ان میں سے ایک کو بلا کر قتل کر دیا پھر اس نے باقی لوگوں کو بلا کر پوچھا، تم نے ایسا کیوں کیا؟ سچ بتاؤ ورنہ تم سب کو قتل کر دوں گا۔ انہوں نے خوفزدہ ہو کر سچ اگل دیا۔

”ہم اتفاق سے یہاں نہیں آ گئے ہیں بلکہ ہم نے واقعی آپ کو دھوکا دیا ہے اور اب آپ اور آپ کا لشکر ایک ایسے مقام پر آ گیا ہے جہاں سے زندہ سلامت بچ کر نکلنا محال ہے۔ اس مقام سے دریا قریب ہے۔ پانی میں کھارا پن اسی دریا کی وجہ سے ہے۔“

”کیا تمہیں یہ خوف نہیں کہ تم بھی اس مقام (جنگل) پر مر جاؤ گے؟“

”ہمیں اپنی سلامتی اپنے وطن کی سلامتی سے زیادہ عزیز نہیں۔“

”اگر ایسا ہے تو ہم سے پہلے تم مرنے کے لیے تیار

ہو جاؤ۔“ فیروز شاہ نے تلوار کھینچ لی۔ اس دھمکی کے بعد وہ سب ڈر گئے اور جنگل سے نکالنے کا وعدہ کر لیا۔

”اس جنگل کو عبور کرنے کے بعد اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ ہمیں باہر نکلنے کا راستہ معلوم ہے۔ ہماری جان بخشی کرو تو۔۔۔ ہم آپ کے لشکر کو اس جنگل سے نکال دیں گے۔“

فیروز شاہ نے لشکر میں منادی کرا دی کہ جس قدر شیریں پانی ہے اسے احتیاط سے استعمال کرو اور جنگل عبور ہونے تک کوئی یہاں کا پانی نہ پیئے۔

پیاسے لشکر نے جیسے جیسے یہ جنگل عبور کیا۔ اس کے بعد یہ سب ایسے ہیبت ناک جنگل میں پہنچے جہاں میلوں کوئی پرندہ نظر نہ آتا تھا اور دردور تک اس جنگل میں درختوں پر ایک پتا تک نہ تھا، گھاس تو بڑی بات ہے۔

چھ ماہ ہو گئے تھے کہ لشکر اور فیروز شاہ کی کوئی خبر دہلی نہیں پہنچی تھی لہذا یہ خبر مشہور ہو گئی کہ فیروز شاہ اپنے لشکر کے ساتھ کہیں غائب ہو گیا ہے۔ بہر حال طرح طرح کی مصیبتیں اٹھانے کے بعد یہ لشکر گجرات پہنچا۔

گجرات پہنچتے ہی اس نے گورنر گجرات نظام الملک سے سخت باز پرس کی اور اسے معزول کر دیا۔

”اگر تم گجرات سے غلہ بھیجتے رہتے تو یہ نوبت نہ آتی۔“ اب وہ گجرات میں تھا۔ دہلی میں اس کی سلامتی کی خبر پہنچ چکی تھی۔

بادشاہ نے فیروز گرگین کو دہلی روانہ کر دیا۔ اس حکم کے ساتھ کہ وہ دہلی جا کر خان جہاں کو تمام حالات سے واقف کرے اور امور سلطنت میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ فیروز تو چاہتا ہی تھا۔ وہ خوشی خوشی دہلی کی طرف چل دیا۔

فیروز شاہ گجرات میں رہ کر ٹھٹھہ پر دوبارہ حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب تیاری مکمل ہو گئی تو اس نے اپنے نائب خان جہاں کو لکھا۔

”میں بری اور بحری فوج کے ساتھ دوبارہ ٹھٹھہ پر حملہ آور ہو رہا ہوں۔ تم کو چاہیے کہ تم میری مدد کے لیے سندھ کے محاذ پر زیادہ سے زیادہ فوج اور سامان جنگ بھیجو۔“

نظام الملک حاکم گجرات کو وہ معزول کر چکا تھا۔ اس نے ظفر خاں کو حاکم گجرات مقرر کیا اور خود ایک لشکر کے ساتھ ٹھٹھہ کی مہم پر روانہ ہوا۔

سلطانی لشکر پہلے حملے کے دوران ٹھٹھہ کی مہم کے مصائب دیکھ چکا تھا اس لیے اکثر سپاہی لشکر کو چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو بھاگنا شروع ہو گئے۔ سلطان کو جب معلوم

الک حور تھا

ہوا تو اس نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ سرداروں نے مشورہ دیا کہ لشکر کے چاروں طرف چوکی پہرے قائم کر دینا چاہئیں تاکہ کوئی بھاگ نہ سکے۔

فیروز شاہ کو یہ مشورہ پسند نہ آیا۔

”میری رائے میں تمہارا یہ خیال درست نہیں۔ قیدیوں کی طرح سپاہیوں کو ساتھ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر ٹھٹھہ کی فتح خدا کی مرضی نہیں تو ہم مجبور ہیں۔ اگر ایک سپاہی بھی میرے ساتھ رہ گیا تو میں ضرور جاؤں گا۔“

لشکر رواں دواں تھا کہ اس وقت کے شیخ الاسلام فیروز شاہ کے پاس حاضر ہوئے اور دست بستہ عرض کی۔

”جہاں پناہ! پہلی مرتبہ جب آپ ٹھٹھہ کی مہم پر روانہ ہوئے تو راستے میں آپ نے اجودھن میں حضرت فرید گنج شکرؒ کی زیارت کی اور ملتان کے دوسرے بزرگوں خصوصاً شیخ بہا الدین زکریا ملتانی کی زیارت بھی کرنی چاہیے تھی۔ اس مرتبہ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ نذر مانیں کہ اگر ٹھٹھہ کی فتح نصیب ہوئی تو آپ ملتان حاضر ہو کر بزرگوں کی زیارت کر کے دہلی چلیں گے۔“

فیروز شاہ نے شیخ الاسلام کی بات مان کر نذر مان لی۔ اس نیت کے ساتھ وہ لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے موسم میں ٹھٹھہ کے قریب پہنچا۔ ٹھٹھہ کے کسان اس کی پہلی ناکامی سے مطمئن ہو کر زراعت و کاشت میں مصروف تھے۔ انہوں نے ہر موضع اور قصبے میں خوب کاشت کی تھی۔

اہل سندھ کو جب معلوم ہوا کہ اس مرتبہ سلطان بڑی فوجی تیاریوں کے ساتھ سندھ آ رہا ہے تو انہوں نے اس کا راستہ روکنے کے لیے سندھ کے پل اور گھاٹ توڑ دیے اور قلعہ بند ہو گئے۔

کھیتیاں پک چکی تھیں۔ فصل کٹنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ سلطان نے یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور معرکہ ہوا اور چار ہزار سندھی گرفتار ہوئے۔

سلطان نے ٹھٹھہ کے قریب خیمہ زن ہو کر لوگوں کو زراعت کے کاٹنے اور غلہ فراہم کرنے کا حکم دیا اور عماد الملک کو دہلی روانہ کر کے خان جہاں کو پیغام بھیجا کہ جتنی بھی فوج ممکن ہو روانہ کرو۔

خان جہاں ان دنوں ہر کام نو روز گرگین کے مشورے سے کر رہا تھا۔ اس نے گرگین سے پوچھا کہ اس پیغام کے جواب میں کیا کیا جائے۔ خان جہاں کا فیصلہ تھا کہ فوج نہ روانہ کی جائے لیکن نو روز نے اس کی مخالفت کی۔

”اگر فوج نہ روانہ کی گئی تو ممکن ہے فیروز شاہ مہم

ادھوری چھوڑ کر واپس آ جائے۔ ہمارا مفاد تو اس میں ہے کہ بادشاہ زیادہ سے زیادہ دہلی سے باہر رہے۔ اگر وہ واپس آ گیا تو آپ سے باز پرس بھی کرے گا اور ہمارے سر پر آ کر بیٹھ جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ پیغام کوئی قاصد لایا ہوتا تو ہم اس سے کوئی بہانہ کر سکتے تھے لیکن عماد الملک خود آئے ہیں۔ ہم انہیں بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ بہتری اسی میں ہے کہ ہم فوج بھیج دیں اور انتظار کریں۔ اس بہانے سے آپ خزانے سے ایک بڑی رقم بھی نکلا سکتے ہیں جو آپ کے پاس محفوظ بھی رہے گی۔“

اس مشورے کے نتیجے میں عماد الملک نے بدایوں، قنوج، سندیلہ، اودھ، جوینپور، بہار وغیرہ سے فوجیں جمع کیں اور ان فوجوں کو لے کر دہلی سے ٹھٹھہ واپس ہو گیا۔

سلطان کے لشکریوں نے کھیتوں پر قبضہ کر لیا تھا جس کی وجہ سے ٹھٹھہ میں قحط پڑ گیا اور دہلی سے مزید فوج کے آ جانے سے سندھی اور بھی پریشان ہوئے۔

جام بایینہ صرف بہادر ہی نہیں عقل مند بھی تھا۔ اگر عقل مند نہ ہوتا تو اپنی فوج کو آگ میں جھونک دیتا لیکن اس کی عقل مندی نے اس کا ساتھ دیا اور اس نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ اب شکست سامنے ہے۔ جنگ کی صورت میں جو بربادی ہوئی وہ صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے صلح کا راستہ تلاش کیا۔ کئی معزز افراد کو فیروز شاہ کے پاس بھیجا لیکن فیروز شاہ کی شرائط اتنی کڑی تھیں کہ صلح کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ جنگ کا پارا نہیں تھا۔ قلعہ بند ہو کر بیٹھا نہیں جاسکتا تھا کیونکہ غلے کی کمی ہونے لگی تھی۔ پھر ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں چمکا۔ ایک ہی شخصیت تھی جو اس وقت اس کے کام آ سکتی تھی۔ ایک نام تھا جو اسے یاد آ رہا تھا۔ یہ نام تھا حضرت سید جلال الدین بخاری جہاں گشت کا تھلہ سلطان محمد تغلق نے حضرت جہانیاں جہاں گشت کو شیخ الاسلام بنا کر یہ خدمت ان کے سپرد کی تھی لیکن آپ اس عہدے کو چھوڑ کر حج کے لیے روانہ ہو گئے تھے اور اب ملتان کے قریب ضلع ”آج“ میں مقیم تھے۔

جام بایینہ نے سید جلال الدین بخاری کی خدمت میں بہ مقام ”آج“ آ دی بھیجا اور درخواست کی کہ اگر آپ تشریف لا کر صلح کرادیں تو ہزاروں انسان خون ریزی سے بچ جائیں گے۔ حضرت نے وعدہ کر لیا۔

آج سے چلے اور سلطانی لشکر میں پہنچ گئے۔ جب آپ لشکر میں آئے تو لشکر کا ہر آدمی آپ کی قدم بوسی کو اپنی سعادت سمجھتا تھا۔ خود سلطان فیروز شاہ نے آپ کا

استقبال کیا اور خیمہ شاہی میں لایا۔
”حضرت! میرا آقا ٹھٹھہ کی فتح کے خواب دیکھتے دیکھتے گور میں جا بسا۔ اب میں اس کا خواب پورا کرنے کے لیے میدان میں نکلا ہوں تو میری کامیابی میں بھی ہزار مشکلیں پیش آرہی ہیں۔ آپ دعا فرمائیں کہ ٹھٹھہ میرے ہاتھوں فتح ہو جائے۔“
”آپ کیا سمجھتے ہیں... میں نے دعا نہیں کی ہوگی۔“
”پھر کیا رکاوٹ ہے کہ آپ کی دعا بھی مقبول نہیں ہوئی۔“

اس سوال پر حضرت مخدوم نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔
”ٹھٹھہ میں ایک صالحہ اور پارسا عورت تھی۔ اس کی برکت کی وجہ سے ٹھٹھہ اب تک فتح نہ ہو سکا۔ میں جب بھی تمہاری کامیابی اور فتح کے لیے دعا کرتا تھا، وہ عورت قبولیت دعا میں حائل ہو جاتی تھی۔ اب تین روز ہوئے کہ اس کی وفات ہو گئی۔ اس لیے امید ہے کہ ٹھٹھہ بہت جلد فتح ہو جائے۔“
جام بابینہ کو آپ کی آمد کا علم ہوا تو پیغام بھیجا۔
”آپ میری تحریک پر آج سے تشریف لائے ہیں۔ ہم سخت پریشانی میں مبتلا ہیں۔ آپ سلطان فیروز سے صلح کی بات کیجیے تاکہ ہمیں پریشانی سے نجات ملے۔“

جب پے در پے کئی پیغام آئے تو حضرت مخدوم نے سلطان سے سندھیوں کی سفارش کی۔ سلطان ان کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے صرف ایک شرط عائد کی کہ جام خود اس کے روبرو حاضر ہو جائے۔

جام بابینہ اپنی پگڑی گردن میں ڈال کر، تلوار کو اپنے گلے میں حائل کر کے مجرموں کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلطان کے پیروں پر گر پڑا۔

”تم کیوں اتنا ڈرتے ہو۔ ہم کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ تمہیں کسی قسم کا خوف نہیں کرنا چاہیے۔“ اور خلعت و انعام سے نواز کر اس کی معافی قبول کی۔

”تم اپنے متعلقین کے ہمراہ ہمارے ساتھ دہلی چلو۔“ سلطان نے کہا۔ اس دعوت کو جام نے فوراً قبول کر لیا۔

سلطان نے ٹھٹھہ کی حکومت پر بابینہ کے بیٹے جام تماچی کو سالانہ خراج کی ادائیگی کے وعدے پر فائز کیا اور جام بابینہ کو اس کے متعلقین کے ساتھ دہلی کی طرف لے کر چلا۔

اسے اپنی نذر پوری کرنی تھی لہذا ملتان پہنچا۔ ملتان کے بزرگوں کی زیارت کر کے وہ دہلی پہنچ گیا۔

☆☆☆

فیروز شاہ کا ایک امیر خواجہ شمس الدین دمغانی بہت

دنوں سے اس تاک میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح اسے گجرات کا صوبہ دار بنا دیا جائے لیکن فیروز شاہ ایسی مہمات میں گھرا ہوا تھا کہ اسے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس نے نوروز گرگین کو اپنے ساتھ ملانا چاہا کہ کسی طرح اپنے مقاصد تک پہنچ سکے لیکن نوروز، خان جہاں کی مرضی کا باند تھا لہذا وہ ٹالتا رہا۔ وہ خان جہاں کی مرضی معلوم کر کے ہی کوئی جواب دینا چاہتا تھا۔ اس نے موقع دیکھ کر خان جہاں سے بات کی۔
”خواجہ شمس الدین یہ چاہتا ہے کہ اسے گجرات کا حاکم بنادیا جائے۔“

”اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی کہ وہ یہاں سے رخصت ہو۔ ہمارا کام تو خود بخود آسان ہوتا جا رہا ہے۔ بادشاہ کے جتنے وفادار امیر ہیں وہ اس سے دور ہو جائیں، اسی میں ہماری کامیابی ہے۔“

”آپ کہیں تو میں اسے ایسی ترکیب بتا دوں کہ بادشاہ اسے فوراً گجرات بھیج دے۔“

”یہ کام میری موجودگی میں نہ ہو۔ بادشاہ خود اسے بھیجنے پر رضامند ہو۔ ہمارے ہاتھ صاف ہوں تو اچھا ہے۔“
”ایسا ہی ہوگا۔“

”بس تو قدرے انتظار کرو۔ بادشاہ دہلی پہنچنے ہی والا ہے۔“

اس گفتگو کے تیسرے چوتھے دن ہی بادشاہ نے دہلی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا۔

خان جہاں اس سے ملاقات کو گیا۔ امور سلطنت چلانے کے لیے اس نے جتنے اجازت نامے جاری کیے تھے، وہ سب اس نے بادشاہ کے سامنے رکھ دیے۔ ساتھ ہی اس نے جان بوجھ کر خواجہ شمس الدین دمغانی کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ اپنی وفاداری کا اس طرح بھی یقین دلایا۔

”میں نے بہت عرصہ آپ کی نیابت کے فرائض انجام دیے۔ میں بہت تھک بھی گیا ہوں۔ اب آپ تشریف لے آئے ہیں۔ یہ ذمہ داری کسی اور امیر کو سونپ دی جائے تاکہ میں گوشہ نشین ہو کر آپ کے حق میں دعا کرتا رہوں۔“

”یہ کیا بات آپ نے منہ سے نکالی۔ ہم یہاں موجود ضرور ہیں لیکن دراصل ہماری جگہ آپ ہی ہیں۔“

”حضور کی غلام پروری ہے جو مجھے اس قابل سمجھتے ہیں۔ میں کبھی آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

اب شمس الدین دمغانی کے معاملے میں خان جہاں بھی آزاد تھا، نوروز گرگین بھی۔

شمس الدین دمغانی بڑی آسانی سے تیار ہو گیا کہ وہ

الٹ دور تھا

خان جہاں سے ملاقات کرے گا۔ پھر وہ نوروز گرگین کے ساتھ خان جہاں کے پاس پہنچ گیا۔ خان جہاں نے بڑی چالاکی سے معذرت کا جال پھیلادیا۔

”اگر آپ نے پہلے یہ ارادہ ظاہر کیا ہوتا تو میں بااختیار تھا۔ اب بادشاہ خود تشریف لے آئے ہیں۔ آپ ان سے ذکر چھیڑ کر دیکھیں۔“

”میں تو آپ کے پاس صرف اس لیے آیا تھا کہ اگر وہ معاملہ آپ پر چھوڑ دیں تو آپ مخالفت نہیں کریں گے۔“
”میں تو آپ کی تعریف ہی کروں گا۔“

اس کے بعد نوروز گرگین کا کام شروع ہوتا تھا۔ اس نے شمس الدین دمغانی کو پٹی پڑھائی کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ اسے کیا کہنا ہے، یہ سب سمجھا کر اسے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ شمس الدین نے نوروز گرگین نے جو کچھ سمجھایا تھا، بادشاہ کے سامنے اگل دیا۔

”گجرات کے عاملین اپنا خراج وصول کرنے میں بہت سستی کر رہے ہیں۔ اس بے توجہی کا کوئی خاص جواز بھی دیوان شاہی میں پیش نہیں کرتے۔ اگر اس کی حکمرانی میرے سپرد کر دی جائے تو میں سو ہاتھی، چالیس لاکھ تنکے اور چار سو جشی و ہندی غلام، دو سو عربی اور عراقی گھوڑے مقررہ خراج کے علاوہ بادشاہ کے نیاز میں پیش کروں گا۔“

یہ سب وہ تھا جو نوروز نے اسے سکھایا تھا۔ نوروز کو معلوم تھا کہ دمغانی اپنا وعدہ کبھی پورا نہیں کر سکے گا اور نتیجے میں شاہی عتاب کا نشانہ بنے گا۔ دمغانی نے کہا بھی تھا کہ وہ یہ سب کیسے فراہم کرے گا۔ اس پر نوروز نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا تھا۔
”آپ ایک مرتبہ وہاں چلے تو جائیں۔ جو پیشکش آپ کریں گے اگر میانہ بھی کر سکتے تو خان جہاں یہاں موجود ہیں۔ وہ آپ کی مجبور یوں سے بادشاہ کو آگاہ کریں گے اور آپ کو رعایت مل جائے گی۔“

اس قدر پیشکش کے بعد بادشاہ کے منہ میں پانی آ گیا۔ اس نے فوراً اپنا نامہ بر گجرات کی طرف بھیجا۔

”اگر شمس الدین ابور جا جو غرض خان کا نائب ہے دمغانی کی پیش کی ہوئی شرائط پوری کرنے کے لیے تیار ہے تو وہ گجرات کا صوبہ دار قائم رکھا جائے گا ورنہ یہاں کی صوبہ داری کا حق شمس الدین دمغانی کے سپرد کر دیا جائے گا۔“

یہ شرائط ایسی نہیں تھیں جنہیں آسانی سے قبول کیا جاسکتا لہذا اس نے قبول نہیں کیا۔ اس انکار کے بعد کوئی وجہ نہیں تھی کہ شمس الدین دمغانی کو گجرات نہ بھیجا جاتا۔

بادشاہ نے اسے کمر بند زر دوزی، نیزہ اور چاندی کا

چوڑا دل عنایت کیا اور ایک پاکی عطا کر کے گجرات روانہ کر دیا۔ اسے گئے ہوئے چند ماہ ہوئے تھے کہ نوروز نے خان جہاں کے مشورے سے دوسرا داؤ چلا۔ اس نے دمغانی کے پاس پیغام بھجوایا کہ وہ خراج ادا کرنے سے معذرت کر لے اور بغاوت پر کمر بستہ ہو جائے۔ یہاں سب انتظام کر لیا گیا ہے۔ تم گجرات کے خود مختار حاکم بن جاؤ گے۔

شمس الدین دمغانی ایک مرتبہ پھر اس سازش کا شکار ہو گیا۔ یہ پیغام ملتے ہی وہ میر صمدہ کے ایک گروہ سے ساز باز کر کے بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔

خان جہاں نے بادشاہ کو مطلع کر دیا کہ دمغانی باغی ہو گیا ہے۔ اس نے خراج کی ادائیگی سے معذرت کر لی ہے اور ایک گروہ سے مل کر بغاوت پر آمادہ ہے۔

دمغانی بے چارہ یہ سمجھ رہا تھا کہ خان جہاں اس کی مدد کرے گا اور یہاں خان جہاں بادشاہ کو لشکر بھیجنے پر اکسارہا تھا۔ سلطان نے لشکر بھیج دیا۔ دمغانی ابھی بغاوت کی پوری طرح تیاری بھی نہ کر سکا تھا کہ لشکر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اسے قتل کیا اور اس کا سر سلطان کے پاس بھیج دیا۔

سلطان نے گجرات کو ملک مفرح سلطانی کے سپرد کر دیا۔ خان جہاں نے ایک تیر سے دو شکار کر لیے۔ دمغانی دنیا سے رخصت ہو گیا اور ملک مفرح دہلی سے دور ہو گیا۔ خان جہاں کا مشن ہی یہ تھا کہ امیروں کو بادشاہ سے دور کرنا چلا جائے۔ کچھ اس کی قسمت بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

دمغانی کا قصہ پاک ہو چکا تھا کہ پرگنہ اثاودہ کے کھیلوں اور چودھریوں نے سرکشی کی۔ بادشاہ ان سرکشوں سے بہت ٹالاں تھا اور چاہتا تھا کہ وہاں بھی لشکر بھیجے لیکن خان جہاں نے اسے مشورہ دیا کہ لشکر کے ساتھ وہ خود جائے۔

”حضور! گجرات کی بات اور تھی لیکن اثاودہ کے کھیا اور چودھری بہت طاقت پکڑ چکے ہیں۔ ان کی سرکشی کو دبانے کے لیے حضور کا جانا بہت ضروری ہے۔“

بادشاہ کا حال تو یہ تھا کہ خان جہاں کے اشاروں پر چل رہا تھا۔ اس کا ہر مشورہ مان لیتا تھا اور خان جہاں کا مشیر نوروز گرگین بنا ہوا تھا۔

بادشاہ نے یہ مشورہ بھی مان لیا اور ایک لشکر کے ساتھ خود اثاودہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک مرتبہ وہ پھر دہلی سے دور چلا گیا۔

اثاودہ کے سرکشوں نے بھی بادشاہ کے سامنے صف آرائی کی ہمت کی لیکن جلال شاہی کے سامنے ایک نہ چلی اور چھوٹی سی جھڑپ کے بعد ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اکثر کوموت نے

اپنی آغوش میں لے لیا، کچھ گرفتار ہوئے۔

اس بغاوت کے بعد بادشاہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ اسے ایسے انتظامات کی ضرورت پیش آئی جس کے بعد اگر سرکشی ہو تو اسے آسانی سے دبا یا جاسکے۔ ان علاقوں میں اس کی فوج ہمیشہ موجود رہے۔ اس نے اثاودہ، اہل، نیلائی جیسی مشہور جگہوں پر مضبوط قلعے بنوائے اور قلعوں کی حکمرانی کے لیے اپنے چند امراء کو وہاں چھوڑا اور خود واپسی کا ارادہ کیا۔ کچھ مزید امراء اس سے دور ہو گئے۔

بادشاہ ایک مقام سامنے پہنچا۔ یہاں سے ہوتا ہوا سہارن پور کے پہاڑ کے دامن میں جا پہنچا۔ وہاں راجا مور اور گردونواح کے دیگر راجاؤں سے بھی خراج اور دیگر تحائف وصول کیے۔ اسی دوران اسے پتا چلا کہ ”سنبھڑا“ کے چودھری گھر کو نے بداؤں کے حکمران سید محمود، اس کے بھائی سید علاؤ الدین اور سید محمود کے تین سرداروں کو اپنے گھر مہمان بلایا اور قتل کرادیا۔

یہ ایسا واقعہ نہیں تھا جسے وہ نظر انداز کر دیتا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے اپنے لشکر کا رخ سنبھڑا کی طرف موڑ دیا (اس مقام کو کٹھیر بھی کہا جاتا ہے)۔

شاہی فرمان کے مطابق فوجی سپاہی ہر گھر کو تباہ و برباد کرنے لگے۔ شہریوں کو تہ تیغ کیا۔ بڑی تعداد میں ہندو مارے گئے۔ گھر کو بھاگ گیا۔ سپاہیوں نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ پہاڑوں کے غاروں میں ایسا چھپا کہ پھر بھی اس کا سراغ نہ مل سکا۔ شاید کسی غار میں راستہ بھول کر وہیں مرکب گیا۔

برسات کا موسم بھی نزدیک آ گیا تھا لہذا اس نے واپسی کا عزم کر لیا۔

وہ تقریباً دو سال دہلی سے باہر رہنے کے بعد دہلی واپس آیا تھا۔ اس دوران کئی سازشیں پک کر تیار ہو گئی تھیں لیکن سلطان اس سے بے خبر تھا۔

خان جہاں کمال کا صابر آدمی تھا۔ ہزار موقع ملنے کے باوجود وہ ابھی تک مناسب وقت کی تلاش میں تھا البتہ نوروز کا بیٹا نہ صبر لبریز ہو گیا تھا۔

بادشاہ کے آجانے کے بعد اس کی بے صبری اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس نے خان جہاں سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”آپ نے ہر موقع ضائع کر دیا اور میں اس عمر کو پہنچ گیا۔ بادشاہ کئی مرتبہ دہلی سے باہر گیا۔ ہم ان مواقع سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔“

”بادشاہ دہلی سے باہر گیا تھا لیکن اس کے وفادار امیر

یہاں موجود تھے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ میں نے ایک ایک کر کے ان امیروں کو بادشاہ سے دور کر دیا۔ بادشاہ کو گجرات کے قریب قلعے بنوانے کا مشورہ دیا جہاں ان امیروں کو حکمران بنا کر بھیجا گیا۔ شمس الدین دمغانی کو راستے سے ہٹایا۔ اب چند امیر رہ گئے ہیں جنہیں دیکھو میں کیسے زیر کرتا ہوں۔“

”اس میں بھی برسوں لگ جائیں گے۔“

”اب یہ برسوں کا کھیل نہیں رہا۔“

”چند دنوں کی بات بھی نہیں۔“ نوروز نے کہا۔ ”آپ کہیں تو میں اپنے آدمیوں کو لے کر ان امیروں کے گھروں میں گھس جاؤں اور انہیں قتل کر دوں۔“

”اگر اس قتل و غارت گری کے بغیر کام چل جائے تو کیسا ہے۔ بس تم مجھے ایک رات دے دو۔ پھر میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔ تم بھی سوچ لو۔ اگر کوئی ترکیب تمہارے ذہن میں آئے تو وہ بھی بتانا۔“

”اب ایک ہی راستہ ہے کہ جو چند امیر رہ گئے اور جن سے ہمیں خطرہ ہو سکتا ہے، انہیں بادشاہ کی نظروں سے گرا دیا جائے اور یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں۔“

”وہ کس طرح؟“

”ذرا کان قریب لائیے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“

نوروز نے خان جہاں کے کان میں سرگوشی کی۔ خان جہاں اثبات میں گردن ہلاتا رہا۔

”نوروز گرگین! تم نے بڑا شاطر دماغ پایا ہے۔ اب دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔“

خان جہاں دوسرے ہی دن بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

”حضور! اب تک تو ہم غلاموں کی بغاوت کا سامنا کر رہے تھے مگر افسوس یہ ہے کہ اب انہوں سے واسطہ ہے۔“

”خیر تو ہے خان جہاں۔“

”خیریت ہی تو نہیں ہے۔ شہزادہ محمد خاں، ظفر خاں، سماء الدین، ملک یعقوب اور ملک کمال وغیرہ امراء سے ساز باز کر کے اور ان کی مدد سے خروج کرنا چاہتا ہے۔“

”کیا کہا تم نے؟ شہزادہ محمد خاں۔“

”جی حضور۔“

”اور ہمارے امراء کو کیا ہو گیا ہے کہ اس کی مدد پر آمادہ ہیں۔ کیا ہم نے کسی امیر کو شکایت کا موقع دیا؟ کیا انہوں نے ہمارے کردار میں کوئی جی دیکھی؟“

”حضور! ان لوگوں نے نوروز گرگین کو بھی اپنے ساتھ

الک حور تھا

ارادے سے نہیں آیا تھا۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا اور سیدھا شاہی محل میں گھس گیا اور اسی طرح مسلح حالت میں باپ کے سامنے حاضر ہوا اور قدموں پر سر رکھ دیا۔

”ابا حضور! جو میں نے سنا ہے اور جو آپ سے کہا گیا ہے سب غلط ہے۔ خان جہاں نے میرے خروج کی غلط خبر آپ تک پہنچائی ہے تاکہ آپ کے دل میں میری طرف سے برائی آجائے۔ آپ کا دل برا ہو گیا اور آپ نے میری گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ اب میں حاضر ہوں، آپ مجھے گرفتار کر سکتے ہیں۔“

”اس طرح مسلح آنے کا کیا مقصد ہے؟“

”یہ صرف یہاں تک آنے کے لیے احتیاطی تدبیر ہے۔ مجھے خان جہاں کے آدمیوں سے خطرہ تھا اس لیے مسلح ہو کر آنا پڑا اور نہ بھلا کسی بیٹے نے آج تک اپنے باپ کو قتل کیا ہے اور اگر کسی نالائق بیٹے نے ایسا فعل بد انجام دیا ہے تو اس نے اپنی جوانی سے اچھا چل نہیں پایا۔“

”خان جہاں نے یہ جھوٹی خبر کیوں پھیلائی ہوگی؟“

”خان جہاں چاہتا ہے کہ شہزادے اور دیگر خواہان سلطنت کے قدم درمیان سے ہٹ جائیں اور وہ سلطنت ہند پر قبضہ و تصرف کرے۔ خروج کا ارادہ میں نہیں، وہ رکھتا ہے۔ اس نے ظفر خاں کو قید کر لیا ہے۔ میری گرفتاری کی بھی تدبیریں کر رہا ہے۔“

”میں نے واقعی خان جہاں پر اندھا اعتماد کر لیا تھا۔ اب میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ جیسے چاہو خان جہاں کو قتل کر کے ظفر خاں کو نظر بندی سے رہائی دلاؤ۔“

شہزادہ محمد خاں باپ سے رخصت ہوا۔ تمام ہاتھیوں اور شاہی گھوڑوں کو تیار کرایا اور دس بارہ ہزار کی تعداد میں فیروز شاہی غلاموں کے ساتھ خان جہاں کے گھر کو گھیر لیا۔

خان جہاں کو اس حصار کی خبر ملی تو اس نے ظفر خاں کو قتل کر دیا اور خود تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ گھر سے باہر نکلا۔ چاہتا تھا کہ لڑتا بھڑتا شہزادے کے حصار کو توڑ کر نکل جائے لیکن زخمی ہو گیا۔ لڑنے کا یارا نہیں رہا تو دوبارہ گھر میں چلا گیا اور دوسرے راستے سے باہر نکل گیا اور میوات کے زمیندار کو کا چوہان کے گھر پہنچ گیا۔

”تم میری حالت دیکھ کر سمجھ گئے ہو گے کہ میں کس مشکل میں ہوں۔ میرے زخم ٹھیک ہونے تک مجھے اپنے پاس پناہ دے دو۔ زخم ٹھیک ہوتے ہی میں تمہاری جگہ چھوڑ دوں گا اور کسی طرف نکل جاؤں گا۔ میرا لشکر تو تباہ ہو گیا، نوروز گرگین اپنا لشکر لے کر میرے پاس پہنچنے ہی والا ہوگا۔ اس کے آتے

ملانا چاہتا تھا۔ اس نے ان کے خوف سے اس وقت تو ہامی بھری لیکن بعد میں اس نے مجھے بتا دیا۔ آپ چاہیں تو اس سے خود بلا کر پوچھ سکتے ہیں۔“

”نوروز گرگین کی جانب سے ہم ہمیشہ خدشوں میں مبتلا رہے لیکن وہ تو ہمارا ایسا وفادار ثابت ہوا۔“

”حضور! اگر وہ بروقت اطلاع نہ دیتا تو یہ سازش کامیاب ہو گئی ہوتی۔“

فیروز شاہ، خان جہاں پر اندھا اعتماد کرنے لگا تھا۔ اس کی ہر بات مان لیتا تھا۔ یہ بات بھی مان لی اور شہزادے کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔

”یہ مت سمجھنا کہ شہزادہ ہمارا بیٹا ہے۔ اسے فوری گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش کر دو۔“

اس حکم کے بعد خان جہاں کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی تھی۔

خان جہاں نے امیر ظفر خاں کو کچھ حساب کتاب سمجھنے کے بہانے اپنے گھر میں مقید کر لیا اور شہزادے کو گرفتار کرانے کی تدابیر کرنے لگا۔

محل میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو شہزادہ محمد خاں سے رابطے میں تھے۔ انہوں نے یہ خبر شہزادے تک پہنچادی۔ شہزادہ بہت دن سے خان جہاں کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس واقعے نے اسے خوفزدہ کر دیا۔ سب چالیں اس کی سمجھ میں آ گئیں۔ وہ مسلح سپاہیوں کی نگرانی میں گوشہ نشین ہو گیا۔

شہزادے کو معلوم ہو گیا تھا کہ خان جہاں نے اس کی فرضی بغاوت کی داستان بادشاہ تک پہنچادی ہے اور اس کی گرفتاری کے احکام جاری ہو گئے ہیں۔ اس کی طرف سے باپ کا دل برا ہو چکا ہے، یہ سوچ کر اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ باپ کے سامنے جائے۔

کئی دن اسی کشمکش میں گزر گئے۔ پھر اس نے باپ کے سامنے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز اس نے اپنے آپ کو مسلح کیا اور پاکی میں سوار ہو کر چلا۔ پاکی میں پردے لگا دیے تاکہ بظاہر یہ معلوم ہو کہ شہزادے کے حرم کی بیگمات شاہی محلات میں ملنے کے لیے جا رہی ہیں۔

اس کی یہ ترکیب کامیاب ہوئی۔ وہ دربار سے ہوتا ہوا شاہی حرم میں داخل ہوا۔ وہ جونہی پاکی سے باہر آیا اور بیگمات نے اسے سچ دیکھا تو ہر طرف شور مچ گیا۔ عورتیں چیخنے چلانے لگیں۔ انہیں گمان ہوا کہ شہزادہ باغی ہو گیا تھا۔ اب اپنا ارادہ پورا کرنے کے لیے محل میں گھس آیا ہے۔ شہزادہ ظاہر ہے اس

ہی میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ جب تک آپ کے دن بدل نہیں جاتے، آپ میری پناہ میں ہیں۔“

☆☆☆

نوروز گرگین اس صورت حال کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ہوا کا رخ بدل گیا ہے۔ اب اسے بھی اپنا رخ بدل لینا چاہیے۔ اس نے فوراً شہزادہ محمد خاں سے ملاقات کی۔

”میں آپ کو نہایت اہم خبر دینے آیا ہوں۔ خان جہاں فرار ہو کر میوات کے زمیندار کو کاچوہاں کی پناہ میں چلا گیا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق وہ زخمی ہے۔ اسے آسانی سے گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ آپ حکم فرمائیں تو میرا چھوٹا سا لشکر اس کام کے لیے حاضر ہے۔“

”نہیں، ہم خود جائیں گے اور اس کام کو سرانجام دیں گے۔“

”حضور! اگر مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چلیں تو میں سمجھوں گا میں نے حق نمک ادا کر دیا۔“

شہزادہ محمد خاں ایک ہزار سوار لے کر میوات پہنچ گیا۔ نوروز گرگین بھی اس کے ہمراہ تھا۔ وہ یقین دل رہا تھا کہ وہ بادشاہ اور شہزادے کا وفادار ہے۔ خان جہاں کی کسی حرکت کا وہ ڈرے دار نہیں۔

شہزادہ محمد خاں نے اس کے گھر کو بھی تباہ و برباد کر دیا اس کے حاشیہ نشینوں اور طرف داروں کو تلاش کر کے موت کے گھاٹ اتارا اور خان جہاں کو کیفر کردار تک پہنچا کر خانماں برباد کر دیا لیکن وہ قتل نہیں ہوا تھا، صرف فرار ہوا تھا۔

بادشاہ نے شہزادہ محمد خاں کو ناصر الدین محمد کا خطاب دے کر اپنا ولی عہد مقرر کیا اور خود خانہ نشین ہو کر عبادت الہی میں مصروف ہو گیا۔ ملک داری کا سامان مثلاً گھوڑے، ہاتھی اور فوج وغیرہ سب اس کے حوالے کر دیے۔

ناصر الدین نے فرمان جاری کیا کہ مجھے کے خطبے میں دونوں بادشاہوں کی فتح مندی کی دعا کی جائے۔ دونوں کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ ناصر الدین نے اراکین سلطنت میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور انہیں بدستور قائم رکھا۔ سب کو خلعت و انعام عطا کیے۔

اس عرصے میں یہ معلوم ہوا کہ کوکا چوہاں پھر اپنے علاقے میوات میں آ گیا ہے۔ خان جہاں بھی دوبارہ اس کی پناہ میں آ گیا ہے۔

شہزادے نے اس کی سرکوبی کے لیے ملک یعقوب کو ایک عظیم لشکر کے ساتھ خان جہاں کے مقابلے کے لیے میوات

روانہ کیا۔ یہ فوج ابھی میوات کے نزدیک پہنچی تھی کہ کوکا چوہاں خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے خان جہاں کو گرفتار کر کے ملک یعقوب کے پاس بھیج دیا۔ ملک یعقوب نے اسے قتل کر کے اس کا سر شہزادہ محمد کے پاس بھیج دیا۔

ملک یعقوب کو سکندر خاں کا خطاب دے کر شہزادہ محمد نے گجرات اس کے حوالے کر دیا تھا لہذا خان جہاں کا کام تمام کرنے کے بعد وہ گجرات چلا گیا۔

شہزادہ محمد خاں مطمئن ہو کر شکار کے لیے نکلا ہوا تھا کہ اس کے پاس خبر پہنچی کہ ملک مفرج اور گجرات کے میر صدہ نے ساز باز کر کے ملک یعقوب کو قتل کر دیا اور اس کا لشکر غارت ہو گیا۔

اس نے یہ خبر اطمینان سے سنی اور شکار میں مصروف رہا اور پھر دہلی چلا آیا۔ اس نے اس فتنہ و فساد پر کوئی توجہ نہیں کی بلکہ عیش و عشرت میں وقت گزارنے لگا۔

اس کی غفلت سے ملک کے کاموں میں خرابیاں شروع ہو گئیں۔

تقریباً پچاس دن گزرے ہوں گے کہ فیروز شاہ کے بھتیجے ملک بہا الدین اور ملک کمال الدین نے باہم سازش کی اور فیروز شاہ کے غلاموں کو ساتھ ملا کر شہزادہ محمد خاں ناصر الدین کے خلاف بغاوت کر دی۔ الزام یہ تھا کہ اس نے قدیم درباریوں کو قعر مذلت میں ڈال کر اپنے نئے اور نو عمر حاشیہ نشینوں کو درباری بنالیا ہے۔

ناصر الدین نے ملک ظہیر الدین لاہوری کو بغاوت کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے بھیجا۔ ملک ظہیر الدین اسی میدان میں پہنچا جہاں فیروز شاہی لشکر جمع تھا۔ لشکر نے پتھر برسائے شروع کر دیے۔ ملک ظہیر الدین زخمی ہو کر لوٹ آیا اور ناصر الدین سے ساری کیفیت بیان کی۔ ناصر الدین نے ان سرکشوں کو کچلنے کے لیے خود جانے کا ارادہ کیا اور شاہی لشکر مرتب کر کے باغیوں کے سر پر جا پہنچا۔ دشمن لشکر بھی مقابلے پر آ گیا۔ تلواریں تلواروں سے ٹکرائیں۔ نہایت سخت جنگ ہوئی لیکن شام ہوتے ہی غلام لشکر پسپا ہو گیا۔ ناصر الدین کو فتح حاصل ہوئی۔

شاہی غلام شکست کھانے کے بعد میدان سے بھاگے اور فیروز شاہ کے سایہ عاطفت میں پناہ لینے کی غرض سے پہنچ گئے۔ دربار فیروزی کو اپنے قبضے میں لے لیا اور ناصر الدین کے سامنے دوبارہ قدم جانے کی نیت کی۔ دارالسلطنت میں دو دن تک خون کی ندیاں بہتی رہیں۔ اس خون ریزی کے باوجود دونوں فریقین میں سے کسی نے بھی ہاتھ نہیں کھینچا۔ تیسرے دن

الٹ دور تھا

غلاموں نے یہ ہوشیاری کی کہ بادشاہ کو کل سراسے باہر لا کر پاکی میں بٹھایا اور میدان کارزار میں لے آئے۔

بوڑھے اور کمزور بادشاہ کو زبردستی لایا گیا تھا لیکن بادشاہ کو وہاں دیکھ کر شاہی فیل بان یہ سمجھے کہ بادشاہ ناصر الدین کے مقابلے پر جنگ کرنے کے لیے بذات خود آمادہ ہو کر آیا ہے۔ تمام فیل بان منحرف ہو کر بادشاہ کی طرف آ گئے۔

ناصر الدین نے جو یہ حال دیکھا تو جنگ سے علیحدہ ہو گیا اور کوہ پایہ سر مور کی طرف چلا گیا۔ اس کا سارا مال و متاع تباہ ہو گیا۔

بادشاہ کے حواس ضعف نے جھٹل کر دیے تھے۔ غلاموں کی فوج ظفر موج اس پر حاوی ہو چکی تھی۔ اس نے غلاموں کے دباؤ سے مجبور ہو کر بادشاہ کے بڑے بیٹے فتح خاں (جس کا انتقال ہو چکا تھا) کے فرزند ارجمند یعنی اپنے پوتے غیاث الدین تغلق شاہ کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔ وہ پہلے کی طرح گوشہ نشین ہو گیا اور امور سلطنت کے تمام کام غیاث الدین نے سنبھال لیے۔

وہ از خود بادشاہ نہیں بن گیا تھا بلکہ اس کی بادشاہت فیروز شاہ کے غلاموں کی مرہون منت تھی۔ دربار کا عجیب حال تھا کہ یہ غلام اس کے ارد گرد تلواریں لیے کھڑے رہتے اور جو احکام چاہتے اس سے صادر کراتے۔ انہی کے کہنے پر اس نے اپنے داماد امیر سید حسن کو جو ناصر الدین کا طرف دار تھا، قتل کرانا پڑا۔

ناصر الدین کے حاشیہ نشینوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔ اسی دوران فیروز شاہ تغلق کا انتقال ہو گیا۔

فیروز شاہ کے انتقال کے ساتھ ہی اس کے غلاموں کی بن آئی۔ جو تھوڑا بہت پردہ تھا، وہ بھی ہٹ گیا۔ غیاث الدین اب باقاعدہ تخت شاہی پر بیٹھ گیا۔

اس کے تخت پر بیٹھے ہی ان غلاموں کے سربراہ ملک بہا الدین اور کمال الدین غیاث الدین کے پاس آئے اور اس سے گزارش نہیں کی بلکہ حکم دیا کہ ناصر الدین کو تاج کرنے کے لیے لشکر روانہ کیا جائے۔ غیاث الدین نے ہر چند چاہا کہ کسی طرح وہ اپنا مطالبہ واپس لے لیں لیکن وہ بصد رہے۔ مجبوراً اسے یہ مطالبہ ماننا پڑا اور ایک لشکر عظیم بھیج دیا۔

ناصر الدین نے سر مور میں دہلی کی فوج کے آنے کی اطلاع سنی تو بدرجہ مجبوری اپنے بچے اور بیوی کو پہاڑ کے ایک مضبوط حصے میں چھوڑ دیا اور خود غیاث الدین کی فوج سے صف آرا ہوا لیکن شکست کھا کر میدان چھوڑ دیا۔ بیوی اور بچے کو

گھوڑے پر بٹھایا، بچا کھچا لشکر ساتھ لیا اور منزلیں مارتا ہوا نگر کوٹ کے قلعے میں پناہ لی۔ نگر کوٹ کا حصار بہت مضبوط اور مستحکم تھا۔

شاہی سپاہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے نگر کوٹ پہنچی ضرور لیکن اس مضبوط قلعے کو سر کرنے کا خیال چھوڑ کر دارالسلطنت واپس چلی گئی۔

اب ان غلاموں نے ایک اور داؤ کھیلایا۔ انہوں نے غیاث الدین کو یہ باور کرایا کہ ناصر الدین ہمیشہ نگر کوٹ میں نہیں رہے گا بلکہ وہ موقع دیکھتے ہی سامانہ پہنچے گا۔ سامانہ کا حاکم عالی خاں ناصر الدین کا دست راست ہے۔ اگر ناصر الدین وہاں پہنچ گیا تو پھر اس کی طاقت میں اضافہ ہو جائے گا۔ جہاں پناہ سامانہ سے دہلی دور نہیں۔ آپ اپنے تخت کی خیر منائیں۔

اس نے امرائے فیروز شاہی کے ایک نامور امیر ملک سلطان شہ خوش دل کو یہ حکم دے کر سامانہ بھیجا کہ عالی خاں کو پکڑ کر اپنے ساتھ دہلی لائے اور اس کی جگہ امیر محمد شاہ کو حاکم بنا دے۔ ملک سلطان نے غیاث الدین کا تحریری حکم نامہ ساتھ لیا اور ایک چھوٹے سے لشکر کے ساتھ سامانہ پہنچ گیا۔ اس کا اندازہ غلط نکلا۔ اس کا استقبال تلواروں سے ہوا۔ غالباً یہ خبر یہاں پہلے ہی پہنچ چکی تھی کہ وہ کس ارادے سے آ رہا ہے۔ وہ حاکم تک کیا پہنچتا، امیر ان صدہ نے اس کے ارادے کو پیروں تلے روند دیا۔ معمولی سی جھڑپ کے بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے لشکر میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔

غیاث الدین جوانی کے نشے میں مست تھا۔ اسے یہ احساس تک نہ ہوا کہ اس کا ایک نامور امیر مارا گیا ہے۔ وہ عیش و عشرت میں مگن رہا۔ عدل و انصاف سے بالکل الگ ہو گیا لہذا انتظام سلطنت میں خرابیاں آنے لگیں۔ غیاث الدین نے اپنی ناتجربہ کاری اور عدم احتیاط کی وجہ سے اپنے سگے بھائی سالار شاہ کو قید کر دیا۔ اس کے سگے چچا زاد بھائی ابو بکر شاہ نے غیاث الدین کے خلاف بغاوت کر دی۔

فیروز شاہی غلام جو ڈوریاں ہلانے، کسی کو بٹھانے کسی کو گرانے کو تیار رہتے تھے، ابو بکر شاہ کے ساتھ ہو گئے۔ یہ ساری جماعت شاہی دیوان خانے میں داخل ہو گئی اور امیر الامرا، مبارک کبیر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

غیاث الدین کو اس فتنے کی اطلاع ہوئی تو وہ محل کے دوسرے دروازے سے بھاگ نکلا۔ حالت یہ تھی کہ نہ سر پر ٹوپی تھی، نہ پاؤں میں جوتی۔ پیدل دریائے جمن کی طرف بھاگا چلا جاتا تھا۔

غلاموں میں سے ایک رکن الدین کو اس کے فرار کی

اطلاع مل گئی۔ اس نے ایک گروہ کے ساتھ اس کا پیچھا کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دریا میں کود کر اپنی جان بچاتا، تلوار کا نشانہ بن گیا۔

اس کے خون کے چند چھینٹے بھی دریا تک نہ پہنچ سکے۔ غیاث الدین صرف پانچ ماہ فرماں روا رہ سکا۔ اراکین سلطنت نے ابوبکر شاہ کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔

☆☆☆

سمانہ کے امیرانِ صمدہ نے ملک سلطان شہ خوش دل کو قتل کر کے اس کا سر ناصر الدین کے پاس نگر کوٹ بھیج دیا اور اسے سمانہ آنے کی دعوت دی۔

وہ اس سر کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہوا ہے۔ وہ جلدی جلدی نگر کوٹ سے نکلا اور جالندھر کے راستے سے ہوتا ہوا سمانہ پہنچ گیا اور امراء سے اپنی حکومت کی بیعت لی۔ سمانہ کے امیرانِ صمدہ اور دامن کوہ کے زمینداروں نے بھی از سر نو بیعت لی۔ دہلی کے امراء و ملوک بھی ابوبکر شاہ کے خلاف ہو گئے اور ناصر الدین سے مل گئے۔ چشم زدن میں بیس ہزار سواروں کا گروہ اس کے پاس اکٹھا ہو گیا۔

وہ سمانہ سے نکلا اور دہلی کی طرف روانہ ہوا تاکہ ابوبکر شاہ کو تخت سے ہٹا کر اپنی بادشاہت کا اعلان کرے۔ دہلی تک پہنچتے پہنچتے اس کے لشکر میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔

ناصر الدین قصر جہاں نما میں جلوہ افروز ہوا۔ ابوبکر شاہ نے اپنی فوج کو ناصر الدین سے جنگ کرنے کے لیے فیروز آباد میں چھوڑ دیا تھا۔

دہلی کے قریب دریائے جمنا کے کنارے یہ شہر سلطان فیروز شاہ نے اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ فیروز آباد کا قلعہ اپنی مضبوطی میں اپنی مثال آپ تھا۔

ابوبکر شاہ نے فیروز آبادی میں اپنے لشکر کو مرتب کیا اور آمادہ پیکار ہونے کے لیے اپنا خیمہ نصب کیا۔ ایک دن بعد وہ باقاعدہ جنگ کرنے کے لیے میدان میں نکل آیا۔ دونوں کے درمیان جنگ ہوئی لیکن جنگ کا فیصلہ ابوبکر شاہ کے حق میں ہوا۔ ناصر الدین دو ہزار سواروں کو لے کر دریائے جمنا پار کر گیا اور دو آب میں پناہ گزیں ہو گیا اور اپنے بچھلے بیٹے ہمایوں خاں کو سمانہ بھیج دیا تاکہ فوج جمع کرے اور خود جالیسر میں دریائے گنگا کے کنارے خیمہ زن ہو گیا۔ ناصر الدین نے حکم جاری کیا کہ جہاں کہیں شاہی غلاموں میں سے کوئی فرد نظر آئے، اسے فوراً قتل کر دیا جائے کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے مجھے اس حال پر پہنچایا ہے۔ یہ فرمان ملتان، لاہور اور دوسرے قصبات

میں جاری ہو گیا۔

فیروز شاہی غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد قتل کر دی گئی۔

ابوبکر شاہ کے امراء اور رعایا اس سے خوش نہیں تھے۔ اب تک تو وہ خاموش تھے لیکن جب ناصر الدین کی شکل میں اس کا نعم البدل نہیں مل گیا تو وہ ابوبکر شاہ کی مخالفت کھل کر کرنے لگے اور اس سے آ کر مل گئے۔ ملک سرور جو فیل خانے کا کوتوال تھا اور ملتان کا حاکم نصیر الملک، حاکم بہار خواص الملک، رائے سرور اور دیگر امراء و اراکین سلطنت ناصر الدین کے ساتھ شامل ہو گئے۔

ناصر الدین نے ان سب کو بڑے بڑے عہدے دے کر اپنا مطیع بنالیا اور دہلی فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ ابوبکر شاہ بھی فوج کی ترتیب و تنظیم کر کے دہلی سے باہر آیا۔ موضع کندنی میں دونوں فوجیں نبرد آزما ہوئیں۔ ناصر الدین کی قسمت میں ابھی گردش کے دن باقی تھے۔ اسے ایک مرتبہ پھر شکست ہو گئی۔ وہ ایک مرتبہ پھر جالیسر میں جا چھا۔ ابوبکر شاہ کی فوج نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ تو ہاتھ نہ لگا، ابوبکر شاہ کا لشکر ناصر الدین کا تمام مال و متاع برباد کر کے فتح مندی کے شادیاں بجاتا ہوا دارالسلطنت واپس آ گیا۔

ناصر الدین کے بیٹا ہمایوں خاں کو جب اپنے باپ اور ابوبکر شاہ کی باہم آویزش کا حال سن کر سمانہ سے چلا تو باپ کے پاس جانے کے بجائے دہلی پر حملہ کر دیا اور آس پاس کے علاقوں کو خوب لوٹا۔ ابوبکر نے ملک شاہین کو مقابلے کے لیے بھیجا۔ پانی پت میں دونوں لشکر آمادہ پیکار ہوئے۔ اس معرکے میں ہمایوں خاں کو شکست ہوئی اور وہ سمانہ بھاگ گیا۔

لشکر شاہی کو ہر مرتبہ کامیابی ملتی تھی لیکن پھر بھی ابوبکر شاہ مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ دہلی سے نکلے اور وہ تخت شاہی چھوڑ کر دشمن کا پیچھا کرنے کو تیار نہیں تھا کیونکہ سمجھ گیا تھا کہ فتنہ و فساد کو ہوا دینے والے دارالسلطنت کے امراء ہی ہیں لیکن اس مرتبہ اس نے دلیری دکھائی اور امراء سلطنت کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ناصر الدین کو قتل کرنے کے لیے خود روانہ ہوا۔

ان مشورہ دینے والوں میں نوروز گرگین پیش پیش تھا۔ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ بیمار بھی تھا لیکن اس کی سانس ناصر الدین میں اٹکی ہوئی تھی۔ ناصر الدین اس پر بھروسہ کرنے لگا تھا لہذا اسے یقین تھا کہ اگر ناصر الدین تخت نشین ہو گیا تو اسے کوئی اہم عہدہ تفویض کرے گا۔ غیاث الدین اور ابوبکر نے اسے تقریباً معزول کر دیا تھا۔

اس کی چرب زبانی یہاں بھی کام آئی اور وہ ابوبکر شاہ کو

دہلی سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

ابوبکر شاہ دہلی سے نکلا اور بیس کوس کے فاصلے پر قیام کیا۔ ابھی وہ جالیسر جانے کا بندوبست کر ہی رہا تھا کہ ناصر الدین نے بیوی بچے جالیسر میں چھوڑے اور خود چار ہزار سواروں کی فوج لے کر ابوبکر شاہ سے لڑنے کے لیے آگے بڑھا۔ باقی فوج اس نے جالیسر ہی میں چھوڑ دی تھی۔ وہ نکلا تو ابوبکر سے جنگ کرنے کے لیے تھا لیکن اس کے سامنے پہنچنے سے پہلے ہی بائیں طرف مڑ کر دہلی پہنچ گیا۔ ابوبکر شاہ شہر کے دروازوں کی محافظت کے لیے معمولی سی فوج چھوڑ گیا تھا۔ اس فوج نے معمولی سی مزاحمت کی مگر اس نے بداؤں دروازے میں آگ لگا دی اور زبردستی دہلی میں داخل ہو گیا اور قصر ہمایوں میں قیام پذیر ہو گیا۔ عمامہ بن اور امراء ناصر الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی فتح و کامرانی پر مبارک باد دی۔ اسی وقت شور مچا کہ ابوبکر شاہ اپنے لشکر سمیت پہنچ گیا ہے۔

ابوبکر شاہ نے بہا الدین خٹکی کو قتل کیا جو درباری کے فرائض انجام دے رہا تھا اور قصر ہمایوں کی طرف بڑھا۔ ناصر الدین کے حاشیہ نشین ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ناصر الدین کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ مقابلہ کرتا۔

ابوبکر کی فوج ہر دروازے پر متعین تھی، صرف ایک دروازہ خالی پڑا تھا۔ ناصر الدین اسی دروازے سے باہر نکلا اور جالیسر چلا گیا۔ اس کے کئی امراء ابوبکر شاہ کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔

ناصر الدین تخت کے قریب آتے ہوئے پھر دور ہو گیا۔ یہ ایسی ناکامی تھی جس کے بعد اسے مایوس ہو جانا چاہیے تھا اور وہ شاید مایوس ہو بھی جاتا کہ اس راکھ سے ایک چنگاری بھڑک اٹھی۔ غلامانِ فیروز شاہی کا سب سے بڑا رکن مبشر حاجب جو اسلام خاں کے لقب سے مشہور تھا، ابوبکر شاہ سے باغی ہو گیا۔ اسلام خاں نے بڑی خاموشی سے غلامانِ شاہی کے ایک بڑے گروہ کو اپنا ہم نوا بنالیا اور انہیں بڑے بڑے لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ کام اتنی رازداری سے ہوا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ جب اس کی طاقت میں خوب اضافہ ہو گیا تو اس نے ناصر الدین کو محبت آمیز خط لکھا اور اپنی وفاداری کا یقین دلا کر اسے دہلی پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔

اس خط کو پڑھ کر ناصر الدین نے یہ سوچا ضرور تھا کہ اسے کسی سازش کے تحت تو نہیں بلایا جا رہا ہے۔ اس نے اپنے ہر امراء سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی اس اندیشے کا اظہار کیا لیکن یہ بھی کہا کہ اتنی مرتبہ شکست ہو چکی ہے ایک شکست اور سہی۔ اگر ہمیں ناکامی بھی ہوئی تو بھی یہ ملال تو نہیں رہے گا کہ ہم

الک دور تھا

نے ایک موقع ضائع کر دیا۔

ابوبکر شاہ کو بروقت پتا چل گیا کہ سازش ہوئی ہے اور ناصر الدین دہلی کی طرف چل پڑا ہے۔ اب کوئی نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا۔ اس نے دہلی چھوڑ دیا اور میوات روانہ ہو گیا۔ ناصر الدین دہلی پہنچا اور کسی مزاحمت کے بغیر تخت شاہی پر بیٹھ گیا۔ ناصر الدین نے اپنی حالت ٹھیک کر کے شاہی ہاتھیوں کو غلامانِ فیروز شاہی سے چھین کر اپنے خاص فیل بانوں کے سپرد کر دیا۔

ناصر الدین کی یہ حرکت غلامانِ فیروز شاہی کو نہایت ناگوار گزری اور اپنے بال بچوں سمیت رات کے وقت بھاگ کر ابوبکر سے جا ملے۔ جو رہ گئے تھے اور بادشاہ گری کے فرائض انجام دے رہے تھے، ان پر بھی ناصر الدین نے بھروسہ نہیں کیا۔ اس نے حکم دیا کہ تین دن کے اندر اندر دہلی سے باہر نکل جائیں ورنہ ان کا مال و متاع سب شہریوں کو دے دیا جائے گا۔ اس حکم کے بعد ایک بڑی جماعت دارالسلطنت سے نکل گئی۔ کچھ غلاموں نے اپنے حلیے بدل کر خود کو شرفاء کے حلقے میں شامل کر لیا۔ یہ بنے ہوئے شرفاء بھی وقتاً فوقتاً موت کے گھاٹ اتارے جاتے رہے۔

ناصر الدین جب ان غلامانِ شاہی کے غلبے سے آزاد ہو گیا تو اطراف و جوانب سے لشکر اکٹھا کیا۔ اسی عرصے میں اس کا بیٹا ہمایوں خاں بھی دہلی آ گیا۔ فرزند کی آمد سے بہت تقویت ہوئی اور ابوبکر شاہ کو تاخت و تاراج کرنے پر کمر بستہ ہوا اور ہمایوں خاں کو نامی گرامی امراء کے ہمراہ اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔

ابھی حالات اتنے ٹھیک نہیں ہوئے تھے کہ وہ خود دہلی سے باہر نکلتا۔

امراء کے روانہ ہونے کے بعد اسے نوروز گرگین کا خیال آیا۔ کیا وہ میری تخت نشینی سے خوش نہیں ہے جو ملنے نہیں آیا؟ اسے معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے۔ بس آخری سانس لے رہا ہے۔ ناصر الدین اس سے خود ملنے گیا۔ نوروز واقعی بستر مرگ پر تھا۔ ناصر الدین کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلاکت آ گئی۔

”جہاں پناہ! میں آپ کو تخت نشین دیکھنے کے لیے ہی زندہ تھا۔“

”فکر مت کرو۔ شاہی طبیب تمہارا علاج کرے گا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

”اب کوئی فائدہ نہیں۔ بس آپ سے ایک التجا ہے کہ مجھے معاف فرمادیں۔ میں آپ کا مجرم ہوں۔ خان جہاں نے جو سازش آپ کے لیے تیار کی تھی اور آپ کے والد گرامی کو

آپ کے خلاف بھڑکایا تھا، اس میں میں بھی شریک تھا بلکہ اس سازش کا خالق میں ہی تھا۔“

نوروز یہیں تک کہنے پایا تھا کہ اس کی سانس اکھڑ گئی۔ اس کی روح نفسِ غصہ سے پرواز کر گئی۔ بادشاہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

”میرے مجرم! میں نے تجھے معاف کیا۔“

☆☆☆

ہمایوں خاں کا لشکر کوئٹہ سے گزر رہا تھا کہ ابو بکر شاہ نے شاہی غلاموں کی مدد سے ہمایوں کے لشکر پر شب خون مارا۔ اس چھاپے میں لشکر کے بہت سے سپاہی زخمی ہو گئے۔ ہمایوں خاں نے کمال بہادری کا مظاہرہ کیا۔ زخمی سانپ کی طرح پلٹا اور لشکر کو ساتھ لے کر اندھیرے کو چیر دیا۔ ابو بکر شاہ نے جو دیکھا کہ تعاقب ہو رہا ہے تو وہ بھی ایڑیوں کے بل گھوم گیا اور صفِ آراء ہو کر مقابلے پر آ گیا۔ اندھیرا ایسا تھا کہ اپنے پرانے کی پہچان نہیں ہو رہی تھی۔ ابو بکر شاہ تھوڑی دیر تو ڈٹا رہا اور پھر بھاگ کر کوئٹہ کے قلعے میں جا چھپا۔

جب یہ خبر ناصر الدین تک پہنچی تو وہ بھی کوچ پر کوچ کرتا ہوا پہنچ گیا۔ اب ابو بکر شاہ کے سامنے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ امان طلب کرے۔ ابو بکر اس کے سامنے پیش ہو گیا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ ناصر الدین نے اس کی معافی قبول نہیں کی اور قلعہ میوات میں قید کر دیا۔ یہ وہی قلعہ تھا جہاں وہ خود بھی پناہ لے چکا تھا۔

اسی قلعے میں اور اسی قید کے دوران، آزادی کا منہ دیکھے بغیر ابو بکر شاہ کی وفات ہوئی۔

☆☆☆

بادشاہِ دہلی سلطان فیروز شاہ نے فرحت الملک کو مفرت الملک کا خطاب دے کر گجرات کا صاحبِ اختیار حاکم بنا دیا تھا ناصر الدین نے بھی تخت نشین ہونے کے بعد اسے اس کے عہدے پر بحال رکھا لیکن اب اس کی نیت میں کھوٹ آ گئی تھی۔ اس کا ارادہ دہلی پر قبضہ کرنے کا تھا اس لیے اس نے گجرات کے زمینداروں اور غیر مسلموں سے بڑا اچھا برتاؤ کیا اور انہیں اپنا ہی خواہ بنالیا۔ ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے وہ ایسی رسومات کو بھی مروج ہونے دیتا تھا جو اسلام کے خلاف تھیں۔ اس کے اس رویے سے گجرات کے تمام علما اس کے خلاف ہو گئے۔ ان علما نے ناصر الدین کی خدمت میں یہ عریضہ روانہ کیا۔

”فرحت الملک اس وقت ہوس پرستی مبتلا ہے۔ خود غرضی اور مطلب پرستی اس کا شیوہ ہے وہ غیر مسلموں اور ان کے

مذہب کی اس قدر طرف داری کر رہا ہے کہ اس وقت سومنات مندر بت پرستوں کا ٹھکانا بنا ہوا ہے۔ اسلامی اصولوں اور احکامات کی پابندی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ مسجدوں میں کہیں نمازی نظر نہیں آتے۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر حضور سے التجا ہے کہ اسلام کی تقویت اور احکامِ شریعت کے نفاذ کے لیے جلد از جلد کوئی قدم اٹھایا جائے ورنہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

یہ عریضہ پڑھ کر ناصر الدین کی غیرتِ ایمانی نے جوش مارا اور گجرات میں دینِ اسلام کے احکام کی حفاظت کی تدبیریں سوچنے لگا۔ بہت غور و فکر کے بعد اس نے گجرات کی حکومت اپنے ایک امیرِ اعظم ہمایوں ظفر خاں کے سپرد کی۔

اعظم ہمایوں کو شاہی بارگاہ سے خلعتِ خاص عنایت ہوا نیز چتر سفید اور سرخ بارگاہ (جو بادشاہوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے) سے نوازا گیا تاکہ اس کے مرتبے اور شان میں اضافہ ہو۔ اعظم ہمایوں اس شان و شوکت کے ساتھ روانہ ہوا۔

ناصر الدین اسے الوداع کہنے کے لیے خود آیا۔ اعظم ہمایوں سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا ناگور پہنچا تو وہاں کے باشندے صوبہ دار گجرات کے مظالم کی شکایت لے کر اس کی خدمت میں آئے۔ اس نے ان لوگوں کو تسلی دی اور مفرح الملک کے نام یہ خط لکھا۔

”سلطان محمد شاہ ناصر الدین کو یہ خبر ملی ہے کہ تم نے چند سال کا محصول سرکاری خزانے میں جمع کروانے کے بجائے اپنی ذات پر خرچ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک عرصے سے تم رعایا کو بھی نثارِ ستم بنا رہے ہو۔ اب بادشاہ نے اس ملک کی حکومت اور یہاں کا انتظام میرے حوالے کیا ہے لہذا تمہارے لیے بہتر ہے کہ محصول کی رقم جو تمہارے پاس موجود ہے، جلد از جلد دہلی روانہ کر دو اور اس کے بعد خود بھی دہلی روانہ ہو جاؤ۔“

اس خط کے جواب میں مفرح الملک نے لکھا۔

”تم جہاں تک آگئے ہو ٹھیک ہے لیکن اس سے ایک قدم بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں دہلی آ کر سارا حساب سامنے رکھ دوں گا بشرطیکہ تم مجھے شاہی موکلوں کے سپرد کر دو۔“

اس جواب کے بعد ظفر خاں کو اس کی سرکشی کا مکمل یقین ہو گیا۔ وہ اور آگے بڑھا اور احمد آباد پہنچ گیا۔ فرحت الملک مفرح نے گجراتیوں اور اس علاقے کے غیر مسلموں سے ساز باز کر کے دس بارہ ہزار سپاہیوں کا ایک لشکر جمع کر لیا اور لڑائی کے لیے آمادہ ہو گیا۔

الک دور تھا

ظفر خاں نے ایک مرتبہ پھر اسے خط لکھ کر سمجھانے کی کوشش کی۔

”اپنی قوت پر مغرور ہو کر اپنے آقا سے غداری کرنا تمہارے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ تمہارے لیے دو ہی صورتیں ہیں یا تو دہلی چلے جاؤ یا میرے پاس آ کر طبقہ امرا میں شامل ہو جاؤ۔ کوئی اور راستہ اختیار کیا تو نتائج کے ذمے دار تم خود ہو گے۔“

فرحت الملک نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ وہ خود مختاری کے خواب دیکھ رہا تھا۔

ظفر خاں نے بھی اس کی بے حسی دیکھ کر اپنا لشکر درست کرنا شروع کر دیا اور تیاری کے بعد ایک مقام ”نہروالہ“ کی طرف بڑھا۔ فرحت الملک بھی آگے بڑھا اور ایک مقام پر دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ زبردست جنگ ہوئی جس میں فرحت الملک کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر نہروالہ میں قلعہ بند ہو گیا۔

ظفر خاں نہروالہ میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے عدل و انصاف سے رعایا کو بہت خوش کیا۔ اس کے بعد وہ کنپایت گیا۔ اس شہر میں تاجر اور مسافر آباد تھے۔ اس نے باشندوں کی تکالیف دور کیں اور حکام اور قاضی مقرر کر کے نہروالہ واپس آ گیا۔

فرحت الملک کی بے جا رعایتوں نے غیر مسلم رعایا اور حکمرانوں کو سرکش بنا دیا تھا۔ ظفر خاں کی عمل داری ہوئی تو ان کی آزادی میں فرق پڑا اور وہ ظفر خاں کے خلاف ہو گئے۔ مسلمانوں پر ظلم ڈھانے لگے۔ ظفر خاں ان سے جہاد کے لیے نکل گیا۔ قریبی علاقوں کے راجاؤں کو اس نے دھول چٹا دی۔

ظفر خاں نے پورے تین سال اس جہاد میں گزار دیے۔

☆☆☆

ناصر الدین ظفر خاں کو گجرات بھیج کر مطمئن ہو گیا تھا۔ اس کی حکومت کو ایک سال ہو چکا تھا۔ ہر طرف امن تھا۔ وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اب کوئی طاقت اسے للکارنے والی نہیں۔ غلامانِ فیروز شاہی جن کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی، ناصر الدین کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ باقی بچ گئے تھے۔ ان کے سینوں میں اپنے ساتھیوں کے مارے جانے کی آگ جل رہی تھی۔ وہ اٹاؤہ، کوئٹہ اور میوات وغیرہ میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ اب ان میں خود اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ ناصر الدین سے بدلہ لے سکیں۔ اس لیے وہ ہندو راجاؤں کو بھڑکانے میں مصروف تھے۔ انہیں ناصر الدین

کی بزدلی کے فرضی قصے سنا سنا کر اس سے لڑنے پر آمادہ کر رہے تھے۔ یہ راجا گجرات کے ہندوؤں پر ہونے والے مظالم کے قصے بھی سن رہے تھے۔ ظفر خاں گجرات میں محمود غزنوی کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ دیگر علاقوں کے ہندو راجا دانت پیس رہے تھے۔ اب جو غلامانِ فیروز شاہی کا سہارا ملا تو وہ دہلی پر حکمرانی کے خواب دیکھنے لگے۔ انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں بغاوت کر دی۔

رائے نرسنگھ، جیت سنگھ راٹھور، بیر بھان وغیرہ کی بغاوت کی خبریں پہنچیں۔ ناصر الدین نے جب ان کی سرکشی کا واقعہ سنا تو اسلام خاں کو ان باغیوں کے سردار رائے سنگھ کو تھک کرنے کے لیے بھیجا۔

”رائے نرسنگھ ان باغیوں کی پشت پر ہے۔ اگر اس کا قصہ پاک ہو جائے تو باقی باغی یا تو دبا کر بیٹھ جائیں گے یا کمزور ہو جائیں گے۔“

اس نے شاہی فوج کے سامنے صفِ آرائی کی اور برسرِ پیکار ہوا مگر اس کی فوج کو شکست ہوئی۔ رائے نرسنگھ رحم و کرم کا طلب گار تھا۔ فریقین میں جتنے باغی راجا تھے، ان سب نے عہد کیا کہ وہ ناصر الدین بادشاہ کے خلاف بھی بغاوت نہیں کریں گے اور ہمیشہ راجا کے حلقہ بگوشوں میں شامل رہیں گے۔ اسلام خاں کو ان فسادوں کے وعدوں پر یقین نہیں تھا۔ وہ انہیں اپنے ساتھ قوت لے گیا اور کسی بہانے سے ان سب کو قتل کر دیا۔ ان میں سے ایک رائے سیرنچ کر لکل بھاگا اور اپنے علاقے ”اٹاؤہ“ پہنچ گیا۔

رائے سیر نے اٹاؤہ پہنچتے ہی قلعہ ”تھارام“ کے آس پاس کے پرگنوں کو برباد کرنا شروع کر دیا۔ بادشاہ نے جب یہ سنا تو اس قلعے کی فتح کئی کے لیے خود آگے بڑھا اور اٹاؤہ کے قلعے کو برباد کر کے قوت آ گیا۔ اسلام خاں اس وقت تک دہلی واپس چلا گیا تھا۔

بادشاہ نے قوت کے اطراف و جوانب کو فتح کیا اور جالیسر پہنچ گیا۔ بادشاہ اس سرزمین کو اپنے لیے مبارک سمجھتا تھا۔ اس سرزمین نے اسے کئی مرتبہ پناہ دی تھی۔ بادشاہ نے اس سرزمین پر ایک قلعہ بنوایا اور اس کا نام ”محمد آباد“ رکھا۔ وہ ابھی جالیسر میں تھا کہ اس کے مقرر کردہ خواجہ جہاں کا عریضہ اس کے پاس پہنچا۔ عریضے کی عبارت ہی ایسی تھی کہ اس کا خون کھول اٹھا۔ اس عریضے میں لکھا تھا۔

”اسلام خاں کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ بہت جلد وہ لاہور پہنچ کر بغاوت کرنے والا ہے۔“

عریضہ پڑھتے ہی وہ دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ دہلی

ساڑھے گیارہ بجے والی ملاقات کی تیاری کرنے لگا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ وہ کسی سے ملنے سے پہلے اپنے سیاہ بالوں میں گتھی ضرور کرتا۔

کمپیوٹر اسکرین پر جان رچرڈ کیل کے بارے میں تمام معلومات آگئی تھیں۔ اسے ڈاک زنی اور حملہ کرنے کے

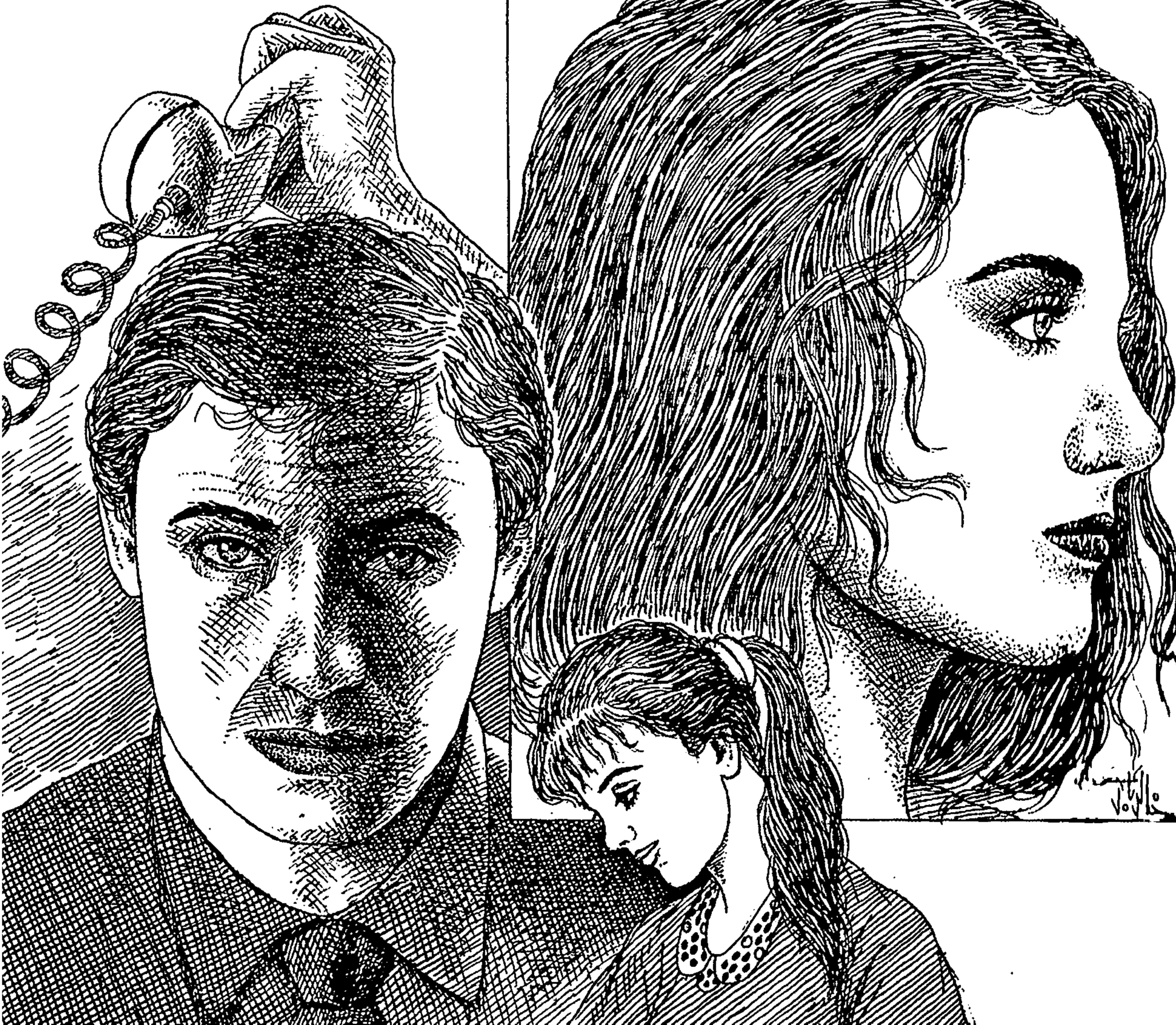
مائیکل بروڈی ایک خوش مزاج اور ملنسار شخص تھا اس لیے دفتر کے ساتھی اس کا حال چال معلوم کرنے آتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی تین افراد اس کے کمرے میں آئے اور معمول کی چھیڑ چھاڑ کرنے کے بعد چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اس نے اپنے دفتر کا دروازہ بند کیا اور

چاہت کے جال میں محبوب کو قید کرنے کا دلچسپ احوال

یہ تو عام سی بات ہے ... خوش مزاج انسان کا حال چال سب پوچھتے ہیں اور بد مزاج انسان کے چال چلن پر نظر رکھتے ہیں لیکن عجیب حالات اس وقت جنم لیتے ہیں جب کوئی شخص خوش مزاجی کا لبادہ اوڑھ کر کسی گھناؤنے جرم کا ارتکاب کر لے ... ایسے میں کسی کو یقین نہیں ہوتا اور قانون اصل مجرم کو تلاش کرتا رہ جاتا ہے۔ یہ بھی انتقام کی ایک صورت ہوتی ہے۔

جواب

تنویر ریاض



شاہ کو شکست ہوئی تھی۔ ناصر الدین نے بہادر شاہ کو معاف کر دیا تھا لیکن ابو بکر شاہ کو قید کر دیا تھا۔ اب وہی بہادر شاہ ناصر الدین کے احسان کو بھلا کر سرکشی پر اتر آیا تھا۔ ناصر الدین اسے سبق سکھانے کے لیے میوات کی طرف روانہ ہوا اور میوات کو تاخت و تاراج کرتا ہوا دور تک چلا گیا۔ بہادر شاہ بھاگ گیا۔ ناصر الدین نے اس کا پیچھا نہیں کیا بلکہ جالیسر چلا گیا۔ یہاں پہنچ کر وہ بیمار پڑ گیا۔ اسی بیماری کی حالت میں اسے معلوم ہوا کہ بہادر شاہ نے دہلی کے بعض پرگنوں کو خوب لوٹا ہے۔ بادشاہ نے بیماری کے باوجود جالیسر سے میوات تک کا سفر کیا۔ بادشاہ کو ٹلہ تک پہنچا تھا کہ بہادر شاہ مقابلے پر آ گیا۔ شاہ کو شکست ہوئی اور وہ حصار کو ٹلہ میں قلعہ بند ہو گیا۔

ناصر الدین اس عمارت کی تکمیل کے لیے پھر جالیسر آ گیا جس کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ صحت یاب ہونے کے بعد لاہور جانے کا ارادہ رکھتا تھا جہاں ایک باغی شیخا کھوکھر نے قلعہ لاہور پر قبضہ کر لیا تھا لیکن بیماری میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور بالآخر 17 ربیع الاول 796ھ کو راسی ملک عدم ہوا۔ اس کی لاش دہلی لائی گئی اور اسے حوض خاص کے کنارے فیروز شاہ کی قبر کے برابر دفن دیا گیا۔

ناصر الدین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں خاں تخت پر بیٹھا مگر وہ بھی بیماری کے سبب صرف ڈیڑھ ماہ حکومت کر سکا۔ اس کی وفات کے بعد مسند نشین التوا کا شکار رہی اور پندرہ دن تک دہلی کا تخت خالی پڑا رہا۔ بد نظمی عروج پر پہنچ گئی بالآخر ناصر الدین کا سب سے چھوٹا بیٹا محمود حکمرانی کے لیے چنا گیا۔ اس کا لقب ناصر الدین قرار پایا۔ وہ ناصر الدین محمود ہو گیا.....

دہلی میں مختلف ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ایک طرح کا انقلاب آچکا تھا۔ سلطنت کی مضبوطی اور طاقت ختم ہو چکی تھی۔ ملک میں چاروں طرف سرکشی اور بغاوت کی آگ پھیل رہی تھی۔ ہندو ہر طرف خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرنے میں مصروف تھے۔

اس بادشاہ نے باوجود مشکلات کے بیس سال حکومت کی۔ اس کے انتقال کے ساتھ ہی گویا شہاب الدین غوری کے غلاموں کی حکومت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور غلامان ترک کے ہاتھ سے حکمرانی جاتی رہی۔

ماخذات:

تاریخ فرشتہ۔ تاریخ فیروز شاہی۔ طبقات اکبری۔ تاریخ سندھ (جلد اول)

پہنچتے ہی اس نے اسلام خاں کو طلب کر کے باز پرس کی۔ ”بارگاہ شاہی میں یہ خبر پہنچی ہے کہ تم مابدولت سے بغاوت کا ارادہ رکھتے ہو اور لاہور پہنچ کر بغاوت کا اعلان کرنے والے ہو۔ کیا ہماری مہربانیوں کا یہی صلہ ہے جو تم ہمیں دینے والے ہو۔“

”حضور! یہ کسی نے بد خبر اڑائی ہے۔ مقصد یہی ہے کہ آپ مجھ سے متنفر ہو جائیں اور عنایات کے دروازے مجھ پر بند ہو جائیں۔ میں اگر یہ خیال بھی کروں تو آپ کی تلوار اور میری گردن ہو۔“

”اب تم جا سکتے ہو لیکن اس وقت تک نظر بند رہو گے جب تک ہم مزید گفتیش نہیں کر لیتے۔“

اسلام خاں کے چلے جانے کے بعد بادشاہ نے اپنے عہدے دار خواجہ جہاں کو طلب کیا اور اسے اسلام خاں کے جواب سے آگاہ کیا۔

”جہاں پناہ! کبھی کوئی مجرم اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے‘ جب تک اسے رنگے ہاتھوں نہ پکڑا جائے۔“

”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اسلام خاں پہلے بغاوت کا اعلان کرے، اس کے بعد ہم اس پر ہاتھ ڈالیں۔“

”ہرگز نہیں۔ میرے پاس ایسے گواہ موجود ہیں جن کے سامنے اس نے اپنے ارادے کا اظہار کیا تھا۔“

”ہم ان گواہوں سے خود بات کرنا چاہیں گے۔“

خان جہاں نے دو گواہ پیش کر دیے۔ ان میں سے ایک اسلام خاں کا بھتیجا تھا۔ ان دونوں نے گواہی دی کہ اطلاع صحیح ہے۔ اسلام خاں نے اپنی زبان سے اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا اور ایک دونوں میں وہ لاہور روانہ ہونے والا تھا۔

ان گواہوں نے کچھ اور ایسی باتیں بتائیں کہ بادشاہ کو اسلام خاں کی طرف سے بالکل ہی متنفر کر دیا۔ بادشاہ پہلے ہی خوفزدہ تھا، ان گواہوں کی بات سچ سمجھ کر اسلام خاں کو قتل کرادیا۔

یہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ گواہ جھوٹے تھے۔ خواجہ جہاں کی سازش کامیاب ہو گئی۔ اب وہ بادشاہ کا دست راست بن گیا اور اسے وزارت کا عہدہ مل گیا۔

ناصر الدین شاہ نے جن دنوں دہلی پر قبضہ کیا تھا تو ابو بکر شاہ بھاگ کر بہادر شاہ کے پاس میوات چلا گیا تھا۔ بہادر شاہ اور ابو بکر شاہ اس کے مقابلے پر آئے تھے۔ ابو بکر

الزام میں ساڑھے پانچ سال کی سزا ہوئی تھی اور اب وہ پیرول پر رہا ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک نوجوان عورت پر تشدد کرنے کا مرتکب ٹھہرایا گیا تھا جو اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ شادی شدہ تھا اور تیس سالہ سوزن جیل میں اس سے ملنے اکثر آتی رہتی تھی۔

اس کا صبح سویرے طبی معائنہ ہو گیا تھا اور اس کی تمام رپورٹیں ٹھیک تھیں۔ پیرول آفس کی میٹنگ سے پہلے یہ لیبارٹری ٹیسٹ ہونا لازمی تھے۔ جب انتظامی افسرینسی ڈیلن نے اس کے دروازے پر دستک دے کر کہا: ”جان کیل آگیا ہے“ تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے معدے میں جلن شروع ہو گئی ہے۔ اس نے بادل ناخواستہ کہا: ”اسے اندر بھیج دو۔“

تقریباً چھ سال جیل میں گزارنے کے باوجود کیل کی شخصیت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اب بھی اس کی چال میں پہلے جیسی اکڑ اور آنکھوں کی چمک نمایاں تھی۔ وہ خاصا خوش شکل شخص تھا اور بہت سی عورتیں اس پر مرمی ہوں گی۔ پیرول آفیسر کے پاس یہ اس کی پہلی پیشی تھی اس لیے وہ اسے متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے استری شدہ سفید قمیص اور نیلی پتلون پہن رکھی تھی اور اس کے جسم سے بروٹ کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

”میں خود کو خاصا گھبرایا ہوا محسوس کر رہا ہوں مسٹر بروڈی۔“

”اس میں گھبرانے والی کوئی بات نہیں مسٹر..... کیا میں تمہیں جان کہہ کر بلا سکتا ہوں؟“

”یقیناً مسٹر بروڈی!“

”تم بھی مجھے مائیکل کے نام سے بلاؤ۔ کافی پیو گے؟“

”ضرور۔“

بروڈی نے کافی کے دو کپ بنائے اور کیل سے پوچھا کہ جیل سے باہر پہلا ہفتہ کیسا گزرا؟

”میری ایک بہت ہی پیاری بیوی ہے اس نے اتنے عرصے میرا انتظار کیا۔ بھی طلاق کی بات نہیں کی اور نہ ہی ادھر ادھر گھومتی رہی، ہم وہیں سے اپنی زندگی شروع کر رہے ہیں جہاں اسے چھوڑا تھا۔“

”تم بہت خوش قسمت ہو جان۔“

”تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔“ کیل کافی کا کپ منہ سے لگاتے ہوئے بولا۔

”تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں کس کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔“ اس نے جین اور اس کی بیٹی کی فریم شدہ تصویر کو دیکھ کر سر ہلایا۔

”میں بھی اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہوں۔“ بروڈی نے خوش دلی سے کہا۔

چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بروڈی نے اسے پیرول سسٹم کے بارے میں وضاحت سے بتانا شروع کیا۔ اس نے خاص طور پر مبینے میں ایک ہارٹیلی فون کے ذریعے رابطہ کرنے پر زور دیا تا کہ بروڈی دیکھ سکے کہ پیرول کے قوانین کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی۔ اس کے علاوہ اس نے اسے شراب اور منشیات سے بھی دور رہنے کا مشورہ دیا۔

”شاید تمہارے کچھ پرانے دوست بھی تم سے ملنے آئیں۔“

”کچھ تو پہلے ہی آ چکے ہیں۔ میں نے انہیں رخصت کر دیا۔ اب میں ان سے کوئی تعلق نہیں رکھتا چاہتا کیونکہ میں کبھی بھی جیل واپس نہیں آؤں گا۔ مجھے کافی سبق مل گیا ہے۔“

بروڈی نے میز پر سے ایک کاغذ اٹھاتے ہوئے کہا:

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہیں گاڑیوں کی مرمت کا کام پسند ہے۔“

”ہاں، میرا باپ مکینک تھا اور میں نے اسی سے یہ کام سیکھا تھا۔ میں جیل کے گیراج میں ہفتے کے پانچ دن اور روزانہ سات گھنٹے کام کیا کرتا تھا۔ شاید میں نے اس پورے عرصے میں چار پانچ چھٹیاں ہی کی ہوں گی۔“

بروڈی نے وہ کاغذ اسے پکڑاتے ہوئے کہا: ”اس پر تین جگہوں کے نام، پتے اور ٹیلی فون نمبرز لکھے ہوئے ہیں۔ یہ دکانیں ہمارے پروگرام کا حصہ ہیں۔ یہ ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں جو جیل میں رہے ہوں۔“

”میں تمہارے لیے وقت لے لیتا ہوں۔“

”اگر مجھے فوراً ہی کام مل گیا تو میری بیوی سون بہت خوش ہوگی۔“

”مجھے امید ہے کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک تمہیں رکھ لے گا۔ اس بارے میں مجھے فون کر کے ضرور بتانا۔“

اس کے جانے کے بعد بروڈی نے ایک کافی اور پی پھر ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”ہائے..... وہ ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے۔“

”انٹرویو کیسا رہا؟“

”بالکل ویسا جو تم نے بتایا تھا۔ اسے ایکٹنگ کرنا آتی ہے اور وہ اس میں کامیاب رہا۔ البتہ اس وقت وہ بہت

حیران ہوا جب میں نے اسے بتایا کہ میرے خیال میں اسے مکینک کا کام مل سکتا ہے۔“

”میں اس سے ہمیشہ ماضی میں کہا کرتی تھی کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ کاروں سے محبت کرتا ہے اور اس کے لیے میں تمہاری بہت زیادہ تعریف کروں گی کہ تم کسی بھی شخص سے زیادہ مجھ سے محبت کرتے ہو۔ سوائے اپنی بیٹی کے۔“

”تمہاری بڑی مہربانی کہ ایسا سوچتی ہو۔“

”یہ سچ ہے اور اسی لیے اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ تمہیں کچھ کرنا ہوگا تا کہ ہماری شادی ہو جائے۔“

”سون! میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہمیں اس معاملے میں جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ کیری کو دوبارہ مسئلہ ہو گیا ہے اور ڈاکٹر وولٹر کا کہنا ہے کہ ہمیں غیر معمولی احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔“

چار مہینے پہلے اس نے اپنے ارد گرد گھیرا تنگ ہوتے دیکھ کر اپنی نو سالہ بیٹی کیری کی دماغی بیماری کی کہانی گھڑی تھی اور اس نے ایک فرضی ڈاکٹر وولٹر بھی دریافت کر لیا تھا۔

اس نے سون کو بتا دیا کہ وہ فی الحال بیوی سے طلاق کی بات نہیں کر سکتا کیونکہ ڈاکٹر نے خبردار کیا تھا کہ اگر ان دونوں میاں بیوی نے کیری کے معاملے میں غیر معمولی احتیاط نہ کی تو کیری کی ذہنی صحت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

”مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔“ سون بولی۔ ”اب تم مجھ سے مل بھی نہیں سکتے۔ یہاں تک کہ رات کو فون کرنا بھی تمہارے لیے ممکن نہ ہوگا۔“

”ہم جانتے تھے کہ اس کے جیل سے باہر آنے کے بعد یہی ہوگا۔ ہمیں اس حقیقت کو قبول کر لینا چاہیے۔“

”اس کے باوجود ہم کل دوپہر کی ہوٹل میں مل سکتے ہیں۔“

”بالکل..... کل دو بجے۔“

”کیا ہی اچھا ہو کہ ہماری شادی ہو جائے۔“

”میں خود بھی انتظار نہیں کر سکتا۔“ اس نے جذباتی ہونے کی کوشش کی۔ ”لیکن اب اجازت دو۔ مجھے اور بھی لوگوں کے انٹرویو کرنا ہیں۔“

”میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔“

”میں بھی..... اب کل ملاقات ہوگی۔“

گزشتہ پانچ چھ سالوں میں وہ اپنی بیوی سے اکٹھا ہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ شاید اس کا وزن بڑھ گیا تھا اور کوشش کے باوجود وہ اس میں کمی نہیں کر سکی لیکن سون کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح جین میں کشش محسوس کرنے لگا تھا اور اس کا حاکمانہ انداز

جس سے اسے ہمیشہ نفرت تھی، اب اچھا لگنے لگا تھا۔ اسے اعتراف تھا کہ اس کے دیے ہوئے مشورے زیادہ تر مفید ثابت ہوتے تھے۔

سون کے ساتھ اس کا معاشرے ایک سوچا سمجھا خطرہ تھا۔ وہ اکثر محسوس کرتا تھا کہ اسے اس سے جان چھڑالینا چاہیے۔ اس نے بھی اس امکان پر غور نہیں کیا کہ اس کی زندگی میں دو عورتوں کا کردار اٹھانا ہو جائے گا۔ اب سون اسے بور گئے لگی تھی اور اس سے جان چھڑانا ضروری ہو گیا تھا۔

سون کے آنے سے تین ماہ قبل اس نے پہلی بار کسی سے ناجائز تعلق قائم کیا۔ اس کے دفتر میں کرسمس پارٹی تھی جس میں جین اپنی بیٹی کی بیماری کی وجہ سے شریک نہ ہو سکی۔

بروڈی نشے میں دھت اسٹاک روم میں چلا گیا جہاں اس کا ٹکراؤ جج آفس کی سیکریٹری سے ہوا۔ وہ اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن اس سے کبھی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے اپنے گھر لے گئی اور صبح جب وہ سو کر اٹھا تو اسے شرمندگی نہیں تھی بلکہ طلب اور بڑھ گئی تھی۔

لیکن گھریلو زندگی اور کام کے ساتھ کسی اور سے تعلق قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بھی بار نہیں جاتا تھا اور دفتر میں کسی کے ساتھ انفر چلانا مناسب نہیں تھا۔ وہ عورت اسے دو تین مرتبہ نظر آئی لیکن وہ کچھ شرمندہ سی تھی پھر سون اس کی زندگی میں آگئی۔ اس نے ایک بہت پرانا کوٹ پہن رکھا تھا اور وہ اسے اتنی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اسے پسند آ گیا ہو۔

اس نے بتایا کہ وہ ایک ریسٹوران میں ویٹرس تھی۔ سڑک پار کرتے ہوئے اس کا ایکسڈنٹ ہو گیا اور اب وہ امداد پر گزارہ کر رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ بہت خوب صورت تھی اور جب وہ جانے کے لیے اٹھی تو بروڈی کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ کچھ دیر اور باتیں کرے۔

وہ اپنے شوہر کے پیرول کے بارے میں مشورہ کرنے آئی تھی اور وہ چاہ رہی تھی کہ بروڈی اسے کچھ باتیں بتا دے جو انٹرویو کے دوران اس کے کام آ سکیں۔ اس نے اپنی سہیلی کا نام لے کر کہا کہ اس کے شوہر کو بھی ایسی ہی صورت حال کا سامنا تھا اور بروڈی نے اسے بہت اچھے مشورے دیے تھے۔ بروڈی کو وہ عورت یاد تھی۔ اس نے پیچھا چھڑانے کے لیے سرسری انداز میں کچھ باتیں بتادی تھیں کیونکہ جانتا تھا کہ وہ عورت غلط جگہ پر آئی ہے۔

اچانک ہی سون نے رونا شروع کر دیا۔ بروڈی نے اسے ٹھوپیہ دیا اور تسلی کے کچھ الفاظ کہے۔ وہ اس کے شوہر سے حسد محسوس کر رہا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹا وہاں ٹھہری پھر

اس کا شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔ سارا دن وہ اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتا رہا۔ اگلے دن اس نے سون کو فون کر کے معذرت کی کہ وہ اس کی کچھ زیادہ مدد نہیں کر سکا اور کہا کہ اس نے پیرول بورڈ کے ایک رکن سے رابطہ کیا ہے جس سے اس کی جان پہچان ہے اور اس سے وہ سوالات پوچھتے ہیں جو انٹرویو میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ یہ سب جھوٹ تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اگلے روز دو بجے اس کے ساتھ لچ کے لیے تیار ہو گئی۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ اسی وقت آتی تھی کیونکہ شام پانچ بجے تک کام کا وقفہ ہوتا تھا پھر وہ ٹائٹ شفٹ کے لیے دوبارہ جاتی۔

ڈیڑھ مہینے تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر ان دونوں نے محسوس کیا کہ وہ اچھے دوست بن چکے ہیں اور وہ مکمل طور پر بروڈی پر انحصار کر رہی ہے۔ ایک دن بروڈی نے مشروب کی بوتل خریدی اور اس کے اپارٹمنٹ چلا گیا۔ اس روز وہ کام پر نہیں گئی تھی۔ اس نے اسے مشروب پلایا اور اس کا بوسہ لیتا چاہا لیکن سون نے اسے دور دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے ساتھ یہ حرکت کیسے کر سکتے ہو؟“ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولی۔ ”میں نے کبھی اپنے شو ہر سے بے وفائی نہیں کی۔“

بروڈی نے معذرت کی اور اس کے فلیٹ سے چلا آیا۔ کچھ دنوں بعد اس نے اسے پھر فون کیا اور دوبارہ اس سے معذرت کرتے ہوئے اسے لچ کی دعوت دی۔ پہلے تو وہ ہچکچائی پھر تیار ہو گئی۔ اس طرح لچ کرتے ہوئے ایک مہینہ اور گزر گیا۔ وہ اس سے اچھے دوست کی طرح ملتا رہا۔ اس کے علاوہ کوئی بات نہیں ہوئی پھر ایک دن سون نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”مجھے یہ کہتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا بلکہ ایسا سوچنا بھی مناسب نہیں لیکن میں تمہارے لیے جذبات محسوس کر رہی ہوں اور نہیں جانتی کہ اس بارے میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

تین دن بعد وہ ایک بار پھر اس کے اپارٹمنٹ پہنچ گیا۔ اب دونوں کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ رہی تھی۔ انہوں نے اس ملاقات سے بھرپور لطف اٹھایا پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ مہینے گزر گئے۔ ان کی وابستگی سے لگتا تھا جیسے دونوں برسوں کے پیار سے ہیں۔ معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں تھا۔ وہ قربت کے ہر لمحے سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دل کھول کر قہقہے لگاتے۔ غیر اخلاقی فلمیں دیکھتے جس کی جین کبھی اجازت نہ دیتی۔ اس نے سون کو اس پر بھی راضی کر لیا کہ وہ ایک سیشن کا ٹیپ بنائے

تاکہ جب کبھی وہ ایک دوسرے سے نہ مل سکیں تو یہ ٹیپ اسے ان گزرے ہوئے لمحات کی یاد دلائے گا۔ جین اس بات پر حیران تھی کہ بروڈی اب بہت کم اس کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے اور گھریلو معاملات میں بھی اس کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ کھانے کی میز پر جب بھی جین اس کی مصروفیت یا کیری کے اسکول کے بارے میں کوئی بات کرتی تو وہ فوراً ہی موضوع بدل دیتا جبکہ پہلے وہ ان باتوں کو غور سے سنتا اور اس بارے میں اپنی رائے دیا کرتا تھا۔

اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ جب پہلی بار سون نے اپنے شو ہر سے طلاق لینے اور اس سے شادی کرنے کا اشارہ دیا تھا تو اسے سنجیدگی سے لیتا چاہیے تھا لیکن وہ اپنی عیاشی میں مگن تھا اور صرف اچھا وقت گزارنا چاہ رہا تھا۔

اس کی بے اطمینانی اس وقت سامنے آئی جب سون نے اسے خط لکھنا شروع کیے، حالانکہ ان کے درمیان اس بات پر اتفاق ہو چکا تھا کہ وہ کبھی ایک دوسرے کو ای میل نہیں کریں گے۔ خطوط کے بارے میں تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا لیکن جب وہ اس کے دفتر کے پتے پر آنا شروع ہوئے تو وہ پریشان ہو گیا۔ ان خطوط نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ سون کی جانب سے شادی کے اصرار کو سنجیدگی سے لے۔ دوسری جانب جین کے رویے میں تبدیلی آ چکی تھی اور اس کی گرم جوشی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے ان خطوط کو روٹی کی ٹوکری میں پھینکنا شروع کر دیا۔

انہی دنوں اس نے سون کی جانب سے شادی کے مسلسل اصرار کا دفاع کرنے کے لیے ڈاکٹر وولٹر کا فرضی کردار تخلیق کیا اور کیری کی بیماری کا بہانہ گھڑ لیا۔ اس طرح کچھ عرصے کے لیے اس کی بچت ہو گئی لیکن سون کے خطوط سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کیری کی بیماری زیادہ عرصہ شادی کی گفتگو کو نہیں ٹال سکتی۔

اب وہ اپنے دفتر میں بیٹھا شدت سے یہ آرزو کر رہا تھا کہ اسے دوبارہ کبھی سون کی شکل نہ دیکھنی پڑے۔ وہ جین اور کیری سے بہت محبت کرتا تھا اور خود بھی متوسط طبقے کا ایک باعزت فرد تھا لیکن سون بری طرح اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ وہ اس سے انتقام لینے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس نے امکانات پر غور کرنا شروع کر دیا۔ وہ جین کو خط لکھ سکتی تھی یا اپنے شو ہر کو بتا دیتی لیکن وہ اتنی بے وقوف نہیں تھی۔ اس کے پاس کو ایک خط لکھنا ہی کافی تھا کہ وہ اس سے مشورہ کرنے گئی تھی لیکن اس نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا اور اس کی

مزت سے کھیلتا رہا۔ اس کا نتیجہ ملازمت سے برطرفی کی صورت میں نکلتا لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس کی بہت زیادہ بدنامی ہوتی۔ میڈیا کو تو ایسی خبروں کی تلاش رہتی ہے اور بے چاری کیری اور جین..... ادھر میرے خدا! ان پر کیا گزرے گی؟

آنے والا دن بہت اہم تھا۔ اسے سون سے ملنے ہوٹل جانا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ سون پر واضح کر سکتا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے علیحدہ ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

وہ دونوں ہوٹل کے کمرے میں بستر پر ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ جب جذبات کا طوفان تھا تو بروڈی نے کہا۔ ”ہمیں کیری کو نفسیاتی اسپتال میں داخل کرانا پڑ گیا۔“ وہ اپنی ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے بولا۔ ”میری پیاری بیٹی اب اسپتال میں ہے۔“

”ادھر میرے خدا مجھے یہ سن کر افسوس ہوا لیکن مجھے امید ہے کہ وہاں اس کی طبیعت بہتر ہو جائے گی اور اس سے تمہارے ذہن کو سکون ملے گا۔“

”میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ اس کے بعد وہ اسے کافی دیر تک کیری کی بیماری کی فرضی کہانی سناتا رہا۔ اس نے کچھ ایسا ڈرامائی انداز اختیار کیا کہ وہ ایک مہوٹے سے وقفے کے لیے تیار ہو گئی۔

”اگر تم چاہو تو ہم مزید کچھ وقت ساتھ گزار سکتے ہیں۔“ سون نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں، اب میں جاؤں گا۔ کچھ لوگ دورے پر آرہے ہیں۔ میرا دفتر میں موجود رہنا ضروری ہے۔“

اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی سون کو اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بستر سے اترتی۔ کپڑے پہنے اور بولی۔ ”بہت خوب! پہلے کیری اور اب تمہارا سپر وائزر میں اس میں کہیں بھی فٹ نہیں ہوتی۔ کیا واقعی ایسا ہے؟“

اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے بڑی احتیاط سے قدم اٹھانا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سون مشتعل ہو کر کوئی ایسا قدم اٹھائے جو اس کی بربادی کا سبب بن جائے۔

اس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہم دونوں کے لیے مشکل وقت ہے سون..... لیکن ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے۔ یقین کرو ہمارے درمیان کچھ نہیں بدلا اور ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے۔“

وہ اس کی طرف جھگٹے ہوئے بولی۔ ”یعنی تم اب بھی

مجھ سے محبت کرتے ہو؟“ اس نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا اور انگلی سے اس کے گال کو چھوتے ہوئے بولا۔ ”بالکل۔ اس میں کیا شک ہے۔“ ”اور تم اب بھی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر تیار ہو؟“ ”اگر تم مجھے اچھی طرح جانتیں تو یہ سوال کبھی نہ کرتیں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔“ گوکہ اس نے سون کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا لیکن اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بولا۔ ”بس تمہیں تھوڑا عرصہ صبر کرنا ہوگا۔“

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”تم اور تمہارا صبر۔ کوئی بھی لڑکی اس بارے میں مشکوک ہو سکتی ہے۔“ ”جانتا ہوں لیکن اس وقت مجھے اپنی بیٹی کی فکر ہے۔ مجھے اسپتال جا کر اسٹاف سے ملنا ہے تاکہ یہ اطمینان ہو جائے کہ وہ اچھی جگہ ہے۔“

”اور جین تمہارے ساتھ جائے گی۔“ پھر وہ جلدی سے بولی۔ ”مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے۔ ظاہر ہے وہ تمہارے ساتھ ہی ہوگی۔ تمہاری بیوی جو ہے۔“

اس نے سون کا گال چومتے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔“

رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ کیری کو سوئے ہوئے تین گھنٹے ہو گئے تھے اور وہ جین کے ساتھ قربت کے مزے لوٹ رہا تھا۔

”اگر میں اپنی سہیلیوں کو بتا دوں تو وہ مجھ سے حسد کرنے لگیں گی کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے شہروں کی شکایت کرتی رہتی ہیں۔“

وہ بستر پر لیٹا اپنے آپ کو بہت پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ سون کے ساتھ اس کا تعلق غیر اخلاقی ہونے کے علاوہ اب غیر دلچسپ ہو گیا تھا۔ جنسی تسکین کے علاوہ اس کے ساتھ گزارا ہوا کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جسے یادگار کہا جاسکے۔ اس نے چار دن سے اسے دیکھا اور نہ ہی اس سے بات ہوئی۔ بالآخر وہ اس کا پیغام سمجھ گئی اور یہ تعلق اب ختم ہو چکا تھا۔

اس رات وہ بڑے سکون سے سویا۔ جین بھی اس کی توجہ پا کر بہت خوش تھی پھر اچانک بروڈی کی آنکھ کھل گئی اور وہ پریشان ہو گیا۔ اتنی رات گئے اسے کون فون کر رہا تھا؟ اس نے تکیے کے نیچے دبا ہوا فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے سون بول رہی تھی۔

”بارش ہو رہی ہے۔ اس وقت میں کہاں جاؤں؟“

جین نے پوچھا۔ ”کون ہے ہنی؟“
بروڈی نے فون پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے
ساتھ دفتر میں کام کرنے والی لڑکی ہے۔ تم جا کر سو جاؤ۔“
پھر اس نے فون پر سون سے کہا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔“
”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”مجھے افسوس ہے کہ اس نے تمہیں پریشان کیا نینسی
لیکن میں آج اس سے بات نہیں کروں گا۔ اس سے کہہ دو
کہ وہ کل صبح تک انتظار کرے اور اس میں کم از کم اتنی
جرات تو ہونی چاہیے کہ مجھے براہ راست فون کرے۔“
”اس نے آج رات پہلی بار شراب پی اور مجھ پر
الزام لگایا کہ جب وہ جیل میں تھا تو میں نے اس سے بے
وفائی کی۔ وہ پہلے بھی مجھے مارنے سے پہلے ایسی ہی باتیں کیا
کرتا تھا اسی لیے میں وہاں سے نکل آئی اور اب سمجھ نہیں آ رہا
کہ میں کہاں جاؤں۔“

”مجھے افسوس ہے نینسی کہ اس نے سب کچھ تم پر ڈال
دیا لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ آج رات کچھ نہیں کر سکتا۔ ہم
کل صبح اس معاملے کو دیکھیں گے۔ اب ہم دونوں کو کچھ دیر
کے لیے سو جانا چاہیے۔“

جب وہ دوبارہ بستر پر لیٹا تو جین نے پوچھا۔ ”سب
کچھ ٹھیک تو ہے؟“

”میرا ایک کلائنٹ پارٹی میں بدست ہو گیا تھا۔
پولیس آئی تو وہ ان سے بھی الجھ گیا۔ لہذا وہ اسے شراب پی کر
غل غماز کرنے کے الزام میں پکڑ کر لے گئے۔ اس نے
نینسی کو فون کیا تو وہ اس کی مدد پر آمادہ ہو گئی۔ وہ براہ
راست مجھے فون کرنے سے ڈر رہا تھا۔ اس لیے وہ چاہ رہا تھا
کہ نینسی مجھ سے سفارش کرے۔ اس کی بیوی نے اسے گھر
سے نکال دیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے گھر فون
کروں۔“

وہ اس سے پلٹتے ہوئے بولی۔ ”تم واقعی بہت اچھے
انسان ہو۔“

مہینے کی دوسری جمعرات کو صبح اسٹاف کی میننگ ہوا
کرتی تھی۔ اس سے فارغ ہوا تو دوسری مصروفیات شروع
ہو گئیں۔ سہ پہر تک وہ بری طرح تھک چکا تھا اور اب اسے
گھر جانے کی جلدی ہو رہی تھی لیکن عین اسی وقت سون کا
فون آ گیا۔

”میں نے گزشتہ رات تمہیں فون کیا تھا۔ دراصل میں
اپنے آپ کو بے یار و مددگار محسوس کر رہی تھی۔“
”میں اس معاملے میں کیا کر سکتا تھا؟“

”یہ صرف ایک رات کی بات نہیں ہے۔ تم مجھ سے
دور ہوتے جا رہے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“ پھر وہ
اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ ”میں نے سن لیا تھا
جب تم نے اسے سوئی کہا کہ بلایا۔ گوکہ تم نے فون پر ہاتھ
رکھا ہوا تھا لیکن پھر بھی میں نے سن لیا۔“

”سون! اس وقت میرے لیے تم سے بات کرنا
مشکل ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میں کام کر رہا ہوں۔“
”یہ بھی جھوٹ ہے۔ میں نے جب بھی تمہیں دفتر فون
کیا تو ہمارے درمیان ہر موضوع پر بات ہوئی تھی۔ یہاں تک
کہ ہم انتہائی ذاتی نوعیت کی گفتگو بھی کرتے تھے۔“
وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی اس لیے اس کے پاس تردید
کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔
”مجھے صرف سچ بتا دو مائیکل..... کیا واقعی سب کچھ ختم
ہو گیا ہے؟“

اس کے لیے سچ بتانا بہت آسان تھا لیکن وہ اپنے دکھ
کی وجہ سے خطرناک ہو رہی تھی اور وہ اس سے ڈر رہا تھا۔ وہ
کچھ بھی کر سکتی تھی۔ لہذا اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔
”تم جانتی ہو کہ میں کیری کی وجہ سے کتنا پریشان ہوں۔“

”اوہ کیری..... کیری..... کیری۔“ اس نے غصے سے
کہا پھر اچانک نرم ہوتے ہوئے بولی۔ ”معاف کرنا۔ مجھے
یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ مائیکل پلیز! مجھے معاف کر دو۔“
”میں جانتا ہوں کہ تمہارا یہ مطلب نہیں تھا۔ چلو کوئی
بات نہیں۔“

”مجھے لگتا ہے کہ میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا
ہے۔ ہمارے منصوبے، شادی.....“

”کچھ ختم نہیں ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری بات کا
یقین کر لو۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تمہاری آواز بھی پہلے جیسی نہیں
رہی۔ اس میں وہ محبت نہیں رہی۔ میں بے وقوف نہیں ہوں۔“
”سون! تم بے وقوف نہیں ہو لیکن غلط تصور کر رہی ہو۔“
”کاش، میں اس پر یقین کر سکتی۔“

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔ ”میں نہیں
جانتی کہ کیا کروں۔ مجھے طرح طرح کے خیالات پریشان
کر رہے ہیں اور میں ان سے چھٹکارا نہیں پاسکتی۔“
”کوئی حماقت مت کرنا۔ مجھ سے وعدہ کرو۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ اپنی بات پر قائم نہ رہوں اور
تمہیں چھوڑ دوں۔“
”سون! تمہیں پرسکون رہنے کی ضرورت ہے۔“

”شاید میں تمہارے پیارے ڈاکٹر وولٹر کو فون
کروں۔ وہی مجھے پرسکون رکھ سکتا ہے۔“
بروڈی نے دل میں سوچا کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ ڈاکٹر
وولٹر کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

”کسی صلاح کار سے مشورہ کرنے کے بارے میں
کیا رائے ہے؟“
”اوہ جنہم میں جاؤ مائیکل۔ سب کچھ ختم ہو گیا اور تم یہ
اچھی طرح جانتے ہو۔“

گفتگو ختم ہونے کے دس منٹ بعد بھی وہ صدمے کی
کیفیت میں بیٹھا رہا۔ اس کی شادی، ملازمت اور مستقبل سب
داؤ پر لگا ہوا تھا۔ اوہ میرے خدا۔ اگر عشق کرنا ہی تھا تو کسی ایسی
عورت سے کیوں نہ کیا جس کا شوہر اس کا کلائنٹ نہ ہوتا کہ وہ
تعلق ختم ہونے کے بعد اس کے لیے خطرہ نہ بن جاتی۔

پھر اس نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ
شاید سون پرسکون ہو جائے۔ پرانے تعلق کا خیال کرتے
ہوئے وہ یہ سمجھ لے کہ بروڈی کو تباہ کرنے سے اسے کچھ
حاصل نہیں ہوگا جیسا کہ اس نے خود کہا کہ ان کا تعلق ختم
ہو چکا ہے اور کوئی چیز انہیں دوبارہ یکجا نہیں کر سکتی۔

وہ دفتر سے اٹھنے ہی والا تھا کہ جین کا فون آ گیا۔
”میں ابھی ابھی دفتر سے گھر پہنچی ہوں اور ہماری پیاری بیٹی
کیری نے تجویز پیش کی ہے کہ کیونکہ میں بہت تھک چکی
ہوں اس لیے ہمیں ڈنر کے لیے کہیں باہر جانا چاہیے۔ وہ یہ
سب میری خاطر کر رہی ہے۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تو
بروڈی کے رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

اگلے دو روز تک بروڈی صبح کام پر جانے سے پہلے
سکون کی گولی لیتا رہا۔ اس نے ایک سال پہلے کام کی زیادتی
سے ہونے والے دباؤ کی وجہ سے اس دوا کا استعمال شروع کیا
تھا لیکن طبیعت بحال ہونے پر وہ اسے المیاری میں رکھ کر بھول
گیا تھا۔ اب اس کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ جب بھی اس کی
اسٹنٹ کہتی کہ اس کا فون ہے تو اس کے پیٹ میں مردوڑ اٹھنے
لگتے۔ وہ جب بھی پارکنگ لاث میں کھڑی اپنی کار کی طرف
جاتا تو اسے یہی ڈر رہتا کہ وہ اچانک ہی کہیں سے آ جائے گی
اور دفتر کے ساتھیوں کے سامنے اس پر چیخنا شروع کر دے
گی۔ وہ جب بھی گھر پر آئی ہوئی ڈاک دیکھتا تو اس کی
نظر اس کی گناہم سفید لفافے کو ڈھونڈتی رہتی۔

گھر کے ٹیلی فون کی کھنٹی بجتی تو اس کا دل تیزی سے
دھڑکنے لگتا۔ ان میں زیادہ فون کیری کے ہوتے۔ وہ اب
بڑی ہو گئی تھی اور اس کی سہیلیاں اسے فون کرتی رہتی

تھیں۔ جین بھی سوشل ورکر تھی اور عموماً رات میں اس کے بھی
تین چار فون آ جاتے۔ اسے یہی خوف تھا کہ اگر سون نے
رات گئے فون کیا تو جین کو شک ہو جائے گا کیونکہ دفتر سے
اسے شاذ و نادر ہی رات میں کوئی فون آتا تھا۔

دوراتوں سے اس کی نیند غائب تھی۔ دوسری رات
اس نے دو گولیاں لیں اور سوچا کہ اگر صبح بھی اس پر غنودگی
طاری رہی تو کافی پی لے گا لیکن دوا کی خوراک بڑھانے
کے باوجود بھی اسے نیند نہیں آئی۔ تیسرے دن وہ یہ تہیہ
کر کے گھر سے نکلا کہ اپنے کام کے علاوہ کچھ نہیں سوچے گا۔
شاید دوا اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ پورا دن خیریت سے گزر گیا۔
نہ تو اس کا فون آیا، نہ وہ پارکنگ لاث میں نظر آئی اور نہ ہی
اس نے کوئی خط بھیجا لیکن رات کے کھانے پر وہ ایک بار پھر
اس کے حواسوں پر چھا گئی۔

رات کے کھانے پر جین بولی۔ ”آج ایک عجیب واقعہ
پیش آیا۔ کام زیادہ ہونے کی وجہ سے مجھے سچ کرنے میں دیر
ہو گئی۔ بہر حال میں ڈھائی بجے دفتر سے باہر نکلی تو میں نے ایک
جوان عورت کو سامنے کھڑے دیکھا۔ میں سمجھی کہ شاید وہ کسی کا
انتظار کر رہی ہے میں جب ریسٹوران پہنچی تو وہ بھی میرے
سامنے والی میز پر آ کر بیٹھ گئی، جب میں سوچ میں پڑ گئی۔
بہر حال اس نے اپنے لیے کافی منگوائی اور وقفے وقفے سے
مجھے دیکھنے لگی پھر وہ اچانک اٹھی اور میری میز کی طرف بڑھنا
شروع کر دیا پھر اس نے قریب آ کر کہا۔ ”مجھے تم سے بات
کرنی ہے۔“ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھے جانتی ہے یا کچھ
بتانا چاہ رہی ہے پھر وہ اچانک رک گئی۔ اس کے بعد مڑی اور
دروازے سے باہر چلی گئی۔“

وہ جین کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا لیکن اسے
وہاں ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی جس سے ظاہر ہوتا کہ
اسے کچھ شک ہو گیا ہے یا سون کا اس کے ساتھ کوئی تعلق
ہے۔ وہ کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی لیکن اسی وقت فون کی کھنٹی
بجی۔ کیری نے لپک کر فون اٹھایا اور بولی۔ ”مما! کیرن
بات کرنا چاہ رہی ہے۔“

اگلے روز بروڈی گیارہ بجے کے قریب اس
ریستوران میں پہنچ گیا جہاں سون کام کرتی تھی۔ وہاں دو
لڑکیاں میز پر لگا رہی تھیں۔ کسی نے اسے نہیں پہچانا کیونکہ وہ
پہلے بھی یہاں نہیں آیا تھا۔ اس نے سون کو دیکھ کر دور سے ہی
اندازہ لگالیا کہ وہ بھی رات کو نہیں سو سکی ہے۔ اس کے
کندھے ڈھلکے ہوئے تھے اور چہرے سے مسکراہٹ غائب
تھی۔ جیسے ہی سون کی نظر اس پر پڑی، وہ تیزی سے چلتی

ہوئی اس کے پاس آئی اور بولی۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“
 ”میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کی وجہ معلوم ہے۔“
 ”مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“
 ”تم نے کل میری بیوی کا پیچھا کیا تھا؟“
 ”یہ ایک آزاد ملک ہے۔“
 ”تم جانتی ہو کہ قانوناً یہ غلط ہے۔“
 ”تو پھر جاؤ..... پولیس کوفون کر دو۔“
 ”تمہیں معلوم ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔“
 ”تم نے مجھ سے کیا ہوا ہر وعدہ توڑ دیا۔“ اس بار اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔
 ”کئی لوگوں کے درمیان تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ یہ تکلیف دہ ضرور ہے لیکن وہ یا گل نہیں ہو جاتے۔“
 ”میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں نے تم پر مکمل بھروسہ کیا تھا۔“
 ”تم صرف اتنا کہہ دو کہ آئندہ ایسا نہیں کرو گی۔ ہمیں اپنی اپنی زندگی گزارنی چاہیے۔“
 ”تمہیں کیا معلوم کہ میں کس حال میں ہوں۔ جان کی ملازمت ختم ہو گئی ہے۔ وہ میرے پرس سے پیسے چراتا ہے اور شراب میں اڑا دیتا ہے۔“
 ”مجھے افسوس ہے۔“
 ”وہ تنگی سے بولی۔ ”تمہیں کسی اور پر نہیں بلکہ اپنے آپ پر افسوس کرنا چاہیے۔“
 ”پلیز سون میری بات سنو۔ اگر تمہاری یہی حرکتیں رہیں تو ہم دونوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔“
 ”مجھے کسی کی پروا نہیں۔“
 اس نے اور بھی کچھ کہا لیکن بروڈی نے نہیں سنا۔ وہ اس کے تصور سے زیادہ غیر مستحکم اور خطرناک نظر آ رہی تھی۔ پھر سب لوگوں نے ایک تھپڑ کی آواز سنی جس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اس کا گال سرخ ہو گیا اور کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ وہ سرعام یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکا اور اس نے سون کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔
 بروڈی اس سے پہلے دو مرتبہ ٹیلی ویژن پر آچکا تھا۔ ایک بار اس نے انٹرویو دیتے پیرول ایجنٹ کے فرائض کے بارے میں بتایا اور دوسری مرتبہ اس نے ایک وکیل اور جج کے ہمراہ پروگرام میں شرکت کی جس میں انہوں نے مجرمانہ زندگی کی طرف لوٹ جانے پر گفتگو کی۔ اس بار چھیل آٹھ ایکشن نیوز کی لیڈ اسٹوری میں بتایا گیا کہ حال ہی میں پیرول پر رہا ہونے والے جان رچرڈ کیل نے اپنے

اپارٹمنٹ میں بیوی کو اتنا مارا کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ پولیس نے اسے سات گھنٹے بعد ایک شراب خانے کے باہر تلاش کیا جہاں اس نے ایک چاقو کے ساتھ پولیس کا سامنا کیا۔ ویڈیو میں کیل کا کلوڑا اب اور شراب خانے کے باہر وہ فٹ پاتھ دکھائی گئی جہاں کیل کی موت واقعی ہوئی تھی۔ اس کے بعد بروڈی نے انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔
 ”یہ واقعی ایک دردناک واقعہ ہے۔ سون ایک یا دو مرتبہ میرے دفتر آئی تھی کیونکہ وہ اپنے شوہر کے غصے سے پریشان تھی۔ اس کے جیل جانے سے پہلے بھی سون نے پولیس کوفون کر کے گھریلو تشدد کی شکایت کی تھی لیکن بعد میں واپس لے لی۔“
 ”کیل خود کیسا تھا؟ اس کے بارے میں تمہارا کیا تاثر ہے؟“
 ”وہ صرف ایک بار میرے سامنے آیا تھا اور دوسرے لوگوں کی طرح اس نے بھی اچھا نظر آنے کی کوشش کی البتہ ایک بات پر وہ بے چین ہو گیا تھا۔“
 ”وہ کیا؟“
 ”اس کا کہنا تھا کہ دوبارہ کوئی بھی اسے جیل نہیں بھیج سکے گا۔“
 ”شاید اسی لیے وہ چاقو لے کر پولیس کے مقابلے پر آ گیا۔ گن کے سامنے چاقو کی کیا حیثیت ہے۔ یہ ایک طرح سے خودکشی ہوئی۔“
 ”ہاں۔“ بروڈی نے کہا۔ ”ایسا ہی لگتا ہے۔“
 پروگرام ختم ہونے پر جین نے کہا۔ ”تم بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔“
 اس نے افسردگی سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا۔“
 جین نے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔
 ”میری خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ جائیں کہ بعض اوقات تمہارا کام کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔“
 ”ہاں۔“ بروڈی نے سوچا اور اس وقت وہ عفریت سے بھی زیادہ خوفناک ہو گیا ہوگا جب اس نے کسی گناہ شخص کا بھیجا ہوا پیکٹ کھولا اور اس میں سے پرانے فیشن کا ویڈیو ٹیپ نکال کر چلایا۔ جس میں اس کی بیوی برہنہ حالت میں نظر نہ آنے والے محبوب کے لیے یوز دے رہی تھی جو کیمرا چلا رہا تھا۔ اس میں خطرہ ضرور تھا لیکن کیل نے وہی کیا جس کی بروڈی کو امید تھی۔ اس نے سون کو تھپڑ کا جواب دے دیا تھا۔



بیمار ذہن

سلیم انور

کبھی کبھی کوئی کیس ایسا بھی فائل ہو جاتا ہے جس کی سطر سطر سرزد ہونے والے جرم کی واضح نشاندہی کرتی ہے، جیسے کہ وہ بھی ٹائم بم لگاتے ہوئے ٹائم کی فکسنگ میں گڑبڑ کر بیٹھا جس کے بعد اس کا برا وقت شروع ہو گیا۔

مغرب سے در آمد شدہ ایک جرم کی مختصر روداد

”تم کہاں تھے؟“ سارجنٹ ولسن نے اس بلے کے ڈھیر اور مسخ شدہ اینٹوں کے پیچھے سے گھوم کر آتے ہوئے کہا جو بھی کیپٹل سٹی بس ٹرمینل کی عقبی دیوار تھی۔ ”میں سمجھا کہ تم یقیناً بیمار ہو گے۔“

سارجنٹ ولسن خفیہ طور پر شرمین ہومز پر انحصار کرتا تھا جو بن بلائے جائے واردات پر خود سے پہنچنے کا عادی تھا۔ اسی لیے سارجنٹ ولسن کو اس بار تین گھنٹے انتظار کرنا بہت کھل گیا تھا اور وہ خاصا بے تاب ہو رہا تھا۔ شرمین کی تاخیر سے آمد

کے باوجود ولسن کا چہرہ کھل اٹھا۔

”سوری اولڈ مین!“ شرمین نے نزلے سے بہنے والی ناک پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ موسم بہار کی الرجی!“

سارجنٹ ولسن نے ان چار آدمیوں کے اسکوڈ کی جانب اشارہ کیا جو ایک سفید شیٹ پر دھات کے جلے ہوئے ٹکڑوں کو اکٹھا کرنے میں مصروف تھے۔ ”ہم ایک لاکر میں رکھا ہوا تھا۔ یہ ٹھیک تین بجے سہ پہر پھٹ گیا۔ چند افراد زخمی تو ہوئے تھے لیکن کوئی زیادہ زخمی نہیں ہوا۔ ہم کامیکزم پرانے طرز کی چابی بھرنے والا کلاک تھا جس کا تار ڈائنامیٹ کی دو اسٹپس سے منسلک کیا گیا تھا۔ اسے الارم کے میکزم سے اس طرح جوڑا گیا تھا کہ تین بجتے ہی یہ خود بہ خود پھٹ پڑے!“

”کیا تمہارے پاس اس کا کوئی جواز موجود ہے؟“

”کوئی ایک کلیو تھی نہیں۔ میرا خیال یہی ہے کہ جس نے بھی یہ بم نصب کیا تھا، اس کا مقصد صرف سنسنی پھیلانا تھا جیسے کہ ہمارا پہلے بھی چند بیمار ذہن آتش زنوں سے واسطہ پڑ چکا ہے۔“

”ہم امید رکھتے ہیں کہ اس سے قبل وہ دوبارہ کوشش کرے، ہم اسے پکڑ لیں۔“ شرمین نے ٹریٹل کے اطراف میں نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”کیا کسی نے دیکھا کہ اس لاکر کو کس نے استعمال کیا تھا؟“

”میں نے ٹریٹل کے ٹائٹ کلرک سے رابطہ کیا ہے۔“

سارجنٹ ولسن نے اس شخص کو قریب آنے کا اشارہ کیا جس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ ”مسٹر پولارڈ! میرے ساتھی کو بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا تھا۔“

”یقیناً۔“ پولارڈ نے اپنے موٹے شیشوں کی عینک درست کرتے ہوئے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”گزشتہ شب لگ بھگ دو بجے کے قریب جب میں اپنے کام پر آ رہا تھا تو میں نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو باہر سامنے ٹیکسی پارک کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ سرخ رنگ کا ایک سفری بیگ اٹھائے اندر آیا اور اسے اس لاکر میں رکھ دیا۔“

سارجنٹ ولسن نے دوبارہ ہاتھ کے اشارے سے بلایا تو مزید دو افراد ان کے ساتھ آ کر شامل ہو گئے۔ ”ہم نے ٹیکسی کمپنیوں کو چیک کیا تو رات دو بجے کے قریب صرف دو ٹیکسیاں اس علاقے میں آئی تھیں۔ بد قسمتی سے مسٹر پولارڈ اس ٹیکسی ڈرائیور کو شناخت نہیں کر پائے جسے انہوں نے سفری بیگ لاکر میں رکھتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”مجھے سرخ رنگ کا سفری بیگ تو یاد رہا لیکن اس شخص کا چہرہ یاد نہیں رہا۔“ پولارڈ نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

پہلا ڈرائیور ایک لائے قد کا صاف ستھرے بالوں والا ایک نو عمر لڑکا تھا جو دیکھنے میں ایسا لگ رہا تھا جیسے حال ہی میں ہائی اسکول سے فارغ ہوا ہو۔

”مجھے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ابھی صرف ایک ماہ ہوا ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”میں نے ایک مسافر کو اتر پورٹ سے اٹھایا تھا اور اسے یہاں کارز پر واقع ہوٹل پر ڈراپ کر دیا تھا۔ یہ لگ بھگ دو بجے رات کی بات ہے۔ پھر میں نے ہائی لینڈ پر واقع گیس اسٹیشن سے ٹیکسی بھروائی اور اپنی شفٹ ختم کر دی۔ اگر یہ شخص یہ کہہ رہا ہے کہ میں یہاں اندر آیا تھا تو یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مجھے کسی بس اسٹیشن میں آئے ہوئے برسوں ہو چکے ہیں۔“

دوسرا ٹیکسی ڈرائیور بھی لگ بھگ اسی قامت کا لیکن ادھیڑ عمر تھا۔ اس کی کمر کی بیلٹ کے نیچے اس کی توند لٹک رہی تھی۔ ”میں نے ایک مسافر کو ٹریٹل کے سامنے اتارا تھا۔“ اس ٹیکسی ڈرائیور نے انہیں بتایا۔ ”اس مسافر کا کہنا تھا کہ وہ دن کے وقت اپنی کار اس ٹریٹل کی پارکنگ لائٹ میں چھوڑ گیا تھا اور اب اسے لینے کے لیے آیا ہے۔ یہ بات رات دو بج کر چند منٹ بعد کی ہے۔ پھر میری ٹیکسی کے ڈسپچر نے مجھے ففٹھ ایونیو کے ایک شراب خانے پر بھیج دیا کہ میں ایک شرابی کو وہاں سے اٹھا لوں لیکن جب میں پہنچا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ ایک شخص نے مجھے ہاتھ لہراتے ہوئے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں اس مسافر کو سوان اسٹریٹ پر واقع ایک آل ٹائٹ ڈائنر پر لے گیا۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں تو یہ سب میری لاگ بک میں موجود ہے۔ تم اسے چیک کر سکتے ہو!“

ہم اسکوڈ کا ایک ممبر ان کے پاس کھڑا ہوا تھا اور کوئی بات کہنے کا منتظر تھا۔ ”ایکسیکو زی، سارجنٹ۔“ اس نے موقع پاتے ہی ولسن کو مخاطب کیا۔ ”ہم ایک سرخ رنگ کے بیگ میں تھا جیسا کہ گواہ نے بتایا ہے۔ سرخ چمڑے کا بیگ۔“

”شکریہ!“ ولسن نے کہا پھر شرمین کی جانب گھوم گیا اور شانے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”اب آگے اور کیا ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ ہوں؟“

”ہمیں بمبار تک پہنچنے کے لیے اتنا کچھ ہی کافی ہے۔“ شرمین نے آسودہ لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا لیکن میں تمہیں یقینی طور پر یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ کون ہے!“

یہ سن کر دونوں ٹیکسی ڈرائیورز، ٹائٹ کلرک اور ہم

اسکوڈ کے افسر کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے جیسے انہیں شرمین کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

سارجنٹ ولسن نے خود کو بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ”میں نے بھی کلیو تلاش کر لیا ہے۔“ اس نے جھوٹ کہا۔ ”لیکن میں چاہتا ہوں کہ ان کو یہ بات بتانے سے تم خود لطف اندوز ہو۔“

”شکریہ۔“ شرمین نے اس کھیل میں اس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر جرم کے مرتکب نے زیادہ پیچیدہ بم کا انتخاب کیا ہوتا تو پھر ہمارا کام اتنا آسان نہ رہ جاتا۔“

”لیکن اسی بات نے تو اسے پیچیدہ بنا دیا تھا۔“ ہم اسکوڈ کے افسر نے اعتراض کیا۔ ”آپ چابی بھرنے والا کلاک کہیں سے بھی خرید سکتے ہیں اور جہاں تک ڈائنامیٹ کی اسٹپس کا تعلق ہے۔۔۔۔۔“

”ہم صرف کلاک تک ہی محدود رہیں تو بہتر ہوگا۔“

شرمین نے اس افسر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ کلاک کی سوئی تھی جس نے آتش گیر مادے کو پھاڑنے کا کام کیا تھا۔۔۔۔۔ درست؟“

”درست۔“

”سو ہم یہ کہتے ہیں کہ اس وقت رات کے دو بجے ہیں اور میں کلاک کا الارم تین بجے پر سیٹ کر دیتا ہوں۔ اب بتاؤ کہ ہم کس وقت پھٹے گا؟ رات تین بجے۔۔۔۔۔ یا اگلے روز سہ پہر تین بجے؟“

”لازمی بات ہے رات تین بجے اور کب؟ اور ایک گھنٹے کے بعد!“

”تو پھر تم اس حقیقت کی وضاحت کس طرح کرو گے کہ جب گواہ نے لاکر میں بم کا بیگ رکھتے ہوئے دیکھا تھا تو وہ ایک گھنٹے بعد پھٹنے کے بجائے تیرہ گھنٹے بعد کیوں پھٹا؟“

ہم اسکوڈ کا افسر اس بات پر اپنا سر کھجانے لگا۔ ”میں

اس کی وجہ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔“

”بالکل ٹھیک۔“ شرمین نے کہا۔ ”اس کی وجہ کسی طریقے سے بیان نہیں کی جاسکتی، ماسوائے اس بات کے کہ ٹائٹ کلرک جھوٹ بول رہا ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ لاکر میں وہ بم اس نے خود نصب کیا تھا۔۔۔۔۔ وہ بھی رات کے تین بجے کے بعد کسی وقت۔“

یہ سنتے ہی سارجنٹ ولسن نے ٹائٹ کلرک کو دو بوج لیا اور اسے تھکڑی پہنا دی۔

توکیب

ملا نصیر الدین خوبصورت خواتین سے گفتگو کا شوق رکھتے تھے۔ لیکن وہ خواتین سے بے تکلف ہونے کے طریقہ کار سے واقف نہیں تھے۔ لہذا انہوں نے ایک دوست سے پوچھا کہ خواتین سے بات چیت کا آغاز کرنے کا طریقہ کار کیا ہے؟ دوست نے کہا۔ ”بہت آسان ترکیب ہے جہاں چند خواتین بیٹھی ہوں وہاں جاییے۔ سلام کے بعد عرض کیجیے کہ آپ شادی شدہ ہیں؟ پھر ان سے پوچھیے بچے کتنے ہیں؟ بس بات چل نکلے گی۔“ ملا نصیر الدین کو یہ ترکیب مناسب، موثر اور کارگر محسوس ہوئی۔ اتفاق سے انہیں ایک تقریب میں جانے کا سنہری موقع مل گیا۔ وہاں انہیں چند لڑکیاں نظر آئیں۔ وہ فوراً وہاں جا پہنچے۔ سلام کیا اور جھٹ سے سوال بھی داغ دیا۔ ”آپ شادی شدہ ہیں؟“ انہوں نے کہا۔ ”نہیں، تو۔“ انہوں نے بنا سوچے سمجھے دوسرا سوال بھی دے مارا۔ ”بچے کتنے ہیں؟“ لڑکیاں آگ بگولہ ہو گئیں۔ ملاجی کی خوب خاطر تواضع ہوئی۔ انہوں نے سوچا شاید سوالات میں الٹ پھیر ہو گیا ہے۔ دوسری جگہ پر انہیں چند خواتین نظر آئیں تو وہاں بھی جا ٹپکے۔ سلام دعا کے بعد پوچھا ”آپ کے کتنے بچے ہیں؟“ انہوں نے باری باری بتایا کہ ہمارے اتنے بچے ہیں۔ یہاں بھی ملانے دوسرا سوال کر ڈالا۔ ”کیا آپ شادی شدہ ہیں؟ یہاں بھی ماحول گرم ہو گیا۔ اب ملا جی آگے آگے اور خواتین پیچھے پیچھے، چنانچہ ملاجی کا شوق کبھی پورا نہ ہو سکا۔

انتخاب: عون عباس بابر، اوکاڑہ



تیسرا حصہ

پاکستان پوائنٹ

اے۔ آر۔ راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جہنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قرار یوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اتراکہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل سے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرنے دیا اور نہ ہی جذبوں کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

شرق و مغرب کے عجب امتزاج اور تاریخی جنوں خیزیوں کے عبرت
اثر اشاروں میں لہرائی دلچسپ داستان



”تو پھر..... تو پھر وہ سب کیا تھا، جب میں اس روز تمہارے خیمے میں داخل ہوئی تھی اور گارشا..... تمہارے بالکل قریب تھی؟“ رینا نے جیسے دبے دبے لفظوں میں شکوہ سا کیا اور شوکی نے اسے دھیرے سے الگ کیا مگر اس کے سنب مرم جیسے بازوؤں کو بدستور تھامے رکھتے ہوئے نہایت رسان مگر مستحکم لہجے میں بولا۔

”یقین کرورینا! وہ گارشا کی دیدہ و دانستہ ایک شرارت تھی کیونکہ میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا اور وہ مجھ سے مواقع تلاشنے کے لیے ہر وقت میرے گلے کا ہار بنے رہنے کی کوشش میں رہتی ہے۔ میں اسے جتنا دھتکارتا ہوں، وہ اتنا ہی میرے قریب ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ اس نے تم سے میرا دل خراب کرنے کی خاطر یہ تک بھی کہا تھا کہ تم..... اور رابرٹ ایک دوسرے کو بچپن سے پسند کرتے ہو..... اور یہ کہ میں تمہیں بھول جاؤں۔“

”اور تم نے اس کی بات کا یقین کر لیا تھا؟“ رینا ہولے سے بولی تھی۔

”ہاں! کیونکہ میں تمہیں اور رابرٹ کو کافی کلوز دیکھنے لگا تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ میرا دل نہیں مانتا تھا کہ یہ سچ بھی ہوگا جو گارشا نے مجھ سے کہا تھا۔“

”گارشا نے واقعی تم سے جھوٹ بولا تھا۔“ رینا نے اس بار اپنی گہری جھیل ایسی نیلی آنکھوں کو جھکاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کچھ نہیں، وہ بس میری ایک مجبوری ہے جس کے باعث میں.....“ وہ کہتے کہتے سانس لینے کو رکھی تھی کہ شوکی نے ایک پریشان کن بے قراری تلے پوچھا۔

”کیسی مجبوری رینا..... مجھے نہیں بتاؤ گی؟“

اس نے کچھ کہنے کے لیے اپنے لب واکیے ہی تھے کہ باہر سے رابرٹ کی آواز ابھری۔

”رینا..... رینا.....!“

شوکی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے، جبکہ رینا ایک دم فکر مند سی ہو گئی اور اسی لہجے میں بولی۔ ”میں اب چلتی ہوں..... دیکھو تم..... اب رابرٹ سے الجھنے کی کوشش مت کرنا..... وقت آنے میں تمہیں سب بتا دوں گی..... چلتی ہوں.....“ وہ جانے لگی مگر شوکی نے اسے نہیں چھوڑا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رینا نے اس کی طرف دیکھا۔ اسے شوکی کا چہرہ جوالا لکھی کی طرح بھڑکتا محسوس ہوا اور پھر رینا نے ایک دم آگے بڑھ کر اپنے نرم و گداز لبوں کا لمس رکھ دیا۔ دونوں کے لب ترساں گویا دو آتشہ بن کر بھڑکے تھے اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے بہت

ہو گیا۔ صرف اظہارِ غم کا نہ کر پانا ہی دل کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا..... بلکہ دل کی بات کا اقرار ممنوعہ بھی بارِ جسم و جاں کہلاتا ہے اور ایسا ہی کچھ معاملہ شوکی کے ساتھ بھی تھا۔ رینا کے اس ذمہ تعارف نے جیسے شوکی کے جذبہ دل کے نہاں خانوں میں چھپے خرمن الفت پر تیلی کا کام کر دیا۔ رینا کے لیے محبت اس کے لیے جنون و فدا اور سودائے عشق کا وہ حاصل تھا جس کی تمنا میں وہ اپنا آپ بھلا بیٹھا تھا۔

شوکی کے دل میں جیسے ایک نئی ترنگ نے کروٹ لی۔ وہ رینا کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اس کی جانب بڑھا اور کہہ بیٹھا۔

”رینا! مجھے اس عذاب سے نجات دلا دو..... میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں..... یہ کہ..... مجھے واقعی تم سے بے حد اور شدید محبت ہو گئی ہے..... میں..... میں تمہاری خاطر مٹ جانا چاہتا ہوں..... میں تمہارے لیے دنیا کا ہر دکہ کسی امرت کی طرح پی جاؤں گا۔“ فرط جذبات تلے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے رینا کے مرمس بازوؤں کو تھام لیا۔ رینا ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ اس کی کشادہ نیلی آنکھوں میں کئی رنگ ایک ساتھ لہرا گئے تھے۔ چہرے کی شکفتہ چمک اور فزوں ہو گئی، گلاب لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ کا ارتعاش ابھرا..... شوکی کے دلی جذبات کا تلاطم کہاں تھا تھا، اس نے دفور جذبات تلے رینا کو خود سے بھی لگا لیا۔ رینا ایک ذرا بھی نہیں مچلی تھی۔ اس کا انداز خود پیردگی بتاتا تھا کہ آتش الفت کی طرف سے دوسری جانب بھی منتقل ہونے لگی تھی۔

”میں اپنے لیے تمہارے جذبات سے اسی دن آگاہ ہو چکی تھی جب تم نے مجھے مارگریٹ کی تیز رفتاری پر گرنے سے بچایا تھا۔“ وہ اس کے ساتھ گویا ایک جاں رہی اور بہت ہولے سے اور بہت سچ سے لہجے میں بولی۔ ”پھونس کے اس ڈھیر پر گرتے ہی تم نے مجھے کسی چوٹ سے بچنے کے لیے خود سے لپٹا لیا تھا اور پھر..... تم بے اختیار ہو کر مجھے چومتے چلے گئے تھے۔“

”رینا! اپنے محبوب کو اس قدر قریب دیکھ کر میں اپنے آپ میں نہ رہا تھا۔ تمہاری قربت نے مجھے بے خود کر کے رکھ دیا تھا۔ جی چاہتا تھا وہ حسین لمحات وہیں رک جاتے، ہم پتھر بن جاتے۔“ شوکی نے ہنوز اسی طرح رینا کو خود سے یوں لپٹائے ہوئے شدید جذبات تلے کہا جیسے ایک لمحے کے لیے اس نے اگر رینا کو خود سے الگ کیا تو وہ اس سے کوسوں دور چلی جائے گی۔

”آیا تھا غصہ.....“ رینا نے ہولے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”تو پھر..... باوجود اس کے آپ مجھے یہ مشورہ دینے چلی آئیں مس رینا حالانکہ یہ مشورہ تو خود آپ کے لیے موزوں ہونا چاہیے۔“ شوکی نے کہا۔ اس کی انجھن آمیز بے قراری نے اور شاید کچھ رینا کے ہلکے پھلکے دوستانہ رویے نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ اس کی بات پر رینا خفیف سے انداز میں مسکرائی اور شوکی اس کی دلفریب مسکراہٹ پر جیسے مسحور سا ہو گیا۔ عجیب سر پھرا عاشق تھا وہ بھی..... محبوب کی ایک ذرا جنبش لطیف نے شوکی کے نبھے دل پر جیسے بارش کی نرم پھوار برساتی تھی۔ اس کا وہ روکھا پن اور مبہم انداز، جو وہ اس کے لیے اکثر اپنے انداز و اطوار میں روارکتی تھی، وہ عنقا ہوتا محسوس ہوا تھا شوکی کو..... وہ آج جیسے اس کے ساتھ کھل کر بات کر رہی تھی۔

”تمہاری بات بھی غلط نہیں ہے لیکن بہر حال میں رابرٹ سے بالکل بھی خوف زدہ نہیں ہوں..... ہاں! ایک شخص سے ضرور ڈر لگتا ہے مجھے.....“ کہتے ہوئے اس نے بڑی معنی خیز نگاہوں سے شوکی کو دیکھا تھا۔

”وہ شخص کون ہے؟“ شوکی نے فوراً پوچھا۔

”تم.....!“ رینا نے جواب دیا۔ اس کے گلاب سی پتھڑیوں پر گدازیت بھری مسکراہٹ جوں کی توں شبنم کی طرح بجی رہی اور شوکی جو اپنے اندر ایک صحرا آباد کیے ہوئے تھا، سیراب ہونے لگا۔ آج جیسے برف پٹھل رہی تھی۔ پتھر کے سنگریزے جھڑ رہے تھے اور اندر سے ایک نئی شبیہ ابھر رہی تھی۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے قدرے حیرانی سے بولا۔

”مجھ سے.....؟“

”ہاں تم سے.....“ رینا کے ہونٹوں کے ساتھ اس کے شفق رنگ گالوں کی قوس قزح بھی جیسے مسکرانے لگی تھی۔

”لیکن مس رینا! میں نے بھلا آپ کو خدا نا خواستہ کب کوئی نقصان پہنچایا ہے؟ بلکہ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا.....“

”مجھے معلوم ہے، بلکہ یقین بھی ہے کہ تم مجھے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، تم تو..... میرے لیے اپنی جان پر ٹھیل جاتے ہو..... اور مجھے اسی بات کا ڈر ہے کہ کہیں میری خاطر تم کسی دن اپنی جان ہی نہ گنوا بیٹھو..... جو مجھے کسی صورت بھی قبول نہیں۔“ اس بار رینا نے شوکی سے یہ الفاظ کسی مسکراہٹ کے بغیر ایک نرم سی متانت میں کہے تھے..... جس میں کسی کی انسیت اور چاہت کا کھلا اعتراف بھی تھا۔ نہ جانے رینا کے لب و لہجے اور الفاظ میں ایسا کیا تھا کہ شوکی کے اندر کا بادیاب جوالا لکھی ایک دم پھٹ پڑنے اور ابلنے کو بے چین

وہ رہنا تھی..... اسے دیکھ کر یکلخت شوکی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ رینا اسے کسی بات پر سرزنش کرنے آئی ہے۔ اسے سخت لہجے میں متنبہ کرے گی لیکن اس نے دیکھا، رینا کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ آنکھوں میں نامعلوم سی اداسی اور گداز لبوں پر بھیدوں بھری خاموشی تھی۔ اسے کچھ حوصلہ ہوا۔

”آ..... آپ.....!“ شوکی کے منہ سے فقط اتنا ہی برآمد ہوا۔

”شوکی.....! تم رابرٹ سے دور ہی رہا کرو۔“ رینا نے اس کی طرف جیسے ویران جنگل کی کسی اداس اور خاموش جھیل ایسی عین نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ شوکی کو اس کی بات عجیب سی لگی تاہم بولا۔

”میں اسے آپ کی نصیحت سمجھوں یا مشورہ؟“

”کچھ بھی سمجھو..... لیکن بس تم اس سے دور ہی رہا کرو۔“ رینا نے پھر دہراتے ہوئے کہا۔

”مجھے بھلا اس کے قریب رہنے کی ضرورت بھی کیا ہے لیکن اس کی نازیبا حرکتیں مجھے پسند نہیں ہیں..... بلکہ کل رات تو اس نے آپ کے ساتھ بھی.....“

”وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“ وہ اس کی بات کا ٹک کر سنجیدگی سے بولی۔ شوکی سمجھ سا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ رینا اس کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ رابرٹ کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اس سے اظہار کرے گی..... اسے اس پر ترجیح دے گی لیکن اس نے تو اسے اپنا ”ذاتی معاملہ“ قرار دے کر جیسے قصہ ہی ختم کر دیا تھا۔

وہ اتنا کہہ کر جانے کے لیے پلٹی تو شوکی بھی نہ رہ سکا۔ کسی بات پر اس کی بے چینی سوا ہونے لگی تو وہ ہولے سے رینا کو پکار بیٹھا۔

”مس رینا۔“ وہ رک گئی اور اس کی جانب پلٹ کر سوالیہ نگاہوں سے ٹکنے لگی۔

”آپ رابرٹ سے کسی بات پر خوف زدہ ہیں.....؟“

شوکی نے اس کے دلکش چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا تو اس نے دیکھا، رینا کے چہرے نے سپاٹ پن ایکایک کر معدوم ہو گیا اور اس کی جگہ ہلکی سی مسکراہٹ نے لے لی، جسے وہ کوئی نام نہیں دے پایا۔

”تم نے کیسے اس بات کا اندازہ قائم کر لیا مسٹر شوکی.....؟“

”کل رات والے واقعے کے بعد جب مجھے رابرٹ کی اس اچھی حرکت پر غصہ آیا تھا تو کیا آپ کو نہیں آیا ہوگا؟“

دھیرے سے الگ کرتے ہوئے رینا نے اس سے بھیدوں بھری سرگوشی میں کہا۔

”آئی لو یو ٹو..... بٹ.....“ وہ آگے نہ کہہ پائی اور فوراً ہی پلٹ کر خیمے سے باہر چلی گئی۔ شوکی جیسے اپنی جگہ بت بنا..... کھڑا رہ گیا۔ رینا کے لبوں کا حلاوت بھرا لہجہ جیسے ابھی تک اسے محسوس ہو رہا تھا۔ اس کیفیت نے جہاں اسے ایک گونہ مسرت سے سرشار سا کر دیا تھا، وہیں اسے ایک تفکر میں بھی مبتلا کر ڈالا تھا..... محبت کی آگ برابر کی تھی تو پھر یہ ”اگر..... مگر“ کیسا تھا؟ کیا رینا، رابرٹ کی طرف سے کسی بلیک میلنگ کا شکار تھی؟ وہ کیوں اس سے ڈرتی تھی؟ یا اس سے کس بات پر درون خانہ خائف سی تھی۔ رینا کی اس سے دانستہ دوری کیا معنی رکھتی تھی، جبکہ اسے شوکی کی محبت اور اس کے دلی جذبات کا اندازہ ہو چکا تھا۔

شوکی نے یہ سب ایک پل میں سوچا اور اسی وقت ایک گہری سانس بھرتے ہوئے خود کلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔

”ہرگز نہیں رینا! میں رابرٹ سے اس وقت تک دور نہیں ہوں گا جب تک کہ تم اس کی غیر مرئی گرفت سے آزاد نہ ہو جاؤ.....“

وہ اپنے کام میں مگن ہو گیا۔ اس کا دل آج محبوب کی قربتوں کی خوشبوؤں سے سرشار ہوا جا رہا تھا۔ رینا نے بھی آج اس سے اپنی محبت کا اظہار کر ڈالا تھا۔ شوکی ایک ملازم تھا مگر آج وہ خود کو دنیا کا امیر ترین آدمی تصور کرنے لگا تھا۔ رینا کی جوانی محبت نے اسے گویا دنیا جہان کی دولت کا مالک بنا دیا تھا مگر رابرٹ والی ”بیچ“ نے اسے ایک طرح کی تفکر آمیز الجھن میں ضرور ڈال دیا تھا مگر اس نے بھی پختہ عزم کر رکھا تھا کہ..... اپنی محبت کی حفاظت کرے گا۔ اسے دوسرے کے چنگل سے آزادی دلا کر ہی رہے گا۔

راکاشی کی اس پراسرار اور پہاڑی بستی سے ناگہرہ کی طرف سفر کا آغاز کر دیا گیا تھا..... جو یہاں سے تقریباً سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ پیدل سفر طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ تاہم وہ کبھی سستاتے اور پھر چل پڑنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہتے ہوئے اپنے سفر کو جاری رکھے ہوئے تھے، لہذا یہ لوگ سہ پہر تک اور شام سے پہلے پہلے ناگہرہ کی سرحد پر پہنچ گئے۔

نسبتاً ایک بلند پہاڑی کی سرسبز ڈھلان پر ذرا سستانے کے لیے یہ لوگ رکے تو انہیں ریاست کی طرف جنوب میں ایک وسیع و عریض پربہیت قلعہ نما عمارت کے خاکے نظر آنے لگے۔ عمارت بے حد خوبصورت اور مضبوط دکھائی دیتی تھی

جو بیک وقت ایک مضبوط قلعے اور محل کا تصور پیش کرتی تھی۔ پروفیسر ہنری کو لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شانے مہاراجا چندر گپتا کے ”راج محل“ کے متعلق آگاہ کر رکھا تھا۔ ان سب کو یہ عمارت دیکھنے کا زبردست اشتیاق ہوا۔ یہ لوگ اب ایک نئے جوش کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

وہاں سرحدی چوکی پر انہیں روک لیا گیا تھا۔ پروفیسر ہنری نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کروایا اور ساتھ ہی لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا کا خاص خط دکھایا تو انہیں نہایت عزت و احترام کے ساتھ مہاراجا چندر گپتا کی حویلی ”راج محل“ پہنچا دیا گیا۔ وہاں پہلے انہیں مہمان خانے میں رکھا گیا جہاں یہ لوگ کچھ دیر آرام وغیرہ کر کے تازہ دم ہو گئے اور پھر رات کے وقت مہاراجا چندر گپتا نے پروفیسر ہنری اور اس کے خاندان کے تینوں افراد یعنی بیٹی رینا، بیٹی گارشا اور رابرٹ سے ملاقات کی۔ باقی ملازم لوگ، یعنی شوکی وغیرہ مہمان خانے میں ہی رہے تھے۔

مہاراجا چندر گپتا کے سلسلے پر پروفیسر ہنری نے اپنے مدعا کو پوری صراحت سے بیان کر دیا اور ساتھ ہی اس سے اجازت بھی طلب کی کہ وہ اپنا ”بیس کیمپ“ بھی یہاں کسی ایسی جگہ قائم کرنا چاہتے ہیں جو آبادی سے ذرا الگ تھلگ مقام پر واقع ہو..... لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا سے آزاد ریاستوں کے تعلقات دوستانہ تھے، تاہم اندر سے یہ لوگ جرنیل سے ڈرتے بھی تھے اور ان سے وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ برصغیر میں برٹش راج کا عرصے سے قبضہ اور دبدبہ تھا۔ علاوہ ازیں..... محلاتی سازشوں اور اپنے تخت و تاج کو بچانے کی خاطر اپنے ہی عزیزوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے راجوں اور مہاراجوں کو ان کی گدی سے فارغ کیا جاتا رہا تھا۔ ایسی کتنی ہی سازشیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایسی ریاستوں کے ”گدی نشین“ ہمیشہ فرنگیوں کے آگے جھکتے آئے تھے۔ تاہم یہ قبائل چونکہ عرصے سے آزاد کہلاتے تھے، اسی لیے یہاں تک فرنگیوں نے... بہ ظاہر تو غاصبانہ دراندازی نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان ریاستوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کو وہ معمولی بات خیال کرتے تھے۔

انگریز جتنی اصول پرست قوم ہے، اس سے زیادہ شاطر اور چالاک ہے۔ یہ ہتھیار کی جگہ ہتھیار اور دماغ کی جگہ دماغ ہی استعمال کرنے کے قائل ہوتے ہیں۔ یوں سمجھ لینا آسان تھا کہ..... برصغیر میں تو ہتھیار کے زور پر جبکہ ان آزاد ریاستوں میں عقل کے زور پر اپنا قبضہ جمارکھا تھا۔

رنگِ آسمان

پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی تھی۔ مہاراجا چندر گپتا نے..... انہیں گھڑسواری سے لے کر آلاتِ حرب و ضرب کی تربیت سے لے کر جدید تعلیم بھی دلوائی تھی۔ جس کے لیے نامی گرامی پروفیسلز اور اساتذہ کا انتظام کر رکھا تھا جو انہیں انگریزی کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی روشناس کراتے تھے۔

اس محلِ نمائندگی کی خوبصورتی اور اس کی بناوٹ، طرزِ تعمیر، آرائش، غلامِ گردشیں، ہالِ کمرے، خواب گاہیں، گردشی زینے اور شہِ نشینیں دیکھ کر یہ لوگ مبہوت سے رہ گئے تھے۔ بلند و بالا چھتوں سے لٹکتے ہوئے بیش قیمت اور دیدہ زیب فانوس الگ ہی قسم کا طلسماتی ماحول بنائے ہوئے تھے۔

ادھر رابرٹ نے تو دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے انکل پروفیسر ہنری کی مہم پر ہزار لعنت بھیج کر ادھر ہی رہے گا اور مزے اڑائے گا، جہاں انہیں نہ صرف ہر طرح کی آزادی تھی بلکہ..... سب کچھ بہ آسانی دستیاب بھی تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ انہیں ریاست کے معززین کا بھی درجہ حاصل تھا۔ رابرٹ کو ان کی دیسی شراب اور تازی تو اس قدر بھائی تھی کہ وہ پیتا ہی چلا گیا تھا۔ رابرٹ یوں بھی فطرتاً ایک عیاش طبع نوجوان تھا۔ پرتاپ نے تو اسے کوئی خاص لطف نہیں کروائی تھی البتہ رابرٹ کی ایٹش کمار اور اس کی خوبصورت سی معصوم صورت بہن سوچنا سے دوستی ہو گئی۔

بہر طور..... حویلی کی سیر اور اس کے بعد کھانے پینے سے فراغت پا کر یہ لوگ مہمان خانے میں آگئے جو اس محلِ نمائندگی کے ساتھ ہی ملحقہ تھا۔

یہ مہمان خانہ بھی کم نہ تھا۔ یہاں بھی ملازموں اور نوکروں کی پوری فوج موجود تھی۔ ہر طرح کے عیش و آرام کا یہاں بھی خیال رکھا گیا تھا۔

پروفیسر ہنری نے صرف ایک روز ہی اس قلعہ نما حویلی کے مہمان خانے میں قیام کیا تھا، اس کے بعد جب اس نے سب کو بیس کیمپ روانہ ہونے کا حکم دیا تو رابرٹ نے صاف انکار کر دیا اور اس کے انکار پر رینا پریشان سی نظر آنے لگی۔

☆☆☆

تین دوپتوں کے اسٹور میں وہ دونوں جیسے اپنی سانسیں تک رو کے دم بہ خود بیٹھے تھے۔ زینے چڑھتے ہوئے ایک سے زائد بھاری جوتوں کی دھک ان کی ٹانگیں ہوئی سماعتوں میں جیسے ہتھوڑے بن کر گونج رہی تھی۔ علیٰ ریحان تو نہیں البتہ شاہ زمان کے دل و دماغ میں یہ خیال رہ رہ کر آ رہا تھا کہ..... اگر اب پکڑے گئے تو اریہ کے بارے میں شبہ غلط نہ تھا، بہ صورتِ دیگر اریہ کو وہ ”کلیر“ قرار دے دیتا۔

کوہِ شمالیہ کی برف پوش اور سنگلاخ پہاڑیوں کے اس سلسلے کی قابلِ ذکر ریاستیں یہ تین ہی تھیں، جن میں ناگہرہ، پالن پور اور تریپال شامل تھیں جبکہ ناگہرہ ان میں سب سے بڑی ریاست کہلاتی تھی۔

مہاراجا چندر گپتا نے اسی وقت اپنے ان چاروں معزز مہمانوں کے اعزاز میں ایک پرتکلف ڈنر کا انتظام کر دیا اور..... خاص ہدایات بھی جاری کر دیں جس کے مطابق پروفیسر ہنری اور اس کے ساتھیوں کو بلاروک ٹوک ریاست سے باہر اور اندر آنے جانے کی اجازت حاصل ہو گئی۔ نیز یہ جو بھی چیزیں خریدنا چاہیں، انہیں بلا قیمت دے دی جائیں اور اس کی قیمت ریاست ادا کر دے گی۔

پروفیسر ہنری کے خاندان کے ان تینوں مذکورہ افراد نے مہاراجا چندر گپتا کے خاندان کے ساتھ ہی رات کا کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے دوران میز پر اور کوئی نہیں تو ایٹش کمار ضرور جو نظروں سے نیلی آنکھوں والی معصوم صورت اور ملکوتی حسن کی مالک رینا کو دیکھ لیتا تھا اور یہ عمل وہ دوسروں کی نظروں سے بچا کر گاہے بہ گاہے دہرائے جا رہا تھا۔ اسے یہ نیلی آنکھوں والی معصوم صورت اور گڑیاسی فرنگن دوشیزہ بہت اچھی لگی تھی۔

چندر گپتا اگرچہ خاصی عمر کا تھا لیکن قابلِ رشک صحت اور مضبوط قوی نے اس کی بڑھتی عمر پر پردہ ڈالے رکھا تھا۔ وہ ایک توانا اور درمیانے قد کا دبنگ شخص نظر آنے والی شخصیت کا حامل مہاراجا تھا اور ایک طویل عرصے سے ”تختِ راج“ پر براجمان تھا۔ اس کی بیوی نجوبائی ایک کشمیری رقاصہ تھی۔ یہ اس کی دوسری بیوی تھی جبکہ مہاراجا کی پہلی بیوی چندری ما..... مریچکی تھی اور اس سے ایک جوان بیٹا تھا۔ اس کا نام پرتاپ تھا اور وہی ریاست کا ولی عہد کہلاتا تھا۔ نجوبائی سے مہاراجا کی دو اولادیں اور تھیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ دونوں جوان اور خوب صورت تھے۔ نجوبائی خود بھی پھرے خدو خال کی پرکشش اور جوان حسین خاتون نظر آتی تھی، جو سر سے پاؤں تک بیش قیمت زیورات سے لدی پھندی تھی۔ اس نے شاہانہ طرز کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور مہارانی کے روپ میں بڑی ٹھٹھے دار عورت نظر آتی تھی۔ دونوں بچے بھی کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ بیٹے کا نام ایٹش کمار تھا جبکہ بیٹی سوچنا تھی۔ دونوں بچے حسن میں ماں پر ہی گئے تھے۔ پرتاپ باپ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ خاموش طبع نظر آتا تھا۔ دراز قامت اور دبلا پتلا تھا۔ وہ اپنی سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں سے کم ہی گھلتا ملتا تھا۔ البتہ تینوں بہن بھائیوں کی

جہانگیر بکس



تسیم چاری کے شاہکار تاریخی ناول

450/- انسان اور دیوتا ہندی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا 300/- پاکستان سے دیوارِ حرم تک تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفر نامہ جواز 450/- آخری چٹان سید غلام جلال الدین خوارزمی کی داستانِ شجاعت جو تاریخوں کے سبیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا 225/- سوسال بعد گاندھی جی کی مہاتما، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر 325/- سفید جزیرہ بحرالکمال کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان 475/- شاہین انڈس میں مسلمانوں کے شہنشاہی و فرائز کی کہانی	475/- معظم علی لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستانِ شجاعت 550/- خاک اور خون سستی، تاریخی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستانِ خونچکاں 450/- کلیسا اور آگ فروری ۱۹۴۷ء کی عید، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوطِ فرات اور انڈس میں مسلمانوں کی گھسٹ کی داستان 599/- قافلہ حجاز راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان 425/- محمد بن قاسم عالم اسلام کے ۱۷ سالہ ہیر کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کنڈیں ڈال دیں 300/- پورس کے ہاتھی ۱۹۶۵ء کی جنگ کے پس منظر میں فیوں اور برصغیر کے سامراجی عزائم کی گھسٹ کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ بولتی تصویر	550/- اور تلواریں گنی شیر سیور (شیخو سلطان شہید) کی داستانِ شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی 500/- گمشدہ قافلہ انگریز کی اسلام دشمنی، ہندوؤں کی عید کی دھڑکی اور سکون کی مصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز کہانی داستان 300/- داستانِ مجاہد فتح دہلی کے بعد راجہ دھرم پال نے مہاراجا جوں کی مدد سے دوسو ہاتھیوں کے علاوہ ۵۰ ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، قانع سندھ کی معرکہ الامار داستان 450/- پردیسی درخت اسلام دشمنی پرستی، ہندوؤں اور سکون کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا 500/- یوسف بن تاشفین انڈس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قدیلیں پلندہ کرنے والے گمراہ سپاہی کی داستان	550/- آخری معرکہ جب سومات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور چھتری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تپتا تھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بہت جان بھگاتا ہوں" "تم جانور کی ایک دلدل جگہ قرار دے لو گوں کو دستانے پہن لینے چاہیے تھے۔" 475/- ثقافت کی تلاش نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو بلبوں کی قہاں بھٹکروں کی چھٹا چھن کے ساتھ پامال کیا 625/- قیصر و کسریٰ ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندِ عدنان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان
--	---	--	---

سبق آموز کتب سلسلہ



- 165/-** اقوال حضرت علی المرتضیٰ
- 165/-** اقوال آئمہ کرامؑ
- 195/-** حکایات گلستانِ سعدیؒ
- 140/-** اقوال شیخ سعدیؒ
- 180/-** حکایات رومیؒ
- 170/-** دلچسپ و عجیب حقائق
- 199/-** حکایات بوستانِ سعدیؒ

- 150/-** دلچسپ وحیرت انگیز باتیں
- 180/-** ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات
- 165/-** بڑے لوگوں کے روشن واقعات

042-35757086 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879

اردو وفات

(جامع ترین)

ملفوظات علامہ اقبالؒ کے منتخب کلامِ رباعی کے ساتھ اردو زبان سے کاپی ہلاؤ

جہانگیر بک ڈپو

انہیں بہت قریب کسی کے بھاری جوتوں کی چاپ سنائی دی۔
”ایک ایک کو تلاش کرو.....“ انہیں موج سنکھ کی تحکمانہ آواز سنائی دی۔ ریحان اور زمان کی امیدیں اب دم توڑنے لگی تھیں مگر وہ مایوس نہ تھے اور جو اللہ کو منظور کی تفسیر بنے رہے کہ اچانک ان کے قریب کی بوریوں کی اٹھا پٹھ ہونے لگی۔ تب ہی اچانک ان کے کانوں سے اریبہ کی آواز نکل گئی۔

”ذرا دھیان رکھیے گا..... یہ اسٹور عرصے سے بند پڑا تھا اور اندر رکھے تین دو پتے بوسیدہ اور پرانے ہو گئے تھے۔ یہاں بچھوؤں کا بھی ڈر رہتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ لوگوں کو دستانے پہن لینے چاہیے تھے۔“

اس کی بات پر اس مشکل گھڑی میں بھی علی ریحان اور شاہ زمان دل ہی دل میں مسکرائے بنا نہیں رہ سکے۔ اریبہ کی چالاکی کو اس وقت صرف یہی دونوں افراد سمجھ سکتے تھے اور اس کا نتیجہ بھی جلد ہی برآمد ہوا کہ..... تلاشی لینے والے، وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے اور چند ایک بوریوں کو ادھر ادھر پٹھنے کے بعد ہی ان کے جاتے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ دونوں کے سینوں کے پتھر سے جیسے پھنسی پھنسی سانسیں کسی طائر بے قرار کی طرح آزاد ہوئی تھیں۔ زمان کو اب اریبہ پر کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ کیونکہ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد اسٹور کا دروازہ بند ہونے کی آواز ابھری تھی۔ پھر کچھ مزید قدموں کی آہٹیں سنائی دیں اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔

خطرہ سر پر آ کے ٹل چکا تھا اور ان دونوں نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ پھر مزید اسی طرح تھوڑی دیر گزر گئی۔ اریبہ نے انہیں سختی سے یہ ہدایات کر رکھی تھیں کہ جب تک وہ خود ان کے پاس نہ آئے یہ لوگ اسٹور سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اسی طرح کچھ دیر مزید بیتنے کا انتظار کیا جاتا رہا۔ اس کے بعد ہی انہیں اسٹور کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

”باہر نکل آؤ..... وہ لوگ جا چکے ہیں۔“ اریبہ نے ہلکی آواز میں پکارا تو یہ دونوں اپنی جگہ سے ابھرے اور اسٹور سے باہر آ گئے۔ اریبہ انہیں لیے کمرے میں آ گئی۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں یہ سوتے تھے۔

”اریبہ بہن! ہم تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتے جس طرح تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہماری مدد کی۔“ علی ریحان نے دل کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔ شاہ زمان کی آنکھوں اور چہرے پر بھی

اب جوتوں کی دھک اور باتیں کرنے کی بھی آوازیں واضح ہونے لگی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ اوپر آ کر ادھر ادھر بکھر کر بالائی منزل کے چپے چپے کی تلاشی میں مصروف ہو گئے تھے۔

علی اور زمان کے دل اب جیسے رک رک کر دھڑکنے لگے۔ وہ تین دو پتوں کی بوریوں اور اس کے گھڑوں کے درمیان میں دبکے بیٹھے تھے۔ زمان کو ہر لمحہ بس ایک ہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اریبہ لالچ میں آ کر کہیں ان کی مخبری نہ کر دے۔ اس نے بھی ایسی صورت میں تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ اریبہ کو تو اسی وقت اس غداری کی سزا میں موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کرے گا۔

دفعہ..... اسٹور کے قریب دو ایک قدموں کی آہٹ ابھری۔

”یہ کمرہ کون سا ہے اور اس میں کیا ہے؟“ ایک بھاری تحکمانہ آواز ابھری۔ لب و لہجے سے انہیں اندازہ ہوا کہ ایسا لہجہ صرف ان کے سینا پتی موج سنکھ کا ہی ہو سکتا ہے۔

”ہی ی..... یہ اسٹور ہے، میں نے آپ کو بتایا تھا تا کہ شامل تین دو پتوں کا کاروبار کرتا تھا۔ یہ اسی کا گودام ہے، اندر تشریف لے چلیں سرکار..... اگر طبیعت پر گراں بار... نہ ہو تو.....“

اس آواز پر زمان کے کان ایک دم کھڑے ہو گئے۔ یہ اریبہ کی آواز تھی۔ اس کا دل اب جیسے سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا تھا۔ اب تب میں کچھ بھی ہونے والا تھا۔ آریبا پار..... تخت یا تختہ..... زندگی یا موت..... کیونکہ اگر یہ دونوں پکڑے جاتے تو ادھر ہی انہیں موت کے گھاٹ بھی اتارا جاسکتا تھا۔ کیونکہ جن جاسوسوں کی منادی کروائی گئی تھی..... وہ ان کے لیے بہت ہی خطرناک تھے اور انہیں دیکھتے ہی گولی مارنے کے احکامات صادر کر دیے گئے تھے۔

”کھولو دروازہ.....“ معا ہی سینا پتی کی کڑک دار اور تحکمانہ آواز ابھری۔

”دروازہ کھلا ہے سرکار! آپ کے اندر تشریف لانے کی دیر ہے۔“ اریبہ کی فدویانہ آواز ابھری۔ اب اس کے لہجے سے کسی قسم کا ڈر، خوف یا جھجک عینا تھی، بلکہ اس کی جگہ اعتماد نے لے لی تھی۔

اندر ایک سے زائد افراد کے گھسنے کی آواز ابھری..... ان دونوں کے دل آیت کریمہ کا درد کرنے لگے۔ کیونکہ ایسی مشکل گھڑی سے انہیں اب صرف اللہ ہی بچا سکتا تھا۔ اچانک

اریہ کے لیے ممنویت بھرے تاثرات تھے، پھر وہ بھی اسی لہجے میں اریہ سے بولا۔

”اور..... یہ تمہارا ہم پر دوسرا احسان ہے۔ پہلے احسان کے طور پر تم نے شمال کی غداری سے ہمیں بچایا۔“

اریہ نے ایک گہری اور گداز بھری نگاہ شاہ زمان پر ڈالی، پھر ذرا اثرات طنزیہ لہجے میں اس سے بولی۔

”شکر ہے، تمہیں تو مجھ پر بھروسہ ہوا.....“ جواب میں علی ہولے سے مسکرایا جبکہ زمان کے ہونٹوں پر البتہ جھینپی جھینپی سی مسکراہٹ تھی۔

”نہیں علی بھائی! میں نے ایسا کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ یہ میرا فرض تھا۔ ان فرنگی سامراجیوں کے خلاف مجھ سے جہاں تک ہوگا میں اللہ کے حکم سے آپ لوگوں کی مدد کرتی رہوں گی۔“ ایک لمحہ متوقف ہونے کے بعد وہ خاصی متانت سے دوبارہ بولی۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں اپنے اصل مشن کی حکمت عملی تیار کر لینی چاہیے۔“

علی ریحان اور شاہ زمان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد علی بولا۔

”ہمارے مشن کا آغاز جنرل مائیکل شا..... کے اپنی جان پال کی آمد اور جوہلی میں اس کی مہاراجا چندر گپتا کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کے دن سے ہی ہو سکتا ہے کیونکہ ہم ان کے آئندہ مذموم مقاصد اور ارادوں اور سازشوں سے بھی آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے رائے طلب نظروں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تھا جس پر زمان نے بھی قدرے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ یہی ہمارے مشن کے آغاز کا بہترین وقت بھی ہوگا۔ لیکن یہ معلوم کیسے ہوگا کہ جان پال کب ناگرہ میں نازل ہو رہا ہے؟“

”یہ پتا چلانا میرا کام ہے۔“ اریہ نے فوراً کہا تو دونوں قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”تم بھلا کس طرح پتا چلاؤ گی؟“ علی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بہ قول تمہارے مہاراجا چندر گپتا کی اس قلعہ نما جوہلی راج محل میں بڑا سخت پہرا ہوتا ہے اور عام فرد تو کیا جوہلی کے مصاحب خاص افراد بھی اپنی شناخت کرائے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتے۔“

جواب میں اریہ نے چند ثانیوں کی پرسوج خاموشی کے بعد کہا۔ ”سب سے پہلی بات تو یہ کہ ہمیں ابھی راج محل میں داخل

ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں گانا بہت اچھا گاتی ہوں۔ گانے گا کر چوب داروں اور محافظین کا دل بہلاؤں گی..... وہیں رہتے ہوئے کسی کو بے وقوف بنا کر اس بات کا پتا چلا ہی لوں گی کہ جان پال کب آ رہا ہے اور میٹنگ کس وقت ہوگی۔“

”خوب تو اچھی ہے تمہاری اریہ بہن مگر..... یہ خطرناک کام تم کرو گی کیسے؟ تمہارا تنہا اس طرح راج محل جیسی عمارت میں جانا ناممکن حد تک مشکل نظر آتا ہے۔“

اس کی بات پر اریہ متنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ”یہی کام تو میرے لیے آسان ہے۔ وہ اس طرح کہ مہاراجا چندر گپتا کو عشقیہ شاعری اور گیتوں سے بہت لگاؤ ہے، اور میں بہت اچھا تو نہیں البتہ اچھا ضرور گالیتی ہوں۔ میلوں ٹھیلوں میں شوقیہ گالیاں کرتی تھی، پھر رفتہ رفتہ مجھے اس سے آمدنی ہونے لگی تو میں نے اس سے متعلق کچھ چھوٹا موٹا سامان بھی خرید لیا۔“

”لیکن باوجود اس کے تم اکیلی یہ کام بہت مشکل سے ہی انجام دے پاؤ گی، یعنی مخبری..... البتہ مجھے اگر منصوبے میں تھوڑی ترمیم کرنے کی اجازت دی جائے تو میں یہ کہوں گا کہ ہم دونوں بھی تمہارے ساتھ ہوں، اس طرح ایک پختہ دو کاج نمٹ جائیں گے۔“ علی نے کہا۔

”یہ بھی اچھا رہے گا، ہم گویوں کا بہرہ بھر کر راج محل یا اس کے قرب و جوار تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔“

”لیکن..... علی! اریہ تو گانا گالے گی، ہم شک کی نگاہ میں آسکتے ہیں۔“ زمان نے خدشہ ظاہر کیا۔ اس پر اریہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”ہم کونسا پیشہ ور لوگ ہوں گے۔ یونہی گلی کوچوں میں میلا ٹھیلہ لگانے والے لوگ ظاہر کریں گے خود کو..... میرے پاس ماؤتھ آرگن اور ایک بندوق ہے۔ پرانی طرز کا گٹار بھی ہے۔ گٹار میں سنبھال لوں گی۔ تم بندوق اور ماؤتھ آرگن سنبھال لیتا۔ گٹار تو تمہیں سنبھالنا نہیں آئے گا، البتہ ماؤتھ آرگن اور بندوق تم دونوں الٹا سیدھا بجالو گے۔ طریقہ میں بتا دوں گی۔“

”کوئی ایک گانا تو سناؤ..... ہم بھی ذرا دیکھیں.....“ زمان نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا تو ریحان ہنستے ہوئے بولا۔

”مگر..... ذرا جیسی آواز میں، باہر آواز نہ جائے.....“

ورنہ لوگ کہیں گے کہ فوجی والے گھر میں گانا بجانا ہو رہا ہے۔“

”میں ابھی آتی ہوں.....“ اریہ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر کہا اور اٹھ کر نیچے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ دوبارہ اوپر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک قدیم طرز کا گٹار تھا۔ اس پر لگی نہیں کہیں دھول بتا رہی تھی کہ اسے استعمال کے کافی عرصہ بیت چکا ہے۔ ساتھ ہی اس نے ایک

رنگ آسمان

مندرمیں دو تہوار ایک ساتھ منائے جانے والے ہیں، ایک گرنتھ کا اور دوسرا پکشن پورنیا کا..... سرحد پار سے کئی ہزارے گویے قاتلوں کی صورت میں ناگرہ کارخ کرتے ہیں اور بیشتر تو ابھی سے سرحدی پٹی پر ڈیرا ڈالے بیٹھے ہیں۔ ہم بھی خود کو یہی ظاہر کریں گے، باقی ضروری باتیں میں تمہیں سمجھا دوں گی۔“

بہر کیف..... باہمی صلح مشورے سے منصوبہ تیار کیا جا چکا تھا۔ پاس کے ایک مکان سے کھانا آ گیا۔ کچھ خواتین بھی اریہ کا غم بانٹنے آئیں۔ کھانا ظاہر ہے اریہ کے لیے ہی تھا اور ایک ہی فرد کے لیے کافی تھا۔

تقریب کے لیے جو چند خواتین آئی تھیں انہیں اریہ نے بڑی چالاکی سے چلتا کر دیا۔ کیونکہ علی اور زمان کے لیے اسے ہی کھانے کا بندوبست کرنا تھا۔ سو وہ رسوئی میں مصروف ہو گئی جو نیچے بنی ہوئی تھی۔ دوپہر کا کھانا کھا کے انہیں سہ پہر تک اپنے مشن کے لیے نکل جانا تھا۔ ریحان اوپر موجود تھا جبکہ زمان نیچے آ گیا۔ ایک طرف صحن میں رسوئی تھی۔ اریہ وہاں کھانا وغیرہ بنانے میں مصروف تھی۔ صحن خاصا کشادہ اور کھلا تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی مرطوب سی ہوا چل رہی تھی۔ فضا میں نباتات کی سوندھی سوندھی خوشبو جی ہوئی تھی۔

زمان ایک شہ نشین کے ستون کے ساتھ ٹکا کھڑا اریہ کو رسوئی میں کام کرتے ہوئے بہ غور دیکھے جارہا تھا۔ اریہ نے آسمانی رنگ کی سوتی شلوار قمیض زیب تن کر رکھی تھی جو اس کے صحت مند جسم پر خاصی چست تھی۔ چوہلے کے قریب کام کرنے کی وجہ سے وہ دوپٹے سے بے نیاز تھی اور ایسے میں وہ چوبی پٹرے پر بیٹھی ردیاں بیل رہی تھی۔ پٹرا زمین پر تھا اور اس کے لیے اریہ کو قدرے اکڑوں ہو کے بیٹھنا پڑ رہا تھا جس کے باعث اس کے دراز قامت جسم کے دلکش خم مدھوش کر دینے والی شاعری ہی کرتے محسوس ہو رہے تھے۔ غزل کا ایک ایک شعر جیسے ابھرا بھر کر موضوع ہو رہا تھا۔ چوہلے اور آگ کی تپش کے باعث اریہ کے حسین و گمان چہرے پر پسینے کے چمکتے ہوئے ننھے منے قطرے زمان کو بہت بھلے لگے۔ یہی حال اس کے سیم تن اور شاخ گل جیسے بدن پر سوتی قمیض کا ہو رہا تھا جو پسینے سے بھیگ کر چپک گئی تھی اور اپنا رنگ چھوڑ کر گورے تن کو نمایاں کر رہی تھی۔

زمان جیسے ٹنگی باندھے اسے دیکھتا رہا کہ اچانک اریہ کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اس کی کشادہ سیاہ آنکھوں میں دلکش سا تاثر دیتی حیرت کا ہلکا شائبہ ابھرا اور گداز و بھرے بھرے لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ مچل گئی۔ اس کے روٹیاں بیلتے

چھوٹا سا نقشین رومال بھی تھام رکھا تھا۔ اس کے اندر ماؤتھ آرگن اور بندوق تھیں۔ وہ اس نے ان کے سامنے قالین پر بیٹھتے ہوئے تھما دیے۔ علی ریحان کے حصے میں بندوق آیا اور زمان نے ماؤتھ آرگن لے لیا۔

اریہ نے پہلے خود بندوق اور ماؤتھ آرگن لے کر بجا یا۔ یہ دونوں یوں بھی عام فہم سے آلات موسیقی تھے جسے زمان اور علی نے جیسے تیسے بجا کر دیکھ لیا۔ اس کے بعد اریہ نے گٹار سنبھال لیا اور شاعرانہ گیت گنگنانے لگی۔ دونوں اس کی طرف دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگے۔

گنگناتے ہوئے اریہ نے ایک بڑی خاص، گہری اور بھیدوں بھری مسکراتی نگاہ زمان پر ڈالی تھی۔

دونوں مبہوت ہو کر اس کی شاعری سن رہے تھے۔ اریہ بڑی خوش گلو تھی۔ زمان اس کی خوش الحان آواز پر فریفتہ سا ہونے لگا۔

اس کے بعد اس نے آرزو لکھنوی کا ایک خوبصورت گیت گایا۔

نہ پی کی نگر یا آئے ہے
نہ چین کر بچو پائے ہے
رات اندھیری رستہ دور
تھک کر ہوا مسافر چور
دیکھ بگھتا جائے ہے
نہ پی کی نگر یا آئے ہے

”واہ..... بہت زبردست..... خوب..... کیا کہنے..... تمہاری بلبل جیسی چکارتی آواز پر تو قلعے کے پہرے دار اپنا سر دھننے بیٹھ جائیں گے اریہ بہن.....!“ علی ریحان نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ زمان تو جیسے ہکا بکا سا اریہ کو تنکٹا رہ گیا تھا۔ اریہ نے اس کی جانب ایک نگاہ ڈالی اور اس کے نرم لبوں پر تبسم ابھرا، اس تبسم نے اس کے دایمیں گال کی ملاحت پر ایک ڈمپل سا بنا دیا۔ گو شہد رنگ اور لمبے گھنے ریشمی بالوں والی یہ حسینہ دل کی عمیق گہرائیوں تک گھر کرنے لگی تھی۔

علی ریحان اسے اریہ کے حسن سحر میں گم پا کر ہولے سے کھٹکھٹا تو زمان کی تحویت ٹوٹی اور اس کے ہونٹوں سے بھی بے اختیار ”واہ.....“ کا لفظ برآمد ہو گیا۔

”لیکن..... ان سب باتوں کے باوصف ہم پر جاسوسوں کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔“ زمان جو حسبِ عادت تصویر کے دوسرے رخ پر بھی نظر رکھنے کا عادی تھا، بولا۔

”کوئی بھی ہم پر شبہ نہیں کر سکے گا۔“ اریہ نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”اس لیے کہ آج کل میں اتفاق سے کالی ویوی کے

ہوئے دونوں ہاتھ تھم گئے۔ زمان سینے پر ہاتھ باندھے سگی ستون سے ٹکا ہوا تھا، دیکھ لیے جانے پر وہ بھی اپنے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا رسوئی کے قریب آ گیا۔

بغیر دوپٹے، سوتی چست قمیص اور اس پر خوب کسا ہوا بھرا بھرا سیم تن، جو پسینے کے باعث اپنا رنگ چھوڑے ہوئے تھا، اب بہت قریب سے نظر آنے لگا تھا۔ جوان اور صحت مند کمر پر سلیقے سے گندھے ہوئے شہر رنگ بال اپنی الگ اور نرالی چھب دکھلا رہے تھے۔

زمان کو خود میں متوجہ دیکھ کر..... اریبہ چھوٹی موٹی سی ہونے لگی تو اس نے دھیرے سے اور مترنم آواز میں کہا۔
”آ..... آپ کو شاید بھوک لگ رہی ہے..... بس! کھانا تیار ہی ہے۔“

زمان اس کے پٹے کے قریب..... بہت قریب، اکڑوں بیٹھ گیا۔ اریبہ کے توانا جسم سے پھوٹی خوشبو اس کے پسینے سے رل مل کر جب اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو زمان کو اس میں بھی ایک کشش انگیز نکبت محسوس ہوئی۔ ایسی خوشبو..... جو حیوانی جذبے کو ابھارنے کا باعث بنتی ہے۔

”اریبہ! تم بہت اچھی ہو..... اور بہادر بھی.....“ زمان نے بہت گہرے پن اور محبت سے لبریز لہجے میں کہا۔ ایسے میں اسے اریبہ کی صراحی دار اور گوری دماغ جلد گردن سے..... پسینے کی ننھی مٹی بوندیں مل کر ایک لکیر کی صورت بنا رہی تھیں۔

اریبہ اس کی بات پر عنابی لبوں تلے ہولے سے مسکرائی۔ روٹی کو توے پر رکھتے ہوئے اس نے پرات سے آٹے کا ایک اور پیڑ اٹاتے ہوئے ایک ذرا گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا تو زمان کو اریبہ کا کشادہ آنکھوں سے اس قدر قریب سے دیکھنا اتنا مسرور کن لگا کہ اس کا دل چاہا وہ ان جھیل سی گہری آنکھوں میں ڈوب ڈوب جائے۔

”آپ بھی اچھے ہو..... بہت اچھے..... اور..... بہادر بھی.....“ زمان کا دل بے اختیار اس کی جانب کھینچنے لگا۔ اس نے دھیرے سے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ روٹی بناتے ہوئے اریبہ کا ہاتھ ایک بار پھر لمحہ بھر کو رک گیا اور اس نے اس کی جانب دیکھا۔

”مجھے تم صرف اچھی نہیں لگتی ہو..... اس سے آگے بھی میرا دل تمہارے بارے میں بہت کچھ محسوس کرنے لگا ہے، دل کی بہت گہرائیوں سے محسوس کرنے لگا ہے۔ یوں جیسے..... تم سے میری شناسائی بہت پرانی ہو۔“ زمان کے لہجے اور آواز سے ٹپکتی محبت پاش شیرینی اریبہ کے جذبات کو بھی

مست خرام کرنے لگی تھی کہ اچانک آسمان پر بادل گرے اور ٹپاٹپ پھوار پڑنا شروع ہو گئی۔

☆☆☆

رابرٹ کے انکار پر پروفیسر ہنری کو کوئی اعتراض نہ ہوا تھا تاہم وہ اپنے ہونٹ سمجھ کر کچھ سوچتے رہ گئے تھے۔ شوکی نے تو اس کے جانے سے انکار پر دل ہی دل میں کلمہ تشکر ادا کیا تھا لیکن..... صورت حال اس وقت بد مزہ ہوئی جب رابرٹ نے رینا کے بارے میں بھی یہی اعلان کر دیا کہ وہ بھی نہیں جائے گی۔ وہ اور رینا ریاست کی سیر کو نکلیں گے۔ یہ اس کا کہنا تھا مگر رینا کے چہرے سے صاف لگتا تھا کہ وہ..... رابرٹ کے ساتھ اس مہمان خانے میں رکنے کے بالکل بھی موڈ میں نہ تھی۔ شوکی کو رابرٹ پر بے حد غصہ آنے لگا کہ وہ رینا پر زبردستی اپنا حکم چلاتا رہتا ہے مگر وہ خود ملازم تھا اور صرف حکم ماننا اس کا فرض تھا، حکم چلانے کا وہ مجاز نہ تھا۔ لہذا وہ امید بھری نظروں سے پروفیسر ہنری کی طرف دیکھنے لگا۔

”رینا بیٹی ہمارے ساتھ ہی جائے گی۔ وہ میری بہترین مددگار ہے۔ وہ ہر مہم میں میرے ساتھ ہوگی۔“ پروفیسر ہنری نے اٹل لہجے میں کہا۔ ”تم گارنٹی کو اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو اور اس کے ساتھ ریاست کی سیر بھی کر سکتے ہو۔“ اس کی بات پر شوکی کے دل کو تسلی سی ہوئی مگر گارنٹی فوراً بول اٹھی۔

”نوائیڈ نیور..... انکل رابرٹ! میں آپ کی ہر مہم میں ساتھ رہوں گی..... برادر رابرٹ اگر یہاں مہمان خانے میں رکنا چاہتا ہے تو رک جائے بے شک مگر میں نہیں رک سکتی۔“ اس کے حتمی لہجے پر پروفیسر ہنری نے..... اپنے کاندھے اچکا دیے۔
”ایزیووش..... بے بی۔“

شوکی بار بار رینا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ رابرٹ کی وجہ سے خاصی تذبذب کا شکار نظر آ رہی تھی۔ اگر رینا ساتھ نہ ہوتی تو شوکی کا اس مہم میں بالکل دل نہیں لگتا۔ یہ مہم اسے رینا کے بغیر بالکل پھسکی لگتی اور پھر اب جبکہ اس نے رینا سے اقرار محبت بھی کر لیا تھا تو اس کے قریب رہنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ اسے بھی خوب اندازہ ہو چلا تھا کہ رینا بھی اس سے محبت کرتی تھی اور نہ صرف یہ بلکہ وہ اس کی آتش الفت سے بھی اچھی طرح واقف تھی۔ شوکی کے اظہار محبت نے بالآخر رینا کا وہ خول توڑ ڈالا تھا جو اس نے خود پر اب شاید دانستہ ہی چڑھا رکھا تھا۔

ایسی ہی بے چین گھڑیوں میں رینا کی نگاہ بھی شوکی پر پڑی اور وہ اس کی نظروں کے اس پیغام کو سمجھ چکی تھی کہ شوکی کا اس کے بغیر بالکل بھی دل نہیں لگے گا۔ مزید یہ کہ وہ یہ کب

رنگ آسمان

چاہے گا کہ اس کی (شوکی کی) غیر موجودگی میں رینا، رابرٹ کے ساتھ راج محل میں رہے۔ ہرگز نہیں، تب ہی رینا آگے بڑھی اور رابرٹ سے بولی۔

”رابرٹ ڈیر! پلیز، ضد نہ کرو..... میں پاپا کی مددگار کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ اس مہم میں میرا ساتھ ان کے لیے نہایت سودمند رہتا ہے۔ تم یہاں انجوائے کرو..... ہم لوٹ کر ادھر ہی تو آئیں گے۔“

سب نے دیکھا رابرٹ نے رینا کو جانے کی خوشی خوشی اجازت دے ڈالی جس پر شوکی کو بھی ایک خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ رینا بھی خوش ہو گئی تھی۔ رابرٹ نے چلبے انداز میں آگے بڑھ کر رینا کو پیار سے ”کس“ کرنا چاہا مگر رینا مسکراتے ہوئے اپنا منہ پھیر کر اس کے پاس سے پلٹ گئی۔

اس کے بعد پروفیسر ہنری نے راکاشی کی اسی پر اسرار پہاڑی بستی کی طرف کوچ کا حکم صادر کر دیا جہاں عجیب قوم آباد تھی۔ مہاراجا چندر گپتا کی ہدایت کے مطابق پروفیسر ہنری نے اپنی روانگی کے بارے میں اسے آگاہ کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ریاست میں کچھ جاسوس خفیہ طور پر گھس آئے ہیں، وہ لوگ بھی کسی اجنبی سے محتاط رہیں۔

انہیں زور اور اور خنجر دستیاب کر دیے گئے تھے۔ چھوٹا موٹا اسلحہ بھی رکھ لیا گیا تھا۔ مہاراجا چندر گپتا نے کچھ زیادہ ہی فرنگی نواز بننے ہوئے اپنے تین تربیت یافتہ فوجی بھی ساتھ کر دیے تھے۔ لیکن پروفیسر ہنری نے ان کے سلسلے میں معذرت کر لی تھی۔ جانے کیا بات تھی کہ پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس مہم میں..... باہر کے آدمیوں کو شامل نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

ایک دن اور ایک رات راج محل اور مہمان خانے میں گزارنے کے بعد یہ مختصر قافلہ راکاشی کی طرف جا نکلا۔

اس وقت موسم خوشگوار تھا۔ نیلے آسمان پر خوش رنگ پرندوں کی ڈارس اڑتی پھر رہی تھیں۔ سفید بادلوں کے ٹکڑے جیسے اڑن کھٹولوں کی طرح تیرتے ہوئے ترائیوں میں اترتے محسوس ہو رہے تھے۔ فضا میں مرطوب ہوا کھلی ہوئی تھی۔ یہ لوگ سنگلاخ راستوں کے بجائے کھنے جنگلوں کی طرف سے ہوتے ہوئے گزر رہے تھے۔ یہ نیا راستہ پروفیسر ہنری نے اپنے کتابی نقشے میں ہی دریافت کیا تھا لیکن جانے کیا بات تھی کہ وہ اس مقام پر آ کر رک گئے تھے۔ اس کے بعد وہ ان سب سے نہایت پر اسرار انداز میں کسی خطیب کی طرح مخاطب ہو کر بولے۔

”میں اب یہاں تم سب سے ایک سوال پوچھوں گا۔ تم

کچھ لحوں کے لیے سکوت طاری رہا۔ چند ایک کو تو پروفیسر ہنری کا سوال ہی مہم لگا پھر وہ آپس میں کھسپ کر گئے۔
”کچھ نہ کچھ جواب ضرور چاہیے مجھے..... جو بھی ذہن میں آئے مجھے بتا دو..... کسی کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ کھل کر اظہار کرو۔“ انہیں خاموش پا کر پروفیسر ہنری نے دوبارہ ان سے مخاطب ہو کر کہا تو سب سے پہلے ڈرائیور امجد خان نے کہا۔

”پروفیسر صاحب! ہم تو مہمان خانے میں ہی رہے تھے۔ اگرچہ تھوڑی بہت سیر ہمیں بھی راج محل کی کروائی گئی تھی، تو میں نے اس قلعہ نما عمارت کی تفصیل، چوہارے اور بلند و بالا گیٹ اور بل کھاتی پختہ راہ گزاریں دیکھیں۔“

”شاباش..... شاباش! جو دیکھا ہے بتاتے رہو۔“ ہنری نے ان کی جیسے حوصلہ افزائی کی، مگر اب بھی لگتا تھا کہ اصل بات کچھ اور بھی یا یوں کہا جائے کہ پروفیسر ہنری اب بھی کچھ اور سننا چاہتے تھے اسی لیے سب کو اظہار کا موقع دے رہے تھے۔ تاہم وہ امجد خان کے جواب میں اتنا ضرور بولے۔

”مہمان خانہ ہوا یا محل کے اندر، جو نظارہ میں نے دیکھا تھا وہ کسی بھی جگہ سے نظر آ سکتا تھا۔“

عمر رسیدہ خانہ ماں جوڑے، نندو بابا اور شامتا نے بھی کم و بیش یہی کچھ بتایا۔ شوکی اب تک خاموش تھا اور پروفیسر ہنری کی نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ گارنٹی کوئی جواب نہ دے سکی تھی البتہ رینا نے بتایا۔

”پاپا! میں نے ایک غیر معمولی بات محسوس کی۔ پہلے تو میں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی لیکن ابھی آپ کے سوال پر وہی بات از خود میرے ذہن میں ابھری۔“

”یس مائی ڈاٹر! میں سن رہا ہوں۔“

”پاپا! محل کی جنوب مشرقی والی فصیل کے دوسری طرف میں نے غیر معمولی پہرا محسوس کیا تھا، جیسے وہاں کوئی خزانہ رکھا ہو۔ اس طرف کسی کو جانے نہیں دیا جا رہا تھا۔“ بالآخر رینا نے بتایا۔

”گڈ! تم میرے سوال کے جواب میں قریب ترین ہو.....“ پروفیسر ہنری نے حوصلہ افزائی کی اور پھر شوکی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسے تذبذب میں مبتلا نظر آیا، جبکہ ہنری کی گھاگ نظروں نے اس کے چہرے سے کچھ تاڑ لیا تھا۔

”یس، بڈی! میرا خیال ہے تم بھی کچھ کہنا چاہ رہے۔“

سیاسی دوست

ایک روز حبیب جالب رات کے دس بجے تک چائینز بچ ہوم میں سیاسی دوستوں کے ساتھ بیٹھے گپ شپ کرتے رہے، اسی اثنا میں اتفاقاً مولانا عبدالستار خان نیازی بھی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے بھی گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ رات کے بارہ بج گئے۔ مولانا اٹھ کر جانے لگے تو حبیب جالب نے کہا۔ ”حضرت! آپ میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمائیں۔“ مولانا نے شکریہ کے ساتھ معذرت کی مگر حبیب جالب بعذر رہے بالآخر انہیں جالب کے گھر جانا پڑا۔ دستک پر جالب کے والد محترم غیظ و غضب میں باہر نکلے تو شاعر عوام نے مولانا عبدالستار خان نیازی کو آگے کیا اور کہا۔ ”اباجی! آپ روزانہ پوچھتے تھے کہ میں رات گئے تک کن لوگوں کے ساتھ بیٹھا رہتا ہوں۔ میں نے سوچا آج ان سے آپ کی ملاقات کرادوں۔ ان سے ملیں آپ ہیں مولانا عبدالستار خان نیازی مدظلہ العالی۔“

”عطا الحق قاسمی“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، نعل ہزارہ

ہنری نے اپنے اس مختصر قافلے کی ترتیب بنا ڈالی تھی اور یہ سب اسی ترتیب سے آگے بڑھ رہے تھے۔ سب سے آگے خود پروفیسر ہنری تھا اور اس کے شانہ بشانہ اس کی بیٹی رینا تھی۔ خانساں کا جوڑ ۸۸، یعنی نندو بابا اور اس کی بیوی شانتا، دونوں ایک ہی خچر پر سوار تھے جبکہ ان سے پیچھے ڈائریور امجد خان اور شوکی کا خچر تھا۔ یہ سب خچر پر سوار تھے جو انہیں راج محل سے ملے تھے۔ زادراہ بھی تھا اور دورا نقلیں بھی ملی تھیں، کچھ فاضل راؤنڈز بھی تھے جبکہ پروفیسر ہنری کے پاس اپنا ذاتی پستول تھا۔ دونوں رائفلوں میں سے ایک شوکی کے کاندھے پر بٹکی ہوئی تھی، دوسری ڈرائیور امجد خان کے۔

”نندو اور شانتا کا کہنا غلط نہ تھا، شوکی برادر!“ امجد نے اپنا خچر اس کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سکی پروفیسر کی

ہوگا۔ میری یہ کتاب ”دنیا کے مشرق کے سربستہ پراسرار راز“ یقیناً بہت مقبول ہوگی جسے میں انگلستان جا کر چھپوانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور تم سب کا بھی اس میں ذکر ہوگا کیونکہ میری اس تحقیقی مہم میں تم سب چشم دید گواہوں کی حیثیت رکھتے ہو۔“

پروفیسر ہنری نے اپنی بات ختم کی تو سب کے بشروں پر خیال انگیز سے تاثرات ابھر آئے۔ اس شخص نے نہ صرف ان کی ہمت سوا کر دی تھی بلکہ اس مہم میں ان کی دلچسپی بھی بڑھادی تھی جو پروفیسر ہنری چاہتا بھی تھا۔

”ویل.....! مسٹر شوکی کی بات نے ظاہر کر دیا کہ میرا اس کا نائب سالار کے عہدے پر انتخاب کرنا غلط نہ تھا، یہ اس کا اہل تھا۔ خیر! اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔“ وہ اتنا کہہ کر رکے۔ سب لوگ ایک بار پھر تجسس چروں کے ساتھ اس کی طرف تکتے لگے۔ جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کیا اب بھی کوئی بات رہ گئی ہے؟

”میں نے مہاراجا چندر گپتا سے جھوٹ بولا تھا کہ ہم راکاشی کی طرف جارہے ہیں..... اگرچہ وہاں جانا میری پہلی ترجیحات میں شامل تھا مگر اب اس نئے بھید کی جان کاری حاصل کرنا اس سے زیادہ اہم ہو گیا ہے، کیونکہ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ قیاس لگا سکتا ہوں کہ..... راکاشی اور وہاں کے عجیب و غریب باسیوں کا تعلق کچھ نہ کچھ اسی گزرگاہ سے ضرور بنتا ہے۔ لہذا اب ہم یہاں سے اس طرف کا سفر جاری رکھیں گے جس بلند فصیل سے وہ گزرگاہ اندر ایک جنگل میں داخل ہوتی ہے، کیونکہ یہ جنگل بھی اسی کی سلسلہ وار کڑی ہے لیکن ایک بات کا خیال رہے۔ اس مہم اور اس پراسرار گزرگاہ کے بارے میں کم از کم رابرٹ کو کچھ نہیں بتانا کیونکہ وہ اس مہم میں مجھے سنجیدہ نظر نہیں آتا۔“ ان کی بات پر سب نے بیک وقت اپنے سر کو بھی جنبش دی تھی۔

اس کے بعد یہ لوگ راستہ بدل کر اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ اس بار ان کے چروں سے خاص قسم کا جوش بھی مترج ہو رہا تھا۔

ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی، جس کی کرنیں درختوں سے چھن کر ان پر پڑ رہی تھیں۔ انواع و اقسام کے پرندوں کی چہکار سے جنگل گونج رہا تھا۔ یہاں جنگل چھدر تھا مگر جیسے جیسے یہ لوگ آگے بڑھتے گئے، جنگل گھٹا اور دن میں بھی تاریکی کا تاثر پیش کرنے لگا۔ ایک عجیب بات اور بھی محسوس کی گئی تھی کہ پرندوں کی چہکاریں بھی یہاں معدوم سی ہونے لگی تھیں۔ سناٹا غیر معمولی حد تک بڑھتا چلا گیا تھا۔ پروفیسر

کچھ ایسا ہے، جسے مہاراجا چندر گپتا راز میں رکھنا چاہتا ہے۔“ قافلے کے سب لوگ ہی نہیں بلکہ پروفیسر ہنری بھی حیرت سے پھٹی پھٹی نظروں کے ساتھ شوکی کو تکتے رہے تھے۔ شوکی جب خاموش ہوا تو وہ فخر تو صیف بھرے لہجے میں بولے۔ ”ویل.....! مسٹر شوکی نے صحیح معنوں میں میری اس مہم کی محنت کا حق ادا کر دیا کیونکہ میں یہی کچھ سننا چاہ رہا تھا، اس لیے کہ میں نے بھی یہی کچھ دیکھا تھا اور اس کا جب یہ ظاہر سب سے سنا کر مہاراجا چندر گپتا سے کیا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو کے بولا تھا..... یہاں ہم ریاست کے دفاعی معاملات کے متعلق میٹنگز وغیرہ کرتے ہیں، جبکہ یہ جھوٹ تھا مگر میں نے ایک دم خاموشی اختیار کر لی تاکہ مہاراجا کو میری اس معاملے میں غیر معمولی دلچسپی کا شبہ نہ ہو سکے۔“

”انکل ہنری! آپ کو کیسے شک ہوا تھا کہ مہاراجا اس معاملے میں دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے؟“ گارشیا نے سوال کر ڈالا۔

”گڈ کوئسٹن مائی ڈیسر.....! ہنری بولا۔ ”میرے شبہ کرنے کی وجہ بہت واضح تھی۔ مہاراجا نے اپنے دشمن، جسے وہ ہمارے مشترکہ دشمنوں سے تعبیر کر رہا تھا، حالانکہ ہمارا ان کے دشمنوں سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ میرا اصول ہے کہ جس آزاد سرزمین میں مکاری اور طاقت کے زور پر غاصبانہ قبضہ کیا جائے..... وہاں کے لوگ اپنی آزادی کے لیے جنگ کرتے ہی ہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے جو جانوروں کو بھی پسند نہیں، طاقت ور سے طاقت ور جانور کسی کمزور جانور کی عمل داری میں زبردستی کھس بیٹھے تو وہ اسے نکال باہر کرنے کے لیے متحد ہو ہی جاتے ہیں۔ خیر، یہ تو برسیبل تذکرہ رہا، میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔“ ہنری نے ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ کہنا شروع کیا۔

”جب مہاراجا نے میٹنگ کا ذکر کیا تو کچھ دیر بعد میں نے انہیں اپنے سپہ سالار، موج سنگھ سے بار بار کسی مندوب کے بارے میں کہتے سنا جس کا نام مجھے جان پال معلوم ہوا تھا وہ عنقریب ایک اہم میٹنگ کے لیے یہاں پہنچنے والا تھا اور وہ اس کے ساتھ مذکورہ جگہ کے بجائے محل کے کسی اور گوشے میں اس کے انتظامات کی ہدایات دے رہا تھا۔ تب ہی مجھے شک گزرا تھا کہ یہ قول مہاراجا چندر گپتا کے..... وہ ایسی میٹنگز تو راج محل میں نہیں کرتا، جس کے لیے اس نے اسی فصیل کی دوسری جانب کے لیے جگہ مخصوص کر رکھی ہے تو پھر اس جھوٹ کی کیا وجہ تھی۔ میں نے اسی راز سے پردہ اٹھانا ہے۔ یہ میری برسوں کی تحقیق کا ایک اہم باب

ہو..... کم آن..... کھل کر اظہار کرو، اس وقت ہم مہاراجا کے راج محل میں نہیں ہیں۔“

شوکی نے ایک خیال انگیزی ہمکاری بھری اور ذرا جھجکتے ہوئے بولا۔ ”سر! میں شاید یہ بات کبھی نہیں بتاتا مگر..... اب چونکہ آپ نے خود ہی پوچھ لیا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ضرور اس کا کوئی مطلب ہوگا۔“

”شیور..... لیٹ می نو..... کم آن.....“ پروفیسر ہنری نے گویا اس کی حوصلہ افزائی کی۔

”مس رینا نے ابھی تھوڑی دیر پہلے راج محل کی جس جنوب مشرقی فصیل والی دیوار کا ذکر کیا تھا، میں بھی اس بات پر چونکا تھا اور چونکہ میں فطری طور پر ذرا تجسس پسند واقع ہوا ہوں اس لیے.....“

”تجسس پسند لوگ ہمیشہ سے ہی میرے پسندیدہ رہے ہیں..... کیونکہ یہی لوگ آگے چل کر بڑا کام کرتے ہیں..... یس.....“ پروفیسر ہنری نے لقمہ دیا۔ وہ خاصا پُر جوش نظر آ رہا تھا، جیسے وہ کسی اہم راز سے پردہ اٹھانے والا ہو یا اٹھانا چاہ رہا ہو۔

شوکی بتا رہا تھا۔ ”یقیناً یہ بات راج محل والوں کو معیوب اور بری لگے لیکن ہمیں نہیں لگتی چاہیے، کیونکہ ہم تو یہاں ان دشوار گزار پہاڑیوں میں آئے ہی تحقیق کرنے اور سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے کے لیے ہیں۔“

”کریٹک۔“ ہنری نے پھر لقمہ دیا۔ وہ بڑی دلچسپ نظروں سے شوکی کے چہرے کی طرف تکتے جا رہے تھے۔

”جب اس طرف میں نے غیر معمولی پہرا دیکھا تو..... مجھے اس کی دوسری جانب تا کا جھانکی کا تجسس پیدا ہوا، میں چونکہ راج محل کی مہمان گاہ تک محدود تھا۔ میں نے یونہی کسی ملازم سے اس دیوار پر پہرے کے بارے میں پوچھ لیا تھا، بات کی ابتدا میں نے..... اسی موضوع سے کی تھی کہ..... کیا یہاں سے راج محل کی طرف کوئی اہم راستہ گزرتا ہے؟ جواب میں مجھے بتایا گیا تھا کہ..... ایسا نہیں ہے، بس یہ ایک اہم گزرگاہ ہے جہاں مہاراجا کے علاوہ کسی اور کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی بات نے میرے اندر تجسس ابھارا اور میں نے..... یونہی مٹرگشت کے بہانے سے ایک موقع نکال کر دوسری جانب سے اس دیوار کی پرلی سمت جھانکنے کی۔.. کوشش کی تھی۔ اس طرف مجھے ایک گزرگاہ سی دکھائی دی تھی، جو فصیل کی بلند و بالا دیوار کے نشیب میں تقریباً تیس چالیس فٹ نیچے نشیب سے ہوتی ہوئی ایک کالے اور تاریک جنگل میں جانی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میرا خیال ہے اس طرف

درحقیقت رابرٹ کا اپنا بیک گراؤ نڈ کوئی قابلِ فخر نہ تھا۔ اس کی اپنی ماں نے تین بار شادیاں کی تھیں اور تینوں ہی ناکام رہی تھیں۔ وہ ایک بار میں کام کرنے لگی۔ خوبصورت اور حسین تھی۔ بار میں وہ ”اسٹریپٹیز“ (Stript ease) جیسا گھنٹیا کام بھی کرتی تھی۔ بار کے مالک سے اس کی دوستی ہو گئی اور وہ اس کا چوتھا (ہونے والا) انفارمل شو ہر کہلایا اور رابرٹ اسی کی ناجائز اولاد تھا۔ ایک ناگہانی حادثے میں وہ انتقال کر گیا۔ وہ بہت پیسے والا تھا۔ خاصی عمر کا تھا۔ اس کا نام پیٹر تھا۔ پروفیسر ہنری برنارڈ اس کا چھوٹا بھائی تھا جو انگلستان (لندن) میں سینڈ ہرسٹ ملٹری کالج سے فوجی تعلیم حاصل کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ناکام اس لیے کہ اسے فوج میں جانے کا کوئی شوق نہ تھا، اس کی فطرت ہی جنگجو نہ تھی۔ وہ تو فطرت کا دلدادہ تھا۔ نیچر کو پسند کرتا تھا۔ تلاش، جستجو اور تحقیق اس کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی مگر اس کے باپ کو شوق تھا کہ اس کا ایک بیٹا فوج میں بھرتی ہو۔ وہ تو یہ خواہش لے کر مر گیا۔ جبکہ ہنری نے وہ کالج چھوڑ کر اپنا شعبہ ہی بدل لیا۔ اسے ہسٹری، لسانیات اور ریسرچ سے شغف تھا، جس میں اس نے نام بھی کمایا، لیکن ابتدا بڑی کٹھن ثابت ہوئی، کیونکہ باپ کے مرنے کے بعد اس کی کفالت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ سوشل سیکورٹی بھی آج کے مقابلے میں ان وقتوں میں اتنی فعال نہیں تھی کہ لوگوں کا اضافی بار اٹھاتی۔ ہنری کو اپنا شوق تو کیا اپنا پیٹ بھی کھٹائی میں پڑتا نظر آنے لگا تھا۔ چھوٹی موٹی گزراہ نوکری بھی اس کا دامن بھرنے کے لیے ناکافی ہوتی ایسے میں اس کے بڑے بھائی، یعنی رابرٹ کے (ناجائز) باپ پیٹر نے اس کی مدد کی تھی اور اسے پڑھایا لکھایا تھا۔ ہنری فطرتاً اچھا انسان تھا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی پیٹر کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلایا۔ ان دنوں پیٹر خود ایک بار میں ملازم تھا، خاصا چالاک تھا، جلد ہی وہ اس بار کا حصہ دار بن گیا اور اچھا خاصا کمانے لگا۔ اسے اپنے چھوٹے بھائی ہنری سے بڑی محبت تھی۔ اسی نے ہی اس کی کفالت اور پڑھائی وغیرہ کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔

ہنری پڑھ لکھ کر قاتل ہو گیا تھا۔ اس نے ایک گھریلو خاتون سے شادی کر لی جس سے رینا پیدا ہوئی تھی۔ رینا کی جوانی تک اس کی ماں کو کسی نسوانی بیماری نے آہستہ آہستہ چاٹ لیا۔ وہ مر گئی۔ ہنری اپنی بیٹی رینا سے بے حد محبت کرتا تھا۔ ادھر پیٹر۔ کو بھی اپنے (ناجائز) بیٹے رابرٹ سے بڑی محبت تھی جبکہ پیٹر کی پہلے بھی ایک بیٹی تھی، گارشیا۔ وہ اس کی دوسری بیوی سے تھی جو اسے چھوڑ گئی تھی لیکن پیٹر کے

پروفیسر ہنری اور اس کی بیٹی کے اوپر کوئی لہراتی ہوئی شے گری، رینا کے حلق سے غیر ارادی سی چیخ خارج ہو گئی اور وہ خنجر پر بیٹھے بیٹھے زور سے تڑپتی..... اور نیچے آ رہی.....

”س..... سانپ..... سانپ.....“ مندوبابا اور اس کی بیوی شاننا نے بیک وقت شور مچا دیا۔ خنجر رک گئے۔ رینا کی چیخ سن کر شوکی نے اپنے خنجر سے چھلانگ لگائی اور پلک جھپکتے ہی رینا کی طرف دوڑ لگا دی۔ کیا دیکھتا ہے رینا جنگلی گھاس پر گری ہوئی تھی اور ایک دھاری دار زہریلا سانپ اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے اسی وقت اپنی پنڈلی کی نیام سے قرولی نکال کر سانپ کے سر پر حملہ کر دیا۔ قرولی کا تیز دھار پھل سانپ کے سر کو چھیدتا ہوا زمین میں دھنس گیا۔ شوکی نے آگے بڑھ کر فوراً رینا کا نرم و نازک ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔ وہ سانپ کے ڈسنے سے بال بال بچ گئی تھی۔

مگر جب اس کی نظر قریب گرے ہوئے پروفیسر ہنری پر پڑی تو دھک سے رہ گئی۔

”پاپا.....!“ وہ چیخی۔ شوکی بھی اس طرف متوجہ ہوا اور دھک سے رہ گیا۔ پروفیسر ہنری گھاس پر گرے ہوئے تھے اور ان کے منہ سے ہرے رنگ کے جھاگ بہہ رہے تھے۔

☆☆☆

رابرٹ کو یہاں کا ماحول ہی نہیں..... بلکہ حسین و جمیل دوشیزہ سوچنا بھی بھائی تھی۔ انگلستان میں رابرٹ کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ تو پیدا ہی وہیں ہوا تھا مگر جس مخلوط اور مادر پدر آزاد معاشرے میں وہ پلا بڑھا تھا، وہاں بہت کم ہی لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی دوشیزگی کو بچا پانی ہوں، لیکن رابرٹ کے علم میں یہ حقیقت بہ خوبی تھی کہ یہاں مشرق میں ایسا نہیں تو کم ضرور ہوتا ہے اور پھر وہ بھی ایک اونچے اور تقریباً شاہی گھرانے کی۔ جہاں مغرب جیسا آزاد معاشرہ نہ تھا۔ رابرٹ کو ایسا دانہ ”چھکھنے“ کا جنون تھا۔ سوچنا اس کے لیے ایک ایسا ہی ”دانہ“ تھی۔ میزبان کے گھر میں ایسی میلی نظر رکھنے کی قبیح حرکت رابرٹ جیسے لوگوں کا ہی شیوا ہو سکتی تھی، مگر یہاں معاملہ صرف اتنا ہی نہ تھا، سوچنا کوئی عام لڑکی نہ تھی۔ ایک بڑی ریاست کے مہاراجا کی لاڈلی بیٹی تھی اور یہی بات رابرٹ کی مطلق العنان فطرت کے عین مطابق تھی کہ وہ کسی معمولی لڑکی کو نہیں بلکہ ایک بڑے اور قدآور خاندان کی لڑکی کو درغلانے کا میدان مارنے والا تھا۔

”ہو ہنسہ مہاراجا کی بیٹی ہے تو کیا ہوا..... یہ لوگ ہمارے غلام ہیں..... ہمارے محکوم ہیں۔ ہم نے برسوں ان پر حکومت کی ہے اور کر رہے ہیں۔“ وہ حقارت سے سوچتا۔

نے بھی اپنا پستول نکال لیا۔ امجد بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ یہ تینوں دھڑکتے دل کے ساتھ اس سمت کو گئے مگر وہاں انہیں کوئی ذی نفس دکھائی نہ دیا تو پروفیسر ہنری اکڑوں بیٹھ گئے اور اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکال کر جلا دی۔ وہ شاید زمین پر کسی کے قدموں کے نشانات دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پُر خیال انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ شوکی یہی سمجھا تھا کہ انہوں نے کسی جنگلی جانور کے پیروں کے نشانات دیکھ لیے ہیں۔

”کچھ لوگ مسلسل ہمارے تعاقب میں ہیں.....“ دفعتاً پروفیسر ہنری نے انکشاف کر ڈالا۔ رینا سمیت شوکی بھی بری طرح سے ٹھکے۔

”کیا مطلب پاپا! وہ کون لوگ ہیں اور کیوں ہمارا تعاقب کر رہے ہیں؟“ رینا نے پوچھ لیا۔

”میں کیا بتا سکتا ہوں مائی سویٹ ڈاٹر! لیکن..... کچھ ایسا ہی ہے، کہتے ہوئے وہ اطراف میں نظریں گاڑنے لگے، مگر کھنے درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔“ لیکن ایسا لگتا ضرور ہے کہ وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف ہیں اور کسی خاص مقصد کے تحت ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔“

”سر! کیا یہ ہمیں نقصان پہنچانے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں؟“ شوکی نے پوچھا تو پروفیسر ہنری بے تاثر مسکراہٹ تلے بولا۔

”تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے میں ان سے ملا ہوں۔ خیر، یہ لوگ ہماری منزل دیکھنا چاہ رہے ہیں، جبکہ ہمارے تعاقب میں ان کا ضرور کوئی ایسا مقصد کارفرما ہو سکتا ہے، جسے جان لینے کے بعد شاید یہ ہمیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں۔“

”تو کیا آپ نے زمین پر کسی جانور کے بجائے انسانوں کے ہی پیروں کے نشان دیکھے ہیں؟“ رینا نے سوال کیا۔

”یس مائی ڈاٹر! یقیناً.....“ پروفیسر ہنری نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ اس کے بعد انہوں نے سب کو محتاط رہتے ہوئے آگے کے سفر کی ہدایت کر ڈالی۔ سب نے دوبارہ اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔ اس نئی صورت حال نے شوکی کو چوکس سا کر دیا تھا۔

دن کے وقت اس اندھیرے جنگل میں ایک بار پھر ان کا سفر شروع ہو چکا تھا مگر اس بار سب کے دل و دماغ کو ایک انجانے سے خوف نے بھی جکڑ رکھا تھا۔

اچانک سب سے آگے چلتے ہوئے دو خچروں پر سوار

خزانے کی تلاش میں ہے اور اپنے ساتھ ہمیں بھی مروائے گا۔ اف! کس قدر خوفناک جنگل ہے۔“ شوکی مسکرا رہا تھا۔ اس کا سارا دھیان رینا کی طرف تھا۔ وہ کسی موقعے کی تلاش میں تھا کہ رینا سے باتیں کرے۔ رینا بھی کن آنکھیں سے اس کی طرف دیکھ کر اور اس کی بے چینی بھانپ کر مسکرا دیتی تھی۔ جنگل میں ہو کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ اس کی اسرار بھری خاموشی میں رہ رہ..... کر کچھ انہونی سی محسوس ہوتی تھی۔

معا شوکی کو اپنے عقب میں کچھ آہٹوں کا احساس ہوا۔ آوازیں ان کے خچروں کی بھی پیدا ہو رہی تھیں لیکن وہ آہٹیں ان سے ہم آہنگ نہ تھیں۔ شوکی کے کان ایک دم کھڑے ہو گئے۔ پروفیسر ہنری نے اسے ہی نہیں بلکہ سب کو یہ خاص طور پر ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی کو بھی اپنے اطراف یا دور قریب کوئی ذرا سی بھی غیر معمولی بات محسوس ہو وہ فوراً اس کا اظہار کر ڈالے، چنانچہ شوکی نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے رکنے کا کہہ دیا اور تیزی سے اپنا خنجر اس سمت کی طرف موڑا تو پروفیسر ہنری نے اسے روک دیا۔

”ٹھہرو..... کیا بات ہے؟“

”سر! اس طرف میں نے کسی کی آہٹوں کی آوازیں سنی ہیں۔“ شوکی نے کہا تو باقی لوگوں پر سنسنی طاری ہو گئی۔

”او کے! امجد کو ساتھ لے جاؤ اور محتاط رہنا۔“ ہنری نے کہا۔ امجد نے فوراً اپنا خنجر شوکی کے ساتھ لگا دیا۔ دونوں نے اپنی رائفلیں کا ندھوں سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیں، جبکہ دوسرے ہاتھ میں خنجر کی باکیں بھی ہوئی تھیں۔

شوکی دھڑکتے دل اور محتاط نظروں کے ساتھ اطراف میں دیکھتا ہوا مذکورہ سمت بڑھا، مگر ایسی کوئی مشکوک شے دکھائی نہ دی۔

”لگتا ہے کوئی چھوٹا موٹا جنگلی جانور ہوگا۔“ شوکی نے کہا۔ اس کے بعد لوٹ آیا۔ قافلہ پھر رواں ہو گیا مگر ابھی چند ہی فرلانگ چلا تھا کہ..... رینا چلائی۔

”اس طرف..... کوئی ہے.....“ اس نے اپنی دائیں جانب اشارہ کیا تھا۔

”مجھے بھی اس طرف کچھ آہٹیں سنائی دی ہیں.....“ پروفیسر ہنری بولے۔ سب رک گئے۔ شوکی کا ایک اپنا خنجر دونوں باپ بیٹی کے قریب لے آیا۔ رینا ہنوز ایک طرف..... اپنے ہاتھ کا اشارہ کیے ہوئے تھی۔ قافلہ پھر رک گیا۔ پروفیسر ہنری اپنے خنجر سے اتر آئے..... سب نے ان کی تھلید کی۔ شوکی اس طرف بڑھنا چاہتا تھا، مگر ہنری نے منع کر دیا۔

”ٹھہرو..... میں بھی چلتا ہوں۔“ کہتے ہوئے انہوں

تیرہ ہدف

ایک نوجوان، مولانا رشید احمد گنگوہی کے پاس پہنچا۔ اس نے ان سے کہا۔

”جناب! میں اپنی چچا زاد بہن سے محبت کرتا ہوں اور اس سے نکاح کا خواستگار ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ میرے چچا مال دار آدمی ہیں اور میں غریب ہوں۔ آپ مجھے تعویذ لکھ کر دے دیجئے۔“

مولانا نے جواب دیا۔ ”میاں! میں تعویذ وغیرہ نہیں لکھتا۔“ نوجوان نہ مانا، اصرار کرتا رہا۔ مولانا بھی کسی طرح نہیں مانے۔ آخر نوجوان مایوس ہو کر صحن میں گیا۔ وہاں کنواں تھا۔ نوجوان کنویں میں پاؤں لٹکا کر بولا۔

”مولوی صاحب! میں بڑی امید لے کر آیا تھا، آپ نے میری امید توڑ دی، میں اب زندہ رہ کر کیا کروں گا۔“ مولانا گھبرا کر چیخے۔

”ارے..... ٹھہرو..... ٹھہرو، یہاں آؤ، میں تعویذ لکھ دیتا ہوں۔“ انہوں نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر نوجوان کو دیا۔ ”جاؤ، سیدھے اپنے چچا کے پاس پہنچ جاؤ۔“

نوجوان نے مولانا کا کاغذ اپنے چچا کو دے دیا، اس کے چچا کاغذ پڑھتے ہی رام ہو گئے، کہنے لگے۔ ”میاں! تم کہاں تھے؟ ہمیں تمہاری تلاش تھی۔“ تھوڑی دیر بعد انہوں نے قاضی کو بلا کر بیٹی کا نکاح جیتے سے پڑھوا دیا۔

چند دن بعد نوجوان کو خیال آیا کہ مولانا نے بڑا تیر ہدف تعویذ دیا تھا۔ دیکھنا چاہیے کہ اس میں کیا لکھا تھا۔ اس نے تعویذ تلاش کیا اور اسے کھول کر پڑھا، لکھا تھا.....

یا اللہ میں کچھ جانتا نہیں اور یہ شخص مانتا نہیں تو اس کا مولا، یہ تیرا غلام اب تو جانے اور تیرا کام

مرسلہ: اطہر حسین..... کراچی

دیا۔ ”یار..... اور ”برادر یار“ کو ایک ساتھ دیکھ کر وہ بھی دل ہی دل میں خوش ہوا تھا۔ وہ دوبارہ اسی طرف کو پلٹا اور ایک نظر سوچنا کے حسین و دلکش چہرے پڑا لے کے بعد مسکرا کر ایش سے بولا۔

”ہاں، ایش! میں تم سے ہی ملنے اس طرف کو آ رہا تھا کہ پرتاپ نے مجھے آگے جانے سے منع کر دیا اور میں واپس جانے لگا تھا۔“

”پرتاپ کون ہوتا ہے تمہیں منع کرنے والا..... کہاں ہے وہ؟“ ایش غصے سے بولا۔ رابرٹ دل ہی دل میں خوش ہوا..... کہ اس کی ”برادر یار“ سے اچھی نہیگی۔

”وہ اس طرف ڈیوڑھی میں موجود ہے۔“ رابرٹ نے اس طرف اشارہ کیا۔

”میں دیکھتا ہوں اسے.....“ ایش کمار برہم ہو کر آگے بڑھا تو اس کی بہن سوچنا نے اس کا بازو پکڑ لیا اور بولی۔

”بھیا! رہنے دو، وہ بڑا بھائی ہے ہمارا.....“ سوچنا کو اپنے سوتیلے بھائی پرتاپ کی حمایت میں بولتا دیکھ کر رابرٹ کو حیرت ہوئی تھی، تب پھر وہ بھی مکاری سے مسکرا کر ایش سے بولا۔

”اُس اوکے! کوئی بات نہیں۔ وہ تمہارے بڑے بھائی ہیں۔ تم مل گئے کافی ہے۔“ دلکش خدو خال اور پُرکشش روپ والی سوچنا نے بھی رابرٹ کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ رابرٹ کو اپنے دل میں گدگدی سی محسوس ہونے لگی۔

”چلو..... ایش! ہم اپنے مہمان کو خود ہی حویلی کی سیر کراتے ہیں۔“ اس کے بعد سوچنا نے اپنے بھائی سے کہا اور پھر یہ تینوں پلٹے۔

ڈیوڑھی کے قریب سے گزرتے ہوئے پرتاپ کی ان پر نظر پڑی تھی۔ ایش نے اس کی طرف ناگواری سے دیکھا تھا۔ وہ جب دیوان خاص کے قریب سے گزرنے لگے تو سامنے سے مہارانی نجوبائی آتی دکھائی دی۔ اس کی چال میں بڑی شاہانہ تمکنت تھی۔ اس کے ہمراہ ایک جھکی جھکی سی کمروالا ایک ملازم ٹائپ آدمی بھی تھا۔ اس کی رنگت خاکستری تھی۔ عمر کا پختہ تھا۔ سر پر بہت کم بال تھے۔ چہرہ لمبوتر تھا اور آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں۔ ناک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔

یہ مہارانی نجوبائی کا خاص ملازم بیجورام المعروف بچھو رام تھا، جو اس کے پیچھے چلنے کے بجائے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور چلنے کے دوران ہی بڑی تعظیمانہ سنجیدگی کے ساتھ مہارانی سے کچھ کہتا بھی جا رہا تھا۔ انداز اس کا رازدارانہ لگتا تھا، جبکہ مہارانی نجوبائی کے چہرے پر بھی کچھ خاص قسم کے تاثرات

حکومت جھارکھی تھی۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ اس سے ڈرتے ہیں، کیونکہ وہ ایک ”حاکم“ قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس بات نے اس کا سینہ اور پھلادیا تھا اور گردن بھی اکڑادی تھی۔

وہ حویلی کی سیر کرتا ہوا..... دیوان خانے کی طرف آ گیا۔ ادھر سے ہی ایک غلام گردش بل کھاتی ہوئی دیوان خاص کی طرف جاتی تھی۔ وہ ایک ذرا دیر کے لیے دیوان خانے کے خوب صورت محراب والے دروازے کے سامنے رکا، وہاں اسے اپنے مطلب کا کوئی فرد نظر نہ آیا۔ اس کا ارادہ سوچنا کے بھائی ایش کمار سے دوستی بڑھانے کا تھا۔ وہ آگے دیوان خاص کی جانب بڑھ گیا، مگر ابھی چند قدم چلا ہوا کہ اسے اپنے سیدھے ہاتھ پر ایک کھلی ڈیوڑھی نظر آئی وہاں مہاراجا چندر گپتا کا بڑا بیٹا اور ولی عہد پرتاپ کھڑا دکھائی دیا۔ رابرٹ نے اسے مسکرا کر دیکھا اور ہاتھ ہلایا، مگر پرتاپ نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس کی طرف سرد مہری سے دیکھنے لگا۔ رابرٹ کی انا کو دھچکا لگا۔ اس نے بھی جواب میں براسامنے بنا کر گردن کو جھکادیا اور آگے قدم بڑھائے تو پرتاپ نے بھاری اور رعب دار آواز میں اسے پکارا۔

”مسٹر رابرٹ! ٹھہرو.....“ رابرٹ کے قدم رک گئے، مگر وہ اس کی طرف پلٹا نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پرتاپ خود اس کی طرف آئے گا، مگر پرتاپ بھی اس کی جانب نہیں بڑھا تھا۔ اس کے برعکس اس نے وہاں سے گزرتے ہوئے ایک ملازم سے کچھ کہا اور ساتھ ہی رابرٹ کی طرف اشارہ بھی کیا۔ وہ ملازم مؤدبانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتا ہوا..... اس کی جانب بڑھا اور رابرٹ سے نہایت احترام سے بولا۔

”جناب! آگے دیوان خاص ہے، خاندان کے افراد وہاں موجود ہیں۔ آپ کو کسی سے ملنا ہے تو ادھر دیوان خانے میں تشریف لے جائیے۔“

رابرٹ کا دماغ بھٹا گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ ولی عہد کا فرمان تھا۔ اس کے دل میں پرتاپ کے لیے اسی وقت کینہ اور بغض پروان چڑھنے لگا۔ وہ ابھی خود بھی کوئی بد مزگی نہیں چاہتا تھا۔ لہذا جب واپس لوٹنے کے لیے پلٹنے لگا تو اسے سامنے سے وہ دونوں بہن بھائی ایش کمار اور سوچنا کسی بات پر ہنستے ہوئے آتے دکھائی دیے۔ وہ دیوان خاص سے ہی نکلے تھے۔ رابرٹ کو یوں پلٹ کر جاتا دیکھ کر..... پہلے تو وہ چونکے، پھر ایش کمار نے رابرٹ کو پکارا۔

”ہائے رابرٹ! تم آن..... واپس کیوں جا رہے ہو؟“ رابرٹ کو ایش کمار کے دوستانہ انداز نے کافی حوصلہ

اب بڑے دنوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کے مرتے ہی اس کی رکھیل نما بیوی نے رابرٹ اور گارشا، جو اب آپس میں سوتیلے بہن بھائی تھے، کو اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا تھا، رابرٹ کو اپنی ماں سے نفرت ہو گئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں نے اس کے باپ کی املاک پر قبضہ جمالیا ہے، وہ بار میں آکر اس سے لڑتا جھگڑتا تھا۔ یہیں سے اس کی نفسیات اور سوسائٹی خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ دنگے فساد کے جرم میں اسے سزا بھی ہوئی رہی۔ بالآخر اسے ہنری نے ہی سنبھال دیا مگر رابرٹ جانتا تھا کہ اس کا چچا ہنری پہلے ہی سے اس کے باپ پیٹر کے احسان تلے دبا ہوا تھا اسی لیے اس نے اپنی ٹانگ اوپچی رکھنے کو ترجیح دی۔ عجیب نفسیات تھی اس کی، یا پھر وہ ضرورت سے زیادہ ہی انا پرست واقع ہوا تھا، اسے یوں لگا جیسے ہنری اپنا احسان اتارنے کے لیے یہ سب کرے گا۔ رابرٹ نے بل فائننگ میں حصہ لیتا شروع کر دیا اور اپنی بہن کو لے کر پہلے امریکا اور بعد میں اسپین منتقل ہو گیا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اسے اپنی سوتیلی بہن گارشا سے ایک انسیت سی تھی، یا پھر شاید اس لیے کہ اسے گارشا کی عادت ہو گئی تھی، کیونکہ وہ اس کا ہر حکم بے چون و چرا..... بجالاتی تھی۔ اسے کل وقتی مفت کی نوکرائی ملی ہوئی تھی۔

مقابلے جیت کر اس نے جو دولت کمائی وہ سیر سپاٹے، پینے پلانے اور عیشیوں میں خرچ کر دی۔ تاہم پھر بھی اس کی انا کو یہ سوچ کر تسکین ضرور ملتی تھی کہ اس نے انکل ہنری سے کوئی مدد نہیں لی تھی۔ یوں وہ جب لندن آیا تو گل رعنا رینا کے حسن کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ تب وہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔

رینا کو ہنری نے بتا رکھا تھا کہ رابرٹ کے باپ کے اس پر بہت احسانات تھے۔ اسی لیے رینا بھی رابرٹ کی کئی بری عادات کے باوجود اس کی عزت کرتی تھی۔ تاہم اس دوستی میں اس نے رابرٹ اور اپنے درمیان ایک حد فاصل قائم کر رکھی تھی۔

رابرٹ..... اب یہاں بھی اپنی عیاش فطرت اور شر پسند عادات سے مجبور تھا۔ اس نے مہاراجا کی بیٹی سوچنا کو پھانسنے اور اسے رام کرنے کا پکا ارادہ کر رکھا تھا۔ اسے حویلی میں بھی بلا روک ٹوک آنے جانے کی اجازت تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہاں حویلی کے ملازمین، خدام اور مصاحب خاص سب اسے دیکھ کر جھک کر سلام کر رہے تھے۔ وہ اور اکڑ جاتا تھا۔ خود کو ان کا حاکم سمجھتا تھا اور ساتھ ہی اس بات پر فخر کرتا کہ اس کی قوم نے اس خوبصورت خطے میں اپنی

رہا اور وہ جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل کافی گھٹا تھا۔ دن میں بھی یہاں رات کا گمان ہوتا تھا۔ جنگل کے بیچ بل کھاتا راستہ دور تک جاتا نظر آ رہا تھا۔ سمجھی اس پر مناسب رفتار سے دوڑنے لگی۔ دو سچ پہرے دار بھیجے کے ”ویکٹ کارٹ“ کے آخری سرے پر بنے ہوئے دو چوبی تختوں پر نکلے بیٹھے تھے۔ جنگل میں گہری خاموشی طاری تھی۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی کبھی کی رفتار آہستہ ہو گئی تھی۔ رابرٹ کھڑکی کے قریب والی نشست پر بیٹھا تھا اور اس کے سامنے والی نشست پر وہ دونوں بہن بھائی بیٹھے تھے۔ رابرٹ باہر کا نظارہ کرنے میں مصروف تھا۔ اسے یہ سیاہ جنگل بہت پر اسرار محسوس ہو رہا تھا۔ جنگل میں چند سوکوس کا راستہ انہیں مزید طے کرنا پڑا تھا، اس کے بعد کبھی..... دائیں جانب مڑی اور پھر تھوڑا اور آگے جا کر رک گئی۔ کوچبان نے اوپر سے لکڑی کی مٹی بجا کر دھیرے سے ”ٹھک..... ٹھک“ کی آواز برآمد کی۔ جس کا مطلب تھا کہ اب یہ لوگ کبھی سے باہر اتر آئیں۔ چنانچہ یہ تینوں نیچے اتر آئے۔ رابرٹ کی نگاہ سامنے پڑی۔ اسے وہاں مہاگنی کے موٹے، چوڑے اور بڑواں تنوں والے گھنے درخت دکھائی دیے۔ ان کے دامن میں ہی اسے ایک عجیب اور مختصر سی مخروطی عمارت نظر آئی۔ اس کی چھت پر تنگونی گنبد بنا ہوا تھا جس پر تلسی کے جھنڈ جھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ عمارت کا رنگ نیلا تھا۔ وہ اس کی مخصوص وضع قطع سے سمجھ گیا کہ یہی کالی کا مندر تھا۔ مندر کے ارد گرد تلسی..... کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ مختصر قد بچوں کی سیڑھی کے اوپر جہاں مندر کا دروازہ تھا اس کے دائیں بائیں عجیب و غریب سینکڑوں والے جانوروں کے چنگھاڑتے ہوئے سنگی مجسمے بھی نصب تھے۔ وہاں دو تین نیم عریاں سے افراد بھی اسے دکھائی دیے تھے جنہوں نے گیر وے رنگ کی دھوتیاں پہن رکھی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں پتیل کا کوئی چمکتا ہوا برتن تھا، دوسرے نے کوئی شمع سی اٹھا رکھی تھی۔ وہ سب مندر کی اینٹوں والی سیڑھی کے قریب ہی کھڑے تھے اور شاید اندر جا رہے تھے کہ ان کی نگہی پر نظر پڑتے ہی رک گئے تھے۔ ”آؤ دوست! اندر چلیں۔“ ایش نے رابرٹ سے کہا۔ ٹھیک اسی وقت جب یہ لوگ مندر کی سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھا رہے تھے، ایک جانب کی قد آدم جھاڑیوں سے دو افراد مزید برآمد ہوئے۔ ان کے حلیے بھی پہلے نظر آنے والے تینوں سے مختلف نہ تھے۔ رابرٹ نے ان کی طرف دیکھا مگر ان کے ہاتھ تو خالی تھے لیکن پشت پر زرد رنگ کے

رابرٹ نے اس روز دونوں بہن بھائیوں کے ساتھ خوب سیر کی..... وہ حویلی کی فصیلوں کی طرف بھی گئے۔ جنوب مشرق کی جانب والی ایک فصیل کی دیوار کے قریب رابرٹ نے ایک برجی میں داخل ہونے کی کوشش کی تو وہاں موجود ایک تلوار بدست چوب دار نے اسے روک لیا مگر جب اس کے ہمراہ راج کمار اور راج کمار کی کو دیکھا تو فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ ”میں یہاں سے ترائی کا منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ رابرٹ نے ایش سے کہا۔ ایش نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا مگر اس کی بہن سوچنا متذنب تھی اور اسی لہجے میں بھائی سے بولی۔ ”بھیا! اس برجی میں داخل ہونے سے مانتاجی نے منع کر رکھا ہے۔“ ”میں تو اس برجی میں ضرور اپنے دوست کو لے کر جاؤں گا، بلکہ نیچے بھی اتروں گا۔ تم نہیں جانا چاہتی ہو تو نہ جاؤ۔“ ایش اٹل لہجے میں بہن سے بولا۔ وہ خاصا ضدی تھا۔ شاطر رابرٹ، سوچنا کی توجہ حاصل کرنے کے لیے فوراً ہی اس کی حمایت میں بولنے کا کوئی موقع نہیں گنواتا تھا۔ ایش سے بولا۔ ”کوئی بات نہیں، اگر مادام نے منع کر رکھا ہے تو نہیں جاتے ایش! کوئی ضروری نہیں۔“ ”مگر سوچنا! اپنی پوجا..... کی جگہ دکھانا کونسا گناہ ہے۔“ ایش بہن سے بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ہمارا انگریز مہمان دوست کالی کا مندر دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔“ ”حرج تو کوئی نہیں ہے۔“ سوچنا ماند پڑتے ہوئے بولی۔ ”اچھا ٹھیک ہے چلو پھر..... میں بھی چلتی ہوں۔“ یہ لوگ برجی میں داخل ہوئے اور اس کے دوسرے دروازے سے باہر آ گئے۔ یہاں پختہ اینٹوں کا ایک پلیٹ فارم سا بنا ہوا تھا اور ایک گھوڑے سے منسلک بھی کھڑی تھی۔ اس میں ایک جوان اور صحت مند کوچبان بھی تھا۔ وہ اس میں سوار ہو گئے۔ وکٹوریہ طرز کی یہ کبھی رابرٹ کو اچھی لگی تھی۔ وہ ایسی گھیاں لندن میں بھی دیکھ چکا تھا۔ بھی آرام وہ تھی۔ کوچبان نے ان کے سوار ہوتے ہی بھی آگے بڑھا دی۔ ایش کمار نے اسے بتایا تھا کہ وہ لوگ، یعنی اس کے مانتا پتا وغیرہ پوجا کے لیے اسی بھی میں کالی کے مندر تک جاتے تھے۔ نیچے نشیمن راستہ تھا جو کنکریٹ کا بنا ہوا تھا۔ سامنے نشیب میں گھٹا جنگل تھا۔ کبھی کا یہ سفر بہ مشکل دس منٹ تک محیط

ضرور ہو گیا ہے۔“ ”تمہاری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے، بچھورام!“ دفعتاً مہارانی نجوبائی نے پڑٹیش لہجے میں اسے جھڑکا اور وہ خفیف سا نظر آنے لگا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ نجوبائی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”بے وقوف! یہ فرنگی پروفیسر مجھے سکی اور دھن کا پکا نظر آتا ہے۔ وہ یہاں کھوجنا کے لیے آیا ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ وہ کالی دیوی کے مندر کی طرف جائے..... تم نے دیکھا نہیں کہ وہ کیسے جنوب مشرقی والی برجی کے بارے میں چند گپتا سے کرید رہا تھا۔ یہ انہیں پتا تھا کہ ہم کم از کم کسی نووارد کو کالی دیوی کے مندر کی بھنک بھی پڑنے نہیں دینا چاہتے، اسی لیے چندر نے بھی اس خطی پروفیسر کو جھوٹ بول کے ٹال دیا تھا، بلکہ ان غیر تہواری دنوں میں..... کسی کو بھی وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے ہماری طرف سے۔ جانتے ہونا..... ان دنوں وہاں کیا ہو رہا ہوتا ہے؟“ مہارانی نجوبائی کا لہجہ پل کے پل اسرار بھرا ہو گیا تھا۔ ”بات تو آپ کی صحیح ہے مہارانی صاحبہ!“ بچھورام بولا۔ ”پر تو، میں پھر عرض کیے دیتا ہوں کہ آپ اس کی چٹانہ کریں۔ وہ لوگ راکاشی کی طرف نکلے ہیں۔“ ”تم کچھ بھی کہو..... بچھورام! یہ فرنگی پروفیسر اپنی تحقیق میں ہمارا کام خراب کر ڈالے گا۔ تم اسی وقت تیز رفتار گھوڑی پر کسی کو بھیج کر مہا پجاری بدری ناتھ کو ہمارا پیغام پہنچا دو۔ ہم اسے ایک پل کی بھی تاخیر کیے بغیر مطلع کر دینا چاہتے ہیں، باقی وہ خود سنبھال لے گا۔ ہمارے خفیہ منصوبے میں کالی دیوی کا مندر بڑا اہم ہے۔“ ”ایسا ہی ہوگا مہارانی صاحبہ!“ بچھورام فدیوانہ لہجے میں بولا۔ ”لیکن ایک مشورہ دینے کی میں بھی آپ کو درخواست کروں گا کہ آپ..... چھوٹے راج کمار ایش کو بھی اس منصوبے میں شامل کر ہی لیں۔“ ”ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ وہ نادان ہے۔ سردست..... اتنے ہی لوگ کافی ہیں۔ ایش تو میرا ہی بیٹا ہے، میں اسے کسی وقت بھی سمجھا بھجا کر اعتماد میں لے لوں گی اور وہ میری ہی مانے گا۔“ ایک لمحے توقف کے بعد مہارانی نجوبائی نے دوبارہ بچھورام سے تحمیلانہ کہا۔ ”جاؤ..... اب جو کام کہا ہے وہ ترنت نمشاؤ.....“ دونوں کی اسرار بھری سرگوشیاں دم توڑ گئیں، کیونکہ بچھورام..... حکم کی تعمیل کرنے کے لیے فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

کھنڈے ہوئے تھے۔ انہیں سامنے سے آتا دیکھ کر بچھورام ایک دم مہارانی کے پیچھے ہو گیا اور مہارانی نجوبائی..... کے چہرے پر بھی کھنڈی ہوئی سنجیدگی ایک دم مسکراہٹ میں بدل گئی۔ وہ رک گئے۔ رابرٹ نے اپنا ہیٹ اتار کر قدرے جھک کے مخصوص ویسٹرن اسٹائل میں مہارانی کو سلام پیش کیا۔ ”گڈ ڈے اینڈ گڈ آفٹرنون مادام.....!“ مہارانی نے بھی اس فرنگی نوجوان کو دلچسپ نگاہوں سے دیکھا اور اپنے دونوں جوان بچوں سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”اپنے مہمان دوست کو یہاں کی خوب سیر کرواؤ..... تاکہ جب یہ یہاں سے جائے تو ہمارے بارے میں اچھے تاثرات لے کر جائے۔“ نجوبائی کی بات سے کچھ مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور اسی وقت ولی عہد پر تاپ ان کے قریب سے گزرنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر ناگواری نظروں سے رابرٹ کی طرف دیکھا اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ مہارانی نجوبائی اور ایش نے بھی اس کی طرف کچھ سرد مہری نظر ڈالی تھی جبکہ بچھورام..... نے مکارانہ فروتنی سے قدرے جھک کر ولی عہد کو سلام پیش کیا تھا۔ تب ہی ایش نے ماں سے اپنے سوتیلے بھائی کی شکایت کر دی۔ ”مانتاجی! پر تاپ ہمارے مہمانوں سے خوش نہیں نظر آتا..... رابرٹ کو انہوں نے واپس چلے جانے کے لیے کہا تھا۔ آپ مانتاجی سے ان کی شکایت ضرور کیجیے گا۔“ ”ہم۔“ مہارانی کے منہ سے فقط اتنا ہی نکلا تھا اور پھر وہ اسی شاہانہ تمکنت سے آگے بڑھ گئیں، بچھورام بھی ہلکے سے..... ”رام..... رام.....“ کرتا ہوا، اس کے پیچھے ہولیا تھا۔ وہ دونوں ”ملکہ اور غلام“ آگے پیچھے چلتے ہوئے ایک کمرے میں آ گئے۔ یہ دیوان خاص صرف مہارانی نجوبائی کے لیے ہی مخصوص تھا۔ کوئی اس کی اجازت کے بغیر اندر نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ نجوبائی شاہانہ تمکنت کے ساتھ خوبصورت اور آرام دہ مسہری کے محرابی سرہانے سے گاؤ نکلیے لگائے نیم درازی پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی، جبکہ بچھورام..... اس کے سامنے ہی تالین پر ہاتھ جوڑے بیٹھ گیا۔ ”بچھورام.....! ان مہمانوں کی ناوقت اور اچانک آمد سے ہمارا سارا منصوبہ ہی چو پٹ ہو گیا ہے، اب کیا کریں؟“ مہارانی نجوبائی نے آہستہ سے مگر اراہ نظر بچھورام سے کہا۔ اس کی بات پر بچھورام کے بدہیت پتلے پتلے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ عود کر آئی..... اسی لہجے میں بولا۔ ”مہارانی جی! آپ چٹا کیوں کرتی ہیں۔ بچھورام ہے نا..... آپ کا غلام! منصوبہ چو پٹ نہیں ہوا، ہاں التوا کا شکار

شرم

ایک دفعہ ایک بزرگ آدمی کی آنکھوں کا آپریشن ہوا..... ڈاکٹر نے احتیاط اور پریہیز بتایا..... اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اگلے معائنے تک نماز میں جھکنے سے پریہیز کریں یا پھر اشارے سے نماز پڑھ لیں۔ گھر آ جانے کے بعد ان بزرگ نے کھانا پینا کم کر دیا ان کے گھر والوں کو پریشانی ہونے لگی۔ انہوں نے دوبارہ ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے کہا کہ ہو سکتا ہے روٹی چباتے وقت آنکھوں میں درد ہوتا ہو اس لیے انہیں نرم چیزیں کھلانے کا کہا۔ ایک دو دن تک گھر والوں نے دیکھا مگر بزرگ نے کھانے میں کوئی تبدیلی نہ کی کچھ دنوں بعد انہوں نے بزرگ سے پوچھ لیا کہ آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہے۔ ڈاکٹر نے تو سجدہ کرنے سے منع کیا تھا نہ کہ کھانا کھانے سے! بزرگ نے جواب دیا۔ ”جس کو سجدہ نہیں کر سکتا اس کا رزق کھاتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔“

پہلے اور بعد

شادی سے پہلے لڑکے کے بیڈروم میں پرفیوم، محبت نامہ، ہرنیٹ ورک کی سم، سی ڈی پلیئر، ایئر فریشنز، سرہانے کے نیچے شاعری کی کتابیں رسالے، ڈائریاں، ناول وغیرہ۔ شادی کے بعد..... ڈسپینرین، جوشاندہ، قرضے کی درخواست، بجلی ٹیلی فون کے بل، اسپنول کا چھلکا، دور و نزدیک کی عینکیں، میڈیکل رپورٹس، خالی بٹوا۔

اور سرہانے کے نیچے کتاب ”موت کا منظر۔“ (مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بطل ہزارہ)

ایورس گیٹر

ہمٹک برڈ گنگنانے والا ایک ایسا پرندہ ہے جو یکسر چیخے کی جانب بھی اڑ سکتا ہے۔ جس طرح آپ کار کو ریورس گیٹر لگا کر چیخے ڈرائیو کر سکتے ہیں، وہ بھی اپنے پردوں کو ریورس گیٹر لگا کر چیخے کی طرف اڑ سکتا ہے۔

(مرسلہ: غلام حسین اختر۔ سرگودھا)

گرج دار اور بھاری لہجے میں کسی کے بولنے کی آواز آرہی تھی، انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی سخت برہم ہو۔

انہوں نے اندر قدم رکھ دیا۔ یہ بھی ایک بڑا سا مال کمر تھا۔ اس کی چھت بھی مخروطی انداز میں اوپر تک چلی گئی تھی۔ سامنے کا منظر کم از کم رابرٹ کے لیے تو ضرور ہی عجیب تھا۔ وہ ٹپ ٹپ دیکھتا رہ گیا۔

وہ ایک موڑتی کودیکھ کر مہبت سارہ گیا تھا جو سنگ سیاہ کے ایک چھوٹے سے چبوترے پر بیٹھی ہوئی تھی اور بہت ارادائی نظر آتی تھی۔ یہ موڑتی تقریباً آٹھ فٹ اونچی اور عورت کی تھی۔ اس کا چہرہ نہایت مکروہ اور سیاہ تھا۔ آنکھیں وحشت انگیز انداز میں پھٹی ہوئی تھیں اور سرخ جھکتے ہوئے پتھروں کے ڈھیلے اس میں گاڑے گئے تھے۔ ناک موٹی تھی۔ منہ ہموٹا اور کھلا ہوا..... نہایت ہی بدہیت منظر پیش کرتا تھا۔ اس کے کالے ہونٹوں سے باہر تک لپکتی زبان سرخ رنگ کی تھی۔ اس کے چہ ہاتھ دکھائے گئے تھے۔ ہر ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا جن میں ترشول، گرز، سنان، چاقو اور خنجر موجود تھے۔ ہلکے تیسرے ہاتھ میں جو دایاں تھا اس میں ایک نوعمر لڑکی کا کٹا ہوا سر تھا، جس کی آنکھیں بند تھیں۔ ماتھے پر بندیا تھی اور مانگ میں سیندھور تھا۔

وہاں ایک شخص کو بھی اس نے دیکھا۔ یہ مندر کا بڑا بھاری بدری ناتھ تھا، جو کسی بھینسے کی طرح پلا ہوا تھا۔ رنگت سیاہ تھی۔ سر بڑے سے تر بوڑھتا تھا۔ اس کی سیاہ روپیشانی سے لے کر آدھے سر تک وہ گنجا تھا، اس کے بعد بال تھے۔ مچھے سے دراز ہو کر چٹیا کی صورت میں جھول رہے تھے۔ اسی ٹیل کی طرح اس کی آنکھوں کے ڈھیلے بڑے اور ابھراواں تھے جن سے وحشت سی ٹپکتی نظر آرہی تھی۔ اس کی ہڈیانی پر قشقہ کھنچا ہوا تھا۔ وہ بھی گروے رنگ کی دھوتی میں تھا اور اوپری بدن پر ہنہ تھا، چہرے پر کرسٹلی جیسے اس کا خاصہ لہ کر رہ گئی تھی۔ نوعمر دوشیزہ جو شاید یہاں کوئی داسی تھی، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مہا پجاری سے کچھ بولی اور اس نے اپنی ٹیل جیسی موٹی گردن کھما کر ان کی طرف دیکھا تو ہلک پڑا۔ اس کے چہرے سے فوراً کرسٹلی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ایک خوش آمدانہ مسکراہٹ نے لے لی لیکن پھر بھی غور سے دیکھنے پر لگتا کچھ ایسا ہی تھا کہ وہ ان کی غالباً بے وقت آہ پر لکڑی مندر ضرور ہو رہا تھا۔

”سواگتم..... سواگتم..... جے مہاراجا کی..... جے.....“ راج کمار کی..... کالی ماتا کے مندر پدھاریے..... کے چرن چھو کر جیون شانت کریں۔“ مہا پجاری نے کالی

”یہاں سنا کیوں ہے؟ کیا اور لوگوں کا داخلہ ممنوع ہے؟“ رابرٹ نے سوچنا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ وہ اس کی بات پر مسکرائی اور جواب میں بولی۔

”ایسی بات نہیں ہے، یہاں اور لوگ بھی آتے ہیں پوجا پاٹ کرنے..... یونو پوجا پاٹ؟ اس اے پریر آف گاڈ..... جنہیں ہم بھگوان کہتے ہیں۔“

رابرٹ کو ہندومت کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات تھیں لہذا اس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سر کو تھپی جنبش دی۔

”یہاں ویسے پکشن پورنیا کے تہوار میں عام لوگوں کا زیادہ رش دیکھنے میں آتا ہے۔“ اس بارایش نے رابرٹ کو بتایا۔ ”آؤ..... اب یہاں کی اصل چیز تمہیں دکھاتے ہیں مگر اسے دیکھ کر ڈرنا مت..... یہ جو بت تم دیکھ رہے ہو، اس میں درحقیقت ہمارے ہندومت کی دھارمک تاریخ کا پرتو ہے..... آؤ.....“ کہتے ہوئے ایش، رابرٹ کو لیے ان مورتیوں کے درمیان میں بنے راستے کی طرف بڑھا تو ساتھ چلتے ہوئے پجاری پرس رام، جو پہلے ہی کچھ متفکر اور تذبذب میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا ایک دم پریشان ہو گیا اور ذرا جھجکتے ہوئے ایش کمار سے بولا۔

”چھوٹے راج کمار جی! جہاں آپ جانا چاہ رہے ہیں وہاں مہا پجاری بدری ناتھ اس وقت کالی ماتا کی پوجا پاٹ میں مصروف ہیں۔“

”کوئی بات نہیں پرس رام! ہم انہیں ڈسٹرب نہیں کریں گے۔“ ایش نے سنجیدگی سے کہا تو پرس رام کو راج کمار کے آگے مزید کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

رابرٹ کو اب اس ماحول سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ بدستور آگے بڑھتے رہے۔ سامنے ایک اور دروازہ آگیا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ ایش نے پرس رام کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں سے مترشح حکم کو بھانپ کر فوراً آگے بڑھا اور دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دی تو وہ کھل گیا۔

رابرٹ نے دیکھا دروازہ ایک جوان اور دلکش بدن کی عورت نے کھولا تھا۔ رنگت تو اس کی سانولی تھی مگر چہرے کے نقوش بہت کشش انگیز تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر تھوڑا چونکی اور ابھی ہوئی نگاہوں سے پجاری پرس رام کی طرف دیکھنے لگی۔ شاید اس نے مخصوص انداز کی دستک پر یہی سمجھا ہوگا کہ آنے والا صرف پجاری پرس رام ہوگا، تاہم دوسرے ہی لمحے وہ ایک دم احترام سے اپنا سر جھکا کر ایک طرف ہو گئی۔ اندر سے

تھیلے جھول رہے تھے۔ یہ بالکل ایسے ہی تھے، جیسے جوگیوں کی پشت پر لدے ہوتے ہیں اور ان میں..... سانپوں کی پٹاری اور دیگر نجانے کیا آلا بلا بھرا ہوتا ہے۔ انہیں دیکھ کر وہ دونوں تھوڑا سا گھبرا گئے تھے، جب ہی ان تینوں پجاریوں میں سے ایک نے انہیں مخصوص اشارہ کیا اور وہ تیز تیز قدموں سے مندر کی میڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ ایش اور سوچنا نے بھی پٹاریوں والے تھیلے اٹھائے ان دونوں پجاریوں کو دیکھا تھا جو جنگل سے اچانک نمودار ہوئے تھے۔

اس کے بعد وہ تینوں پجاری نما افراد ایش کمار، سوچنا اور رابرٹ کی طرف بڑھے۔ انہیں مؤدبانہ انداز میں تعظیم پیش کی اور بالخصوص رابرٹ کی طرف ٹیکسی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”سواگتم..... سواگتم..... جے..... چھوٹے راج کمار اور کمار جی کی..... یہ آپ کے مہمان ہیں؟“

”جی ہاں، یہ ہمارے مہمان ہیں، مسٹر رابرٹ..... ہم انہیں کالی ماتا کا یہ مندر دکھانے لائے ہیں۔“ راج کمار ایش نے پجاری سے کہا تو اس کی گھنی بھوئی آپس میں مل گئیں اور وہ بولا۔

”کیا انہیں پہلے سے اس مندر کے بارے میں جان کاری تھی؟“

”کیسی باتیں کرتے ہو تم پجاری پرس رام! یہ تو پہلی بار یہاں آئے ہیں۔“ ایش نے مسکرا کر کہا۔ ”انہوں نے اوپر فصیل کی دیوار سے یہاں تک آنے کا ایک راستہ دیکھا تو تجسس میں پڑ گئے اور بولے کہ میں نے یہاں کی سیر کرنا ہے تو میں نے اس مندر کے متعلق بتایا۔ انہوں نے یہاں آنے کی اچھا کر دی۔“

”اچھا..... اچھا..... اندر تشریف لے آئیں۔“ پجاری پرس رام جلدی سے بولا اور انہیں راستہ دیا۔ تینوں آگے بڑھے اور مندر کی میڑھیاں چڑھتے ہوئے دروازے تک پہنچے، جو کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ سامنے ہال سا تھا۔ چھت زیادہ بلند نہ تھی، جو اوپر جا کر محراب سی بنائی محسوس ہو رہی تھی۔ سامنے ہی رابرٹ کو چھوٹے چھوٹے چبوتروں پر کچھ عجیب سی پتھر کی مورتیاں بنی نظر آئیں۔

رابرٹ کو ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ تو محض سوچنا سے قریب ہونے کی خاطر یہاں تک آیا تھا۔ کوئی ایسا موقع تاکنے کہ وہ اکیلی ہو اور اس سے تنہائی میں کچھ باتیں کر سکے۔ تاہم وہ دکھاوے کے لیے مصنوعی دلچسپی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شاہ زمان اور اریبہ تو میاں ہوئی بن گئے تھے، جبکہ علی اریبہ کا بھائی۔ تینوں نے گویوں والا مخصوص چمکتا وکتا لباس پہنا ہوا تھا۔ اریبہ ہلکے کاسنی رنگ کے راجستھانی لاپے میں بھی اور دکنی چولی میں، اس کے دوپٹے میں پشت ماہی کا دیدہ زیب کام نظر آتا تھا۔ زمان اور علی لمبے کرتوں اور گھیر والی شلوار پہنے ہوئے تھے۔ کرتوں پر سنہری دھاگوں کی کڑاہی کی گئی تھی۔ اریبہ نے گٹار تھام رکھا تھا، جبکہ علی نے مینجو اور زمان کے پاس ماؤ تھ آرگن تھا۔

یہ تینوں ساز بجاتے اپنی دھن میں چلے جا رہے تھے۔ اریبہ گیت گاتی جاتی تھی۔ راہ گیر نما شائقین ان کے ساتھ ساتھ چلتے جاتے تھے اور تھوڑی دور ساتھ دینے کے بعد پلٹ جاتے اور ان کی جگہ نئے شائقین لے لیتے۔ علی کی منصوبہ بندی کے مطابق انہوں نے ابھی دانستہ راج محل کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔ اس میں بھی ان کے منصوبے کا دخل تھا کہ وہ پہلے وہاں مٹر گشت کرتے ہوئے فوجیوں اور شاہی سپہ سالاروں کی نظروں میں آنا چاہتے تھے۔ ایک قدرے مصروف چوراہے پر ایک فرنگی فوجی نے انہیں دیکھا جو اپنی مخصوص وردی سے فوج کا کوئی چھوٹا موٹا افسر ہی نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ شاہی محافظ بھی کھڑے تھے۔ اس نے ان تینوں کی طرف دیکھ کر دو شاہی محافظوں سے کچھ کہا تو وہ دونوں ان کی طرف بڑھے۔ اس وقت یہ تینوں اپنے ”فن“ کا مظاہرہ کرنے میں مصروف تھے۔ علی ریحان اور شاہ زمان نے بھلا کیا مظاہرہ کرنا تھا اپنے فن کا..... وہ تو صرف سُر ملانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ البتہ خوش گلو، اریبہ کی ورد بھری شاعری اور گیتوں نے ایک سماں باندھ رکھا تھا وہاں۔ اطراف میں کھڑے لوگوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے وہ دونوں مذکورہ شاہی سپہ سالار ان کی طرف بڑھے اور انہیں خاموشی اختیار کرنے کا اشارہ کیا۔ اریبہ نے گانا ترک کر دیا۔ علی اور زمان بھی اپنے دستی سازوں کے ساتھ قہم گئے، مگر اندر سے ان کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے دھڑکا ایک ہی تھا کہ..... کہیں ان پر کسی قسم کا شبہ تو نہیں کر لیا گیا تھا؟ زمان نے اس کی وردی اور اس کے شولڈر پر لگے پھولوں سے اندازہ لگایا تھا کہ یہ لیفٹیننٹ تھا اور اس کا نام سینے پر لگے ٹیگ سے لیف بروج رکھا نظر آتا تھا۔

”اے.....! تم تینوں ادھر چلو ہمارے ساتھ.....“ ایک محافظ نے ان کی طرف دیکھ کر کڑک دار تحکمانہ آواز میں کہا اور وہ تینوں چہروں پر حیرت سجائے ایک دوسرے کی طرف تکتے ہوئے ان کے ساتھ ہو لیے۔ قریب ہی وہ فرنگی

آنکھوں کے بند گوشے نمناک ہونے لگے تھے۔ اس نے ایک بار پھر پورے زور سے اریبہ کو بھیج لیا کہ اریبہ کی ہلکی سی سکاری خارج ہوگئی مگر اس کا سبب جسمانی دھن نہ تھی، بلکہ جذبات کے باعث تھی جو اس نے زمان کی حلاوت بھری قربت میں محسوس کی تھی۔

تب ہی اس نے بہت دھیرے سے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ ”آخری روٹی اتارتی ہوں، کھانا لگاتی ہوں۔“ زمان نے اسے چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر بعد یہ تینوں اکٹھے اوپر کھانا کھا رہے تھے۔ اریبہ کے ہاتھوں میں بڑی لذت تھی۔ کام و دہن کے وہ سارے لوازمات خالص گندم کے آٹے کی روٹی اور مرغابی کے بھنے ہوئے گوشت سے پتا لگتے تھے۔ اس نے بطن کا بھی گوشت بنایا تھا اور ساگ بھی۔ ابلے ہوئے چاول بھی تھے۔ علی ریحان کو مرغابی کا گوشت اچھا لگا اور اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”اریبہ بہن! ماشا اللہ تم نے کھانا تو بہت اچھا بنایا ہے۔ روٹی تو اس قدر ذائقہ دار ہے کہ روکھی ہی کھائے جاؤ اور پیٹ بھر لو۔ دیسی گھی کے تڑکے والا ساگ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ بطن کے گوشت کی تو کیا ہی بات ہے، لیکن یہ مرغابی کا گوشت تو سمجھو اس دسترخوان پر بازی ہی لے گیا۔ یہ کہاں سے دستیاب ہوئی؟ میرا خیال ہے عام طور پر تو یہ بازاروں میں نایاب ہوتی ہے؟“

”شکریہ علی بھائی! آپ کو میرا کھانا پسند آیا۔“ اریبہ مسکرا کر بولی۔ ”مرغابی کا گوشت یہاں عام ملتا ہے۔ اس لیے کہ یہ پہاڑی اور جنگلاتی علاقہ ہے۔ لوگ خود بھی شکار کرتے ہیں اور بیچتے بھی ہیں۔“

کھانا ختم ہوا۔ انہوں نے تھوڑی دیر قیلولہ کیا۔ اس کے بعد سہ پہر میں اریبہ نے چائے بنالی۔ چائے بھی بہترین اور خوش ذائقہ تھی۔ چائے پی کر خمار گندم کے آٹا کرم ہوئے تو یہ لوگ اپنے مشن کے بارے میں سوچنے لگے۔ سوچ تو چکے تھے، بس ایک ذرا تیاری نمٹانا تھی، جس کو جتنی شکل دی گئی۔

شام کے سائے دراز ہونے سے قبل ہی یہ تینوں مکان سے نکلے۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں کسی کی ان پر نگاہ نہ پڑنے پائے۔ کم از کم علی ریحان اور شاہ زمان پر..... اسی سبب پہلے اریبہ نکلی تھی، اس کے بعد علی اور زمان بھی ایک ایک کر کے دائیں بائیں کی گلیوں میں گھس کر آگے جا کے اریبہ سے جا ملے تھے۔

تینوں اب بنجارے نما گویوں کے بھیس میں تھے۔

باریک اور چست قمیص گیلی ہو کر اس کے نرم و گداز بدن سے چپک کر ہم رنگ وہم آہنگ ہوگئی تھی اور زمان اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا، جبکہ اریبہ کو اپنی ”حالت“ کا بھی احساس تھا اور قریب، بالکل قریب..... کھڑے زمان کی ”نظروں“ کا ادراک بھی..... مگر اس نے سبکڑنے سمٹنے کی مطلق کوشش نہ کی تھی۔ ہاں، ایک ذرا نگاہ بھر کے۔ اور گردن اٹھا کے زمان کی طرف مسکرا کے ضرور دیکھا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے وہ اسے کس قدر اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔

وہ وہاں سے ہٹنے لگا، مگر جی نہیں چاہا کہ بھرے شباب گویوں آنکھوں سے جانے دے۔ اس نے پھر بھی جی کڑا کر کے اور وہاں سے قدرے ہٹتے ہوئے ہولے سے کہا۔ ”بارش زیادہ ہو رہی ہے، میرا خیال ہے، مجھے اندر چلے جانا چاہیے۔“

”بس! بھر گیا جی.....؟“ اریبہ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر وہ جیسے اس کی بات کا مطلب سمجھ کر بے اختیار آگے بڑھا اور قدرے جھک کر اس نے اریبہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ دودل ہی نہیں، دودن بھی دروں و بروں بیک وقت مینہ، ساغر و مستی میں بھیگنے لگے اور پھر زمان نے اریبہ کو خود سے لپٹا لیا۔ اک بے اختیاری سی بے اختیاری تھی اور وہ تھے۔ کئی لمحات کیف و نشاط کے اسی طرح بیت گئے اور اریبہ تھوڑا سا کسمپاسی تو زمان نے اس کے نرم و گداز ہونٹوں کی گرمی چھو لینے کے بعد اپنے ہونٹ اس کے لبوں سے جدا کرتے ہوئے جذبات و فاسے لبریز لہجے میں کہا۔

”اریبہ! تم نے یہ کیا جادو کر دیا ہے مجھ پر کہ میں اپنے آپ میں ہی نہ رہ سکا ہوں۔ میں تو..... میں تو کسی اور منزل کا مسافر ہوں مگر مجھے ڈر ہے کہ میری وہ ڈگر نہ بدل جائے جس کے عظیم مقصد کے لیے میں اپنے سر پر کفن باندھ کے نکلا تھا۔“ ”تم اب بھی اپنی ڈگر پر ہی ہو، زمان!“ اریبہ نے اس سے لگے ہوئے جذبات سے مرتعش آواز میں کہا۔ ”خدا نہ کرے میں تمہیں تمہارے عظیم مقصد کی ڈگر سے ہٹانے کا ایک ذرا سا بھی سبب بنوں۔ ہرگز نہیں زمان! میں تو تمہارے ساتھ ہوں..... وفائے جان و قلب سے لے کر تمہارے جذبہ حب الوطنی تک.....“

”اور اگر میں اس عظیم مقصد میں کام آگیا تو.....“ ”تو میں تا عمر ایک شہید کے ساتھ اپنے اٹوٹ انگ پر فخر کرتی رہوں گی۔“ کہتے ہوئے اریبہ نے اپنی کشادہ آنکھوں کی گھنیری پلکیں گرا دیں تو زمان نے دیکھا، اریبہ کی

دیوی کی طرف خفیف سا اشارہ بھی کر دیا۔ ایش اور سوچنا آگے بڑھے اور چوتھے پر چڑھ کر کالی دیوی کے قدموں پر جھک گئے۔ رابرٹ حیران پریشان کھڑا رہا۔ مہا پجاری بدری ناتھ اب اس کی طرف کڑوی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ رابرٹ یہی سمجھا شاید پجاری نے برا منایا ہے، لہذا وہ بھی جلدی سے آگے بڑھا اور سنگ سیاہ کے چوتھے پر چڑھ کر اس نے کالی دیوی کے قدم چھو لیے۔

ایش نے رابرٹ کا تعارف کروایا..... اس کے بعد بولا۔ ”یہ ہمارے معزز مہمان ہیں، مندر کی سیر کا شوق انہیں یہاں لے آیا۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ مہا پجاری بدری ناتھ نے کہا۔ ”لیکن بہتر ہوتا کہ دودن بعد آپ یہاں آتے اور پکشن پورنیا کے جشن سے لطف اندوز ہوتے۔“ ایش نے کچھ کہنا چاہا تو رابرٹ بول پڑا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، ہم دور و ز بعد آجائیں گے.....“ کہتے ہوئے اس نے ایش سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میرا خیال ہے اتنا کافی ہے..... اب چلنا چاہیے۔“

”جیسے تمہاری مرضی دوست!“ ایش نے کاندھے اچکا دیے۔ یہ لوگ پلٹے اور ہال کمرے کے نکاسی والے دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ کسی عورت کی تیز اور لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔

☆☆☆

وہ دونوں پہلے ہی بحر الفت کی شبنم میں دھیرے دھیرے بھیگ رہے تھے، ایک کی بھا دوں برستی مینہ نے تو جیسے ان دودیوانوں کو شربور ہی کر دیا۔

بارش کی پھوار ترچھی اور رسوئی کے دروازے سے اندر بھی پڑ رہی تھی، جہاں قریب ہی پڑا رکھے اریبہ روٹیاں بنا رہی تھی۔ اس پر تو بارش کی پھوار نے جیسے اور ہی رنگ جمادیا تھا، گویا اس کا روپ ہی نکھار ڈالا ہو۔ بال سبیلے ہو کر اس کے حسین چہرے کو ایک نود میدہ سی تازگی بخشنے لگے تھے۔ دلکش بدن کے سلگتے ہوئے خرمین شباب پر ٹھنڈے پانیوں کے چھینٹوں نے تو جیسے آتش جواں بدن کو بجائے بجھانے کے، جلتی پرتیل کی طرح دہکا دیا تھا۔ اسے بسنت رچنا کا روپ عطا کر دیا تھا۔ وہ گلاب کی طرح کھل رہی تھی اور شاہ زمان رسوئی کی چوکھٹ سے نکلا کھڑاموم کی طرح پگھل رہا تھا۔ وہ خوشبو بن کر بکھر رہی تھی اور وہ ہوا کی طرح اس کی سنگت میں تھا۔

اریبہ بارش کے پانیوں میں بھیگ گئی تھی۔ اس کی

ہے۔ اس میں کیا شک ہے؟“
”تم میری بات نہیں سمجھ علی بھالہ! اریہ نے کہا۔“ میں اس انگریز فوجی افسر کی بات کر رہا ہوں، وہ ابھی تک ہم سے مطمئن نہیں ہوا ہے۔“

”ہاں! یہ بات تو میں نے بھی محسوس کر لی مگر وہ.....“
اب مہاراجا چندر گپتا کے سامنے بے بس ہے، ہارے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔“ علی نے کہا۔

”ایسی بات نہیں ہے دوست! زمانہ اس بار گہری سنجیدگی سے بولا۔“ ہمیں اس سے محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔ وہ کوئی بھی گل کھلا سکتا ہے ہمارے خلاف..... اس کا نام بروجر ہے اور وہ مجھے بہت ہوشیار اور ہالاک معلوم ہوتا ہے۔“

اریہ اور زمانہ کے خدشات کچھ ابے غلط بھی نہ تھے۔ کیونکہ ادھر اپنی بیرک میں موجود لیف بروج بچھے ہاتھ باندھے پرسوج انداز میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور چہرے پر تناؤ کی کیفیات گہری۔ اب پتا نہیں یہ اس کا تجربہ تھا یا اس کی چھٹی حس کا ٹھکانہ..... کہ اسے اریہ اور اس کے دونوں ساتھیوں پر جاسوس ہونے کا شبہ ہو رہا تھا۔ وہی جاسوس جن کی اطلاع ملی ہوئی کی اور ان کی تلاش و منادی بھی جاری تھی مگر وہ مہاراجا چندر گپتا کے سامنے مجبور تھا۔ تاہم اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اپنے فرض سے کوتاہی ہرگز نہیں کرے گا اور اپنا شک دور کر کے ہی رہے گا۔ وہ تینوں پر آج ہی سے کڑی مگر خفیہ نگاہ رکھے گا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے ایک ساتھی فرنگی اریہ، علی اور زمانہ کی مخبری پر لگا دیا۔ رینک کے اعتبار سے وہ برٹش آرمی میں سارجنٹ تھا۔ اس کا نام جارج تھا۔ وہ ایک درمیانی عمر کا فوجی تھا اور لیف بروج کا خاص اور قریبی ملازم بھی۔

”بے حد ہوشیاری اور خاموشی سے تمہارا یہ کام کرنا ہوگا، جارج!“ لیف بروج دھیمی آواز میں اسے کہہ رہا تھا۔ ”تمہاری جاسوسی کا یہ پول کھلنے نہ پائے..... اور تمہی تم خود مہاراجا کے سپاہیوں کی نظروں میں نہایت نکت اصول رکھتا ہے۔ کوئی اس کے مہمانوں کو تنگ کرے یا ان کی جاسوسی پر مامور ہو یہ اسے قطعاً پسند نہیں۔“

”ڈونٹ وری سر!“ جارج نے جواب دیا کہا۔ ”میں اپنا کام بہ خوبی انجام دیتا جانتا ہوں۔“

”کوشش کرو کہ آج رات تک ہی نہان رازداری سے ان کی باتیں سننے کی کوشش کرو۔“ بروج ہلکا۔ ”اگر یہ

آن پہنچا اور مہاراجا چندر گپتا کے اس حکم پر پریشان ہو کر بولا۔ ”جناب! میں پہلے ان کی اچھی طرح چھان بین کر لینا چاہتا ہوں، اس کے بعد ہی ان کا راج محل میں داخلہ بہتر ہوگا۔“

”ہم ان کی چھان بین کر چکے ہیں مسٹر بروج! یہ لوگ جاسوس نہیں ہو سکتے۔“ مہاراجا چندر گپتا نے بارعب اور گونج داری آواز میں کہا۔

”لیکن جناب مہاراجا صاحب! کل صبح ایک اہم میٹنگ ہونے والی ہے۔ اس میٹنگ سے پہلے انہیں فی الحال ادھر ہی رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ لیفٹیننٹ بروج کی ”اہم میٹنگ“ والی بات پر ان تینوں کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ اندر ہی اندر مسرت سی محسوس کر رہے تھے کہ قدرت نے ان کا کام کس قدر آسان کر دیا تھا۔ ساتھ ہی وہ ایک بار پھر اریہ کی ذہانت کے بھی قائل ہونے لگے تھے لیکن انہیں اس خراٹ انگریز افسر پر غصہ بھی آ رہا تھا جو ان کا بنانا یا کھیل بگاڑنے اور ان کا راستہ کھوٹا کرنے کے درپے تھا۔

”ہم فیصلہ کر چکے ہیں، ایسی کوئی بات نہیں، بلکہ ہم کل اپنے آنے والے مہمان مسٹر جان پال کے ساتھ راگ رنگ کا جشن بھی منائیں گے۔“

انگریز افسر کو چپ ہونا پڑا۔ وہ یہاں محدود اختیارات رکھتا تھا۔ اریہ، علی اور زمانہ کو فوراً شاہی مہمان خانے لے جایا گیا۔

”اللہ اس نیک مقصد میں ہماری پوری مدد فرما رہا ہے، ورنہ ایسی کامیابی کا کب سوچا تھا کہ جیسے منزل خود چل کر ہمارے نزدیک آگئی ہو۔“ علی ریحان نے سرگوشی اور دبے دہے سے جوش میں کہا تو اریہ مسکرا کے ہولے سے بولی۔

”بے شک اللہ کی مدد شامل حال ہے، لیکن ہمیں اب پہلے سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے، کیونکہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“

”اریہ! شامل ایسے ہی نہیں تمہاری تعریفیں کرتا تھا۔ بلاشبہ تم نے غضب کا دماغ پایا ہے۔“ زمانہ کے لہجے میں بھی اریہ کے لیے توصیف تھی۔

”اس میں کوئی شک نہیں، اریہ بہن کی وجہ سے ہم اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے گویا بام آچکے ہیں۔“ علی نے کہا۔ تب اریہ نے سنجیدگی سے ان کی توجہ ایک مسئلے کی طرف مبذول کراتے ہوئے بچی آواز میں کہا۔

”مگر ہم ایک خطرے سے اب بھی دوچار ہیں۔“
”خطرہ تو اب ہمارے چاروں طرف ہی موجود

رہا تھا۔ اس کے برعکس وہ مطمئن ہی نظر آ رہی تھی۔
”اے..... اے..... اے..... چھوٹے کیوں ہو.....؟ چھوڑو ہماری بیاں۔“ وہ اپنا بازو دبوچے جانے پر روایتی ٹیلی عورتوں کے انداز میں محافظ سے بولی۔ ”ہم لوگ مہاراجا سے تمہاری شکایت کر دیوں گے، ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہم گویوں کی کتڑ اجت (عزت) کر رہے ہے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے ہے۔ ہم منگتے نہیں ہیں، جدی بستی ڈومین میرانی ہیں۔“

اریہ کی یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی، وہ انہی آزاد ریاستوں کی پروردہ تھی۔ اسے پتا تھا کہ راجے مہاراجے شاعروں اور گویوں کو کیسی قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ لہذا انگریز فوجیوں کو تو نہیں البتہ شاید شاہی محافظوں کو اس حقیقت کا ادراک تھا اسی لیے وہ ذرا خفیف سے نظر آنے لگے تھے تاہم فرنگی افسر کا حکم بھی ماننے پر مجبور تھے۔

انہیں راج محل لایا گیا جہاں انہیں ایک تنگ سی بیرک میں بند کر دیا گیا۔ اریہ وہاں بھی کچل نہیں بیٹھی تھی۔ اس نے خود بھی وہاں گانا شروع کر دیا اور علی اور زمانہ کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ اڑتے اڑتے یہ خبر کسی طرح مہاراجا چندر گپتا کے کانوں تک جا پہنچی کہ..... سرکاری (شاہی) قید خانے میں ایک بہت ہی خوب صورت اور خوش گلو..... ڈومنی (مغنیہ) جاسوسی کے شہسے میں لائی گئی ہے۔ وہ گاتی بڑا اچھا ہے اور اچھی عمدہ شاعری کا بھی ذوق رکھتی ہے وغیرہ..... مہاراجا کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ اس قدر دلدادہ تھا کہ ان کی چھان پھٹک کرنے اور ٹھونک بجانے کے لیے خود ہی بہ نفس نفیس وہاں جا پہنچا۔

اریہ تو اتنی نہیں البتہ علی ریحان اور شاہ زمانہ اس طرح اچانک اور غیر متوقع طور پر راج محل کے بادشاہ کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ ان کے تو سان گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ اریہ کا فسوں راج محل کے مضبوط در و بام کو چیرتا ہوا مہاراجا کے دیوانہ خاص تک پہنچ جائے گا اور یہی نہیں اسے کچے دھاگے سے باندھے یہاں تک بھی لانے کا سبب بنے گا۔ اب انہیں اریہ کی فسوں خیزی کا معترف ہونا پڑا تھا۔

اریہ نے وہیں مہاراجا کے کھڑے کھڑے ایسے اشعار اور غزلیں موضوع کیں کہ مہاراجا اس کی شاعری ہی نہیں بلکہ سرلی آواز کے سرگم میں گم ہی ہو کر رہ گیا۔ اس نے فوراً حکم صادر کر دیا کہ ان تینوں کو فوراً شاہی مہمان خانے میں منتقل کیا جائے۔

ایسے ہی وقت میں جب اس انگریز افسر کو مہاراجا کی اس طرح قید خانے میں آمد کا پتا چلا تو وہ بھی دوڑا ہوا وہاں

افسر کھڑا تھا جو ان کا ہی منتظر تھا۔ خاصا لمبا تڑنگا اور صورت سے ہی کرخت مزاج اور چالاک نظر آتا تھا۔ ایک برساتی ہوئی نظر ان پر ڈالنے کے بعد ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بولا۔

”کون ہو تم لوگ؟ اور کہاں سے آئے ہو.....؟“
اریہ نے فوراً انجانوں والے مخصوص انداز و لہجے میں، ایک مسکراتی سی نگاہ انگریز افسر پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”سرکار.....! گویے ہیں ہم، ادھر پورب کی وادی تریپال سے آوت ہیں بستی بستی نگر یا نگر یا گا کے جیون سکھی اور من شانت رکھت ہیں، اپنا بھی اور دوسروں کا بھی.....“

”کیا نام ہے تمہارا.....؟“ انگریز افسر نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

”میں کوری.....“

”اور یہ دو کون ہیں؟ کیا لگتے ہیں تیرے.....؟“
”سرکار! یہ تو میرا ہضم ہونے ہے۔“ اریہ نے زمانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دانستہ تھوڑا شرما کر کہا اور پھر علی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”بھوپت نام ہے اس کا، اور وہ ہرے بھیا ہیں، سوشل۔“

”تم لوگوں کو ریاست میں کیسے داخل ہونے کی اجازت دی گئی؟“ وہ خراٹ انگریز افسر کی طور بھی مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے ان پر سوالات کی بوچھاڑ کر رکھی تھی، مگر اریہ نے بھی پورے اعتماد سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”سرکار.....! ہم بخاروں کو بھلا کون روکے ہے؟ ہم تو ہر سال ادھر کالی ماتا دیوی کے مندر کی زیارت کرت ہیں۔ کبھی گرنہ تہور اور کبھی پنکشن پورن ماشی میں۔“

اسی وقت ایک محافظ پہرے دار نے انگریز افسر کے کان میں جھک کر کچھ کہا تھا۔ علی اور زمانہ کی دھڑکتی مگر بھانپتی ہوئی نظریں اسی افسر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ محافظ کی بات پر اس افسر نے کوئی توجہ نہ دی تھی۔ اس نے شاید اس خراٹ افسر کو انہیں چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا مگر وہ نہیں مانا تھا۔ وہ بدستور ان کی طرف اشتباہ انگیز نظروں سے دیکھتے ہوئے محافظوں اور اپنے ساتھیوں سے تحکمانہ بولا۔

”ان تینوں کے بارے میں جب تک ہمیں کوئی تسلی نہیں ہو جاتی، ہم انہیں جانے نہیں دیں گے، انہیں ساتھ لے چلو۔“

یہ حکم صادر ہوتے ہی محافظوں نے انہیں گرفت میں لے لیا۔ علی اور زمانہ اس مخدوش صورت حال سے پریشان ہو گئے تھے مگر اریہ کے چہرے سے ایسا کچھ بھی ظاہر نہیں ہو

جاسوس ہوئے تو ضرور ایسی باتوں پر تبادلہ خیال کریں گے جس مقصد کے لیے وہ یہاں آئے ہیں یا بھیجے گئے ہیں۔“

”نیس! میں ابھی سے ان کے پیچھے پڑ جاتا ہوں، رات تک آپ کو رپورٹ دینے کی کوشش کروں گا۔“

”ان کا آج رات ہی پول کھل جائے تو اچھا ہے، کیونکہ کل ہمارے ایک بڑے افسر مسٹر جان پال آرہے ہیں یہاں راج محل میں..... یہ لیفٹیننٹ جنرل مائیکل شا کے خاص اپنی اور نمائندے ہیں..... برٹش آرمی میں یہ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ گوریلہ ہیں۔“

ایک ذرا متوقف ہونے کے بعد وہ دوبارہ جارج سے کہنے لگا۔ ”ہمیں نہایت باخبر ذرائع سے یہ اطلاع ملی ہے کہ..... وہ جاسوس درحقیقت اس اہم میٹنگ کو ہی سبوتاژ کرنے کی غرض یہاں ناگرہ ریاست میں بھیجے گئے ہیں۔“

مخبر بروجر نے..... اثبات..... میں..... سر ہلایا اور اپنا ”کام“ نمٹانے کی غرض سے اسی وقت الٹ ہو گیا۔

☆☆☆

سب پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ پروفیسر ہنری زہریلے سانپ کا شکار ہو گئے تھے اور ان کے چہرے کی بدلتی رنگت اور منہ سے گہرے سبز جھاگ بہنا اسی بات کا ثبوت تھا کہ سانپ کا زہر کام کر گیا تھا اور وہ کسی بھی قسم کی طبی امداد سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ رینا ان کی لاش سے لپٹ کر بچھاڑیں مار مار کے رونے لگی..... اس بے چاری کا یوں بھی اپنے باپ کے سوا اور کون تھا دنیا میں..... یہ ایسا اندوہناک اور اچانک سانحہ تھا کہ کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جو شخص اب تک اتنی تنہا ہی جستجو اور لگن و جوش کے ساتھ دلی سے کوہِ شمالیہ کے اس عظیم پہاڑی سلسلے تک بڑی کامیابی سے اپنی ٹیم کے ساتھ پہنچا تھا، وہ یوں اچانک ایک زہریلے سانپ کا شکار ہو کر ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا بھی ہو سکتا ہے۔ پروفیسر ہنری برنارڈ کی اس ناگہانی موت پر ہر کوئی دنگ اور اداس تھا۔ شوکی کو تو ہنری کی موت کا بہت زیادہ دکھ ہوا تھا۔ وہ انہیں اپنا سر پرست سمجھتا تھا، یہی وہ واحد شخص تھا جس نے شوکی کو کبھی نوکر نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی کمتر..... رابرٹ حالانکہ اس کا بھتیجا تھا اور یہی نہیں رابرٹ کا باپ ہنری کا محسن بھی تھا، مگر باوصف اس کے وہ رابرٹ کے اس کے ساتھ ناروا رویے پر اپنے بھتیجے کو ہی تصور وار سمجھتا تھا اور اسے سرزنش کرتا تھا۔ یہی وہ باتیں تھیں جس نے شوکی کو پروفیسر ہنری کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔

جنوب مشرقی سمت کی یہ کھوجنا ہم شوکی کو اب ادھوری

پڑتی نظر آرہی تھی۔ وہ رینا کو دکھی دیکھ کر خود بھی آزرده ہو گیا تھا۔ گارشیا نے ہی غم زدہ رینا کو سنبھالے رکھا تھا۔ فضا ایک دم سوگوار ہو گئی تھی۔

سانپوں کے اس حملے میں شوکی نے نائب سالار کی حیثیت سے سب کو اپنے گرد و پیش سے محتاط رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔

رینا کی آہ و فغاں تھی تو..... شوکی نے یہ ہم ادھوری چھوڑ کر واپس راج محل لوٹنے کا کہا مگر رینا ایک دم بولی۔

”میں اپنے پاپا کی اس مہم کو مکمل کیے بغیر ہرگز واپس نہیں پلٹوں گی۔“ سب اس کی بات سن کر حیران ہو گئے۔ شوکی کچھ فکر مند سا ہو گیا۔ وہ رینا کے آزرده چہرے پر ایک عجیب سے جوش بھرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ جبکہ اس کا اپنا خیال اور ارادہ یہی تھا کہ اس مہم کو ادھور ہی لپیٹ کر واپس کا راستہ اختیار کر لیا جائے..... مگر رینا کی بات پر وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہونے لگا تھا جبکہ گارشیا رینا کو سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”رینو! جوش میں پاگل مت بنو..... یہ ایک ناگہانی حادثہ تھا۔ انکل ہنری اب دنیا میں نہیں رہے ہیں جس کا ہم سب کو بے حد افسوس ہے۔ ہمیں اب راج محل ہی نہیں بلکہ واپس دلی لوٹنا ہو گا۔“

”یہ ناگہانی حادثہ نہیں تھا۔“ معارینا اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بولی۔ ”کسی نے ہم پر سانپوں سے دانستہ حملہ کر دیا ہے۔“ اس کی بات پر کوئی بھی متفق نہ ہوا، شوکی کو بھی رینا کی یہ بات ہضم نہیں ہوئی تھی مگر وہ اس کی بات رد نہیں کر سکتا تھا، لہذا وہ تو خاموش رہا لیکن گارشیا نے پھر اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

”رینو! تم پھر پاگل ہو رہی ہو، تمہاری بات لغو ہے، بھلا یہاں ہمارا کون دشمن پیدا ہو گیا جو ہمیں سانپوں سے حملے کروا کے ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا؟“

”میں پاگل نہیں، پورے ہوش میں ہوں.....“ رینا نے اس سے کہا۔ شوکی اس کے غم پر ایک عجیب سے جوش کو غالب آتے ہوئے صاف محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ بھی اس کی بات پر غور کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ آخر کوئی تو ایسی بات ہوگی جس پر رینا یہ سب کہہ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے گارشیا سے مخاطب ہو کر کہا۔

”مس گارشیا! میرا خیال ہے رینا کی بات سن لینی چاہیے۔ اس میں ہمارا بھی فائدہ ہے، اگر کوئی ہمارا دشمن پیدا ہو بھی گیا ہے تو ہم بھی محتاط رہیں گے۔“

”تم تو اس کی ہر جائز و ناجائز بات کی طرف داری

رنگ آسمان

کر دے ہی مسٹر شوکی!“ گارشیا نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”جبکہ تم خود بھی یہ تسلیم کر رہے ہو کہ ہمارا ایسا کوئی دشمن ہے بھی تو ہمیں فوراً واپس راج محل کی طرف لوٹ جانا چاہیے..... نہ کہ ہم خود کو نامعلوم دشمنوں کے حوالے کر دیں۔“ شوکی نے اس کی بات اور طنز کو صرف نظر کرتے ہوئے رینا سے کہا۔

”مس رینا! میرا خیال ہے کہ اب آپ ذرا کھل کر اپنے شبے کی وجہ بھی بتا دیں تو بہتر ہوگا، تاکہ ان لوگوں کی بھی تسلی ہو جائے۔“

”شوکی! دشمن صرف میرے پاپا اور میری جان لینا چاہتے تھے اور..... میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ ان چھپے ہوئے دشمنوں کا تعلق راج محل سے جڑا محسوس ہوتا ہے مجھے۔“

رینا نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا تو سب اس کی بات پر چونکے بغیر نہ رہ سکے تھے، وہ پُر زور لہجے میں مزید بولی۔ ”تم کیوں بھول رہے ہو کہ پاپا نے اس مہم پر نکلنے سے پہلے ہم سے کچھ سوالات پوچھے تھے اور صرف میں اور شوکی ہی ان کے سوالات کے ٹھیک جوابات دے سکے تھے۔ کیونکہ ہم نے راج محل میں جوابات محسوس کی تھی وہ ہم نے پاپا کو بتا دی تھی۔ جنوب مشرق کی فصیل کی طرف ہمیں جانے سے روکا گیا تھا۔ پھر مہاراجا چندر گپتا نے..... اس سلسلے میں جھوٹ بولا کہ وہ جگہ خاص میٹنگز کے لیے مخصوص ہے اور ریاست کے بعض ضروری معاملات نمٹائے جاتے ہیں۔ پاپا نے ان کا یہ جھوٹ بھی پکڑ لیا تھا۔ جب انہوں نے اپنے شبے کی تفصیلی وجہ بتاتے ہوئے کہا تھا کہ..... جب مہاراجا نے مجھ سے میٹنگ کا ذکر کیا تو کچھ دیر بعد میں نے انہیں اپنے سپہ سالار، جنہیں یہ لوگ سینا پتی کہتے ہیں، موج سنگھ نام تھا اس کا، اس سے بار بار کسی مندوب کے بارے میں بتا رہے تھے جس کا نام مجھے جان پال معلوم ہوا تھا۔ وہ عنقریب ایک اہم میٹنگ کے لیے یہاں پہنچنے والا تھا اور وہ اس کے ساتھ مذکورہ جگہ کے بجائے کل کے کسی اور گوشے میں اس کے انتظامات کی ہدایات دے رہا تھا۔ تب ہی مجھے شک گزرا تھا کہ یہ قول مہاراجا چندر گپتا کے..... وہ ایسی میٹنگز تو راج محل میں نہیں کرتا، جس کے لیے اس نے اسی فصیل کی دوسری جانب کے لیے جگہ مخصوص کر رکھی ہے تو پھر اس جھوٹ کی کیا وجہ تھی۔ میں نے اسی راز سے پردہ اٹھانا ہے۔ یہ میری برسوں کی تحقیق کا ایک اہم باب ہوگا۔ میری یہ کتاب ”دنیا کے مشرق کے سربستہ پراسرار راز“ یقیناً بہت مقبول ہوگی جسے میں انگلستان جا کر چھپوانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور تم سب کا بھی اس میں ذکر ہوگا، کیونکہ میری اس

تحقیقی مہم میں تم سب چشم دید گواہوں کی حیثیت رکھتے ہو۔“

”مگر ہم انہیں یہ کب بتا کر راج محل سے چلے تھے کہ ہم دوسری طرف سے گھوم کر اسی فصیل کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“ گارشیا نے رینا کی بات پر اعتراض اٹھایا۔ ”بلکہ ہم تو انہیں یہی بتا کر راج محل سے مہم پر روانہ ہوئے تھے کہ ہم راکاشی کی پہاڑیوں کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”تمہارا اعتراض غلط نہیں.....“ رینا نے کہا۔ ”مگر ہو سکتا ہے کسی نے ہمارے تعاقب میں کچھ لوگوں کو روانہ کر دیا ہو..... وہ یہ تسلی کرنا چاہتے ہوں کہ آیا ہم راکاشی کی طرف ہی جانے کا ارادہ رکھے ہوئے ہیں یا کہیں اور..... جب انہوں نے دیکھا کہ ہم اپنا راستہ بدل چکے ہیں اور راکاشی کی وادی میں جانے کے بجائے مذکورہ فصیل والے راستے کی طرف بڑھنے لگے ہیں تو انہوں نے سانپوں کا حملہ کر دیا۔ چونکہ اس قافلے کے سرخیل پاپا ہی تھے اسی لیے انہوں نے پہلے مجھ پر اور پاپا پر ہی حملہ کر دیا..... ممکن ہے اوروں پر بھی کرنا چاہا ہو.....“

”لیکن انہوں نے پروفیسر ہنری جیسے معزز مہمان کو کیسے ایک دم مروا ڈالا؟ خوف زدہ کرنے کی خاطر پہلے وہ..... ہم میں سے کسی اور کو بھی نشانہ بنا سکتے تھے؟“ شوکی نے باریک بین لہجے میں کہا۔

”میں نے ابھی کہا تھا..... کہ ہو سکتا ہے، پہلے تم میں سے ہی کسی کو نشانہ بنانا چاہتے ہوں، یا پھر انہیں پاپا کو ہی ہلاک کرنا زیادہ سہولت ہو کیونکہ اس مہم کے اصل سرخیل پاپا ہی تھے۔“

”اوہ..... ہم لوگوں کی جان پر مبنی ہوئی ہے اور تم دونوں یہ کیا فضول موضوع چھیڑ کر بیٹھ گئے ہو، فوراً واپس راج محل چلو، بلکہ واپس دلی جانے کی سوچو.....“ گارشیا پریشان لہجے اور بیزاری سے بولی۔ ان کی آپس کی باتوں سے وہ شاید خوف زدہ ہی ہونے لگی تھی، بلکہ تند و بابا اور شاننا سمیت امجد خان بھی موجودہ سنگین صورت حال سے خوف زدہ نظر آنے لگے تھے۔

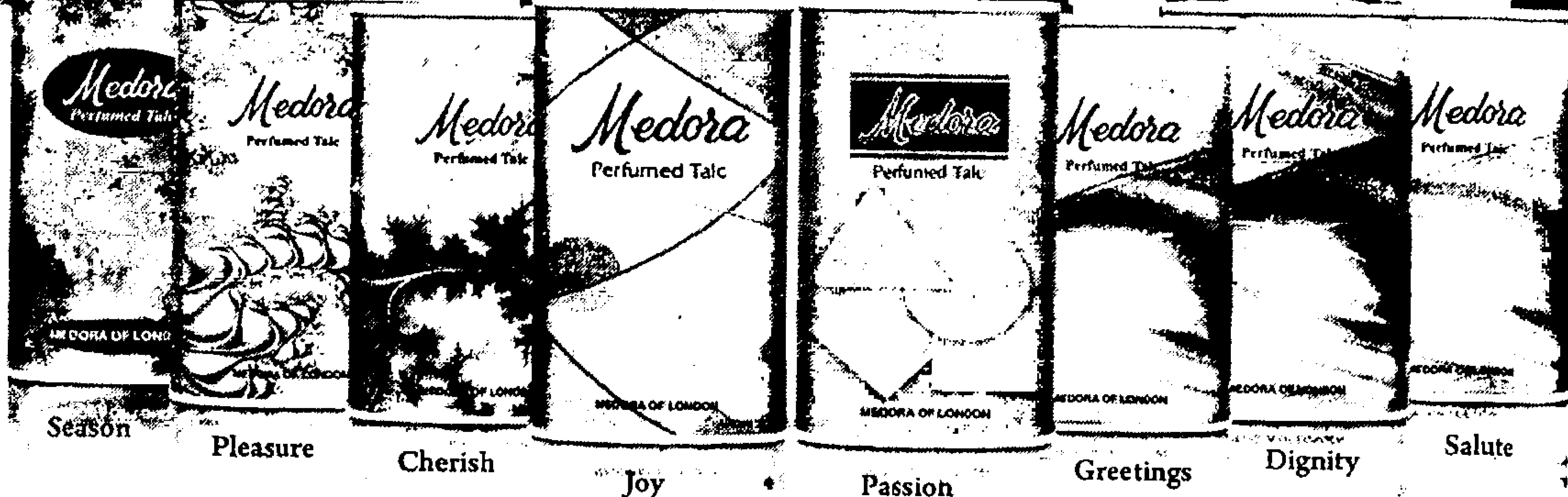
”جس نے واپس جانا ہے چلا جائے، میں اب اس راز سے پردہ اٹھا کر رہوں گی کہ..... اس راستے سے متعلق ہم سے جھوٹ کیوں بولا گیا اور ایسا کیا ہے اس میں کہ انہیں خون بھی کرنا پڑ گیا۔“ رینا فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

”میں واپس جا رہی ہوں راج محل..... کون میرے ساتھ چلے گا؟“ گارشیا نے بالآخر اپنا پاؤں ہٹاتے ہوئے



Medora
Perfumed Talc

خوشبو جو دل کو بہلائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے



عشوبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس

MEDORA OF LONDON

ہے.....“ امجد خان نے ہولے سے خود کلامیہ بڑبڑا کے شوکی سے کہا تھا جو پروفیسر ہنری کی لاش کو ایک چادر میں لپیٹ کر اس کے خچر پر لا دیا تھا۔ کیونکہ پروفیسر کی لاش والے اس خچر کو سنبھالنے کی ذمہ داری امجد خان کے سپرد کی گئی تھی اور وہ بے چارہ اس ذمہ داری سے گھبرا رہا تھا۔ وہ بعض نہ آیا اور ایک بار پھر پچھی پچھی آواز میں شوکی سے بولا۔

”شوکی! اس لاش کے بجائے پتھروں کا ڈھیر خچر پر رکھ لو، میں سنبھال لوں گا مگر..... یہ..... لال..... لاش.....“

”خاموش رہو..... رینا نے سن لیا تو واپس دلی جا کر تمہاری شکایت کر دے گی جزل شاہ.....“

وہ پلٹا اور رینا کے قریب آ گیا..... اس نے ایک حکم صادر کیا اور تقریباً نصف گھنٹے کے وقفے کے بعد ہی یہ قافلہ نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں تھا۔

متوقع منزل کی جانب فاصلہ زیادہ دور ثابت نہ ہوا۔ جلد ہی انہیں سرسبز رنگ کا تھوکی گنبد اور مینار نظر آ گیا جو کالی کا مندر کہلاتا تھا۔ جب یہ لوگ عمارت کے قریب پہنچے تو چونک پڑے۔ یہ راستہ کالی دیوی کے مندر کے پھانک پر ہی ختم ہوتا تھا، جبکہ ایک اور راستہ مل کھاتا ہوا، اوپر پہاڑی کی سرسبز ڈھلان سے آتا دکھائی دے رہا تھا، جس کا مطلب تھا کہ یہاں کالی کے مندر تک آنے کے لیے فقط دو ہی راستے تھے اور دوسرا راستہ راج محل کی جنوب مشرقی فصیل سے آ رہا تھا جس کے برج میں داخل ہونے سے انہیں روکا گیا تھا مگر ان کے چونکنے کی اصل وجہ اور بھی تھی۔ انہیں مندر کے احاطے میں شاہی بھی کھڑی نظر آئی تھی۔ وہ اسی دوسرے والے راستے پر کھڑی تھی، جس کا صاف مطلب تھا کہ ادھر راج محل سے بھی کوئی یہاں آیا تھا۔ یہاں اطراف میں عجیب سا سکوت طاری تھا۔

بہر طور..... یہ منظر دیکھ کر رینا ہی نہیں شوکی بھی کچھ الجھن کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ کچھ اور کی توقع رکھے ہوئے تھے، کوئی خفیہ جگہ، کوئی ایسا مقام، یا کچھ ایسا جس کا شمار خواص میں ہوتا ہو مگر یہ تو ایک عام سامندر تھا..... اور یقیناً یہاں دیگر خاص و عام کو آنے جانے کی اجازت ہوگی ہی..... تو پھر ایسی کیا بات تھی آخر کہ یہاں آنے سے انہیں روکا جا رہا تھا..... جھوٹ بولا گیا اور یہاں تک کہ ایک قتل بھی کر دیا گیا؟

”یہ ہندوؤں کی عبادت گاہ ایک مندر ہے نا..... شوکی؟“ معارینا نے پوچھا۔

”ہاں! لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا یہی ہماری منزل تھی؟“ شوکی بولا۔

کہا۔ ”میں خود کو جانتے بوجھتے موت کے منہ میں نہیں دھکیلنا چاہتی.....“ گارشا نے کہا اور پھر ان سے چند قدموں کے فاصلے پر جا کھڑی ہوئی۔ گویا دیکھنا چاہتی ہو کہ کون کون اس کے ساتھ واپسی کے سفر میں شامل ہوتا ہے۔ پروفیسر ہنری جو اس کا رواداں کے سالار تھے، وہ بھی اب آنجہانی ہو چکے تھے۔ تاہم ان کی بیٹی زندہ تھی اسی لیے وہ انہیں کسی بھی صورت میں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گارشا کا کسی نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ پریشان ہو گئی اور ہراساں ہو کے رو پڑی۔ شوکی نے اس کی حالت دیکھ کر ایک گہری سانس خارج کی اور پھر ایک نظر قریب کھڑی رینا پر ڈالنے کے بعد وہ روتی ہوئی گارشا کی طرف چند قدم بڑھا اور اس سے بولا۔

”مس گارشا! انسان جب بھی کسی مہم پر نکلتا ہے تو اسے ذہنی طور پر ہر قسم کے حادثات کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ ایڈو خچر صرف گھومنے پھرنے کا ہی نام نہیں ہوتا بلکہ اس طرح کے حالات میں جواں مردی سے کام لینا بھی پڑتا ہے، تمہارے مقابلے میں رینا زیادہ دھکی ہے، اس کے پاپا کو ہلاک ہوئے ابھی گھنٹا بھر بھی نہیں بیتا، لیکن دیکھو اس نے خود کو نہ صرف سنبھالے رکھا ہے بلکہ یہ اس مہم کو بھی ادھورا چھوڑنا نہیں چاہتی..... تا کہ ایک طرف وہ راز آشکار ہو سکے جس کی خاطر پروفیسر ہنری نے اپنی جان دی ہے اور دوسری طرف ان کے تمام قاتلوں کا بھی پتا لگایا جاسکے۔“

”میں پھر یہ کہوں گی کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے۔“ گارشا اپنی ناک کی پھٹکی کو انگلی سے چھو کر ٹھکا مار کے بولی۔

”اگر یہ اتفاقی حادثہ ہے تو پھر تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟“ شوکی نے فوراً اسے لا جواب کرنے کی غرض سے کہا۔

”میں سانپوں سے خوف زدہ ہوں، مجھے تو یہاں کھڑے ہوتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں ابھی مجھ پر بھی کسی درخت کی شاخ سے جھوٹا ہوا سانپ نہ گر پڑے۔“

”شوکی!“ معارینا نے اسے آواز دی۔ ”آگے بڑھنے کی تیاری کرو اور پاپا کی لاش کو کسی چادر میں لپیٹ کر خچر پر ڈال دو۔“

شوکی ہی نہیں باقی لوگ بھی رینا پر حیران تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ رینا کو کیا نام دیں؟ بے حس کہیں.....؟ جسے اپنے باپ کے مرنے پر ماتم کرنے کے بجائے اس مختصر سی مہم کو پورا کرنے کی دھن سوار ہے، یا پھر اسے غیر معمولی حوصلہ مند عورت کہیں جسے اس طرح کے مزید رونما ہونے والے متوقع خطرات کی قطعاً پروا نہیں؟

”ان انگریز زنانیوں کی تو نفسیات ہی اور ہوتی

دروازے پر نمودار ہوا تھا اور ان لوگوں کو آپس میں الجھتا دیکھ کر اس کے بدہیت سیارو چہرے پر بڑی مکروہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ جبکہ اس کا چیلہ پجاری پرس رام اس کی طرف بڑھا تھا، اتنے میں بدری ناتھ بھی ان کے قریب آ گیا اور بولا۔

”آپ لوگ آپس میں مت الجھیں..... یہ پوتر جگہ ہے لڑائی بلوا مناسب نہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ آپ لوگ اسی وقت واپس..... راج محل لوٹ جائیں اور مہاراجا صاحب کے علم میں اس حادثے سے متعلق.....“

”یہ حادثہ نہیں ہے مسٹر.....!“ رینا جس کی آنکھیں غم کے بوجھ تلے متورم سی ہو رہی تھیں، رابرٹ نے اپنی بے بسی کے باعث اس کا زخم پھیل دیا تھا۔ ایک دم بدری ناتھ کی بات کاٹ کر بولی۔ ”یہ قتل ہے..... اور قاتلوں کا تعلق اسی جگہ سے ہے.....“ اس کی بات پر جیسے وہاں موجود سب کو ایک دم سانپ سونگھ گیا۔ جبکہ مہاراجا بدری ناتھ کے چہرے پر رینا کی بات سن کر پہلے تو شیشا نے کے تاثرات ابھرے، پھر اس کی جگہ کرخشی نے لے لی اور وہ اس کی پروا کیے بغیر کہ رینا شاہی محل کی معزز مہمانوں میں سے تھی، غصے سے بولا۔

”یہ تم کیا اول فول بک رہی ہو، بڑی! جانتی ہو یہ کون سی جگہ ہے؟ کالی دیوی کا وہ پوتر استھان ہے جہاں لوگ عقیدت سے آکر اپنا ماتھا تکیٹے ہیں، اپنی بلائیں اور پریشانیاں دور کرتے ہیں اور تم یہ کہہ کر ہمارا دھرم بھرشت کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ یہاں قاتل رہتے ہیں۔“ پھر وہ ایش کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

”چھوٹے راج کمار صاحب! دیکھ رہے ہیں نا آپ اپنے معزز مہمانوں کو..... یہ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں، آپس کے جھگڑے میں اس پوتر جگہ کو بدنام کرنے کی کوشش رہے ہیں؟“

رابرٹ..... جو رینا کی ناراضگی پر اندر سے کچھ نادم ہوا تھا پھر بڑے پجاری کو اپنے خلاف اس طرح کہتے ہوئے پا کر وہ بھی خاموش نہیں رہا اور چند قدم آگے بڑھ کر بولا۔

”مسٹر بدری ناتھ! رینا کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جب میں یہاں آ رہا تھا تو..... میں نے ہی نہیں بلکہ مسٹر ایش اور مس سوچنا نے بھی دوا لیے پجاریوں کو جنگل کی طرف سے اسی راستے پر نمودار ہوتے دیکھا تھا جس راستے سے یہ لوگ (شوکی وغیرہ) آئے ہیں، ان دونوں پجاریوں کے کاندھوں پہ پیلے رنگ کے تھیلے لہے ہوئے تھے۔ جس کی تہ میں کوئی گول گول سی شے پڑی نظر آرہی تھی۔“

اس کی بات پر رینا سمیت سبھی لوگ ٹھکے تھے۔ شوکی بھی

آگے بڑھے۔

”رر..... رابرٹ! ام..... میرے پاپا انتقال کر گئے۔“ رینا نے اس کے قریب پہنچ کر رقت بھرے لہجے میں کہا۔ گارشا بھی بھائی کے قریب آ کر رو پڑی تھی۔

”برو! اکل ہنری ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا چکے ہیں۔“

”واٹ.....؟ ی ی..... یہ کیا کہہ رہی تم دونوں..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا؟“ رابرٹ بوکھلا کر بولا۔ ادھر کھڑے پجاری پرس رام اور اس کا ساتھی بھی ان کے قریب چلے آئے تھے۔ اندر موجود مہاراجا بدری ناتھ نے صرف چند ثانیوں کے لیے مندر کے مرکزی دروازے کے اندر سے باہر جھانکا تھا، اس کے بعد وہ بہ سرعت واپس مڑ گیا تھا۔

راج کمار ایش اور اس کی بہن سوچنا کورینا کی حالت زار پر ترس آ رہا تھا جبکہ ایش کے چہرے پر اس کے علاوہ بھی رینا کے لیے جذبات پنپنے لگے تھے جو ابھی دل تک ہی محدود تھے۔ مہمانوں میں اس نے رینا ہی کی شخصیت میں غیر معمولی دلچسپی محسوس کی تھی۔

جب رینا نے رابرٹ کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ منہ بتا کے بولا۔

”انکل بھی تو کسی کی نہیں مانتے تھے نا..... بہت ضدی تھے وہ۔ اگر انہیں یہاں آنا ہی تھا تو سیدھی طرح ہمارے ساتھ ہی پروگرام بنالیتے تو ایسا حادثہ نہ ہوتا۔“

”یوشٹ اپ.....“ اس کی بے بسی پر رینا غم و غصے سے آگ بگولا ہو گئی۔ ”تمہیں شرم نہیں آتی تم میرے پاپا کے لیے کنڈولنس کرنے کے بجائے اس قسم کے الفاظ استعمال کر رہے ہو۔ آئی ہیٹ یو.....“

وہ روتی ہوئی پلٹ گئی تو نندو بابا کی بیوی شاننا نے اسے سنبھالا دیا۔ رابرٹ اپنا سامنہ لے کر رہ گیا جبکہ گارشا نے بھی اس بات پر اپنے بھائی کو سزائش کی۔

شوکی بڑی غصے بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سے بھی نہ رہا گیا اور اس سے پہلے کہ وہ رابرٹ سے کوئی سخت بات کرنے کے لیے اس کی جانب بڑھتا، امجد خان نے اسے روک لیا۔

”نہیں شوکی! رینا نے رابرٹ کو سبق سکھا دیا، یہی کافی ہے۔“

”یہ رابرٹ مجھ سے کبھی بری طرح پٹ جائے گا۔“ شوکی نے غصے سے کہا۔

اس دوران مہاراجا بدری ناتھ..... اندر جا کر دوبارہ

پرچی ہوئی تھیں اور نمایاں طور پر اس کے چہرے سے ہی نہیں بلکہ اس کی آواز اور لب و لہجے سے بھی پریشانی اور تشویش مترشح ہو رہی تھی۔

”اس بھی میں کون آیا ہے؟ یہ تو مجھے راج محل سے آئی ہوئی لگتی ہے، کیا وہاں سے اور کوئی بھی یہاں آیا ہوا ہے؟“ اس بار شوکی نے پجاری سے دریافت کیا۔ پھر اس سے پہلے کہ پجاری پرس رام شوکی کے سوال کا جواب دیتا اچانک مندر کے اندر سے ایک لڑکا دینے والی نسوانی چیخ ابھری۔ باہر موجود سب لوگ بری طرح ٹھکے تھے۔ جبکہ دونوں پجاریوں کے چہروں سے پریشانی کے آثار دوچند ہونے لگے تھے جس میں گھبراہٹ بھی شامل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

چیخ کی آواز پر تینوں ہی نکاسی کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بری طرح چونک کر رہ گئے تھے۔

”پجاری جی! یہ کون چیخ رہا ہے؟“ راج کمار ایش نے مہاراجا بدری ناتھ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ سوچنا بھی پریشانی سے مندر کے دروازوں کو یوں تنکے لگی تھی جیسے وہ چیخ کی گونجتی بازگشت اور اس کے مخرج کو تلاش چاہتی ہو، جبکہ رابرٹ کی گھبراہٹ دوچند ہونے لگی تھی اور وہ دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا کہ..... خواجہ وہی ایسی منحوس اور پراسرار جگہ پر آیا۔ تاہم اسے کچھ تسلی تھی کہ اس کے ہمراہ کوئی عام لوگ نہ تھے۔

مہاراجا بدری ناتھ جو کالی دیوی کے قریب ہی کھڑا ان تینوں کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا، چیخ کی آواز سن کر وہ بھی پریشان سا ہو گیا تھا اور پھر انہیں رکتے دیکھا تو بھی وہ اپنی جگہ سے ہلاتک نہیں تھا لیکن جب ایش نے پلٹ کر بدری ناتھ کو مخاطب کر کے اس چیخ کے بارے میں دریافت کیا تو وہ جلدی سے ان کی جانب لپکا اور بولا۔

”چھوٹے راج کمار جی! وہ..... اندر استھان گھاٹ میں کوئی گریب ناری ہے۔ بیمار ہے بے چاری..... اسے علاج کے لیے رکھا ہوا ہے۔ آپ شانت رہیے۔“

”ہوں۔“ ایش کے منہ سے برآمد ہوا۔ اس کے بعد یہ تینوں مندر سے باہر آ گئے تو ان کی نگاہ مندر کے پھاٹک والے احاطے پر پڑی۔

”ارے..... یہ لوگ یہاں کیسے.....؟“ رابرٹ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ اپنی بہن گارشا اور دیگر افراد کو یہاں دیکھ کر حیران سا ہو گیا تھا، جبکہ ایش اور سوچنا بھی اپنے مہمانوں کو یہاں پا کر چونک سے گئے تھے۔ وہ بھی اسی طرف متوجہ تھے اور پھر یہ سب ایک دوسرے کو پہچان کر

”میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔“ رینا بھی خیال انگیز لہجے میں بولی۔ ”ایسی جگہیں تو عمومی حیثیت رکھتی ہیں، میرا مطلب ہے یہ تو عبادت گاہ کہلاتی ہے ہندوؤں کی جسے وہ پوجا پا کا نام دیتے ہیں اور یہاں تو ہر کسی کو آنے جانے کی اجازت ہوگی بلکہ ریاست کی رعایا تو آتی رہتی ہوگی، پھر ایک عام سی جگہ جانے کے لیے ہمیں کیوں روکا جا رہا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری منزل اب بھی اور ہو.....؟“ وہ بری طرح الجھ گئی تھی۔

”ہماری منزل یہی ہے رینا!“ شوکی نے پُرسوچ سے لہجے میں کہا تو رینا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ بولی۔

”کیا تم اپنی بات کی وضاحت کرنا پسند کرو گے؟“

”کیا خبر اس مندر کے اندر ہی کوئی ایسا پراسرار چکر ہو..... جس کا عام لوگ کھوج لگانے سے قاصر ہوں لیکن..... پروفیسر ہنری جیسے لوگ، جو تحقیق و جستجو اور تجسس کے ہمیشہ سے ہی متنی رہتے ہیں، اس کا راز جان لیتے ہیں۔“

”تم نے بالکل ٹھیک کہا شوکی!“ رینا نے توصیفی لہجے میں کہا۔ ”یقیناً، ہم سے کچھ لوگ خوف زدہ ہو گئے ہوں گے۔ آؤ..... اندر چلتے ہیں۔“

یہ لوگ پھاٹک سے اندر آ گئے، خچروں کو ایک طرف باندھنے لگے تو مندر کے مرکزی دروازے سے گیروے رنگ کی دھوتی اور بنیان پہنے دو افراد برآمد ہوئے۔ یہ پجاری تھے، ان میں ایک وہی پرس رام پجاری تھا جو مہاراجا بدری ناتھ کا چیلہ تھا، دوسرا کوئی اور تھا۔ پرس رام کی جوان پر نگاہ پڑی تو وہ بری طرح چونک پڑا۔ اس کی ترشول زدہ بدہیت پیشانی پر تفکر آمیز الجھن کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ وہ تیزی سے ان کی جانب بڑھا..... اور ان کے قریب آ کر قدرے درشت لہجے میں بولا۔

”اے..... کون ہو تم لوگ.....؟ یہاں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔“

”ہم مہاراجا چندر گپتا کے مہمان ہیں۔“ رینا نے... برا اعتماد لہجے میں پجاری پرس رام سے کہا تو وہ کچھ نرم ہوا اور بولا۔

”لیکن راج محل کی طرف سے تو ہمیں ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی کہ مہمان یہاں کارخ کرنے والے ہیں.....؟“

”ہاں! ہماری منزل اور تھی..... لیکن بد قسمتی سے ہمارے ساتھ راستے میں ایک حادثہ ہو گیا تھا۔“ کہتے ہوئے رینا نے امجد خان والے خچر کی طرف اشارہ کیا جس پر پروفیسر ہنری کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ ”میرے پاپا پروفیسر ہنری کو سانپ نے ڈس لیا تھا، وہ انتقال کر گئے ہیں۔“

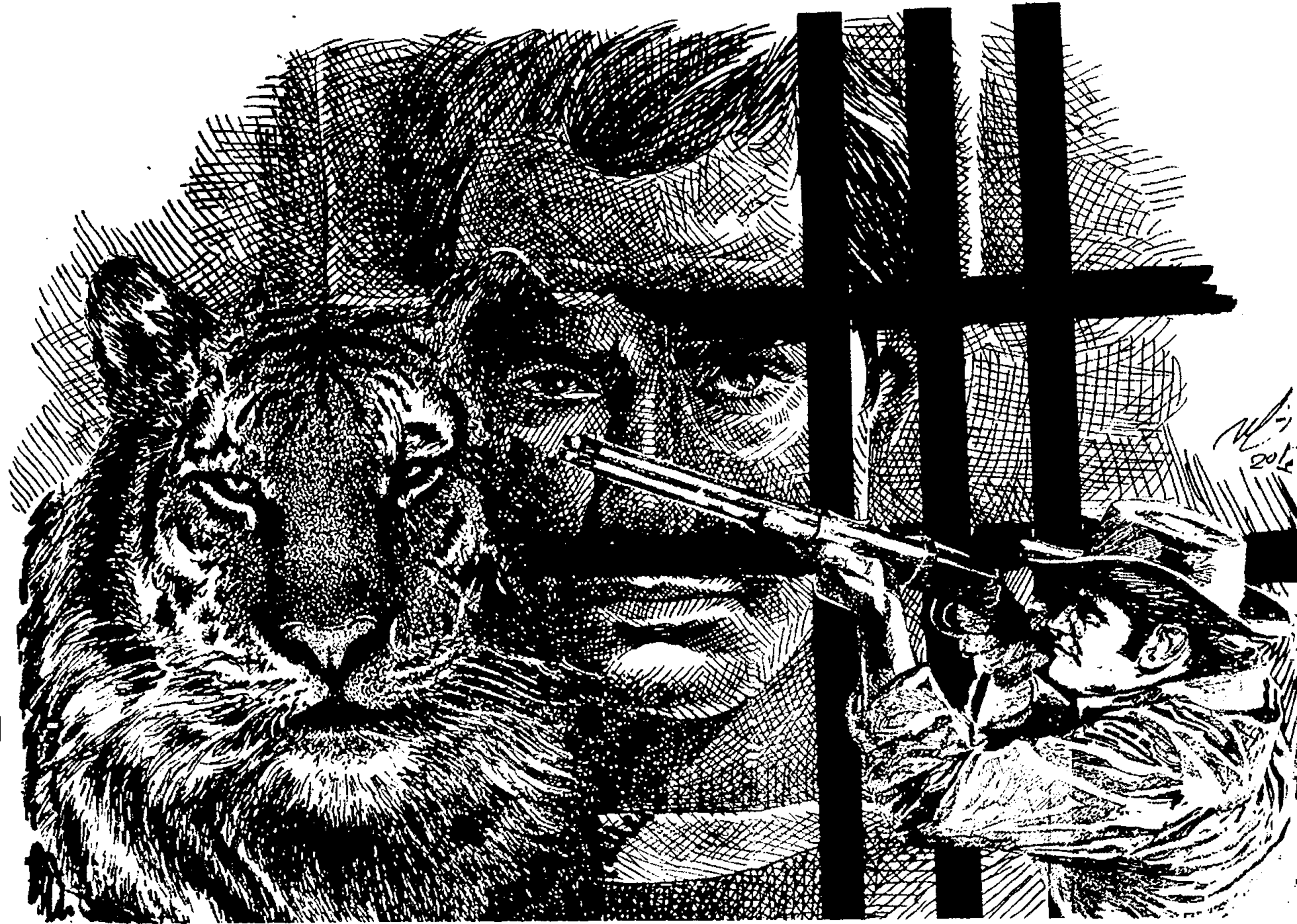
شوکی کی نظریں بدستور پجاری پرس رام کے چہرے

بھنور

محمد یاسر اعوان

حسن کا بے ایمان ہونا اور حسن پر بے ایمان ہوجانا دو مختلف نظریات ہیں۔ یہاں بھی شیروں کو زیر کرنے والی حسینہ کا قاتل حسن خود اسے بھی قاتل ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا، وہ تو بھلا ہو اس قدردان کا جو اس کے قاتل حسن پر مر مٹا تھا اور پھر اس کے جذبہ عشق نے اپنی اس محبوب ہستی کو اس بھنور سے نکال باہر کیا یہ اور بات کہ اسے خود کتنے امتحان سے گزرنا پڑا۔

ایک نظر کی محبت اور عمر بھر کی رفاقت کا اٹکھاتہ



اس کا پیشہ ورانہ نام سیروزی ڈمپل تھا۔ گراہم برادرز سرکس کے پوسٹروں میں اس کا یہی نام درج تھا۔ اس کے تعارف کے طور پر پوسٹروں پر لکھا تھا..... اپنی آنکھوں سے دیکھیے کہ حسین و جمیل سیروزی ڈمپل کس طرح خوشخوار شیروں کو سدھاتی ہے، کس طرح ان پر حکم چلاتی ہے اور کس طرح انہیں اپنے اشاروں پر نچاتی ہے۔ میری عمر چھبیس سال ہے اور میں کمپیوٹر پروگرامر ہوں۔ میں اپنی کمپنی کی طرف سے ایک اجنبی شہر میں کام

ابھی مندر کے اندر چلتے ہیں..... اور تم ان دونوں پجاریوں کو بلا لاؤ..... جنہوں نے اپنے کاندھوں پر تھیلے اٹھا رکھے تھے۔ انہیں ہم نے بھی دیکھا تھا۔“

راج کمار ایش کی بات سن کر بدری ناتھ کا ہی نہیں اس کے چیلے پجاری پرس رام کا بھی چہرہ دھواں دھواں سا ہونے لگا تھا۔

”ہم اپنے معزز مہانوں کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ہم نہیں چاہتے کہ ان کے دل میں کوئی پھانس رہ جائے۔“

ایش کمار کو مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ صرف حسن کو اور اپنے مفادات کو ہی مذہب سمجھتا تھا۔

مہا پجاری بدری ناتھ کو تو ایش کمار کے حکم کے آگے کچھ بولنے کی جرأت نہ ہو سکی، البتہ ایش کی بہن جو اس کے ساتھ ہی کھڑی تھی، وہ ذرا دھارک تھی۔ بھائی سے اعتراض اٹھاتے ہوئے بولی۔

”ایش بھیا! ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا۔ کالی کے مندر کی اس نیت سے تلاشی لی جائے کہ یہاں کسی کے قتل کی سازش تیار کی گئی ہے، کالی دیوی کو ناراض کرنے والی بات ہوگی۔“

”لیکن جن کا خون ہوا ہے، ان کی تسلی کیسے کی جائے؟ جبکہ سارے شواہد یہی بتا رہے ہیں جو ایک حد تک ہمارے دیدہ بھی ہیں۔“ ایش نے بہن سے کہا۔ سوچنا کے پاس بھائی کے اس سوال کا جواب نہ تھا۔ اس کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ کوئی جواب سوچنے کی کوشش میں تھی، مگر اسی اثناء میں ایش نے اپنا حکم دوبارہ دہرایا۔

اب تو چھوٹے راج کمار کی بات ٹھکرانا بدری ناتھ کے بھی بس میں نہ رہا تھا۔ تاہم پھر بھی ایک آخری چال کے طور پر پتا پھینکنے کی کوشش میں بولا۔

”چھوٹے راج کمار صاحب! آپ اندر جانے کی زحمت نہ کریں، میں ان دونوں کو ادھر ہی بلا لیتا ہوں۔“

”ہرگز نہیں..... جیسا راج کمار صاحب نے کہا ہے، ویسا ہی ہوگا۔ اندر جا کر سانپوں کو غائب کیا جاسکتا ہے۔ کسی کو ہوشیار کیا جاسکتا ہے۔“ رینا ایک دم بولی۔ ایش کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، اور رینا بھی اسی کی طرف مچی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایش نے وہی کیا جیسا رینا چاہتی تھی.....

یہ سب لوگ کالی دیوی کے مندر کے صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگے.....

”جاری ہے“

سمجھ گیا تھا کہ رابرٹ کی تھیلوں سے مراد پٹاریاں تھیں۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کر رینا کے کان میں کچھ کہا تو رینا کا چہرہ ایک بار پھر جوش تلے سرخ ہو گیا۔

ادھر وہاں موجود مہا پجاری بدری ناتھ اور پرس رام سمیت، ایک دو اور پجاریوں کے چہروں پر سناٹے کی سی کیفیات نمودار ہوئی تھیں۔ جیسے ان کی چوری پکڑ لی گئی ہو مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے مجرمانہ قسم کے چورتاثرات کو ایک بار پھر برہمی کے پردے میں ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہوئے کوئی سخت بات کہنی چاہی مگر ایش کمار نے اپنا ایک ہاتھ بلند کر کے مہا پجاری بدری ناتھ کو خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا اور وہ بری طرح زچ ہو کے اندر ہی اندر تالا کھانے لگا، مگر تفکر و پریشانی کے تاثرات ہنوز اس کے لال

بھوکا چہرے سے مترشح ہو رہے تھے۔

”معاملہ کیا ہے آخر..... ہمیں کچھ تفصیل سے آگاہ کیا جائے تاکہ ہم بھی اس مسئلے کے بیچ کچھ کہہ سکیں۔“

بالآخر ایش نے رینا کی طرف دیکھ کر کہا۔

رینا کو شوکی، کان میں کچھ کہہ کر محتاط کر چکا تھا کہ..... وہ کم از کم ایش کمار سے کچھ نہ چھپائے۔ رینا نے ایش کمار کو دھیرے دھیرے ساری بات سے آگاہ کر دیا اور یہی کچھ بتایا کہ وہ لوگ راکاشی کی طرف نکلے تھے، مگر ایک راستہ یہاں جاتا دیکھ کر وہ اس طرف کو نکل آئے۔ یوں راستے میں ہمیں کچھ گڑبڑ کا احساس ہوتا رہا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دو سانپ ایک چھتتا درخت سے ان پر پھینکے گئے، وہ تو خوش قسمتی سے بیچ گئی مگر پروفیسر ہنری اس حملے سے نہیں بچ پائے۔ سانپ نے انہیں ڈس لیا اور وہ آنا فانا موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔

ایش کمار نے بڑے غور سے رینا کی بات سنی تھی، اس کے بعد وہ مہا پجاری بدری ناتھ کی طرف متوجہ ہوا اور نہایت سنجیدگی سے بولا۔

”پجاری جی! کیا مندر میں سانپ موجود ہیں.....؟“

ایش کے سوال پر بدری ناتھ تھوڑا گڑبڑا سا گیا۔ شاید اسے اس سوال کے پوچھنے کی توقع نہ تھی تاہم پھر دوسرے ہی لمحے سنبھل کر بولا۔

”مم..... میں کیا جانوں.....؟ مم..... میرا مطلب ہے، بھلا..... زہریلے سانپوں کا مندر کے اندر کیا کام ہے؟“

رینا اور شوکی کی تیز اور بھانپتی ہوئی سی نظریں مہا پجاری بدری ناتھ کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

”اچھی بات ہے۔“ ایش نے ایک ہنکارا بھرا۔ ”ہم

کے سلسلے میں ایک ماہ سے مقیم تھا۔ میں اوسط درجے کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرے قیام و طعام کے اخراجات میری کمپنی ادا کر رہی تھی اور میں یہاں ایک بڑے کاروباری ادارے کے لیے کمپیوٹر پروگرامنگ کر رہا تھا۔ ابھی میرا کئی دن کا کام باقی تھا۔ اسی شہر میں، میں نے سرکس کے پوسٹر دیکھے تھے۔ سرکس میں نے صرف بچپن میں دیکھا تھا۔ بڑے شہروں میں اب تو اس کا رواج ہی ختم ہو گیا تھا۔ میں نے پوسٹر دیکھا تو ایک عجیب سی کشش عود کر آئی اور مجھے یہ اپنی بوریٹ زدہ شام گزارنے کا اچھا ذریعہ محسوس ہوا۔ اس شہر کی دوسری محدود سی تفریحات سے میں حسب استطاعت لطف اندوز ہو چکا تھا۔

وہ مئی کا مہینا اور منگل کی شام تھی جب میں سرکس دیکھنے پہنچا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ پرانی روایت کے مطابق سرکس کے اصل کھیل تماشے شروع ہونے سے پہلے شہر کے چند معززین اور مقامی سیاسی شخصیات مسخروں کا روپ دھارے رنگ میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے، الٹی سیدھی حرکات کے ذریعے حاضرین کا دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

میری بات تو یہ تھی کہ مجھے ان شوقیہ مسخروں یا دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی نیکی پیٹھ پر کرتب دکھانے والوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو صرف سیروزی اور اس کے شیروں کو دیکھنے آیا تھا۔ اس کے لیے مجھے پندرہ منٹ تک بیتابی سے انتظار کرنا پڑا۔ آخر کار نہایت شاہانہ انداز میں اس کی آمد ہوئی۔ اس کے لباس پر ستارے ہی ستارے جھلملا رہے تھے۔ پیروں میں اونچی ہیل کے سینڈل اور سر پر رنگین پروں کا تاج تھا۔ پوسٹر میں اسے اسی لباس میں دکھایا گیا تھا لیکن ظاہر تھا کہ وہ اس لباس میں شیروں کے ساتھ کرتب نہیں دکھا سکتی تھی۔ یہ تو صرف تماشائیوں کا دل بہانے کے لیے تھا۔

اس نے قیامت خیز چال کے ساتھ تماشائیوں کو اپنی مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے مسلسل ہاتھ ہلاتے ہوئے رنگ کے دو چکر لگائے پھر لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔ وہ گہرے میک اپ میں تھی۔ حالانکہ میرے خیال میں اسے میک اپ کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی مگر سرکس کی بہر حال اپنی کچھ روایات ہوتی ہیں۔ سیروزی کی عدم موجودگی میں سرکس کے کارکن رنگ کے وسط میں سلاخوں والا بڑا سا پنجرہ نصب کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد سیروزی لوٹ آئی۔ اب اس کے جسم پر

شکار یوں کا سالباس تھا یعنی خاکی شرٹ، خاکی نیکر اور سر پر چمچے دار ٹوپی جیسا ہیلمٹ..... وہ اس لباس میں بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ مجھے نے اسے دیکھ کر سیٹیاں بجائیں اور پر جوش نعرے بلند کیے۔ تماشائیوں کا جوش و خروش تو اپنی جگہ تھا، ایک شوقیہ مسخرہ بھی اس دوران میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور کچھ زیادہ ہی والہانہ انداز میں ایک گلدستہ اسے تھمانے کے لیے اس کی طرف لپکا۔ وہ غالباً کچھ بے تکلفی سے اس سے لپٹنے کی فکر میں تھا مگر سیروزی نے بے مروتی اور سختی سے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ اس طرح اطمینان سے چلتے ہوئے پنجرے میں داخل ہوئی جیسے اپنے گھر کے کسی کمرے میں جا رہی ہو۔ اسی دوران میں پچھلے راستے سے تین شیر پنجرے میں داخل کر دیے گئے۔ وہ خاصے خوفزدہ کر دینے والے انداز میں غرایہ تھے لیکن سیروزی ڈھیل کو جیسے ان کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

اس نے ایک کرسی، چابک اور ایک بڑے رنگ کے ذریعے شیروں کے کرتب دکھانا شروع کیے۔ اس نے ایک ہی آہنی کرسی پر تین شیروں کو اوپر تلے بٹھا کر دکھایا۔ انہیں مختلف انداز سے آہنی رنگ کے درمیان سے چھلانگیں لگوائیں۔ شیر واقعی اس کے اشاروں پر ناچ رہے تھے اور تماشائیوں کے مسرت بھرے شور سے پنڈال لرز رہا تھا۔

سیروزی کا شو بیس منٹ کا تھا جو مجھے بہت ہی مختصر محسوس ہوا۔ اس کے ختم ہوتے ہی میرا دل سرکس سے اجاٹ ہو گیا۔ دوسرے آئٹمز سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں پنڈال کے عقبی دروازے سے باہر نکل آیا۔ پنڈال کے پچھلی طرف میں نے ایک بار پھر سیروزی کو دیکھا۔ وہ کسی مسخرے کے ساتھ گرم باغیچے میں ابھی ہوئی تھی اور اس کا انداز بھی جارحانہ تھا..... مسخرے کے میک اپ کی وجہ سے ان کے تاثرات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا لیکن لگتا ہی تھا کہ مسخرہ کافی غصے میں تھا اور سیروزی ڈھیل بھی کچھ کم برہم نہیں تھی۔ پھر مسخرے نے اچانک ہی خاموش ہو کر گویا بحث ختم کر دی اور ایک طرف کوچل دیا۔

میں کچھ دیر بے مقصد سے انداز میں ادھر ادھر گھومتا رہا حتیٰ کہ سرکس ختم ہو گیا اور ہجوم بکھرنے لگا۔ قریب ہی دریا تھا، میں اس طرف چل دیا۔ دریا کے آس پاس اونچی عمارتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ انہی عمارتوں میں سے ایک میں میرا کام جاری تھا۔ دریا پر کشادہ پل تھا جس پر کھڑے ہو کر دریا میں موجود ایک بھنور کا نظارہ کیا جاسکتا تھا جو ارد گرد

کی روشنیوں میں بڑا خوب صورت دکھائی دیتا تھا۔ دریا کے دوسری طرف ریڈ اسٹار کے نام سے ایک ریسٹوران تھا جو رات گئے کھلا رہتا تھا۔

میں جب راتوں کو دیر تک کام کرتا تو کھانے کے وقت اکثر وہاں چلا جاتا تھا کیونکہ اس ہوٹل کے کھانے بڑے لذیذ ہوتے تھے..... اس وقت بھی میں وہیں جا بیٹھا۔ میں نے کھڑکی کے قریب ایک میز منتخب کی تھی۔ یہاں سے بھی بھنور کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ ریسٹوران میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ میں نے ایک ڈرنک لی اور وقت گزاری کے انداز میں چسکیاں لینے لگا۔

میں اس وقت دوسری ڈرنک سے شغل کر رہا تھا اور مجھے وہاں بیٹھے ایک گھنٹا گزر چکا تھا جب میں نے سیروزی ڈھیل کو ریسٹوران میں آتے دیکھا۔ گوکہ اس وقت وہ ہلکے سے رین کوٹ میں تھی جس کا کالر اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ میرے سامنے والی ٹیبل پر آن بیٹھی اور اس نے اپنے لیے مشروب کا آرڈر دیا۔ وہ کچھ مضطرب دکھائی دے رہی تھی لیکن میں نے سوچا شاید ایک پنجرے میں تین شیروں کے ساتھ بیس منٹ گزارنے کے بعد وہ روزانہ ہی اس حد تک مضطرب دکھائی دیتی ہو۔ مجھے اس کو مخاطب کرنے کی جرأت اپنے اندر مجتمع کرنے میں بھی پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ آخر کار میں اس سے کہنے میں کامیاب ہو گیا۔

”آپ کی پرفارمنس بہت شاندار تھی۔ میں آج کم از کم چودہ پندرہ برس کے وقفے کے بعد سرکس دیکھنے آیا تھا اور مجھے امید نہیں تھی کہ میں شیروں کے ساتھ آپ کے کرتبوں سے اس قدر لطف اندوز ہوں گا۔“ اس نے میرے اچانک بولنے پر چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”شکریہ۔“

”کیا باہر اب بھی بارش ہو رہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ موسم کا موضوع ہمیشہ بات کو آگے بڑھانے کا ایک اچھا بہانہ ثابت ہوتا ہے۔

”بہت معمولی سی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیا آج کل یہاں بارشوں کا موسم چل رہا ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”معلوم نہیں۔“ میں نے کندھے اچکائے۔ ”میں تو خود آپ ہی کی طرح یہاں اجنبی ہوں۔ ایک مہینے سے یہاں مقیم ہوں۔“

وہ ہلکی سی مترنم ہنسی کے ساتھ بولی۔ ”کاش! میں بھی

کسی ایک شہر میں کبھی ایک ماہ کے لیے رک سکتی۔ میرا مزاج سرکس کی زندگی یا ہر وقت کی مسافت کے لیے موزوں نہیں ہے لیکن جانوروں سے مجھے محبت ہے۔“

ہم نے اپنی اپنی میز پر رکھے ہوئے ڈرنک لیے اور بیٹھے بیٹھے ہی مزید چند منٹ باتیں کیں۔ ان شہروں میں سے چند کا تذکرہ ہوا جہاں جہاں اس کا سرکس جا چکا تھا۔ آخر میں نے اسے اپنی میز پر مدعو کرتے ہوئے کہا۔ ”کیوں نا ایک ڈرنک میری طرف سے ہو جائے؟“

وہ صرف ایک لمحے کے لیے ہچکچائی پھر بولی۔ ”ٹھیک ہے..... میں صرف ایک ہی ڈرنک لوں گی..... اس کے بعد جا کر سو جاؤں گی۔“

وہ میری میز پر آئی تو میرا یہ احساس مزید پختہ ہوا کہ وہ میک اپ کے بغیر زیادہ اچھی لگ سکتی ہے۔ اس وقت وہ اپنے گہرے میک اپ سے چھٹکارا پا کر آئی تھی اور اس کا فطری حسن اپنے اندر زیادہ کشش لیے ہوئے تھا۔ اس وقت اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ سرکس میں شیروں کے کرتب دکھاتی ہے۔ میرے دل میں اس خوش فہمی آمیز امید اور تصور سے گدگدی سی ہونے لگی کہ شاید وہ ایک آدھ پیگ اور پینے اور مزید کچھ باتیں کرنے کے بعد میرے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں چلنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ پینے پلانے کے دوران ہمارے درمیان اچھی خاصی دوستانہ گفتگو ہونے لگی۔ میں اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ”یہ تم شیروں کو سدھانے والی کیسے بن گئیں؟“

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ میرے لیے سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ سوال اس سے پہلے بھی اس سے بار بار پوچھا جا چکا تھا۔ اس وقت بھی شاید وہ کوئی طنزیہ جواب دینے لگی تھی مگر اس کی نوبت نہیں آئی کیونکہ اسی لمحے آسانی رنگ کے رین کوٹ پہنے دو آدمی ہماری میز کے قریب آن کھڑے ہوئے تھے۔

”مس سیروزی ڈھیل.....؟“ ان میں سے ایک نے تصدیق چاہی۔ وہ دراز قد تھا۔ اس کے بال چھدرے اور سفیدی مائل تھے۔

”ہاں۔ میں ہی سیروزی ڈھیل ہوں۔“ سیروزی نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”میں سراغ رساں سار جنت نیلی شرے ہوں.....“ اس نے اپنا بیچ اور شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا پارٹنر فریڈرک ہے۔ یہاں..... گلی میں دوسری جانب ایک آفس بلڈنگ ہے۔ وہاں مشتبہ حالات میں ایک شخص مردہ پایا گیا

ہے۔ ہم اس کی موت کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں۔ لاش کی شناخت کے سلسلے میں ہمیں آپ کی مدد درکار ہے۔“

سیروزی کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ اس سلسلے میں میرے پاس کیوں آئے ہیں۔ میں تو یہاں کے آفس بلڈنگ سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کو نہیں جانتی۔“

”لیکن آدھا گھنٹا پہلے آپ اس عمارت کی پندرہویں منزل پر واقع ایک آفس میں جیک ٹام نامی ایک ویل سے ملنے گئی تھیں۔“ سارجنٹ بلی بولا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو پچھلے ایک گھنٹے سے اسی ریسٹوران میں اس نوجوان کے ساتھ موجود ہوں۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ اس کی بات آدھی سچ تھی اور اس میں آدھا مبالغہ تھا۔ وہ ایک گھنٹے سے تو نہیں، البتہ آدھے گھنٹے سے میرے سامنے موجود تھی لیکن میں نے فوری طور پر اس کے بیان کی نفی کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سراغ رساں بولا۔

”بہتر ہوگا کہ آپ دونوں میرے ساتھ چلیں..... معاملہ کافی سنگین ہے۔“

میں نے بل ادا کیا اور ہم اس کے ساتھ چل دیے۔ اس کا رخ شیلڈ بلڈنگ کی طرف تھا۔ اس کے برابر والی بلڈنگ میں میرا کام چل رہا تھا لیکن میں کبھی شیلڈ بلڈنگ کے اندر نہیں گیا تھا۔ اس کے سامنے اس وقت پولیس کی دو کاریں، دوسرے عملے کی گاڑی اور مردہ خانے کی گاڑی کھڑی تھی۔ سکیورٹی گارڈ کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم سراغ رساں کی راہنمائی میں لفٹ کی طرف بڑھے۔ اس دوران میں ہم میں سے کسی نے کوئی بات نہیں تھی۔ پندرہویں منزل پر ہم چند فوٹو گرافرز کے قریب سے گزرے۔ ان میں پولیس کا فوٹو گرافر بھی شامل تھا۔ ہم وکیلوں کی فرم کے ایک آفس میں داخل ہو کر استقبالیہ کمرے سے گزر کر ایک کشادہ کمرے میں پہنچے۔ کمرے کے وسط میں ایک شخص آڑا ترچھا ساکت پڑا تھا۔ اس کے جسم پر سوٹ کے چھتھرے بانی تھے۔ چہرے پر مسخروں والا میک اپ تھا مگر چہرہ خون میں لتھڑا ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ رنگین دکھائی دے رہا تھا۔ ہونٹوں پر اور ان کے آس پاس چمکیلا سرخ رنگ لگا ہونے کی وجہ سے اس کا دہن مسخروں والے روایتی انداز میں پھیلا نظر آ رہا تھا۔ چہرہ صرف خون آلود ہی نہیں، مسخ شدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کسی درندے کے پنجوں نے اسے سر سے پاؤں تک ادھیڑ ڈالا ہو

لیکن میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ وہاں آس پاس خون پا کمرے میں بے ترتیبی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی درندہ نما جانور اچانک کہیں سے نمودار ہوا تھا اور اس نے نہایت پُر سکون انداز میں اس شخص کو پنجوں سے ادھیڑ دیا اور کمرے میں ذرا بھی بے ترتیبی پیدا کیے بغیر پُر امن طریقے سے واپس چلا گیا۔

یہ منظر دیکھ کر غالباً صرف مجھے ہی نہیں بلکہ سیروزی کو بھی دھچکا لگا تھا۔ ہم ذرا سنبھلے تو سراغ رساں بلی بولا۔

”آپ اس واقعے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہیں مس سیروزی ڈمپل؟“

اس وقت تک ہم دوسرے کمرے میں جا چکے تھے جو کانفرنس روم معلوم ہوتا تھا۔ سیروزی نے ٹھنڈی سانس لی تو بلی مزید بولا۔ ”مرنے والے کو آپ کس حد تک جانتی تھیں؟“

”بالکل بھی نہیں۔“ سیروزی بولی۔

”وہ آج رات کے شو میں شوقیہ طور پر مسخرہ بننے والے معززین شہر میں سے ایک تھا۔“ پھر اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔

”اس نے آج رات میرے ایکٹ کے دوران مجھے زبردستی ایک گلدستہ دینے کی کوشش کی تھی پھر بعد میں اپنا وزینٹنگ کارڈ مجھے دیتے ہوئے فرمائش کی تھی کہ میں اس سے ملنے یہاں آؤں۔“ مگر سراغ رساں بلی نے اسے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”لابی میں جو گارڈ موجود ہوتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ آپ آج رات اس سے ملنے آئی تھیں۔ لفٹ کے ذریعے اوپر آئیں لیکن فوراً ہی واپس چلی گئی تھیں۔ اس نے آپ کو سڑک عبور کر کے ریسٹوران کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ تب اسے یونہی خیال آیا کہ وہ احتیاطاً یہاں..... جیک ٹام کے آفس میں فون کر کے پوچھ لے کہ سب خیریت تو ہے..... لیکن جب یہاں کسی نے فون نہیں اٹھایا تو اس نے ہمیں اطلاع دی۔“

”میں یہاں ضرور آئی تھی.....“ سیروزی نے اعتراف کیا۔ ”لیکن آفس میں اندھیرا تھا۔ لگتا تھا کہ یہاں کوئی موجود نہیں ہے۔ اس لیے میں باہر سے ہی فوراً واپس چلی گئی تھی۔“ اس کے لہجے میں اضطراب تھا اور اس کا انداز مدافعانہ سا تھا۔ سارجنٹ بلی اب اہم نکتے اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا جا رہا تھا۔

”اگر ہم یہ مان لیں کہ آپ اسے جانتی نہیں تھیں تو یہاں کیوں آئی تھیں؟“ اس نے دریافت کیا۔ سیروزی کی

انگلیاں کانفرنس ٹیبل پر رقصاں تھیں۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

”میں آپ کو بتاتی ہوں کہ سرکس کے سلسلے کیسے چلتے ہیں۔ ہمارا سرکس جب کسی شہر میں جاتا ہے تو ہمارے ایک دو آدمی پہلے سے وہاں آ کر بعض ضروری انتظام کرتے ہیں۔ ان میں ایک کام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ پہلے شہر کے کچھ ایسے معززین کے ساتھ پروگرام طے کر لیتے ہیں جو شوقیہ طور پر مسخرے بننا چاہتے ہیں۔ آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہو کہ بہت سے معززین، مسخروں کے روپ میں مجھے کے سامنے آنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ان میں سیاستدان، وکیل کاروباری افراد وغیرہ سبھی ہوتے ہیں۔ شاید بظاہر سنجیدہ اور نہایت معزز نظر آنے والے انسانوں کے اندر بھی ایک مسخرہ چھپا ہوتا ہے جو اپنا اظہار چاہتا ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے سرکس کا مالک..... ہمارا باس سائنس گراہم بھی شو کے دوران مسخرے کا روپ دھارے ادھر ادھر پھرتا رہتا ہے۔ اسی نے آج رات ان بڑے بڑے لوگوں کو بلایا تھا جن کا شوقیہ مسخروں کے طور پر پیش ہونے کا پروگرام طے تھا۔“

سارجنٹ بلی میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

”کیا آپ بھی مسخروں میں شامل ہونے کے خواہش مند تھے؟“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں تو سرکس دیکھنے گیا تھا۔

”پھر جب میں نے ریڈ اسٹار ریسٹوران میں مس سیروزی ڈمپل کو اپنے سامنے والی میز پر بیٹھے دیکھا تو غیر ارادی طور پر میں ان سے مخاطب ہو گیا اور ہمارے درمیان باتیں شروع ہو گئیں۔“

”میں آپ دونوں سے الگ الگ کچھ سوالات کرنا چاہوں گا.....“ سارجنٹ نے ہمیں مطلع کیا پھر سیروزی سے مخاطب ہوا۔

”نی الحال آپ سے ایک اور بات پوچھنی ہے۔ آپ کے جیک ٹام کے آفس آنے کا مقصد کیا تھا؟“

”ہم سے سائنس گراہم کا اصرار ہوتا ہے کہ ہم جس شہر میں بھی جائیں وہاں کے متوسط طبقے کے افراد سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی کوشش کریں۔ بقول اس کے کاروباری مصلحتوں کا تقاضا یہی ہے اور اس میں سرکس کے لیے بہت سے فائدے ہیں۔ جیک نے آج رات شو سے پہلے زبردستی مجھے گلدستہ دینے کی کوشش کی تھی تو میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا تھا۔ پاس کھڑے سائنس کو میری یہ حرکت سخت ناگوار گزری تھی۔ بعد میں جب جیک ٹام نے

مجھے یہاں آنے اور اپنے ساتھ ایک آدھ پیگ پینے کی دعوت دی تو میرے باس نے حکم دیا کہ مجھے یہ دعوت قبول کرنی ہوگی۔“

”اور یہاں..... رات گئے اس کے آفس میں آنا ہوگا؟“ سارجنٹ نے تصدیق چاہی۔

”سائنس گراہم نے کہا تھا کہ آفس میں دوسرے لوگ بھی موجود ہوں گے لیکن جب میں نے یہاں آ کر دیکھا کہ کسی کی موجودگی کے آثار نہیں ہیں تو میں فوراً واپس روانہ ہو گئی۔“

”آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ جیک کا چہرہ اور جسم کس درندے کے پنجوں کا نشانہ بنا ہے؟“

”نہیں.....“ سیروزی نے جواب دیا۔ ”البتہ یہ بات بھی یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ درندہ میرے شیروں میں سے کوئی نہیں تھا اور امید ہے آپ یہ بھی نہیں سوچ رہے ہوں گے کہ چاندنی راتوں میں شاید میں شیرنی کا روپ دھار لیتی ہوں۔“

سارجنٹ بلی نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور نوٹ بک بند کرتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے مس سیروزی! اب آپ براہ کرم دوسرے کمرے میں چلی جائیں۔ میں آپ کے دوست کا بیان بھی لے لوں۔“

وہ جا چکی تو سارجنٹ بلی مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”سچی بات یہ ہے سر.....! میرے خیال میں آپ براہ راست اس معاملے میں ملوث نہیں ہیں لیکن آپ ایک اہم گواہ ضرور ہیں۔ میں اپنے سوالوں کے جواب میں آپ سے سچ کی توقع رکھتا ہوں۔ اگر آپ خود کو پریشانی سے بچانا چاہتے ہیں تو آپ کو سچ ہی بولنا چاہیے۔ یہ خاتون ریڈ اسٹار ریسٹوران میں کتنی دیر سے آپ کے ساتھ تھیں؟“

”میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تو اسے بیس منٹ گزرے ہوں گے لیکن جب میں نے اسے مخاطب کیا اس وقت بھی اسے دوسری میز پر بیٹھے کم از کم دس منٹ ہو چکے تھے۔ میرے خیال میں تو آپ کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اس قتل سے اس کا کوئی تعلق ہے۔“ میں نے کہا۔

”میرا خیال ہے وہ مقتول کے دفتر میں گئی تو تھی۔ وہاں کچھ ایسی صورت حال پیدا ہو گئی جو لڑکی کے لیے ناپسندیدہ ہوگی۔ معاملہ ہاتھ سے نکلنے دیکھ کر اس نے غالباً کئی نوکوں والے اوزار سے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی ہوگی جس سے باغ میں کھدائی وغیرہ کی جاتی ہے۔“

”خدا کے لیے سارجنٹ! کوئی عقل کی بات کرو۔“

کھدائی کا اوزار کیا وہ اپنی جیب میں چھپا کر لے گئی تھی؟ اور پھر اگر قتل اس نے کیا ہوتا تو کیا وہ عمارت کے آس پاس ہی موجود رہتی؟ وہاں سے نکل کر قریبی ریستوران میں آ بیٹھتی؟“

سارجنٹ بلی اب بھی ڈھٹائی سے اپنے نظریے پر قائم رہتے ہوئے بولا۔ ”وہ ریستوران میں شاید اس لیے آئی ہو کہ اسے راستے میں آلہ قتل دریا کے بھنور میں پھینکنا تھا۔“

”جیک کو قتل کرنا اس کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ ان کے درمیان کچھ مزاحمت کچھ کشش ضرور ہوتی اور اس کے کپڑوں پر بھی کچھ نہ کچھ خون..... اور شاید مسخروں والے میک اپ کا کچھ رنگ و روغن بھی ضرور لگ جاتا۔“ میں نے کہا تو سارجنٹ فوراً بولا۔

”ہو سکتا ہے اس نے یہ سب کچھ صاف کر لیا ہو۔ ہم اس کے کپڑوں کا لیبارٹری ٹیسٹ کرائیں گے۔ فی الحال یہ بتائیں کہ ابھی آپ کچھ دنوں کے لیے تو اسی شہر میں ہیں نا؟“

”میرا ابھی یہاں دو ہفتوں کا کام باقی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ طمانیت سے بولا۔ ”شاید ہمیں دوبارہ آپ سے بات کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔“

میں عمارت کے نیچے آ کر سیروزی ڈمپل کا انتظار کرنے لگا۔ میں سوچا کر رہا تھا کہ پولیس والے اسے ہتھکڑیاں لگا کر نیچے نہ لائیں۔ میں نے اس دوران میں سیکورٹی گارڈ سے پوچھا۔ ”کیا تم نے اس سرکس والی لڑکی کے آنے سے پہلے جیک کو اوپر جاتے دیکھا تھا؟“

”ہاں۔“ اس نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔ ”وہ لڑکی کی آمد سے تقریباً بیس منٹ پہلے اوپر گیا تھا۔ اس وقت دس بجے تھے۔ وہ اس وقت بھی مسخروں والے حلیے میں تھا۔ اگر وہ اپنا شناختی کارڈ نہ دکھاتا تو شاید میں اس کے ارغوانی رنگ کے ہونٹوں اور چہرے پر دوسرے رنگوں کی وجہ سے اسے پہچان نہ پاتا۔“ پھر اس نے آمدورفت کے اندراجات والا اپنا رجسٹر دیکھ کر بتایا۔

”جیک دس بج کر پانچ منٹ پر اوپر گیا تھا اور لڑکی دس بج کر بائیس منٹ پر آئی تھی۔“

”کیا وہ اکیلی تھی؟“

”ہاں جناب اور وہ اکیلی ہی رخصت ہوئی؟“

”اس کے علاوہ تو بلڈنگ سے کوئی نہیں نکلا؟“

”نہیں..... وہ اکیلی تھی..... میں نے اسے ریستوران کی طرف جاتے دیکھا تھا۔“

”اس کے ساتھ کوئی شیر تو نہیں تھا؟“ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ کر ہنسا اور بولا۔

”کیوں مذاق کرتے ہیں جناب.....!“

مجھے تقریباً ایک گھنٹا سیروزی کا انتظار کرنا پڑا۔ آخر کار وہ نمودار ہوئی۔ وہ تھکی ہوئی اور کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اپنا منتظر دیکھ کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ میں اتنی دیر تک اس کا انتظار کروں گا۔

”کیسی رہی تفتیش؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت بری.....“ وہ بولی۔ ”ان کا خیال ہے کہ جیک کو میں نے قتل کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے وہ مجھے حوالات میں بند کرنے کے لیے نہیں لے گئے۔“

ہم ایک بار پھر ریستوران میں آ بیٹھے اور ایک ایک سوٹ ٹرنک کا آرڈر دیا پھر میں نے کہا۔ ”تمہارا شو ختم ہونے کے بعد میں نے تمہیں ایک مسخرے سے ذرا تیز و تند انداز میں بات کرتے دیکھا تھا۔ کیا وہ جیک تھا؟“

”نہیں.....“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ ہمارا باس سائنس گراہم تھا۔ وہ بھی شوقیہ مسخروں کے ساتھ مسخرہ بن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ اس نے شو سے پہلے مجھے جیک کو اس کے گلدستے سمیت ایک طرف دھکیلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس بات پر ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا پھر اس نے مجھے حکم دیا کہ مجھے جیک ٹام کی دعوت قبول کرنی ہوگی اور کچھ دیر کے لیے اس کے ساتھ پینے پلانے کی غرض سے اس کے آفس میں جانا ہوگا۔“

”ویسے..... بائے داوے..... تم نے جیک کا گلدستہ کیوں قبول نہیں کیا تھا؟“

”وہ اس وقت نشے میں دھت تھا۔ دور ہی سے اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ تمنا شایوں میں بچوں کی بھی بڑی تعداد تھی۔ مجھے اس طرح کے اوچھے اور چھوٹے لوگ بالکل اچھے نہیں لگتے جو بچوں کے سامنے بھی تفریحات پیش کرنے کے موقع پر نشے میں دھت ہو کر آ جاتے ہیں۔ ایسا آدمی کتنا ہی معزز اور اہم کیوں نہ ہو، میں اس کی پروا نہیں کرتی۔“

”لیکن تم بہر حال اس کے آفس جانے کے لیے آمادہ ہو گئیں؟“

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”نو کری بچانے کے لیے بعض اوقات دل پر جبر بھی کرنا پڑتا ہے۔ اب تو شیر سدھانے والی لڑکیوں کو بھی ملازمت کو مضبوطی سے پکڑ کر

رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ان کی متبادل بھی آسانی سے مل جاتی ہیں۔ بہر حال جب میں نے دیکھا کہ جیک کے آفس میں اندھیرا ہے تو میں نے وہاں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور فوراً واپس روانہ ہو گئی۔“

”سیکیورٹی گارڈ کا کہنا ہے کہ تم سے پہلے جیک ٹام اوپر گیا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”تو پھر مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں چھپا ہوا تھا۔“ اس نے کہا اور ڈرنک ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اب مجھے چلنا چاہیے۔“ میں نے ایک کارڈ کی پشت پر اسے اپنا فون نمبر لکھ کر دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر میری کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت پڑے تو مجھے ضرور اطلاع دینا۔“

”شکریہ۔“ اس نے کارڈ رکھتے ہوئے کہا۔

”ہمارے سرکس کا یہاں صرف تین رات کا قیام اور ہے..... خدا کرے اس وقت تک یہ معاملہ ختم ہو چکا ہو۔“

☆☆☆

سیروزی ڈمپل کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ معاملہ جلدی ختم نہیں ہوا۔ دوسرے روز کے اخباروں میں جیک ٹام کے قتل کی خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی۔ سہ پہر کے قریب سیروزی نے مجھے آفس میں فون کیا اور بولی۔ ”وہ سراغ رساں کچھ دیر پہلے ایک بری خبر لے کر آیا تھا جو کہ بعید از امکان معلوم ہوتی ہے۔ وہ لوگ یہاں میرے شیروں کے نیچے جیک کر رہے تھے۔ لیبارٹری رپورٹ کے مطابق جیک کی موت تو دل کے دورے سے واقع ہوئی تھی لیکن غالباً شیر کا حملہ دل کے دورے کی وجہ بنا تھا۔ اس طرح وہ چیسر زکواس کی موت کا ذمے دار قرار دے رہے ہیں۔“

”اور یہ چیسر زکون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے شیروں میں سے ایک کا نام چیسر ز ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”جیک کے جسم پر موجود پنچوں کے نشانات کا معائنہ کیا گیا تو انہیں معلوم ہوا کہ حملہ آور شیر کا ایک ناخن ٹوٹا ہوا تھا۔ انہوں نے آ کر شیروں کے پنچوں کا معائنہ کیا تو پتا چلا کہ چیسر ز کا ایک ناخن ٹوٹا ہوا ہے۔“

”لیکن ایسا سوچنا تو پاگل پن ہے۔“ میں نے کہا۔

”سب کو معلوم ہے کہ تم جب اس بلڈنگ میں گئیں تو تمہارے ساتھ کوئی شیر نہیں تھا۔“

”قصہ یہ ہے کہ اس بلڈنگ میں پچھلی طرف ایک ایسی بڑی لفٹ ہے جو سامان لانے، لے جانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ سارجنٹ بلی کا کہنا ہے کہ شاید میں شیر کو

کامیابی

☆ غلطی کرنا انسانی فطرت اور معاف کرنا خدائی صفت ہے..... ہمیں اپنی باتوں میں مٹھاس پیدا کرنا چاہیے کیونکہ مٹھے چشمے پر ہر کوئی آتا ہے۔

☆ دو ہی چیزیں ایسی ہیں جس میں کسی کا کچھ نہیں جاتا..... مسکراہٹ اور دعا..... انہیں ہمیشہ تقسیم کرنا چاہیے۔

☆ جب خود کو عالیشان اور دوسروں کو نیچا سمجھنے لگو تب ایک چکر قبرستان کا ضرور لگنا۔ اے انسان وہاں تم سے بھی عالیشان انسان مٹی میں دفن ہیں۔

☆ ان لوگوں کو معاف کر دو جو بھی آپ کی تکلیف کا سبب بنے تھے اور انہیں یاد رکھو جو ہر وقت آپ کی خوشیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔

☆ میں کتنا ہی طاقتور بن جاؤں لیکن ہر شام کو زندگی کا ایک دن کم ہو جاتا ہے اور میں اس کو روک بھی نہیں سکتا لیکن وہ میرا مہربان رب مجھے نئی صبح دے کر پھر مہلت دے دیتا ہے..... شاید میرا بندہ تو بہ کرے اور میں اسے بخش دوں۔

☆☆☆

دین میں بلڈنگ کی پچھلی طرف سے عقبی دروازہ کھول کر سپان والی لفٹ کے ذریعے اوپر لے گئی ہوں گی۔ جیک کو قتل کر کے میں شیر کو نیچے لائی ہوں گی۔ اسے واپس دین میں بند کیا ہوگا پھر گارڈ کو دکھانے کے لیے سامنے کی طرف سے باہر نکلی ہوں گی، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ میں پانچ منٹ سے زیادہ بلڈنگ میں نہیں رہی۔ کیا میں نے اتنی سی دیر میں یہ سب کچھ کر لیا؟ کیا یہ ناممکن سی بات نہیں ہے؟“ اس کا لہجہ وحشت زدہ تھا۔

”کیا انہوں نے تمہیں باضابطہ طور پر حراست میں لے لیا ہے؟“

”نہیں..... لیکن انہوں نے مجھے تفتیش مکمل ہونے تک شہر میں ہی رکھنے کا حکم دیا ہے۔ خواہ اس دوران میں سرکس آگے روانہ ہو جائے۔“ میں چند لمحے اپنے سامنے موجود کمپیوٹر کی اسکرین پر نظر جمائے اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ میرا جاری کام کتنی دیر میں ختم ہوگا۔ پھر میں نے پوچھا۔ ”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”اسی میدان میں..... جہاں سرکس لگا ہوا ہے۔ آج بھی شو ہے۔“ اس نے بتایا۔

”میں ایک گھنٹے بعد تم سے وہیں ملوں گا۔ کوشش کرنا

کہ تم شیروں کے پنجروں کے پاس رہو۔“ میں نے کہا۔
میں حسب وعدہ جب وہاں پہنچا تو شوغٹام کے
قریب تھا۔ سیروزی ایک شیر کے پنجرے کے پاس موجود تھی
اور خاصی پریشان اور بیزار دکھائی دے رہی تھی۔ وہ مجھے نرمی
سے اس شیر کا پنجرہ دکھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ چیسر ہے۔۔۔۔۔
اس کا ایک ناخن دافنی ٹوٹا ہوا ہے۔ اس مردود سائن گراہم
نے آج اس بے چارے کو تماشا نیوں کے سامنے بھی نہیں
آنے دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ قتل کا ملزم ہے۔“
”فی الحال تو یہ کہنا زیادہ غلط نہیں۔۔۔۔۔ اور اگر پولیس
اس سلسلے میں تمہارے بارے میں بھی اپنا موقف ثابت
کرنے میں کامیاب ہوگئی تو تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے
باس کے لیے بھی اچھا خاصا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔“
اس لمحے وہ ایک طرف دیکھتے ہوئے بولی، اس کی
آواز دھیمی تھی۔ ”میرا باس آرہا ہے۔“
چند لمحے بعد ایک شخص ہمارے قریب آن کھڑا ہوا جو
مکمل طور پر مسخروں والے حلیے میں تھا۔ میری طرف انگلی
سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ اس کا مخاطب سیروزی تھی۔
”یہ کون ہے؟“

سیروزی نے میرا نام بتایا تو وہ اپنی پلاسٹک کی
مصنوعی ناک اور وگ اتارتے ہوئے بولا۔ ”تم پولیس
والے ہو؟“

”نہیں جناب۔۔۔۔۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں
کمپیوٹر پر گرامر ہوں اور ریڈ اسٹار ریسٹوران میں سیروزی
سے متعارف ہوا تھا۔“

”خیر! یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ سیروزی ایک حسین
اور دلکش لڑکی ہے۔ یہ جہاں بھی جاتی ہے، کوئی نہ کوئی اس
سے متعارف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔“ گراہم بولا۔

سیروزی اس تبصرے پر خوش ہونے کے بجائے
قدرے شرمندہ نظر آنے لگی اور جلدی سے بولی۔ ”میں اس
معاملے سے جلد از جلد جان چھڑانا چاہتی ہوں اور تم دونوں
میری کوئی مدد نہیں کر رہے۔“

سائن نے اپنے ہونٹوں سے ارغوانی پینٹ صاف
کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر مجھے عدالت میں
پیش کیا گیا تو پہلی پیشی پر ہی کیس خارج ہو جائے گا۔ بھلا کسی
کو قتل کرنے کے لیے کیا کوئی پالتو کتے کی طرح شیر کو ساتھ
لے کر سڑک سے گزر کر اس طرح کسی بلڈنگ میں جاسکتا ہے
کہ کوئی اسے نہ دیکھ پائے؟“

”اس سلسلے میں سارجنٹ بیلے نے ایک نظریہ قائم کیا

ہے۔“ سیروزی نے اسے بتایا۔ ”اس کا خیال ہے کہ میں
وین میں شیر کو لے کر بلڈنگ کے پچھلے دروازے سے اندر
گئی تھی۔ وہ اب وین میں شیر کے بال وغیرہ تلاش کرنے
کے لیے لیبارٹری والوں سے اس کا معائنہ کرانے والا
ہے۔“

”نہیں!“ وین میں کوئی بال وغیرہ نہیں ملیں گے۔“
سائن گراہم نے بے پروائی سے کہا۔

”اتنے یقین سے یہ بات مت کہو۔“ سیروزی نے
کہا۔ ”تمہیں یاد نہیں، پچھلے ہفتے بچوں کے اسپتال میں
مریض بچوں کا دل بہلانے کے لیے میں خاص طور پر شیر کو
وین میں بٹھا کر وہاں لے گئی تھی اور بچوں نے پارکنگ لاٹ
میں آ کر اسے دیکھا تھا۔ اس لیے وین میں شیر کے بال
دستیاب بھی ہو سکتے ہیں۔“

میں نے اپنی دانست میں مدلل انداز میں گفتگو میں
مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں سب سے پہلے تو گزشتہ
رات کے واقعات کے بارے میں وقت کا تعین کرنا چاہیے
کہ کون سی بات کس وقت ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ صرف
اسی سے ثابت ہو جائے گا کہ تم جیک کی موت کی ذمہ دار
نہیں ہو سکتیں۔“

اس دوران میں گراہم اپنی آنکھوں کے گرد سے
سفید پینٹ بھی صاف کر چکا تھا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ
تقریباً چالیس یا پچاس سال کا ایک وجیہ آدمی تھا۔ اس نے
مسخروں والا ڈھیلا ڈھالا لباس بھی اتار دیا۔ اس کے نیچے
وہ اسپورٹس شرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اب اس نے
جیب سے نظروں کا چشمہ بھی نکال کر لگا لیا۔ دوسری جیب میں
سے وہ چھوٹا سا نوٹ پیڈ اور پین نکال کر میری طرف
بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تم تمام واقعات کے وقت کا حساب
کتاب اس پر نوٹ کر سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔
”سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ پرفارمنس کب شروع ہوئی
تھی؟“

”ساڑھے سات بجے۔“ سائن گراہم نے جواب
دیا۔ ”تماشا نیوں میں چونکہ بچے بھی ہوتے ہیں۔ ہم انہیں
زیادہ دیر انتظار نہیں کراتے۔“

میں نے لکھنا شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”جیک اور
دوسرے شوقیہ مسخرے اس وقت یہاں موجود تھے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ سب اوپننگ پریڈ میں حصہ لیتے ہیں۔“
”کیا جیک اس وقت اپنی حرکات و سکنات سے نارمل

لگ رہا تھا؟“ میں نے پوچھا تو سیروزی نے بتایا۔
”وہ نشے میں دھت تھا، اسی لیے میں نے اس وقت
اسے ایک طرف دھکیل دیا تھا جب اس نے مجھے گلہ ستہ
دینے کی کوشش کی تھی۔“

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، تم جس وقت اپنے
جھملا تے لباس اور پروں والے تاج کے ساتھ رنگ میں
آئیں، اس وقت آٹھ بجتے ہیں دس منٹ تھے پھر تم لباس
تبدیل کرنے چلی گئی تھیں اور کارندے پنجرے نصب
کرنے لگے تھے۔“ میں نے کہا تو سائن گراہم بولا۔

”یہ آٹھ سے لے کر سوا آٹھ بجے تک پنجرے میں
شیروں کے ساتھ تھی۔ ہم ہر کام وقت کی پابندی کے ساتھ
کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ٹھیک ساڑھے نو بجے شو ختم
ہو جائے۔“

”شو ختم ہونے کے بعد جب میں رخصت ہو رہا تھا تو
میں نے تم دونوں کو کسی بات پر بحث کرتے دیکھا تھا۔“ میں
نے کہا تو سائن نے کن آنکھوں سے سیروزی کی طرف
دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔

”جیک نے ایک ڈرنک کے لیے اسے اپنے آفس
میں مدعو کیا تھا اور میں اس پر زور دے رہا تھا کہ اسے جانا
چاہیے۔ ہمیں سرکس کی بہتری اور کاروباری مفادات کے
لیے ہر شہر میں بڑے لوگوں سے تعلقات خوشگوار رکھنے
پڑتے ہیں۔“

”میں نے اسے یہی جواب دیا تھا کہ میں نہیں جاؤں
گی۔“ سیروزی نے کہا۔ ”میں پاؤں پیختے ہوئے یہاں سے
چلی گئی تھی اور اپنا غصہ کم کرنے کے لیے پون گھنٹے تک ادھر
ادھر گلیوں میں پھرتی رہی تھی۔ جب میرا غصہ ٹھنڈا ہوا تو میں
نے دل میں سوچا کہ اگر مجھے سرکس میں نوکری کرنی ہے تو
مجھے سائن کے اصرار کے مطابق جیک ٹام کے آفس چلے
ہی جانا چاہیے۔ بہر حال میں دل ہی دل میں یہ دعا کرتے
ہوئے گئی تھی کہ وہ جا چکا ہو۔ مجھے اس کے آفس میں اندھیرا
نظر آیا تو میں یہی سمجھی کہ میری دعا قبول ہوگئی۔ میں فوراً ہی
وہاں سے واپس آ گئی۔“

”تم نے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ دروازہ کھلا
ہے یا بند ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے یونہی دروازے کو ہاتھ لگا کر دیکھا تھا۔
مجھے احساس ہوا تھا کہ دروازہ غیر مقفل تھا لیکن بہر حال۔۔۔۔۔
میرا اندھیرے آفس میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں
یہی سمجھی کہ وہ گھر چلا گیا ہے لیکن نشے میں دروازہ مقفل کرنا

بھول گیا ہے۔“
سائن گراہم نے کہا۔ ”سارجنٹ بیلے کا خیال ہے کہ
سیروزی وین میں شیر کو بلڈنگ کے پچھلے دروازے پر لے گئی۔
اسے سامان والی لفٹ سے اوپر پہنچایا۔ خود سامنے والے
دروازے سے اندر گئی اور شیر سے جیک کو ہلاک کر دیا اور واپس
آ گئی۔ تم نے ایسی احقانہ بات اس سے پہلے بھی سنی ہے؟“
میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وقت کا جو
حساب کتاب بن رہا ہے اس کی مناسبت سے بھی یہ ممکن نظر
نہیں آتا۔ اس کے علاوہ انسان کو قتل کرنے کے اس سے
کہیں زیادہ آسان طریقے موجود ہیں۔“

سائن نے کہا۔ ”میں عدالت میں حلفیہ بیان دینے
کے لیے تیار ہوں کہ ہمارا شیر پچھلی رات پنجرے سے نہیں
نکلا۔ میرے پاس اس کا گواہ بھی موجود ہے۔“

اس نے ایک نوجوان کو آواز دی جو شیروں کے
پنجرے صاف کر رہا تھا۔ وہ قریب آیا تو سائن نے کہا۔
”کیوں ڈگس! کیا پچھلی رات کی پرفارمنس کے بعد چیسر ز،
اپنے پنجرے میں یہی موجود نہیں رہا؟“

”یقیناً وہ اپنے پنجرے میں ہی تھا مسٹر سائن!“
ڈگس نے جواب دیا۔

”کیا سیروزی پرفارمنس کے بعد یہاں آئی تھی؟“
میں نے پوچھا۔

”میں نے اسے نہیں دیکھا۔“ ڈگس نے جواب
دیا۔

”سرکس کی وین کے بارے میں کیا خیال ہے؟ شاید
وہ وین لے کر گئی ہو؟“ اس کا جواب سائن نے دیا۔

”وین کی چابیاں صرف میرے پاس ہوتی ہیں۔
ضرورت پڑنے پر سیروزی مجھ سے چابیاں لے لیتی ہے
لیکن پچھلی رات اس نے نہیں لیں۔“

”تو پھر ہو سکتا ہے تم شیر کو وین میں وہاں لے گئے ہو؟“
میں نے سائن سے کہا۔۔۔۔۔ اس پر ڈگس ہنس پڑا اور
کہنے لگا۔ ”مسٹر سائن کو تو کوئی لاکھ ڈالر دے تب بھی یہ
شیروں کے قریب نہیں جاتے۔ اس کے علاوہ میں بتا چکا
ہوں کہ پچھلی رات کوئی شیر کہیں نہیں گیا۔ میں یہیں ان کی
نگرانی پر موجود تھا۔“

میں نے سوالات کا سلسلہ ختم کر کے اپنے لکھے ہوئے
نوٹ پیڈ میں سے وہ کاغذ الگ کر کے اپنی جیب میں رکھ
لیے تو سیروزی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے
بولی۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“

”یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔“ میں نے کہا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں بھٹکنے کے سے انداز میں ادھر ادھر پھرتا ہوا آخر کار اسی بلڈنگ کی طرف چل دیا جس میں کام کر رہا تھا..... میں دریا کے پل پر سے گزرتے وقت غیر ارادی طور پر بھنور کا نظارہ کرنے کے لیے رک گیا۔ یہ نظارہ بہت سے لوگوں کے قدم روک لیتا تھا۔

سچی بات یہ تھی کہ اس وقت میرے ذہن میں بے شمار خیالات بھنور کی طرح چکرارہے تھے مگر صحیح طرح کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کسی بات کا سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاہم میں حقیقت کی تلاش میں مسلسل غور کیے جا رہا تھا۔

”لگتا ہے بھنور کا نظارہ تمہیں بہت پسند ہے۔“ میرے عقب سے آواز ابھری۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، سارجنٹ بلی میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اسی لمحے اچانک..... میرے ذہن میں چھنا کا سا ہوا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”سارجنٹ! یہ کیس اس لیے مشکل ثابت ہو رہا ہے کہ تم نے اب تک اس پر کسی اور زاویہ نظر سے غور کرنے کی کوشش نہیں کی۔“

”چلو تم بتاؤ..... تمہارا اس سلسلے میں کیا زاویہ نظر ہے؟“ سارجنٹ نے نچلے سے کہا..... میں نے اسے اپنے اس خیال کے بارے میں بتانا شروع کیا جو اسی لمحے میرے ذہن میں آیا تھا۔

☆☆☆

میں اور سارجنٹ بلی اس وقت سرکس پہنچے جب شو ختم ہو رہا تھا۔ سیروزی ڈمپل تیزی سے ہمارے قریب آئی اور سارجنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”کیا یہ مجھے گرفتار کرنے آیا ہے؟“

”ابھی ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔“ میں نے کہا۔ اس دوران میں سائمن گراہم بھی قریب آ گیا تھا۔ وہ اپنے مسخروں والے حلیے میں تھا۔ وہ سارجنٹ سے مخاطب ہوا۔

”کیا اب مزید سوالات کرنے آئے ہو؟“

”نہیں..... کچھ باتوں کی تصدیق کرنے۔“

سارجنٹ نے جواب دیا۔ ”اس سے پہلے کہ تم اپنا یہ مسخروں والا میک اپ اتارو..... میں چاہتا ہوں کہ تم شیلڈ بلڈنگ میں رات کو ڈیوٹی دینے والے سلیپورٹی گارڈ سے مل لو۔“

میں اسی لمحے سارجنٹ کا ساتھی فریڈرک ایک طرف سے نمودار ہوا۔ سلیپورٹی گارڈ اس کے ساتھ تھا۔ سائمن کے چہرے پر مختلف رنگوں اور مصنوعی ناک کی موجودگی کی وجہ

سے اس کے تاثرات کا اندازہ لگانا مشکل تھا لیکن جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں تناؤ تھا۔ ”اے کس لیے لائے ہو؟“ اس نے جانتا چاہا۔

سارجنٹ گویا اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے گارڈ سے مخاطب ہوا۔

”سانتے! اس مسخرے کو غور سے دیکھو۔ کیا یہ وہ شخص ہو سکتا ہے جو پچھلی رات دس بج کر پانچ منٹ پر تمہارے سامنے سے گزر کر اوپر جیک کے آفس میں گیا تھا؟“

گارڈ سانتے، ایک لمحے تک سائمن گراہم کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”سرکس کے سب مسخرے مجھے ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ بہر حال اگر یہ مسخرہ اوپر گیا تھا تو اس کے پاس جیک ٹام کا شناختی کارڈ تھا اس کی وجہ سے میں نے اسے جیک ہی سمجھا۔“

”سرکس کے سارے مسخرے ایک جیسے نہیں ہوتے۔“ میں نے گارڈ کو بتایا۔ ”ہر ایک کے لباس اور میک اپ کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ میں نے رات جب جیک کی لاش دیکھی تو رنگ کی مدد سے بڑے کیے گئے اس کے ہونٹ سرخ تھے لیکن تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے جس شخص کو جیک سمجھ کر اوپر جانے دیا اس کے ہونٹ ارغوانی تھے۔ تم بات کرتے وقت یہ تذکرہ یونہی سرسری سے انداز میں کر گئے تھے لیکن آج یہ بات مجھے اچانک یاد آئی تو ذہن میں جیسے کوئی گرہ سی کھل گئی۔ آج میں نے سائمن گراہم کو اپنے سامنے مسخروں والا میک اپ صاف کرتے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے ہونٹ ارغوانی تھے اور اس وقت بھی ارغوانی نظر آ رہے ہیں۔“

”ہاں۔“ گارڈ نے گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے اب زیادہ پر یقین ہو کر کہا۔ ”یہی وہ شخص ہے..... جسے میں نے جیک سمجھ کر اوپر جانے دیا تھا۔“

”لیکن اگر سائمن وہاں گیا تھا تو پھر یہ کہاں غائب ہو گیا؟ اور جیک اپنے آفس میں کیسے پہنچا؟“ سارجنٹ نے مسکرا کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ بات اپنے دوست سے پوچھیں۔“

”یہ چیزوں کو مختلف زاویہ نظر سے دیکھنے کے ماہر ہیں۔“

سیروزی ڈمپل نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ کل رات شو ختم ہونے کے بعد تک بھی جیک ٹام اچھا خاصا نشتے میں تھا۔ وہ شیروں کے پنجرہ کی طرف جا نکلا اور ترنگ میں آ کر غالباً اس نے سوچا ہوگا کہ وہ بھی سیروزی کی طرح شیروں کو

اشاروں پر بچا سکتا ہے۔ وہ چیسرز کے پنجرے میں گھس گیا۔ شیر چیسرز نے یقیناً اس کی حرکتوں کا برا منایا ہوگا اور اپنے پنجنوں سے اسے خوب ادھیڑ ڈالا ہوگا۔ اسی دوران میں خوف کے باعث جیک کو دل کا دورہ پڑا جو اس کی موت کا اصل سبب بنا۔“

میں نے سائمن گراہم کی طرف ایک نظر دیکھ کر بات جاری رکھی۔ ”یہ صورت حال سائمن کے لیے کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہیں تھی۔ بظاہر تو یہی دکھائی دیا ہوگا کہ شہر کے ممتاز وکیل کو سرکس کے شیر نے ہلاک کر ڈالا۔ اس نے تصور ہی تصور میں نہ صرف سرکس کو بری طرح ناکام ہوتے اور ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہوتے دیکھا ہوگا بلکہ اسے یہ خطرہ بھی محسوس ہوا ہوگا کہ سرکس پر لاکھوں ڈالرز کے ہرجانے کے دعوے دائر کر دیے جائیں گے۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں یہی حل آیا ہوگا کہ لاش کو یہاں سے ہٹا کر جیک کے آفس میں پہنچا دیا جائے اور سامان والی لفٹ سے شیر کو نہیں بلکہ جیک کی لاش کو اوپر لے جایا گیا تھا۔“

سائمن گراہم بڑبڑا اٹھا۔ ”اس منحوس کو نہ تو میں نے ہلاک کیا تھا اور نہ ہی چیسرز (شیر) نے..... وہ خود اپنی غلطی سے مرا تھا۔“

”مگر تم اس کی لاش سرکس والی وین میں ڈال کر بلڈنگ کے عقب میں تولے گئے۔ شاید صفائی کرنے والے نو جوان نے بھی تمہاری مدد کی ہوگی۔ وین پچھلی طرف کھڑی کر کے تم چکر کاٹ کر اگلے دروازے سے گارڈ کو یہ تاثر دے کر اندر پہنچے کہ تم جیک ٹام ہو۔ اس مقصد کے لیے اس کی جیبوں سے اس کے آفس کی چابیاں اور شناختی کارڈ تم نے پہلے ہی نکال لیا ہوگا۔ اندر ہی اندر بلڈنگ کی پچھلی طرف آ کر تم نے سامان والی لفٹ کے ذریعے جیک کی لاش اس کے آفس میں پہنچائی۔ اس کی چابیاں اور شناختی کارڈ دوبارہ اس کی جیب میں ڈالا اور بتیاں بجھا کر سامان والی لفٹ ہی کے ذریعے پچھلی طرف سے نکل گئے۔“

”اس سارے معاملے میں سیروزی کا کیا کردار تھا؟“ سارجنٹ نے دریافت کیا۔

”سیروزی کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ وہ جیک کے ہاں جانے سے انکار کر چکی تھی اور سائمن نے اس امکان کے بارے میں سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ کچھ دیر گلیوں میں آوارہ گردی کرنے کے بعد اپنا ارادہ بدل لے گی اور جیک سے ملنے اس کے آفس جا پہنچے گی۔ سائمن کا ارادہ اسے اس الزام میں پھنسانے کا ہرگز نہیں ہوگا لیکن حالات

نے یہ رخ اختیار کر لیا۔ سائمن نے جیک کی لاش اس کے آفس میں چھوڑتے وقت شاید یہی سوچا ہوگا کہ اس کی موت کا ذمے دار کسی چور ڈاکو یا نقب زن کو سمجھ لیا جائے گا اور یہی رائے قائم کی جائے گی کہ چور یا ڈاکو نے کوئی ٹکلیا، خطرناک ہتھیار استعمال کیا ہوگا۔“

”اب میرے ساتھ کیا ہوگا؟“ سائمن نے جانتا چاہا۔

”اس کا فیصلہ ڈسٹرکٹ اٹارنی کرے گا کہ تم پر کیا الزامات عائد کیے جائیں۔ پھر عدالت میں جو کچھ ثابت ہو سکا اس کی روشنی میں عدالت فیصلہ کرے گی کہ تمہیں کیا سزا دی جائے۔“ سارجنٹ نے جواب دیا۔

”میں چاہتا ہوں معاملہ جلد از جلد ختم ہو جائے۔“ سائمن نے کہا۔ ”میں نے کوئی ایسا سنگین جرم تو نہیں کیا..... بس لاش اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ ہی تو پہنچائی تھی۔“

”یہ بھی بڑا سنگین جرم ہے۔“ سارجنٹ بلی نے کہا۔

☆☆☆

میں..... اور سیروزی ڈمپل ایک بار پھر رستوران میں بیٹھے تو اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں شروع ہی سے یقین تھا کہ میں بے قصور ہوں؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وقت کے تعین سے یہ ممکن ہی نظر نہیں آ رہا تھا کہ یہ کام تم نے کیا ہوگا اور بات کچھ دل کو بھی نہیں لگ رہی تھی پھر میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ لاش کے آس پاس خون موجود نہیں تھا اور نہ ہی وہاں کسی قسم کی مزاحمت کے آثار یا توڑ پھوڑ دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جیک ہلاک کہیں اور ہوا تھا، اسے بعد میں اس کے آفس لایا گیا تھا۔ اس انداز میں ہلاک ہونے کا زیادہ امکان سرکس میں ہی نظر آتا تھا۔“

”تمہیں تو سراخ رساں ہونا چاہیے تھا۔“ سیروزی کے لہجے میں ممنونیت بھی تھی اور تحسین بھی پھر اس نے پوچھا۔

”اب تم کیا کرو گے؟“

میں نے ویٹر کو ایک اور ڈرنک لانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب میں روزانہ سرکس میں تمہارا شو دیکھنے آیا کروں گا اور جب تم اپنے سرکس کے ساتھ اگلے کسی شہر کی طرف کوچ کر جاؤ گی تو میں روزانہ رات کو یہاں بیٹھ کر بھنور کو دیکھا کروں گا۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں ہلکی سی اداسی شامل ہو گئی تھی۔

گریبان

سرزا امجد بیگ

سادگی اور بے وقوفی میں بس دو چار ہاتھ کا ہی فاصلہ ہے اور جب کوئی سادہ انسان اپنی بے وقوفی کو عقلمندی کی معراج سمجھ کر ایک لمبی چھلانگ لگاتا ہے تو ایسا حال ہوتا ہے کہ نہ صرف چال لڑکھڑا جاتی ہے بلکہ وہ انسان حال سے بے حال ہو کر جینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ بے وقوف انسان بھی قدرت کی اس کرم نوازی کو نہیں سمجھ پایا تھا کہ رشتے قدرت کی طرف سے تحفے ہوتے ہیں، جن کی قدر کی جاتی ہے مگر وہ ناشکر اس سب سے خوب صورت رشتے ”ماں“ کی بھی قدر نہ کر سکا جو ممتا کی تمام حدوں کو پار کر کے بھی اپنی اولاد کے دل میں ذرا سی جگہ نہ پاسکی... حقیقت تو یہی ہے جب تک اندھیرا اپنی چادر میں نہ لے لے تب تک روشنی کی قدر نہیں ہوتی... اور یہ روشنی بالآخر ایک دن اس کی زندگی کو بھی اندھیروں کے سپرد کر کے رخصت ہو گئی۔

خود غرضی کی لاٹھی سے منزل تلاش کرنے

والے بھٹکے ہوؤں کا قصہ

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا پھر اپنی میز کی دوسری جانب بچھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”جی بالکل۔ آپ ٹھیک جگہ پر آ گئے ہیں۔ تشریف رکھیں۔“

اس نے تسلی کرنے والے انداز میں ایک مرتبہ پھر میرے چیمبر کا جائزہ لیا اور تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد وہ ایک کرسی کھینچ کر اس پر ٹنگ گیا اور بولا۔
”آپ وکیل صاحب ہیں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا

سادگی اور بے وقوفی میں سرسوفرق ہے اور یہ تفاوت ایک سادہ انسان اور ایک احمق انسان کی زندگی کے ہر شعبے میں بڑی وضاحت کے ساتھ قدم قدم پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ سادہ انسان سودوزیاں سے بے نیاز ہوتا ہے جبکہ احمق انسان بہ زعم خود سب سے زیادہ عقل مند ہوتا ہے اور اسی خوش فہمی میں وہ خود کو چالاک ثابت کرنے کی کوشش میں اپنا نقصان کر بیٹھتا ہے۔ فرید بھی ایک ایسا ہی ڈیڑھ ہوشیار انسان تھا!

وہ میرے چیمبر میں داخل ہوا اور چاروں جانب نگاہ دوڑانے کے بعد مجھ سے مستفسر ہوا۔ ”یہ وکیل صاحب کا آفس ہے نا؟“

ہوں؟“

میں نے چند لمحے پہلے اسے تشریف رکھنے کے لیے کہا تھا۔ وہ کرسی پر تقریباً ٹکا بیٹھا تھا۔

”جناب! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے۔“ وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”میرا نام فرید احمد ہے۔“

”میرے پاس لوگ اپنے ضروری کام ہی سے آتے ہیں فرید صاحب۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ حکم کریں؟“

وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھتا چلا گیا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے ایک کنفیوز شخص لگا تھا۔ میرے پاس پہنچنے سے پہلے میری سیکریٹری سے یقیناً اس کی بات ہوئی ہوگی جس کے بعد ایسی کسی تصدیق کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ یہ کسی وکیل کا آفس ہے اور کیا وہ کسی وکیل سے بات کر رہا ہے؟ لیکن اس نے اپنی تسلی کی خاطر مجھ سے یہ تمام سوالات کیے تھے۔ بہر حال میرے استفسار پر وہ تھوڑا سا آگے کوچکا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

”مجھے آپ سے ایک سرٹیفکیٹ بنوانا ہے۔“ وہ پہلے ہی کرسی کے کنارے پر ٹکا ہوا تھا۔ اس کے آگے جھکنے پر میرے ذہن میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ منہ کے بل میری میز پر نہ آ رہے تاہم خیریت گزری اور وہ اپنی پوزیشن پر جما بیٹھا رہا۔

میں نے پوچھا۔ ”کس نوعیت کا سرٹیفکیٹ؟“

”گارجین سرٹیفکیٹ۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیسی گارجین شپ؟“

”وہ جناب! بات دراصل یہ ہے کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اور مجھے بچوں کے لیے گارجین سرٹیفکیٹ چاہیے۔“

”کس کے بچوں کے لیے؟“ میں نے ابھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

شاید وہ میرے سوال کو سمجھ نہیں پایا، جلدی سے بولا۔

”بچے نہیں جناب، بچیاں۔ میری چار بیٹیاں ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میری بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”یہ چاروں بیٹیاں آپ ہی کی ہیں نا.....؟“

”جی الحمد للہ۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”وہ میری سگی بیٹیاں ہیں۔“

”جب آپ ان چاروں کے باپ ہیں تو پھر آپ کو ان کے لیے گارجین سرٹیفکیٹ کی کیا ضرورت ہے۔ وہ

آپ کی سگی اولاد ہیں۔ آپ ان کے سگے باپ ہیں۔ بات ختم.....“

”بات ختم نہیں ہو پارہی جناب۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔ ”لگ بھگ ایک سال پہلے میری بیوی نفیسہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ نفیسہ کے نام پر کچھ جائداد بھی جو میں نے اس کی زندگی ہی میں فروخت کر کے رقم کو بینک میں رکھوا دیا تھا لیکن جب نفیسہ کا انتقال ہوا تو اس کے چھوٹے بھائی نے مجھ پر کیس کر دیا لہذا بینک والوں نے اس اکاؤنٹ کو فریز کر دیا ہے۔ وکیل میرا کیس لڑ رہا ہے لیکن ابھی تک میرا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اب وکیل نے مجھ سے کہا ہے کہ تم کراچی سے بچیوں کا گارجین سرٹیفکیٹ بنوا کر لے آؤ۔ پھر میں معاملے کو آگے بڑھاتا ہوں۔“

”کراچی سے گارجین سرٹیفکیٹ بنوانے کا کیا مطلب ہوا.....“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی فرید صاحب؟“

اس روز میرے آفس میں زیادہ رش نہیں تھا، اسی لیے فرید کو بے آسانی مجھ تک رسائی حاصل ہو گئی تھی۔ میں بھی ایک طرح سے فارغ ہی بیٹھا ہوا تھا، اس لیے فرید کی بے تکی بات کو بھی توجہ سے سننے لگا۔

”میں کراچی میں رہتا ہوں نا اور میری بیٹیاں بھی ادھر ہی ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”اس لیے وکیل صاحب نے کہا ہے کہ کراچی ہی سے گارجین سرٹیفکیٹ بنوا کر لاؤ۔“

”آپ کا وکیل کراچی میں نہیں ہوتا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب۔ وہ تو حیدر آباد میں ہے۔“

”اور کیس کہاں پر ہے؟“

”وہ بھی حیدر آباد کی عدالت میں ہے۔“ اس نے بتایا۔

”آپ کی مرحومہ بیوی کی جائداد کراچی میں تھی یا حیدر آباد میں؟“ میں نے اس کے معاملے میں دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

”جی وہ فلیٹ تو کراچی میں تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”مذکورہ فلیٹ آپ نے کتنے میں فروخت کیا تھا؟“

میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”تین لاکھ روپے میں۔“

یہ آج سے لگ بھگ تیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔

فرید کے بیان کے مطابق، نفیسہ کا فلیٹ کراچی کے علاقے

گریبان

شو مارکیٹ میں تھا۔ آج کے حساب سے مذکورہ فلیٹ کی مالیت تیس لاکھ سے کم نہیں ہونا چاہیے۔

میں نے پوچھا۔ ”فرید صاحب! آپ نے فلیٹ کی فروخت سے حاصل ہونے والی تین لاکھ کی رقم حیدر آباد کے کسی بینک میں کیوں جمع کرائی تھی؟“

”آپ سمجھ نہیں جناب۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”وہ رقم تو میں نے نفیسہ کے اکاؤنٹ میں جمع کرائی تھی اور یہ بینک کراچی میں ہے۔“

فرید احمد کی عمر پینتالیس کے قریب تھی۔ اس کی رنگت گندمی اور سر کے بال گھنکر لے تھے۔ وہ درمیانی قامت اور اکہرے بدن کا مالک تھا۔ اب تک اس سے ہونے والی گفتگو کے نتیجے میں مجھے یہ سمجھنے میں کوئی وقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ یا تو انتہائی سادہ انسان تھا یا پھر بے پناہ بے وقوف۔ بہر حال میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”تین لاکھ کی رقم کراچی کے کسی بینک میں پڑی ہے۔ آپ کی بیوی کا انتقال کراچی میں ہوا لیکن آپ کے سلسلے صاحب نے حیدر آباد کی کسی عدالت میں آپ کے خلاف مقدمہ دائر کر کے بینک میں موجود تین لاکھ کی رقم کو فریز کروا دیا ہے اور اس رقم کو اپنایا اپنی بیٹیوں کا حق ثابت کرنے کے لیے آپ کو بچیوں کی گارجین شپ کا سرٹیفکیٹ چاہیے.....؟“

”جی..... جی.....“ وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”اب آپ ساری بات سمجھ گئے ہیں۔“

”ٹھیک کہا آپ نے۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ”میں تو سمجھ ہی گیا ہوں سارے معاملے کو لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ کو سمجھنا نہیں پاؤں گا لہذا ہم گارجین سرٹیفکیٹ پر آ جاتے ہیں۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ عجیب سی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ مجھے کیا نہیں سمجھا سکتے؟“

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کو صرف گارجین سرٹیفکیٹ بنوانا ہے یا اپنے کیس پر بھی کچھ روشنی ڈالوانا ہے؟“

”میرا کیس تو ادھر حیدر آباد میں وکیل صاحب لڑ رہے ہیں نا۔“ وہ بڑے غر سے بولا۔ ”بس آپ مجھے گارجین سرٹیفکیٹ بنادیں۔“

جب وہ خود اپنے معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا تو میں نے بھی اسے فارغ کرنے کی غرض سے کہہ دیا۔

”آپ اپنی چاروں بیٹیوں کے باپ ہیں لہذا از روئے قانون آپ کو کسی گارجین سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں۔ گارجین کا مطلب ہے، والد یا والدہ کے علاوہ بچوں کا کسی اور شخص کی کسٹڈی میں ہونا جیسے چچا، ماموں، تایا..... یا کوئی اور.....“

”جناب! میں تو قانونی معاملات کو جانتا نہیں ہوں۔“ وہ معذور سے لہجے میں بولا۔ ”میرے وکیل نے مجھ سے جو کہا وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔ کیا آپ مجھے اس قسم کا کوئی سرٹیفکیٹ بنا کر دے سکتے ہیں؟“

”..... سرٹیفکیٹ تو بن جائے گا، یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں تو آپ کو حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ باقی جیسی آپ کی مرضی۔ والدین کا بہ طور گارجین کا تصور یا تو امریکا میں ہے یا بعض یورپی ممالک میں جہاں قانونی لحاظ سے والدین کو بھی اپنی اولاد کا گارجین یا کیئر ٹیکر سمجھا جاتا ہے خیر.....“

میں نے لحاظی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”ایک گارجین کے ایشوکا کیا روٹا، آپ کا تو پورا کیس ہی چوں چوں کا مر رہا ہے۔ تین لاکھ کی رقم کراچی کے بینک میں پڑی ہے اور مقدمہ حیدر آباد کی عدالت میں۔“

وہ میری بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے مجھ سے مستفسر ہوا۔ ”جناب! اس سرٹیفکیٹ پر کتنا خرچہ آ جائے گا؟“

”دیکھیں فرید صاحب۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس نوعیت کے چھوٹے موٹے کام نہیں کرتا مگر آپ کی پریشانی کے پیش نظر میں آپ کو آپ کا مطلوبہ سرٹیفکیٹ بنا دیتا ہوں۔“ بات کے اختتام پر میں نے اسے اس کام کا ایک نارمل سامعہ بھی بتا دیا۔

وہ معاوضے کی رقم کا سن کر اس طرح اچھلا جیسے اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار کو چھو گیا ہو۔ پھر وہ منت ریز لہجے میں بولا۔

”جناب! آپ تو بہت زیادہ پیسے بتا رہے ہیں۔ میں ایک غریب انسان ہوں اور اوپر سے مصیبت زدہ بھی۔ آپ کچھ رعایت کر دیں تو مہربانی ہوگی۔“

”میں نے آپ کی مصیبت کا احساس کرتے ہوئے ہی یہ پیسے بتائے ہیں جو کہ محض اسٹیپ پیپر اور اسٹیٹنری کا خرچہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر میں نے اس کے اندر اپنی

ہے۔

”میرے انداز کی سچائی اور خلوص کا معاملہ ایک طرف رکھیں فرید صاحب!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ تو میرے پیٹھے کا تقاضا ہے اور میرے مزاج کا حصہ ہے۔ باقی جہاں تک آپ کی مدد کرنے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں دو باتیں ہیں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں.....“ لچاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”نمبر ایک، جب تک مجھے آپ کے حالات سے آگاہی نہیں ہوگی، میں آپ کو کوئی مفید مشورہ نہیں دے سکوں گا۔ نمبر دو، میں ایک پیشہ ور وکیل ہوں لہذا اپنی فیس وصول کیے بغیر میں کسی کیس میں ہاتھ نہیں ڈالتا اور..... فیس میں ایڈوائس لیتا ہوں۔“

”جناب! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ابھی آپ کو اپنی کہانی سنا دیتا ہوں۔“ وہ دھکی لہجے میں بولا۔ ”اور جہاں تک آپ کی فیس کا تعلق ہے تو وہ بھی میں آپ کو ضرور دوں گا مگر آپ کو میری معصوم بچیوں کا واسطہ کہ انسانیت کے ناتے آپ فیس میں کچھ رعایت ضرور دیں گے۔“

میں سال میں ایک آدھ چیریٹی کیس بھی لے لیتا ہوں یعنی ایسا کیس جس میں ”نو پرافٹ، نولوس“ کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ اس طرح دھکی انسانیت کی خدمت بھی ہو جاتی ہے اور دل کو سکون کا احساس بھی ہو جاتا ہے۔

”فیس کا معاملہ بعد میں طے کر لیں گے۔“ میں نے تعاون آمیز انداز میں کہا۔ ”آپ اپنی کہانی سنانا شروع کریں تاکہ میں آپ کے حالات سے کما حقہ آگاہی حاصل کر سکوں۔“

میرے گرین سگنل دینے کی دیر تھی، وہ شروع ہو گیا۔

☆☆☆

فرید احمد کا تعلق کراچی کے علاقے ”شو مارکیٹ“ سے تھا۔ پیٹے کے اعتبار سے وہ ایک سیلز مین تھا اور اس وقت گل بہار المعروف گولی مار کے علاقے میں ایک گارمنٹس اسٹور پر کام کر رہا تھا۔ دس سال پہلے اس کی شادی نفیسہ سے ہوئی تھی۔ نفیسہ کا تعلق حیدرآباد سے تھا۔ نفیسہ کے بطن سے فرید کی چار بیٹیاں نورین، نازیہ، کرن اور مسکان پیدا ہوئی تھیں جن کی عمریں علی الترتیب آٹھ، چھ، چار اور دو سال تھیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی مسکان جب ایک سال کی تھی تو نفیسہ کا انتقال ہو گیا۔

پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔“

”میں آپ کی وجہ سے فکر مند ہو گیا ہوں۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ پھر امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”میری وجہ سے؟“ میں نے اسے گھورا۔ ”میں سمجھا نہیں!“

”میرا مطلب ہے، آپ کی باتوں کی وجہ سے۔“ وہ اپنی دانست میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں جب سے آپ سے مل کر گیا ہوں، مسلسل آپ کی باتوں پر غور کر رہا ہوں اور میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ نے جو کہا، ٹھیک ہی کہا ہے۔“

مجھے کافی حد تک اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ کس تناظر میں بات کر رہا ہے لیکن پھر بھی تصدیق کی غرض سے میں نے پوچھ لیا۔

”آپ میری کن باتوں کا ذکر کر رہے ہیں؟“

”یہی کہ میرا وکیل مجھے دھوکا دے رہا ہے۔“ وہ میرے انداز سے پر مہر تصدیق مثبت کرتے ہوئے بولا۔

”اب مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔“

”تو کیا آپ مجھے یہی سب بتانے آئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جناب! میں جس نوعیت کے حالات میں پھنسا ہوا ہوں، میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں، کدھر جاؤں؟ میں چار بیٹیوں کا باپ ہوں۔ سب سے چھوٹی بیٹی کی عمر دو سال ہے۔ نفیسہ کے انتقال کے وقت مسکان محض ایک سال کی تھی۔ میں اپنی بیٹیوں کو دیکھوں یا نوکری کروں یا وکیل کے پیچھے حیدرآباد کے چکر لگاؤں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ خود مر جاؤں گا یا کسی کو مار ڈالوں گا۔ گھر میں بوڑھی والدہ ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو چلا پاتی ہیں، میری چار بیٹیوں کو کیسے سنبھالیں گی.....!“

بات کے اختتام پر اس کی آواز بھرا گئی۔ ان لمحات میں وہ مجھے کافی قابلِ رحم نظر آیا۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

”آپ دوبارہ میرے پاس آئے ہو۔ بتاؤ، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”مجھے آپ کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔“ وہ امداد طلب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنے حالات کی حقیقت کو سمجھنا چاہتا ہوں اور یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں۔ میں نے آپ کے انداز میں بہت سچائی اور خلوص دیکھا

”کون سا مفت مشورہ؟“

”آپ میرے آفس سے باہر نکلیں گے تو تھوڑے ہی فاصلے پر سٹی کورٹ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ وہاں۔“

”جی، میں نے سٹی کورٹ دیکھ رکھا ہے۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ آپ نے سٹی کورٹ دیکھ رکھا ہے۔“ میں نے رکھائی سے کہا۔ ”آپ میرے آفس سے نکل کر سیدھے سٹی کورٹ جائیں۔ وہاں آپ کو کورٹ کے باہر بہت سے نوٹری پبلک مل جائیں گے۔ ان کے پاس جا کر آپ اپنے لیے گارجین سرٹیفکیٹ بنوالیں۔ میرے بتائے ہوئے معاوضے کے مقابلے میں وہ بہت کم پیسوں میں آپ کا کام کر دیں گے اور عین ممکن ہے، وہ آپ کی درخواست پر ادھار بھی کر لیں۔“

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یقیناً اسے میرا یہ مفت مشورہ پسند نہیں آیا تھا حالانکہ میں نے اس سے کوئی مذاق یا غلط بیانی نہیں کی تھی۔ اس کے بعد وہ میرے چیمبر سے اس تیزی سے نکلا جیسے اس نے وہاں کسی عفریت کو نمودار ہوتے دیکھ لیا ہو۔

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ انہی افراد میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ذہن میں ڈاکٹروں اور وکیلوں سے بھی ادھار کرنے کا تصور پایا جاتا ہے۔ بہر حال یہی کہا جاسکتا تھا..... کیسے کیسے لوگ ہمارے دل کو جلانے آ جاتے ہیں.....!

فرید احمد جس انداز میں میرے آفس سے اٹھ کر گیا تھا اس سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ میں نے اس کے مقصد کے حصول کے لیے اسے جو راستہ دکھایا تھا وہاں پہنچ کر وہ با مراد ہو جاتا لیکن ایسا سوچنا میری خام خیالی تھی۔

چند روز کے بعد وہ پھر میرے آفس میں موجود تھا۔

”کیا ہوا.....“ رکی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا۔ ”آپ نے گارجین... سرٹیفکیٹ بنوالیا تھا؟“

”جی۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”وہ تو میں نے ایک نوٹری پبلک سے بنا کر اپنے وکیل کو دے دیا ہے۔“

”پھر اب کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کافی

فیس بھی لگادی ہوتی تو آپ اب تک بے ہوش ہو چکے ہوتے۔“

وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ”پھر بھی جناب۔ آپ کچھ تو ڈسکاؤنٹ دیں نا.....!“

اب مجھے اس کی باتوں سے کوفت محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے بیزاری سے کہا۔ ”فرید صاحب! میں نے یہاں پر کوئی پرچون کی دکان نہیں کھول رکھی جو آپ کو ڈسکاؤنٹ دوں۔“

”آپ تو ناراض ہو رہے ہیں جناب۔“ وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ ”چلیں آپ رعایت نہ کریں لیکن اتنی فیور ضرور دیں کہ مجھ سے چند دن کا ادھار کر لیں۔ میں بہت جلد اس سرٹیفکیٹ کے پیسے آپ کو دے جاؤں گا۔“

فرید احمد کے رویے نے میری کوفت کو جھنجھلاہٹ میں بدل دیا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

”کیا حیدرآباد میں جو وکیل صاحب آپ کا کیس لڑ رہے ہیں ان کے ساتھ بھی آپ قرض ادھار یا ڈسکاؤنٹ کا معاملہ چلا رہے ہیں؟“

”نہیں جناب..... وہ تو بہت ہوشیار بندہ ہے۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔

میں نے ترش انداز میں پوچھا۔ ”تو کیا میں آپ کو بے وقوف دکھائی دیتا ہوں؟“

”یہ بات نہیں ہے جناب۔“ وہ میرے لہجے میں موجود خفگی کو محسوس کر کے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

”اس وکیل نے تو پچھلے ایک سال میں مجھے بالکل ہی خالی کر دیا ہے۔ وہ تو پیسے کے بغیر بات ہی نہیں کرتا۔“

”وہ روزِ اول سے آپ کو بے وقوف بنا رہا ہے۔“

”میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ اور روزِ آخر تک وہ آپ کو الو بناتا رہے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے سائلے نے حیدرآباد میں آپ پر کس قسم کا مقدمہ کر رکھا ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہاں کی کسی عدالت میں دائر مقدمے کے اثر سے آپ کی بیوی کا اکاؤنٹ فریز ہو جائے اور آپ کو اپنی سگی اولاد کا باپ ثابت کرنے کے لیے گارجین... سرٹیفکیٹ کی ضرورت پیش آئے۔ اس معاملے میں شروع سے آخر تک کوئی زبردست نوعیت کا گھپلا ہے۔ بہر حال میں ہر دست آپ کو ایک مشورہ دے سکتا ہوں اور وہ بھی بالکل مفت.....“

اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نمودار ہوئی، میری پیشکش میں گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

MEDICAM

Bleach Cream

Whiteness in 14 days

*No Side Effects



آپ پر!

رہتی ہے۔ تیسرا اور آخری طریقہ یہ ہے کہ سب کچھ بینک کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ صد فیصد قانونی طریقہ بھی یہی ہے۔ بینک متونی کے اکاؤنٹ میں موجود رقم میں سے ایک روپیہ بھی ادھر ادھر نہیں کرتا اور نہ ہی وہ کلیم کرنے والے نیکسٹ ٹوکن کو رقم تھماتا ہے۔ اس کا ایک لیگل پروسیجر ہے۔ بینک اس پروسیجر کو اڈاپٹ کرتا ہے۔ اس طرح متونی کی رقم نیکسٹ ٹوکن کے توسط سے حقیقی وارث تک پہنچ جاتی ہے اور یہ حقیقی وارث نیکسٹ ٹوکن بھی ہو سکتا ہے۔

”جناب! پہلا جھٹکا مجھے اس وقت لگا جب بینک والوں نے مجھے رقم دینے سے انکار کر دیا۔“ فرید نے بتایا۔ ”حالانکہ فارم میں باقاعدہ لکھا ہوا ہے کہ نفیسہ کے انتقال کے بعد اس کی ساری دولت مجھے ملے گی۔“

”جو کچھ اکاؤنٹ اوپننگ فارم میں لکھا ہے وہ بالکل درست ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”بینک والے بھی غلط نہیں کہہ رہے اور آپ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی جناب!“ وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”جب سب کچھ اپنی جگہ ٹھیک ہے تو پھر بینک والوں نے مجھے رقم کیوں نہیں دی؟“

”جب بینک والوں کو پتا چلتا ہے کہ ان کا کوئی اکاؤنٹ ہولڈر چل بسا ہے تو وہ خود ہی اس اکاؤنٹ کو فریز کر دیتے ہیں۔“ میں نے۔ ”لیکن یہ انجما دعارضی ہوتا ہے کچھ عرصے کے بعد بینک بعض قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد اکاؤنٹ میں موجود رقم کو ریلیز کر دیتا ہے۔“

”کس قسم کے قانونی تقاضے؟“ اس نے حیرت بھرے انداز میں استفسار کیا۔

”ان تقاضوں کی تفصیل میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”فی الحال آپ مجھے یہ بتائیں کہ بینک والوں کا مایوس کن جواب سننے کے بعد آپ نے کیا کیا تھا؟“

”میں سیدھا حیدر آباد پہنچ گیا تھا اپنی سسرال۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے ان لوگوں کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔“

”اس کے بعد کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔ ”آپ کی سسرال والوں نے اس پر کیا رد عمل ظاہر کیا؟“

”میری ساس عالیہ تو یہ سب سن کر گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی لیکن میں نے اپنے سالے کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے تھے۔“ فرید نے بتایا۔

میں نے سوال کیا۔ ”آپ کی سسرال میں کُل کتنے

نفیسہ کی موت کا سبب سرطان کا مرض تھا۔ اسے بریسٹ کینسر ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ایسے موذی مرض پر زیادہ ریسرچ نہیں ہوئی تھی اور اس کی تشخیص اسی وقت ہو پاتی تھی جب یہ اپنے شکار کو پوری طرح شکنجے میں جکڑ کے بے بس کر چکا ہوتا تھا۔ خیر، آج بھی دنیا کینسر ریسرچ کے جس مقام پر کھڑی ہے اسے کوئی شافی مقام نہیں کہا جاسکتا۔ مہنگی سے مہنگی ادویات اور دیگر ٹریٹ منٹ تو وضع کر لیے گئے ہیں مگر شافی علاج کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔

انسان چاہے ترقی کی معراج کو چھو لے لیکن انسان کے مختلف گروہوں کے بیچ طبقاتی تفاوت ریل کی دو پٹریوں اور دریا کے دو کناروں کے مانند ہمیشہ متوازی چلتا ہے۔۔۔۔۔

بہمین امیر اور غریب کے حالات و واقعات و معاملات بھی کبھی ایک دوسرے سے لگا نہیں کھاتے!

جب نفیسہ کے کینسر کی تشخیص ہوئی تو یہ عفریت بڑی خاموشی کے ساتھ جگر تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ نفیسہ کا علاج نہ کرایا گیا ہو۔ نفیسہ کے میکے والوں نے اور فرید نے حتی الامکان کوشش کی یہاں تک کہ فرید فلیٹ کو فروخت کر کے کرائے کے مکان میں اسی مقصد سے چلا گیا تھا کہ اپنی بیوی کا مہنگا علاج کروا سکے مگر نفیسہ کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ تین لاکھ روپے بینک میں رکھے رہ گئے اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملی اور..... اب یہی تین لاکھ روپے مرحومہ نفیسہ کے اکاؤنٹ میں فریز پڑے تھے۔

فرید نے مجھے بتایا کہ جب نفیسہ کا اکاؤنٹ کھولا گیا تھا تو ”نیکسٹ ٹوکن“ کے کالم میں اس کا نام لکھا گیا تھا یعنی نفیسہ کے بعد اس کے اکاؤنٹ میں موجود رقم کا وارث فرید تھا پہلے ہی قدم پر اس نے حماقت کا ثبوت دیا۔ نفیسہ کی تجہیز و تکفین سے سننے کے چند روز بعد وہ بینک پہنچ گیا اور وہاں جا کر بتایا کہ اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے لہذا تین لاکھ روپے اس کے حوالے کر دیے جائیں۔

میں نے فرید کی اس حرکت کو ”حماقت“ اس لیے کہا کہ ایسے مواقع پر عقل مند لوگ دو میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ نمبر ایک، اگر کسی بینک اکاؤنٹ ہولڈر کی زندگی کو کوئی سنگین خطرہ لاحق ہو تو احتیاطاً دو تین چیک پر اس کے دستخط کروا لیتے ہیں تاکہ اس کی وفات کے بعد بینک سے پیسے نکلوانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ بینک کو اکاؤنٹ ہولڈر کی موت کی ہوالگائے بغیر وہ کسی ماہر جعل ساز کی مدد سے چیک پر مرحوم کے دستخط بنوا لیتے ہیں۔ اس طرح بینک سے رقم نکلوانے میں آسانی

افراد ہیں؟“

”میری ساس عالیہ اور چھوٹا سالا راشد۔“

”بس یہی دو افراد؟“ میں نے حیرت بھری نظر سے

اس کی طرف دیکھا۔

”وہ بات دراصل یہ ہے..... وکیل صاحب کہ“

..... فرید احمد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میرے سر

محمد اکرم کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی صرف تین

اولادیں تھیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی یعنی میری بیوی

نفیسہ.....“

”ایک منٹ!“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے دو سالے ہیں نا؟“

”جی بالکل۔“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے

بولا۔ ”شاہد اور راشد۔“

”چھوٹے سالے راشد نے تم پر حیدر آباد میں یہ قول

تمہارے کیس کر رکھا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں

جھانکتے ہوئے کہا۔ ”راشد کا ذکر تم دو تین بار کر چکے ہو مگر

شاہد کا کوئی تذکرہ تمہاری زبان پر نہیں آیا۔ اس کا کوئی

خاص سبب؟“

”جی، اس کی ایک خاص وجہ ہے۔“ وہ اثبات میں

گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرا بڑا سالا شاہد ایک بھلا

مانس اور شریف انفس انسان ہے۔ وہ راشد سے بالکل

مختلف مزاج کا مالک ہے۔ شاہد سے مجھے بھی کوئی شکایت

نہیں رہی بلکہ اس مقدمے والے معاملے میں بھی شاہد نے

کبھی کوئی دجپسی نہیں لی۔ وہ شادی شدہ ہے اور اپنے بیوی

بچوں کے ساتھ سکھر میں رہتا ہے۔ وہ بالکل الگ تھلگ

زندگی گزار رہا ہے۔“

فرید نے مجھے بتایا کہ شاہد، نفیسہ مرحومہ سے دو تین

سال بڑا ہے۔ اس کی شادی پندرہ سال پہلے سلمیٰ نامی ایک

عورت سے ہوئی تھی۔ سلمیٰ سے شاہد کی دو اولادیں ہیں۔

تیرہ سالہ ریحان اور دس سالہ فوزیہ۔ شاہد کی والدہ عالیہ

ایک تیز طرار عورت تھی لہذا سلمیٰ کی اپنی ساس کے ساتھ بن

نہ سکی۔ شاہد اپنی ماں کی عادات اور مزاج سے اچھی طرح

آگاہ تھا لہذا وہ الگ ہو گیا تاکہ روز و شب کی ہنگامہ آرائی

سے نجات حاصل ہو۔ شاہد نے سکھر میں ایک چھوٹا سا جنرل

اسٹور کھول رکھا تھا جو اس مختصر سی فیملی کی گزراوقات کے لیے

کافی تھا۔ شاہد بہت کم حیدر آباد کا چکر لگاتا تھا۔

”کیا تمہارا چھوٹا سالا راشد بھی شادی شدہ ہے؟“

اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب! اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔“

”اس کی کیا عمر ہوگی اور وہ کرتا کیا ہے؟“

”وہ کم و بیش پینتیس سال کا ہوگا۔“ فرید نے بتایا۔

”وہ حیدر آباد میں پراپرٹی کا کام کرتا ہے۔ اس نے ایک

اسٹیٹ ایجنسی کھول رکھی ہے۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے

لہجے میں کہا۔ ”آپ نے تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا ہے کہ

جب آپ نے اپنی ساس اور چھوٹے سالے کو حقیقت حال

سے آگاہ کیا تو آپ نے راشد کے چہرے پر عجیب سے

تاثرات دیکھے تھے.....؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ ”کس نوعیت کے عجیب تاثرات؟“

”جیسے وہ میری بات سن کر گہری سوچ میں پڑ گیا

ہو۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”پھر وہ اٹھ کر کھڑا

ہو گیا تھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر یہ کہتے ہوئے گھر سے نکل

گیا تھا..... آپ ایجنسی پر آئیں۔ مجھے آپ سے ضروری

باتیں کرنا ہیں۔“

”تو کیا آپ اپنے سالے کی اسٹیٹ ایجنسی پر گئے

تھے؟“

”جی گیا تھا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے

بولا۔ ”اور جب میں وہاں پہنچا تو راشد نے مجھے بتایا کہ

بینک والوں نے مجھے رقم دینے سے اس لیے انکار کر دیا تھا

کہ اس نے میرے خلاف حیدر آباد کی عدالت میں مقدمہ

دائر کر رکھا ہے۔“

فرید احمد کی بات سن کر میں دل ہی دل میں مسکرا اٹھا

تاہم میں نے اس مسکراہٹ کو اپنے چہرے سے ظاہر نہیں

ہونے دیا کیونکہ یہ بات اس کی اپنی نہیں تھی بلکہ وہ راشد

کے کہے ہوئے الفاظ کو مجھ تک پہنچا رہا تھا اور میں بخوبی سمجھ

رہا تھا کہ راشد نے فرید کی سادگی نمابے وقوفی سے فائدہ اٹھا

کر اسے ایک چکر میں ڈال رکھا تھا۔ میں نے فرید سے

استفسار کیا۔

”کیا راشد نے آپ کو اس مقدمے کی نوعیت کے

بارے میں کچھ بتایا جو بہ قول اس کے اس نے آپ کے

خلاف حیدر آباد کی کسی عدالت میں دائر کر رکھا تھا؟“

”جی، میں نے راشد سے اس بارے میں پوچھا تھا۔“

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”راشد نے

مجھے بتایا کہ نفیسہ کے جس فلیٹ کو فروخت کر کے میں نے تین

لاکھ روپے نفیسہ کے اکاؤنٹ میں جمع کرائے تھے اس رقم پر

گریبان

میرا کوئی حق نہیں بلکہ یہ رقم راشد اور اس کی والدہ عالیہ کو ملنا

چاہیے کیونکہ نفیسہ نے مذکورہ فلیٹ خریدنے کے لیے انہی

سے رقم لی تھی۔“

”حقیقت کیا ہے؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے

پوچھا۔

”حقیقت یہ ہے جناب کہ اس فلیٹ کی خریداری کے

لیے اسی فیصد رقم میری مرحومہ بیوی نفیسہ ہی نے دی تھی۔

اس نے محلے میں ایک بی سی (کمپنی) ڈال رکھی تھی۔ جب

اس کی بی سی نکلی تو اسی وقت نفیسہ نے اپنا تمام زیور بھی

فروخت کر دیا تھا تاکہ ایک فلیٹ خرید سکے۔“ لمحائی توقف

کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو

آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”باقی بیس فیصد رقم میں، میں نے بھی حصہ ڈالا تھا۔

میں جس گارمنٹس اسٹور پر کام کرتا ہوں اس کے سیٹھ سے

میں نے منت خوشامد کر کے کچھ ایڈوانس پکڑ لیا تھا۔ میں یہ

نہیں کہتا کہ اس موقع پر راشد یا عالیہ نے نفیسہ کو کچھ نہیں دیا

ہوگا۔ یقیناً انہوں نے بھی اس کام میں تھوڑے بہت پیسے

ملائے ہوں گے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ اپنی اگلی

کٹوا کر شہیدوں کی فہرست میں شامل ہو جائیں۔ میں راشد

کو یہ رقم ہڑپ نہیں کرنے دوں گا۔“

آخری جملہ اس نے بڑے عزم کے ساتھ ادا کیا تھا۔

میں نے نیم تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”اسی لیے آپ نے

انصاف کے حصول کی خاطر ایک وکیل کر لیا۔“

”جی بالکل۔“ وہ تلخی بھرے لہجے میں بولا۔ ”لیکن

اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ وہ وکیل میرے ساتھ مخلص نہیں

ہے۔“

”میں آپ کے محسوسات کی قدر کرتا ہوں۔ دیر آید،

درست آید“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے

کہا پھر پوچھا۔ ”وکیل کرنے کا مشورہ آپ کو کس نے دیا

تھا؟“

”راشد کی اسٹیٹ ایجنسی پر طفیل نامی ایک بندے

سے میری ملاقات ہوئی تھی۔“ اس نے مجھے بتایا۔ ”طفیل

نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے ایک وکیل

سے ملوادی تھا۔ طفیل کا کہنا یہ تھا کہ جب تک میں عدالت

سے کیس نہیں جیتوں گا، بینک اس رقم میں سے مجھے ایک

روپیہ بھی نہیں دے گا۔ طفیل کی بات میں مجھے وزن نظر آیا

اور میں نے راشد سے نمٹنے کے لیے وکیل کر لیا۔ اصل میں

راشد نے مجھ پر دو طرف سے دباؤ ڈال رکھا تھا۔ ایک تو وہ

یہ کہہ رہا تھا کہ مذکورہ فلیٹ کی خریداری کے لیے انہوں نے

نفیسہ کو رقم دی تھی۔ دوسرے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ نفیسہ کے

علاج پر بھی انہوں نے اچھا خاصا پیسا خرچ کر دیا ہے لہذا یہ

تین لاکھ تو ہر صورت میں انہیں ہی ملنا چاہئیں۔“

بات کے اختتام پر اس کی آواز بھرا گئی۔ ان لمحات

میں مجھے اس کی حالت پر بہت ترس آیا۔ میں راشد کا سارا

کھیل بخوبی سمجھ گیا تھا۔ وہ فرید کو اعصاب اور نفسیات کی مار

مار رہا تھا اور یہ سادہ لوح انسان اس کے شکنجے میں پھنس کر رہ

گیا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا کہ طفیل نامی وہ شخص بھی راشد ہی کا

ایک مہرہ ہے اور جس شخص کو فرید نے اپنا وکیل کر رکھا ہے وہ

بھی راشد کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ مزید تصدیق کی غرض سے

میں نے سوال کیا۔

”کیا تم بھی اپنے وکیل کے ہمراہ حیدر آباد کی اس

عدالت میں پیش ہوئے ہو جہاں یہ مقدمہ دائر ہے؟“

”جی نہیں..... کبھی نہیں۔“ وہ بڑی مصہومیت سے

بولا۔

”وکیل سے تمہاری ملاقات کس طرح ہوتی ہے؟“

میں نے پوچھا۔

”اس کے دفتر میں۔“ اس نے سادگی سے بتایا۔

”میں جب بھی حیدر آباد جاتا ہوں تو سیدھا وکیل کے دفتر جا کر

اس سے ملتا ہوں۔ ہر ملاقات پر وہ کسی نہ کسی بہانے مجھ سے

پیسوں کا مطالبہ کر دیتا ہے اور یقین دلاتا ہے کہ بس آئندہ

پیشی پر اس مقدمے کا فیصلہ میرے حق میں ہو جائے گا۔“

”جب ایک سال سے بھی آپ عدالت میں پیش ہی

نہیں ہوئے تو پھر کیا گزشتہ پیشی، کیا موجودہ پیشی اور کیا

آئندہ پیشی فرید صاحب!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”آپ کے وکیل کا نام کیا ہے اور حیدر آباد میں اس کا دفتر

کہاں پر واقع ہے؟“

”انعام درانی۔“ اس نے وکیل کا نام بتایا پھر اس کا

ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر بھی مجھے نوٹ کروا دیا۔

”میں اپنے ذرائع استعمال کر کے انعام درانی کی

اور خاص طور پر آپ کے کیس کی حقیقت جاننے کی کوشش

کروں گا۔“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”لیکن

میری ایک بات آپ ابھی سے ذہن نشین کر لیں کہ آپ کا

کیس حیدر آباد کی کسی عدالت بلکہ پاکستان کی کسی عدالت

میں بھی دائر نہیں ہے۔ انعام درانی اور راشد میں ملی بھگت

ہے۔ یہ دونوں مل کر آپ کو لوٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے.....!“ وہ ہکا بکا ہو کر مجھے

نکٹے لگا۔ ”اگر میرے خلاف راشد نے کوئی مقدمہ دائر ہی نہیں کر رکھا تو پھر بینک والوں نے تین لاکھ کی رقم کیوں فریز کر دی؟ انعام درانی کس مقدمے میں میرے لیے وکیل صفائی کا کردار ادا کر رہا ہے؟ آپ نے کہا کہ انعام درانی اور راشد دونوں مل کر مجھے لوٹ رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انعام درانی گا ہے بے گاہے مجھ سے پیسے لیتا رہتا ہے مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ راشد کس طرح مجھے لوٹ رہا ہے.....؟“

”آپ نے ایک ہی سانس میں بہت سارے سوالات کر ڈالے ہیں۔ خیر..... میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا مگر الگ الگ سانس میں.....“ چند لمحات کا توقف کر کے میں نے گہری نظر سے، فرید کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیا پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جہاں تک بینک والوں کا مرحومہ نفیسہ کے اکاؤنٹ میں موجود تین لاکھ کی رقم کو فریز کرنے کا معاملہ ہے تو اس کا کہیں بھی دائر کسی مقدمے سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ آپ نے ”آئیل مجھے مار“ کے مصداق خود بینک جا کر انہیں بتا دیا کہ آپ کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے لہذا انہوں نے بینکاری کے قوانین کے مطابق آپ کی مرحومہ بیوی کا اکاؤنٹ منجمد کر دیا جواب ایک مخصوص لیگل پروسیجر کے بعد ہی ریلیز ہو سکے گا۔ یہ تو ہو گیا آپ کے پہلے سوال کا جواب۔ آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ.....“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”انعام درانی کسی بھی مقدمے میں آپ کے لیے وکیل صفائی کا کردار ادا نہیں کر رہا۔ وہ محض آپ کو الو بتا رہا ہے تاکہ ہر ملاقات پر ایک نئی کہانی سنا کر وہ آپ سے کچھ رقم اینٹھ سکے اور یہ سب کچھ وہ آپ کے چھوٹے سالے راشد کے ایما پر کر رہا ہے اور جہاں تک ان دونوں کے مل کر آپ کو لوٹنے کا معاملہ ہے تو انعام درانی کی لوٹ مار تو آپ کے علم میں ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ انعام درانی کے ذریعے راشد آپ کو ایک ایسے مقام پر لانا چاہتا ہے جہاں آپ اس کی مرضی کے مطابق کسی راضی نامے پر تیار ہو جائیں اور.....“

”راضی نامہ.....!“ اس نے قطع کلامی کی پھر چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”پچھلی ملاقات پر انعام درانی نے ایسی کوئی بات کی تھی.....!“

اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ ”کیسی بات.....؟“

”انعام درانی نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ مقدمات و قدمات میں کچھ نہیں رکھا۔ بہتر یہی ہے کہ اس سلسلے میں سمجھوتے کی کوئی راہ نکالی جائے۔“ فرید نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

”کیسا سمجھوتا؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”وہ کہہ رہا تھا کہ اگر میں راضی ہوں تو وہ اپنے ذرائع سے راشد سے بات کرے گا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”کچھ دے دلا کر اگر راضی نامہ ہو جاتا ہے تو یہ عقل مندی کا فیصلہ ہو گا۔“

”پہلی بات تو یہ کہ یہ امر پایڈ ثبوت کو پہنچ گیا کہ آپ کے خلاف حیدر آباد کی کسی عدالت میں کوئی بھی مقدمہ دائر نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ میرا یہ شک یقین میں بدل گیا ہے کہ راشد اور انعام درانی کے بیچ بڑا خطرناک گٹھ جوڑ ہے۔ وہ دونوں اپنے اپنے محاذ پر کھڑے ہو کر آپ کے خلاف ایک ایسی جنگ لڑ رہے ہیں جس میں وہ بالآخر آپ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے۔“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر پوچھا۔ ”کیا انعام درانی نے آپ کو کچھ دینے دلائے؟“ کی کوئی تفصیل بھی بتائی تھی؟“

”جی بالکل بتائی تھی۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس نے کہا تھا کہ بینک والے تین لاکھ میں سے اگر میں آدھی رقم یعنی ڈیڑھ لاکھ روپے راشد کو دینے پر تیار ہو جاؤں تو راشد کیس واپس لے لے گا۔ اس کے بعد مجھے کراچی کی متعلقہ عدالت میں ایک معمولی سی قانونی کارروائی کرنا ہوگی۔ پھر بینک وہ تین لاکھ میرے حوالے کر دے گا۔“

میں انعام درانی اور راشد کے اتحاد کا مقصد اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ فرید کی شکل میں انہیں ایک آسان شکار میسر آ گیا تھا جسے وہ بڑی مہارت اور فن کاری سے ذبح کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں نے فرید کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”پھر آپ نے انعام درانی کو کیا جواب دیا؟“

”میں نے کہا کہ سوچ کر بتاؤں گا۔“

”یہ آپ نے بہت عقل مندی کی بات کی ہے۔“

میں نے ستائشی انداز میں کہا۔ ”اب آپ نے اس ”سوچ کر“ بتانے کو طویل کرنا ہے۔ انعام درانی جب بھی پوچھے کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ تو آپ کا جواب ہونا چاہیے،

گریبان

میں بہت جلد آپ کو سوچ کر بتاتا ہوں۔ آپ اسے خوش امیدی کے جھولے میں بٹھائے رکھیں۔ اس دوران میں مجھے اپنا کام کرنے کا موقع مل جائے گا۔“

”کون سا کام وکیل صاحب؟“ وہ ہونقوں کے مانند منہ کھول کر مستفسر ہوا۔

”آپ کو بینک میں پڑے تین لاکھ کوریلیز کروانا ہے یا نہیں؟“

”بالکل کروانا ہے جناب۔“ وہ بڑے جوش سے بولا۔ ”اسی مقصد کو پانے کے لیے تو میں پچھلے ایک سال سے تکلیف اٹھا رہا ہوں۔“

”بس تو پھر سمجھ لو کہ میرا کام بھی یہی ہے کہ بینک والی رقم کو آزاد کرادوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس مقصد کی خاطر میں کل ہی متعلقہ عدالت میں ایک زبردست قسم کی درخواست لگا تا ہوں۔“

”یہاں کراچی میں.....؟“ وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”آپ کی مرحومہ بیوی کا بینک کہاں واقع ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کراچی میں۔“ اس نے جواب دیا۔

”بس تو پھر آپ حیدر آباد کو بھول جائیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”حیدر آباد میں جو بھی من گھڑت کہانیاں چل رہی ہیں، وہ محض آپ کو بے وقوف بنا کر ڈیڑھ لاکھ روپے ہتھیانے کے لیے ہیں اور اس کمزورہ مشن میں آپ کا چھوٹا سالادار آپ کا وکیل ایک ہی مقصد لے کر چل رہے ہیں۔ تین لاکھ کے حصول کے لیے جو بھی قانونی کارروائی ہوگی وہ کراچی کی عدالت میں ہوگی اور اس کا ایک مختصر سائیکل پروسیجر ہے۔ اس عمل سے گزرنا بہت ضروری ہے تاکہ متونی کا ترکہ اصل حق داروں تک پہنچ سکے۔ ہمارے ملک کے قوانین میں اس کا باقاعدہ ایک لائحہ عمل بنا ہوا ہے۔“

”وراثت کے اصل حق داروں سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ وہ ابھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا نفیسہ کے ترکے کا حقیقی وارث میں نہیں ہوں؟“

”ایک حد تک آپ بھی ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس سلسلے میں عدالت وراثت کی تقسیم یا تحویل احکام قرآن کی روشنی میں کرتی ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ النساء میں اس کی پوری تفصیل درج

”وکیل صاحب! میں نے قرآن کو کبھی ترجمے کے ساتھ نہیں پڑھا، اس لیے میں اس تفصیل سے آگاہ نہیں ہوں۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”کیا آپ مجھے اس بارے میں کچھ بتائیں گے!“

قارئین متوجہ ہوں



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچائیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں اذکارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیاب نہ ہو۔
- ☆ شہر اور علاقے کا نام۔
- ☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

شمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپینس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C فیروز ٹیکسٹائٹ ہاؤسنگ اتھارٹی، کوئٹہ روڈ، کوئٹہ

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

”یہ صرف آپ کا نہیں بلکہ پچانوے فیصد مسلمانوں کا بھی مسئلہ ہے کہ انہوں نے کبھی قرآن کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔“ میں نے افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس بات میں کوئی شک نہیں، قرآن مجید کی عربی عبارت کو پڑھنا بھی بہت اجر و ثواب کا کام ہے لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ اگر مسلمان یہ بھی سمجھ جائیں کہ کائنات کی سب سے عظیم المرتبت اس کتاب قرآن مجید میں اللہ نے کیا فرمایا ہے۔ اصول یہ ہے کہ کہنے والے کی بات اگر سمجھ میں آجائے تو اس پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے لیکن بد قسمتی سے بہت کم لوگوں کو اس بات کی پروا ہے کہ احکام خداوندی سے شتاسائی حاصل کی جائے اور اس دوڑ میں جاہل آن پڑھ سے لے کر بڑے بڑے اعلیٰ تعلیم یافتہ بی ایچ ڈی افراد بھی شامل ہیں۔ دنیاوی علوم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہم ہر راستہ، ہر ذریعہ اختیار کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتتے اور جہاں بھی دین کا معاملہ آجائے تو اس کام کے لیے ہم نے سب کچھ مولوی صاحب پر چھوڑ رکھا ہے۔ اللہ ہم سب کو عقل سلیم عطا فرمائے کیونکہ اس وقت ہم بہت نازک دور سے گزر رہے ہیں۔“

”وکیل صاحب! میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔“ وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھے وراثت کی تقسیم کے حوالے سے احکام اللہ کے بارے میں کچھ بتائیں۔“

”پوری تفصیل بتانا تو ممکن نہیں ہوگا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ کا کیس جہاں ٹچ ہوتا ہے، وہ بتا دیتا ہوں۔“

”جی بہت شکریہ۔“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

”قرآن مجید کی سورۃ النساء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے.....“ اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا، اگر وہ بے اولاد ہوں تو ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں تر کے کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے۔ یہ تقسیم وصیت کی تعمیل کے بعد (جو متوفی نے کر رکھی ہو اور اس قرض کی ادائی کے بعد جو اس کے ذمے ہو) کی جائے گی۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”اور اس کے برعکس اگر آپ کا انتقال ہو جائے تو ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق.....“

”چاہے تمہاری ایک بیوی ہو یا ایک سے زائد بیویاں ہوں وہ تمہارے تر کے میں مجموعی طور پر ایک چوتھائی کی حق دار ہوں گی، اگر تم بے اولاد ہو تو، ورنہ صاحب اولاد ہونے کی

صورت میں ان کا حصہ مجموعی طور پر آٹھواں ہوگا اور یہ تقسیم اس وصیت کی تعمیل کے بعد کی جائے گی جو تم نے کر رکھی ہو اور اس قرض کو ادا کرنے کے بعد جو تم نے لے رکھا ہو۔“

”سبحان اللہ!“ وہ جھوم اٹھا۔ ”اللہ تعالیٰ نے کتنی آسانی سے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔“

”اللہ پاک کے کام ایسے ہی ہیں۔ وہ اپنے بندوں کے لیے آسانیاں فراہم کرتا ہے اگر کوئی سمجھنا چاہے تو.....“

میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف ہے اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔“

”بے شک!“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ”بیوی کی وراثت کی تقسیم کا مسئلہ تو میری سمجھ میں آ گیا۔ یہ بتائیں، کیا شوہر کے تر کے میں بیوی بچوں کے علاوہ اس کے والدین یا بہن بھائیوں کا حصہ بھی ہوتا ہے؟“

”ایک بات ذہن میں رکھ لیں کہ تقسیم وراثت کی کسی بھی صورت میں اولاد کے حوالے سے مرد لڑکے کا حصہ دو عورتوں/لڑکیوں کے برابر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر میت کی وارث دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انہیں کل تر کے کا دو تہائی دیا جائے گا اور اگر صرف ایک ہی لڑکی ہو تو اسے کل تر کے کا نصف دیا جائے گا۔ اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو کل تر کے کا چھٹا حصہ ملے گا یعنی ماں کا بھی چھٹا حصہ اور باپ کا بھی چھٹا حصہ اور اگر میت بے اولاد ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو کل تر کے میں سے ایک تہائی ماں کا حصہ اور ایک تہائی باپ کا حصہ اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو پھر ماں چھٹے حصے کی حق دار ہوگی اور یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے جب میت کی وصیت کی تعمیل کر دی جائے اور اس کے ذمے جو قرض ہے وہ ادا کر دیا جائے.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک طویل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”آج کل چونکہ وراثتی معاملات عدالت کے ذریعے بھی دیکھے جا رہے ہیں لہذا ہر فیصلہ احکام قرآن مجید کی روشنی میں کیا جاتا ہے اور کسی بھی مرحلے پر اللہ کے فرمان کی خلاف ورزی نہیں کی جاتی۔ تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔“

”جی، میں سمجھ گیا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن وصیت کی تعمیل اور قرض کی ادائی والا

معاملہ میرے ذہن کو الجھا رہا ہے۔“

”اس میں الجھن والی کون سی بات ہے۔“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا تمہاری مرحومہ بیوی نے اپنی میراث کے حوالے سے کوئی وصیت کر رکھی تھی؟“

اس نے نفی میں جواب دیا۔ ”نہیں جناب، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

”کیا مرحومہ نفیسہ پر کسی قسم کا کوئی قرض وغیرہ تھا؟“ میں نے فرید سے استفسار کیا۔

اس نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے کہا۔ ”پھر ان دونوں شرائط کا اطلاق مرحومہ نفیسہ کی میراث کی تقسیم پر نہیں ہوتا۔ جس میت نے اپنی میراث کے حوالے سے کوئی وصیت کر رکھی ہو تو پہلے اس وصیت کی تعمیل ضروری ہے۔ اسی طرح اگر میت نے کوئی قرض لے رکھا ہو تو اس قرض کی ادائی ضروری ہے۔ اس کے بعد جو تر کہ باقی بچے گا اس کی تقسیم احکام قرآن مجید کے مطابق کی جائے گی بلکہ اگر یہ تقسیم میراث کسی عدالت کے توسط سے ہو رہی ہو تو اس سلسلے میں عدالتی اخراجات کو بھی میت کے تر کے میں سے منہا کیا جائے گا۔ اس کے بعد باقی بچ رہنے والے تر کے کو تقسیم کیا جائے گا۔ اگر وراثت کے حق داروں میں نابالغ بچے اور بچیاں ہوں جیسا کہ آپ کی چاروں بچیاں ہیں تو پھر عدالت ان کا حصہ کسی ایسی اسکیم میں لگانے کی ہدایت کرے گی جہاں سرمایہ محفوظ رہے اور اس رقم پر ماہانہ یا سہ ماہی یا سالانہ منافع ملتا رہے۔ یہ منافع وہ شخص حاصل کرے گا جو ان نابالغ بچوں کی نگہداشت پر مامور ہوگا پھر جب یہ بچے سن بلوغت کو پہنچ جائیں گے تو ان کا حصہ ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

”زبردست..... بہت خوب.....“ وہ سر اٹھانے والے انداز میں بولا۔ ”اللہ کا نظام کتنا درست، مکمل اور مفید ہے۔“

میں نے نکالت نامے اور چند دیگر ضروری کاغذات پر فرید کے دستخط لیے اور اسے ہدایت کی۔ ”جب تک میں نہ کہوں، آپ حیدر آباد کا رخ نہیں کریں گے اور اگر وہاں جانا ناگزیر ہو تو آپ انعام درانی یا راشد یا عالیہ سے ہرگز ملاقات نہیں کریں گے۔“

”ٹھیک ہے جناب! میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا۔“ وہ فرماں برداری سے بولا پھر پوچھا۔ ”اگر میرا وکیل مجھ سے فون پر رابطہ کرے اور مجھے حیدر آباد

بلائے تو پھر میں کیا کروں؟“

”کون آپ کا وکیل؟“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ گڑبڑا گیا اور بولا۔ ”انعام درانی.....“

”انعام درانی نہیں، اب میں آپ کا وکیل ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور آپ کا کیس حیدر آباد میں نہیں بلکہ کراچی میں ہے چنانچہ اس کیس کے حوالے سے حیدر آباد جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر.....“ میں نے چند لمحات کے لیے توقف کیا پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

”اگر انعام درانی کا فون آئے تو آپ نارمل انداز میں ایڈیز کریں اور اسے اسی خوش فہمی میں مبتلا رکھیں کہ آپ کو اس پر کامل بھروسہ ہے اور آپ بہت جلد اس سے ملاقات کرنے حیدر آباد آنے والے ہیں۔ علاوہ ازیں، اسے یہ بھی بتائیں کہ آپ اس کی تجویز نما پیشکش پر بھی غور و فکر کر رہے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا.....؟“

”جی، میں بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ وہ بیزار سے بولا۔ ”اور مجھے شدید غصہ بھی آرہا ہے۔“

”غصہ.....“ میں نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ کو کس پر غصہ آرہا ہے؟“

”ان دونوں بد معاشوں پر“ وہ دانت کچکپاتے ہوئے بولا۔ ”دل چاہتا ہے، میں ابھی حیدر آباد جاؤں اور اپنے ہاتھوں سے راشد اور انعام کا گلا بادلوں.....“

ان دونوں افراد کے لیے فرید کے دل و دماغ میں پوشیدہ نفرت کو میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ جب سے اسے ان کی اصلیت کا علم ہوا تھا، اس کے اندر ایک سمندری طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا لیکن یہ وقت جوش میں آنے کا نہیں بلکہ ہوش میں رہنے کا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

”فرض کریں، آپ نے اپنے دل کی خواہش پر عمل کرتے ہوئے ان دونوں کا گلا دبا دیا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟“

”ہونا کیا ہے جناب۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”وہ دونوں جہنم واصل ہو جائیں گے..... خس کم، جہاں پاک!“

”خس کم، جہاں پاک..... والی بات پر تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن.....!“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ سرسراتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔ ”لیکن کیا وکیل صاحب؟“

”لیکن یہ کہ.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وضاحت کر دی۔ ”ان دونوں کے قتل کے الزام میں آپ ایک طویل عرصے کے لیے جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے چلے جائیں گے۔ ایک لمحہ..... صرف ایک لمحہ کے لیے یہ سوچیں کہ اگر آپ کو جیل ہوگئی تو آپ کی چاروں بیٹیوں کا کیا ہوگا، وہ بیٹیاں جن کی عمریں آٹھ سے دو سال کے درمیان ہیں اور وہ ماں کی محبت سے بھی محروم ہیں۔ اگر آپ نے ان کے سر سے باپ کی شفقت کا سائبان بھی کھینچ لیا تو ان کا جو حشر ہوگا اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

اس نے ایک جھرجھری لی اور سر اسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔ مجھے ایسی حماقت نہیں کرنا چاہیے۔ نفیہ کی موت کے بعد میری بیٹیاں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہیں، خاص طور پر سب سے چھوٹی بیٹی مسکان کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ اگر مجھے طویل سزا ہوگئی تو.....“

بولتے بولتے وہ رک گیا اور ہمدردی طلب نگاہ سے مجھے تنکے لگا۔ میں نے اس کی تشویش رفع کرنے کی غرض سے کہا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے فرید صاحب! آپ صرف اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھیں اور میں نے تھوڑی دیر پہلے جن چیزوں کی تاکید کی ہے، ان پر ہر حال میں آپ کو عمل کرنا ہے۔ بانی اللہ خیر کرے گا۔ آپ کا کیس سیدھا سادہ ہے۔ میں بینک میں پڑے ہوئے تین لاکھ روپے کی ریکوری کے لیے عدالت میں درخواست لگا رہا ہوں۔ جب عدالتی پروسیجر مکمل ہو جائے گا تو از روئے قانون تقسیم وراثت وہ رقم آپ کو مل جائے گی۔“

اس کے چہرے اور آنکھوں سے اطمینان جھلکنے لگا۔ وہ چند لمحات تک عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ”اس کیس میں آپ کی فیس کیا ہوگی؟“

”میں آپ سے پوری فیس لوں گا مگر آپ کے حالات کے پیش نظر میں نے اپنے اصول میں تھوڑی تبدیلی کر لی ہے۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

”کیسی تبدیلی وکیل صاحب؟“ اس کی آنکھوں میں الجھن نمودار ہوئی۔

”میں اپنی فیس اس کیس کے اختتام پر لوں گا یعنی

کیس جیتنے کے بعد۔“ میں نے کہا۔ ”اور کیس تو ہم لازمی جیتیں گے جب بینک والی رقم آپ کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جائے گی تو پھر میں فیس بھی لے لوں گا۔ بس، میں اس سے زیادہ طویل ادھار نہیں کر سکتا۔“

”میرے لیے یہ بھی بہت ہے جناب۔“ وہ جذبات سے لبریز آواز میں بولا۔ ”یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔ آپ نے میری بچیوں پر ترس کھایا۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ میں تو آپ کے حق میں صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔“

”ایک انسان کسی دوسرے انسان کو جو سب سے انمول تحفہ دے سکتا ہے وہ پر خلوص دعا ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کی دعائیں ضرور رنگ لائیں گی۔“

وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

گہمی بات یہ ہے کہ میں نے شروع ہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ فرید کا کیس میں فیس وصول کیے بغیر ہی لڑوں گا اور میں ایسا ہی کرنے والا تھا۔ فیس والی بات میں نے اس سے اس لیے کی تھی کہ اس کی خودداری کو ٹھیس نہ پہنچے۔ وہ بے چارہ اندرونی اور بیرونی طور پر برے حالات میں پھنسا ہوا تھا۔ اس موقع پر واقعاً اسے کسی مخلص انسان کے تعاون کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

میراث کی تقسیم کے معاملات کو لوگ عموماً گھری میں نمٹا لیا کرتے ہیں لیکن اگر میت اپنے پیچھے کوئی چھوٹی یا بڑی رقم چھوڑ جائے اور یہ رقم کسی بینک میں پڑی ہو تو پھر عدالت سے رجوع کیے بغیر مذکورہ رقم کو واگزار نہیں کیا جاسکتا۔ بینک کو تو جیسے ہی خبر ہوتی ہے کہ اس کا اکاؤنٹ ہولڈر چل بسا، وہ پہلی فرصت میں اس اکاؤنٹ کو فریز کر دیتا ہے۔ تب ایسی رقم کی وصولیابی کے لیے ایک مخصوص عدالتی پروسیجر کرنا پڑتا ہے اور عدالت قرآن مجید میں موجود خدائی احکام کی روشنی میں فیصلہ کرتی ہے۔

اس مقصد کے لیے عدالت میں ایک خاص شعبہ ہوتا ہے جو کسی سیشن جج یا مجسٹریٹ کی نگرانی میں اس نوعیت کے معاملات کو دیکھتا ہے۔ کسی میت کی بینک میں رکھی گئی رقم کو واگزار کرانے کے لیے اس شعبے میں درخواست دی جاتی ہے۔ جج یا مجسٹریٹ جو کہ عہدے کے لحاظ سے ”ناظر“ کہلاتا ہے اس کا اپنا ایک عدالتی اکاؤنٹ ہوتا ہے۔ ناظر اپنے قانونی اختیارات استعمال کر کے بینک میں موجود رقم کو اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کراتا ہے۔ اس کے بعد مذکورہ وراثت سے متعلق تمام حق داروں کو اپنے پاس بلاتا ہے اور

گریبان

از روئے قانون میراث وہ حق دار کا حصہ اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں ضروری کاغذی کارروائی بھی کی جاتی ہے تاکہ سند رہے اور بہ وقت ضرورت کام آئے۔

اگلے روز میں نے اپنی وکالت میں فرید احمد کی جانب سے ناظر کی عدالت میں ایک درخواست لگا دی۔ چند ہی روز میں عدالت نے تمام متعلقہ افراد کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دے دیا۔ اس نوعیت کے مقدمات زیادہ طوالت کا شکار نہیں ہوتے۔ مجھے امید تھی کہ دو یا تین بیٹیوں میں ناظر اس کام کو بہ طریق احسن نمٹا دے گا۔ میں نے فرید احمد کے معاملے کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا تھا۔

تین لاکھ کی رقم کا کیس ناظر کی عدالت میں چل رہا تھا۔ اس دوران میں ایک روز فرید احمد میرے پاس آیا۔ میں نے فوراً اسے اپنے چیمبر میں بلا لیا۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات دیکھ کر میں نے پوچھا۔

”سب خیریت تو ہے نا؟“

میرے سوال کا جواب دینے کے بعد الٹا اس نے مجھ سے استفسار کیا۔ ”وکیل صاحب! میں یہ کیس جیت جاؤں گا نا..... مطلب، تین لاکھ کی رقم مجھے مل جائے گی.....؟“

”عدالت کی اب تک کی کارروائی آپ کے سامنے ہے۔“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”ایک آدھ پیشی میں یہ کیس نمٹ جائے گا۔ عدالت آپ کا حصہ آپ کے حوالے کر دے گی اور آپ کی بیٹیوں کے حصے کی رقم کو فلکسڈ ڈیپازٹ کر کے آپ کو اس کا نگران مقرر کر دے گی۔ پھر جیسے جیسے آپ کی بیٹیاں سن بلوغت کو پہنچتی جائیں گی، ان کا حصہ ان کے حوالے کیا جاتا رہے گا۔ اس دوران میں فلکسڈ ڈیپازٹ سے جو منافع حاصل ہوگا اسے آپ اپنی بیٹیوں کی تنہداشت پر خرچ کرنے کے مجاز ہوں گے۔ یہ ساری باتیں میں آپ کو پہلے بھی دو تین بار سمجھا چکا ہوں۔“

”جی..... آپ کی باتیں مجھے اچھی طرح یاد ہیں.....“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”پھر کیا پریشانی ہے؟ آپ چہرے سے خاصے فکر مند دکھائی دیتے ہیں۔“

لحاتی تذبذب کے بعد اس نے پوچھا۔ ”کیا میں اس بات کا اطمینان رکھوں کہ ادھر حیدر آباد میں راشد نے کوئی مقدمہ دائر نہیں کر رکھا.....!“

فرید کے اس احقناہ سوال پر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے غصے کا اظہار کیا اور نہ ہی اسے ”احق“ کا

ایوارڈ دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا آپ کو اس بات میں کوئی شک ہے کہ کراچی کی ایک عدالت میں، میری وکالت کے ساتھ آپ کا مقدمہ چل رہا ہے؟“

”کوئی شک نہیں جناب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو خود اپنی بیٹیوں کے ہمراہ ناظر کی عدالت میں پیش ہو چکا ہوں۔“

”تو آپ کو ایسا لگتا ہے کہ ناظر کی عدالت میں اب تک جو قانونی کارروائی ہوئی ہے وہ کوئی بھیا تک مذاق ہے..... ایک دھوکا ہے..... ایک سراب ہے.....؟“ میں نے قدرے نفی بھرے انداز میں سوال کیا۔

”ہرگز نہیں وکیل صاحب!“ وہ خجالت آمیز انداز میں بولا۔ ”یہاں کی ساری عدالتی کارروائی میرے علم میں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مرحومہ نفیہ کے اکاؤنٹ والے تین لاکھ روپے ناظر کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو چکے ہیں.....“

”تو پھر مسئلہ کیا ہے؟“ اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے سوال داغ دیا۔ ”جب سارے حقائق آپ کے سامنے ہیں تو پھر آپ اتنے فکر مند کیوں ہو رہے ہیں۔ اول تو حیدر آباد میں راشد نے آپ کے خلاف کسی بھی قسم کا کوئی مقدمہ دائر نہیں کر رکھا۔ دوم اگر بہ فرض محال ایسا کچھ ہے بھی تو آپ کی بلا سے۔ اگر راشد نے اپنی مرحومہ بہن کے تین لاکھ روپے کو کسی بھی عدالتی کارروائی کے ذریعے فریز کر لیا ہوتا تو پھر آپ کی درخواست پر ناظر متحرک نہ ہوا ہوتا اور ناظر کے حکم پر بینک نے تین لاکھ روپے ناظر کے اکاؤنٹ میں چپ چاپ منتقل نہ کیے ہوتے۔ اس واضح اور سادہ سی حقیقت کو آپ کا ذہن قبول کرنے سے کیوں قاصر ہے؟“

”میں سب سمجھ رہا ہوں جناب۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”کل انعام درانی کا فون آیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”کیا کہہ رہا تھا وہ فراڈ یا وکیل؟“ میں نے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

انعام درانی کے لیے میں نے ”فراڈ یا وکیل“ کے الفاظ اس لیے استعمال کیے ہیں کہ اس کا کردار آپ کے سامنے ہے۔ وہ راشد کے ساتھ مل کر فرید احمد کو ذبح کرنے

کی تنگ و دو میں لگا ہوا تھا۔ میں نے اپنے طور پر بھی انعام درانی کے بارے میں اچھی خاصی تحقیق کر لی تھی۔ حیدر آباد کی عدالتوں میں اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ اپنی اسی نوعیت کی غیر نصابی سرگرمیوں کے باعث وہ خاصا بدنام تھا۔ سنجیدہ اور معتبر و کلا سے منہ نہیں لگاتے تھے۔ میں نے گزشتہ چند روز کی کوشش سے انعام درانی کے خلاف بعض ایسے ثبوت بھی اکٹھا کر لیے تھے جو بہ وقت ضرورت اسے نمونہ عبرت بنانے کے لیے استعمال کیے جاسکتے تھے۔ انعام درانی کا شمار ان نام نہاد و کلا میں ہوتا تھا جو ساری زندگی نقل کر کے پاس ہوئے ہوں یا پھر انہوں نے ڈگریاں خریدی ہوں۔ کالی بھیڑیں ہر جگہ میں موجود ہوتی ہیں۔ انعام درانی ہمارے پیشے کی کالی بھیڑ تھا..... بلیک شیپ!

”اس نے مجھے حیدر آباد بلایا ہے۔“ فرید نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”وہ آپ کو کیوں بلا رہا ہے؟“

”کہہ رہا تھا، اگر میں نے راشد کے ساتھ مصالحت کی کوشش نہیں کی تو اگلی پیشی پر حیدر آباد کی عدالت میرے خلاف فیصلہ دے دی گی۔ عدالت کے اس فیصلے کے بعد مجھے تین لاکھ کی رقم سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ ابھی تو راشد فنی فنی کے فارمولے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہے لیکن اگر میں اس ڈیل کے لیے راضی نہ ہوا تو راشد نے ایسے ثبوت عدالت میں جمع کر رکھے ہیں جن کی روشنی میں عدالت اس کے حق میں فیصلہ دے دے گی اور بینک والے تین لاکھ راشد کو دے دیے جائیں گے۔“

”بکواس کرتا ہے انعام درانی.....“ میں نے فرید کے خاموش ہونے پر زہر خند لہجے میں کہا۔ ”اگر راشد نے واقعتاً کسی عدالت میں ایسے ثبوت جمع کر رکھے ہیں جو اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ آپ کی مرحوم بیوی نفیسہ نے ماضی میں وہ فلیٹ راشد یا عالیہ کی دی ہوئی رقم سے خریدا تھا تو پھر یہ بازی صد فیصد راشد کے ہاتھ میں ہے۔ اس صورت حال میں وہ آدھی رقم آپ کو دینے کے لیے کیوں مراجارہا ہے؟“

”میں نے یہ سوال انعام درانی سے کیا تھا۔“ وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”پھر اس نے کیا جواب دیا؟“

”وہ کہتا ہے، راشد کو اپنی بھانجیوں کا بہت احساس ہے۔“ فرید نے بتایا۔ ”اسی نیک مقصد کے لیے وہ آدھی رقم پر سمجھوتا کرنے کو تیار ہے تاکہ اسے بھی کچھ رقم مل جائے

اور میری بیٹیوں کی بھی حق تلفی نہ ہو۔“

”بکواس پر بکواس۔ آپ کا وکیل دروغ گوئے اعظم ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”جناب! میرے وکیل تو آپ ہیں!“ وہ بڑی معصومیت سے بولا۔

”میرا مطلب تھا کہ آپ کا سابق وکیل انعام درانی۔“ میں نے تھج کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر انعام درانی کی بات کو بہ فرض محال چند سیکنڈ کے لیے درست بھی مان لیا جائے اور اس امر کا یقین کر لیا جائے کہ راشد کے دل میں اپنی بھانجیوں یعنی آپ کی چار بیٹیوں کے لیے محبت کے دریا رواں دواں ہیں تو پھر منطقی طور پر اسے عدالت کا رخ کرنے کے بجائے آپ سے بات کرنا چاہیے تھی۔ آپ کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ راشد کو آپ سے یا اپنی بہن کی بیٹیوں سے کسی قسم کی کوئی ہمدردی نہیں اور وہ بہ ذریعہ عدالت، بہ زور قانون آپ کی رقم کو ہتھیانے کا منصوبہ بنائے بیٹھا ہے۔ یہ میں انعام درانی کے بیان کی روشنی میں کہہ رہا ہوں ورنہ حقیقت وہی ہے جو میں نے ابتدا ہی میں آپ کو بتادی تھی۔“

”جی، مجھے آپ کی بات پر پورا بھروسہ ہے وکیل صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ”آپ نے انعام درانی کو کیا جواب دیا ہے؟“

”میں نے کہا ہے کہ سوچ کر بتاتا ہوں۔“

”آپ نے بالکل مناسب جواب دیا ہے۔“ میں نے سر اپنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اب انعام درانی چار دن تو آپ کے سوچنے کا انتظار کر لے گا۔ اس کے بعد قیل اس کے کہ اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھے، آپ خود اسے فون کریں اور بتائیں کہ ہفتہ دس دن کے بعد آپ معاملات طے کرنے حیدر آباد آرہے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“

”جی وکیل صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ آپ لگ بھگ پندرہ دن کا وقت کیوں لے رہے ہیں.....!“

”اس کا ایک خاص سبب ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ ”کیا آپ مجھے اس سبب کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟“

گریبان

”ضرور بتاؤں گا لیکن سر درست نہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”مگر آپ سے میرا یہ وعدہ ہے کہ پندرہ دن سے پہلے ہی میں آپ کو کچھ نہیں بلکہ سب کچھ بتا دوں گا۔“

اس نے اصرار نہیں کیا اور تھوڑی دیر مزید میرے پاس بیٹھنے کے بعد، مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

میں نے ایک خاص مقصد کے تحت فرید احمد کو کم دیش دو ہفتے کے لیے خاموشی اختیار کرنے کو کہا تھا۔ یہ کوئی مخصوص نوعیت کا چلہ یا وظیفہ نہیں تھا۔ انسان کو پہلے اپنے حصے کا کام سرانجام دینا چاہیے، اس کے بعد کسی غیبی مدد کی طرف نگاہ لگانا چاہیے۔ سیدھی سی بات ہے۔ آپ پوری محنت اور تیاری کے ساتھ پرچہ دینے کمرائے امتحان میں پہنچیں اور مکمل دیانت داری کے ساتھ اپنا پرچہ حل کریں۔ اس کے بعد گھر آ کر آپ اے گریڈ یا اے دن گریڈ کے لیے دعا کریں تو یہ عمل آپ کو زیب دیتا ہے۔

میں نے فرید احمد کو پندرہ دن اس لیے صبر کرنے کو کہا تھا کہ میرے اندازے کے مطابق اس سے پہلے ہی ناظر کی عدالت سے فرید کے حق میں اس کیس کو کلوز ہو جانا تھا اور پھر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ آئندہ ہفتے میں یہ معاملہ مکمل طور پر نمٹ گیا۔ اس کے اگلے روز فرید احمد مجھ سے ملنے آفس آیا تو اس کے ہاتھ دو کلو گرام والا مٹھائی کا ایک ڈبا بھی تھا۔

وہ مذکورہ ڈبے کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس کا میا بی کے لیے آپ کو بھی مبارک ہو۔ یہ سب آپ کی محنت کا ثمر ہے۔“

”محنت کا پودا پھلوں اور پھولوں سے ہمیشہ لدا پھندا رہتا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”محنت میری ہو، آپ کی ہو یا کسی اور کی ہو، کبھی بے ثمر نہیں رہتی۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں وکیل صاحب۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”میں تو ٹھیک ہی کہتا ہوں مگر کچھ ٹھیک ٹھاک میں آپ کے منہ سے بھی سننا چاہتا ہوں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جاتے ہوئے کہا۔

”جی پوچھیں وکیل صاحب۔“ وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

”کیا آپ کو یقین آ گیا کہ آپ کیس جیت چکے

ہیں؟“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی پکا یقین۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس امر میں کسی شک و شبہ کی کوئی بھی گنجائش باقی نہیں۔“

”آپ کے حصے کی رقم آپ کے اکاؤنٹ میں جمع ہو چکی؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے استفسار کیا۔ ”اور آپ کی بیٹیوں کے حصے بھی فلکسڈ ڈیپازٹ کی شکل میں محفوظ ہو چکے ہیں۔“

”جی..... جی ہاں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں اس حوالے سے پوری طرح مطمئن ہوں۔“

”مطلب، اب آپ کے دل میں ایسا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ آپ کا سالا حیدر آباد کی کسی عدالت میں دائر مقدمہ جیت کر آپ کو تین لاکھ کی رقم سے محروم کر دے گا؟“

میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ پورے یقین سے بولا۔ ”ایسا کوئی مقدمہ سرے سے میرے خلاف دائر تھا ہی نہیں۔ وہ دونوں بد معاش مل کر مجھے ٹھکنے کی کوشش میں تھے۔“

”تو کیا وہ آپ کو ٹھکنے میں کامیاب ہو پائے؟“

”نہیں..... آپ نے مجھے بچالیا۔“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

”میں نے نہیں، اللہ نے آپ کو بچایا ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کو اس وبال سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ کامیابی دینے والی ذات صرف اور صرف اللہ ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں وکیل صاحب! اللہ نے واقعی مجھ پر بڑا کرم کیا ہے جو میں گارجین... سرٹیفکیٹ بنوانے آپ کے پاس چلا آیا تھا۔“ وہ احسان مندی کے جذبات سے لبریز آواز میں بولا۔ ”ورنہ عین ممکن ہے، میں انعام درانی کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر آدھی رقم راشد کو دینے کے لیے اپنی رضا مندی ظاہر کر دیتا۔ آپ کی کوشش نے ان شیطاں کی چال کو نا کام بنا دیا۔“

”اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھا نہیں وکیل صاحب!“

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”میں نے

آپ کو کم و بیش پندرہ دن کے لیے خاموشی اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اب یہ مدت قریب الختم ہے.....!“

”جی۔ یہ بات تو میری سمجھ میں آگئی کہ آپ نے ناظر کے حتیٰ فیصلے کی خاطر مجھے چند روز کے لیے صبر کرنے کو کہا تھا۔“ اس نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ”تو کیا اب میں انعام درانی سے ملنے حیدر آباد جاؤں؟“

”یہ ملاقات تو بنتی ہے نا!“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ”وہ وہ بے چارہ کتنی بے چینی سے آپ کے جواب کا انتظار کر رہا ہوگا۔“

”اسے بے چارہ تو نہ کہیں وکیل صاحب۔“ فرید احمد برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔ ”اس مردود نے ایک سال تک مجھے الو بنایا ہے۔ پیسا تو جو گیا سو گیا، اس دوران میں جس ذہنی اذیت سے میں گزرا ہوں، وہ میں ہی جانتا ہوں یا میرا خدا جانتا ہے۔“

”تھوڑا بہت اندازہ مجھے بھی ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”انعام درانی، آپ کے سپالے کے ہاتھ کا کھلونا بن کر آپ کے جذبات اور آپ کی رقم کے ساتھ کھلواڑ کرتا رہا ہے۔ اس حوالے سے اس نے آپ پر جو قرض چڑھا دیا ہے آپ اس بوجھ کو اتاریں گے نہیں؟“

”کس طرح؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”اس سے ایک بھر پور ملاقات کر کے۔“ میں نے کہا۔

”میں آپ کے حکم پر انعام درانی سے ملنے حیدر آباد چلا جاتا ہوں وکیل صاحب۔“ وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں یہ سمجھ نہیں پا رہا کہ اس سے کہوں گا کیا۔ تین لاکھ والا مسئلہ تو حل ہو گیا۔“

”..... کا ٹائلنگ جانے کے بعد جسم کے متاثرہ حصے کے اندر کچھ دیر تک اس کانٹے کی چھین محسوس ہوتی رہتی ہے۔ آپ نے اسی تکلیف کا حساب لینا ہے اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ انعام درانی سے کہیں گے کیا تو وہ میں آپ کو بریف کر دوں گا.....“ لہجائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اس شیطان نے اپنے جیسے دوسرے شیطان کے ساتھ مل کر جس طرح آپ کو تکلیف پہنچائی ہے اس کے جواب میں ان دونوں کے ساتھ بھی کوئی ہلکا پھلکا مسئلہ ہو جائے تو مزہ آجائے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

میرے آخری جملے پر اس کی آنکھوں میں بڑی

شریر چمک نمودار ہوئی۔ رازدارانہ انداز میں اس نے جواب دیا۔ ”میں آپ کے خیال سے مکمل اتفاق کرتا ہوں وکیل صاحب۔ بتائیں، کرنا کیا ہے.....؟“

میں نے نہایت مختصر مگر موثر الفاظ میں اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ اس نے ملاحظہ ہوتے ہوئے پوری توجہ سے میری بات سنی اور بڑے عزم کے ساتھ بولا۔

”آپ فکر نہ کریں وکیل صاحب۔ میں آئندہ ہفتہ وار چھٹی کے دن حیدر آباد جاتا ہوں پھر واپس آ کر آپ کو رپورٹ دوں گا۔“

”آل ڈی بیسٹ۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہونے لگا تو میرے چیمبر کے دروازے سے پلٹا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”واپسی پر مجھے ایک اور ضروری کام بھی کرنا ہے۔“

میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کون سا کام؟“

”آپ کی فیس.....“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”آپ نے سچی لگن سے اپنا کام نمٹایا ہے۔ اب میری باری ہے۔ ایک بینڈم اماؤنٹ میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو چکی ہے۔ اب میں اس پوزیشن میں ہوں کہ بہ آسانی آپ کی فیس ادا کر سکتا ہوں اور..... وہ بھی نقد۔“

میں نے زیر لب مسکرانے پر اکتفا کیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے کسی فیس کی آس میں فرید احمد کے کیس میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا بلکہ مجھے اس کے مالی حالات اور اس کی چار بیٹیوں سے ہمدردی کے جذبے نے یہ کیس ہینڈل کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اگر میں فرید کی درست راہنمائی نہ کرتا تو وہ بے چارہ ابھی تک انعام درانی کے شیطانی چکر میں پھنسا رہتا۔ فرید اگر مجھے فیس کی پیشکش نہ بھی کرتا تو خیر بھی لیکن اگر وہ مجھے فیس دینے کا خواہشمند تھا تو بھی مجھے اس کی خواہش پوری کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جو معاملات سو دو زیاں کو نظر انداز کر کے انسانی ہمدردی میں طے کیے جائیں ان میں کبھی بھی زیاں کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا لیکن اس راز کو سمجھنے کے لیے وسعت نظر اور کشادگی قلب کی ضرورت ہوتی ہے.....!

تین چار روز کے..... بعد فرید احمد ایک مرتبہ پھر میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس دوران میں وہ حیدر آباد سے ہوا یا تھا اور خلاف معمول خاصا کھلا کھلا دکھائی دے رہا

کریبان

تھا۔ میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔

”لگتا ہے، آپ کچھ زیادہ ہی انجوائے کر آئے ہیں؟“

”آپ کی پٹی پر چل کر مزہ آ گیا وکیل صاحب۔“

وہ پُرسرت لہجے میں بولا۔ ”وہاں جو کچھ پیش آیا اسے نہایت ہی دلچسپ اور محفوظ کن کہا جاسکتا ہے۔ آپ نہیں گئے تو دنگ رہ جائیں گے۔“

”میں ضرور سنوں گا۔“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”آپ شروع ہو جائیں۔“

اور وہ شروع ہو گیا.....!

اس نے مزے لے لے کر مجھے اس ملاقات کا احوال سنایا جو اس کے اور انعام درانی کے مابین حیدر آباد کے ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔ فرید نے میری ہدایات کے مطابق انعام درانی سے کہا۔

”وکیل صاحب! میں آپ کے کہنے پر آ گیا ہوں۔ اب آپ جلد از جلد مجھے اس مصیبت سے نکالیں گے۔“

”یہ کیس اسی وقت تک آپ کے لیے وبال جان تھا جب تک آپ نے ایک درست فیصلہ نہیں کیا تھا۔“ انعام درانی نے کہا۔ ”مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ نے میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مصالحت کے لیے رضامندی ظاہر کر دی ہے، ورنہ عدالتی چکروں میں کچھ نہیں رکھا۔ صرف وقت اور پیسے کا نقصان ہوتا، انسان کے ہاتھ میں کچھ نہیں آتا۔ جب مقدمہ ختم ہوتا ہے تو اس وقت انسان بھی اپنی زندگی کے اختتام پر کھڑا ہوتا ہے۔ بہت کم ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کی زندگی میں ہی ان کے کیس کا اچھا یا برا فیصلہ آ جاتا ہے، ورنہ اکثر کیس تو نسل در نسل چلتے ہیں اور خاندان کے خاندان تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ وکالت میرا پیشہ ہے۔ یہ میری روزی روٹی ہے لیکن آپ یقین جانیں کہ.....“ اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میری یہی کوشش ہوتی ہے کہ فریقین کے مابین تمام تر تنازع عدالت کے باہر نمٹ جائیں جیسا کہ میں آپ کے معاملے میں کر رہا ہوں۔“

”اللہ آپ کو اس کا اجر دے وکیل صاحب۔“ فرید نے میری پڑھائی ہوئی پٹی کے مطابق انعام درانی کو شیئے میں اتارتے ہوئے کہا۔ ”یقیناً آپ ایک بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔“

”اب آپ بتائیں کہ کب آپ راشد کو ڈیڑھ لاکھ

روپے ادا کریں گے۔“ انعام درانی فوراً اپنے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ”میرے اشارے پر آپ کا سالانہ کیس تو واپس لے لے گا لیکن اسے رقم کی ادائیگی کے لیے کوئی ٹائم فریم تو دینا پڑے گا نا۔“

”جناب! یہ حقیقت آپ بھی جانتے ہیں کہ میرے تین لاکھ روپے بینک میں پڑے ہوئے ہیں۔ جب تک حیدر آباد کی عدالت سے مقدمہ خارج نہیں ہوگا، وہ بینک مجھے رقم نہیں دے گا۔ اگر بینک مجھے رقم نہیں دے گا تو میں راشد کو کہاں سے ادائیگی کر پاؤں گا۔ سارے حالات آپ کے سامنے ہیں اور اس سچویشن میں، میں راشد کو کوئی ٹائم فریم کیسے دے سکتا ہوں!“

فرید میری دی ہوئی ٹیس کے مطابق بہت عمدہ کھیل رہا تھا۔ اس نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ بال کو انعام درانی کی کورٹ میں پھینک دیا تھا۔ انعام درانی نے ایک لمحہ غور کیا پھر بڑے اعتماد سے بولا۔

”مقدمہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ میں کل صبح ہی خارج کر دوں گا لیکن راشد کو مطمئن کرنے کے لیے آپ کے اور اس کے درمیان ایک معاہدہ تیار کرنا پڑے گا۔“

”کیسا معاہدہ؟“ فرید نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ ایک لیگل ڈیکوونٹ ہوگا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جس کی رو سے آپ ایک مخصوص مدت کے بعد راشد کو ڈیڑھ لاکھ روپے دینے کے پابند ہوں گے۔ اس ڈیکوونٹ پر آپ دونوں فریقین کے دستخط ہوں گے پھر اصل دستاویز راشد رکھ لے گا اور اس کی کاپی آپ کو دے دی جائے گی۔“

”مجھے ایسے کسی ڈیکوونٹ کی تیاری پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ فرید احمد نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہا۔ ”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟“

”کون سی بات؟“ انعام درانی نے پوچھا۔

”مخصوص مدت والی بات۔“ فرید ایک لفظ پر زور ڈالتے ہوئے بولا۔ ”اس مدت کا تعین کیسے کیا جائے گا؟ مجھے اس کے علاوہ بھی آپ سے ایک ضروری بات پوچھنا ہے.....!“

”پہلے آپ ضروری بات پوچھ لیں۔“ انعام درانی نے کہا۔ ”پھر میں مدت کے تعین کی وضاحت کر دوں گا۔“

”اگر آپ کے کہنے مطابق، کل صبح راشد یہ کیس واپس لے لیتا ہے تو اس کے کتنے دن کے بعد بینک مجھے رقم

دے دے گا؟“ فرید نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔
 ”بینک سے رقم حاصل کرنے کے لیے آپ کو ایک لیگل پروسیس کرنا پڑے گا۔“ انعام درانی نے کہا۔ ”اس کے بعد تین لاکھ کی وہ رقم بینک آپ کے حوالے کر دے گا جس میں سے ڈیڑھ لاکھ روپے آپ راشد کو دینے کے پابند ہوں گے اور جہاں تک مخصوص مدت کا معاملہ ہے تو اس کا تعین اسی حساب سے کیا جائے گا جیسے آپ کو بینک سے رقم ملنے کا امکان ہوگا۔ اس سلسلے میں آپ راشد کے نام پوسٹ ڈیٹ کا ایک چیک دے دیں گے جس کی مالیت ڈیڑھ لاکھ روپے ہوگی۔ اس طرح راشد بھی مطمئن ہو جائے گا اور آپ کا مقصد بھی حاصل ہو جائے گا۔“
 ”آپ کی اسکیم مجھے پسند آئی۔“ فرید نے ستائشی نظر سے انعام درانی کی طرف دیکھا۔ ”آپ مجھے... اس لیگل پروسیس کے بارے میں کچھ بتائیں جس کو اختیار کرنے کے بعد بینک میری فریز کی ہوئی رقم کو ریلیز کر دے گا؟“

انعام درانی نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں فرید کو اس لیگل پروسیس سے آگاہ کر دیا جسے اختیار کر کے وہ اپنی رقم وصول کر سکتا تھا۔ ”سکتا“ اس لیے کہ انعام درانی حقیقت حال سے واقف نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ فرید ان مراحل سے بہ خیر و خوبی کامیابی کے ساتھ گزر ”چکا“ ہے۔
 انعام درانی کے خاموش ہونے پر فرید نے سوال کیا۔ ”کیا یہ لیگل پروسیس یہاں حیدر آباد کی عدالت میں ہوگا؟“

”نہیں۔“ انعام درانی نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ ”آپ کی وائف کا کاؤنٹ چونکہ کراچی کے بینک میں ہے اس لیے یہ لیگل پروسیس بھی وہیں کی کسی عدالت میں ہوگا۔“

”چلیں جہاں بھی ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ فرید نے بے پروائی سے کہا۔ ”میرے لیے اطمینان کی بات یہ ہے کہ آپ ہی میری وکالت کریں گے۔ میں آپ کے سوا کسی اور وکیل پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ آپ میرے لیے نجات دہندہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔“

”میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں فرید صاحب۔“ انعام درانی نے کہا۔ ”لیکن میری کچھ جی مجبوریاں ہیں۔ میں کراچی میں آپ کے کیس کی پیروی نہیں کر سکوں گا۔ ویسے بھی میں نے جس لیگل پروسیس کے بارے میں آپ کو بتایا ہے اس کے لیے کسی نہایت ہی تجربہ

کار اور کہنہ مشق وکیل کی بالکل ضرورت نہیں۔ آپ کسی سگلی محلے کے وکیل سے بھی کہیں گے تو وہ آپ کا یہ کام بہ آسانی کر دے گا۔“
 ”ٹھیک ہے وکیل صاحب جو آپ کا حکم۔“ فرید نے فرماں برداری سے کہا۔ ”میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا۔“

انعام درانی نے بڑی ہوشیاری سے پوچھا۔ ”آپ حیدر آباد میں رکھیں گے یا واپس چلے جائیں گے۔“
 ”میں تو صرف آپ سے ملنے آیا تھا۔“ فرید نے جواب دیا۔ ”ملاقات ہوگئی۔ اب تو میں واپس ہی جاؤں گا لیکن آپ نے یہ بات کیوں پوچھی؟“
 ”اگر آپ دو ڈھائی گھنٹے یہاں ہیں تو ہم ایک ضروری کام نمٹا لیتے ہیں۔“ انعام درانی نے کہا۔ ”کون سا ضروری کام وکیل صاحب؟“

”آپ دونوں کے ایگریمنٹ والا کام۔“ انعام درانی نے چالاکی سے کہا۔ ”آپ ذرا گھوم پھر کر دو گھنٹے کے بعد میرے آفس آجائیں۔ اس دوران میں مذکورہ لیگل ڈاکیومنٹ میں تیار کرلوں گا اور راشد کو بھی میں اپنے پاس بلا لوں گا۔ میری موجودگی میں آپ دونوں حضرات اس ایگریمنٹ پر دستخط کر دیجیے گا۔ اللہ اللہ، خیر سلا۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آج کے آج ہی یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔“ فرید نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں دو گھنٹے کے بعد آپ کے پاس آتا ہوں۔“
 پھر وہ دونوں ہوٹل سے اٹھ گئے۔ دو گھنٹے کے بعد جب فرید انعام درانی کے پاس پہنچا تو اس نے بڑے تپاک سے فرید کا استقبال کیا پھر اسٹیپ پیپر پر بنا ہوا ایک لیگل ایگریمنٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے تیار کر دیا ہے۔ آپ بھی اسے پڑھ لیں۔“

فرید نے ایگریمنٹ کی عبارت پڑھی۔ وہ تحریر گول مول زبان میں تھی۔ کہیں بھی کسی کیس یا کورٹ کا ذکر نہیں تھا۔ اس عبارت کے مطابق عنقریب فرید کو کہیں سے تین لاکھ ملنے والے تھے جس میں آدھی رقم راشد کا حصہ تھی۔

فرید نے راشد کو ڈیڑھ لاکھ کا چیک دے دیا تھا۔ جیسے ہی تین لاکھ کی رقم فرید کے اکاؤنٹ میں آئی، اس نے راشد کو آگاہ کرنا تھا۔ اس کے بعد راشد نے فرید کا دیا ہوا چیک اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرنا تھا۔ اسٹیپ پیپر پر اسی نوعیت کی چند باتیں اور بھی تحریر تھیں لیکن کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا

گریبان

تھا کہ فرید کے پاس وہ تین لاکھ کی رقم کہاں سے اور کس مد میں آنے والی تھی اور یہ کہ راشد کس بنا پر اس رقم میں آدھے کا حصہ دار تھا۔

اس تحریر کے اختتام پر جہاں فریقین کے دستخط کے لیے جگہ مخصوص تھی وہاں پہلو بہ پہلو فرید اور راشد کے نام مع ولدیت رہائشی پتے کے ساتھ درج تھے اور دونوں کے نام کے نیچے ان کے قومی شناختی کارڈ

کا مخصوص نمبر بھی لکھا گیا تھا۔ یہ سب تو معمول کی کارروائی تھی لیکن جس چیز نے فرید کو چونکنے پر مجبور کیا وہ تھے راشد کے دستخط۔

راشد والے کھاتے میں اس کی تفصیلات کے نیچے اس کے دستخط بھی موجود تھے۔ فرید نے انعام درانی سے استفسار کیا۔

”یہ کیا معاملہ ہے وکیل صاحب۔ راشد تو آپ کے آفس میں کہیں نظر نہیں آ رہا اور اس کے دستخط ایگریمنٹ پر موجود ہیں۔ آپ نے یہ ایگریمنٹ ابھی تیار کیا ہے یا.....؟“
 ”ذہن میں کسی بدگمانی کو جگہ نہ دیں فرید صاحب۔“ انعام درانی نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”آپ بے فکر ہو جائیں۔ یہ لیگل ڈاکیومنٹ میں نے تھوڑی دیر پہلے ہی تیار کیا ہے۔ بانی جہاں تک راشد کے دستخط کی بات ہے تو.....“ اس نے ذرا دیر کو رک کر ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

”جب میں نے راشد کو اپنے دفتر بلایا تو وہ فوراً ہی آ گیا تھا۔ میں نے اس کی موجودگی ہی میں یہ ڈاکیومنٹ تیار کیا ہے۔ جب ڈاکیومنٹ تیار ہو گیا تو راشد نے مجھ سے کہا کہ اس کی والدہ یعنی آپ کی ساس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لہذا اسے جلدی گھر جانا ہوگا۔ میں نے اس سے کہا کہ تھوڑی دیر رک جائیں پھر اسے بتایا کہ آپ بھی پہنچنے ہی والے ہیں۔ راشد نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا کہ اسے آپ سے ملنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں اس سے دستخط کراؤں تاکہ وہ جلد از جلد اپنی بیمار والدہ کے پاس جاسکے۔ راشد نے بات ہی ایسی کر دی تھی کہ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی اور ایگریمنٹ پر اس کے دستخط لے لیے بلکہ میں نے ایگریمنٹ کی اصل کے علاوہ آپ والی کاپی پر بھی راشد کے دستخط لے لیے ہیں تاکہ جو کاغذات آپ کے پاس جائیں ان میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ رہ جائے۔ میں کچے کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”جی..... یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ فرید نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”آپ نے ایگریمنٹ کی تحریر کو اچھی طرح پڑھ لیا ہے۔“ انعام درانی نے کہا۔ ”اگر آپ کو اس کے مندرجات پر کوئی اعتراض نہیں تو پھر آپ بھی اس پر دستخط کر دیجیے تاکہ یہ ڈاکیومنٹ مکمل ہو جائے۔“

فرید نے کسی قسم کا کوئی اعتراض اٹھائے بغیر مذکورہ ڈاکیومنٹ کی اصل اور نقل پر دستخط کر دیے۔ انعام درانی نے اصل اپنے پاس رکھ کر نقل یعنی اس ایگریمنٹ کی کاپی فرید کی جانب بڑھا دی۔

فرید نے وہ ڈاکیومنٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”وکیل صاحب! ایگریمنٹ کے اندر ڈیڑھ لاکھ کے جس چیک کا ذکر کیا گیا ہے وہ تو میں نے ابھی آپ کو دیا ہی نہیں.....!“

”مجھے آپ پر بھروسہ ہے آپ جلد از جلد وہ چیک مجھ تک پہنچا دیں گے۔“ انعام درانی نے کہا۔ ”اب میرے اس بھروسے کی لاج رکھنا آپ کا کام ہے۔“

”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں وکیل صاحب۔“ فرید نے کہا۔ ”آپ نے مجھے اس مصیبت سے نکالنے کے لیے بہت تعاون کیا ہے۔ میں آپ کے اعتماد کو بھلا کیسے ٹھیں پہنچا سکتا ہوں۔“

”فرید صاحب! آپ بڑے اچھے اور نیک دل انسان ہیں۔“ انعام درانی نے کہا۔ ”میں نے آپ کی حد سے زیادہ مدد اس لیے بھی کی کہ آپ اس کے حق دار ہیں۔ اب آپ مطمئن ہو کر گھر جائیں اور بینک والی رقم وصول کرنے سے پہلے اپنا ڈیڑھ لاکھ والا چیک میرے پاس پہنچا دیجیے گا۔“

”میں کل ہی رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے مذکورہ چیک آپ کے آفس کے ایڈریس پر پوسٹ کر دوں گا۔“ فرید نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ چونکہ ایک کراس چیک ہوگا اس لیے اس کے مس یوز ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ وہ صرف راشد کے اکاؤنٹ ہی میں جمع ہو سکے گا۔“

”بالکل ٹھیک۔“ انعام درانی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اور جیسے ہی رقم آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو، آپ فوراً مجھے فون کر کے اس کی اطلاع دیں گے۔“

”جی میں ایسا ہی کروں گا وکیل صاحب۔“ فرید نے فرماں برداری سے کہا۔

”فرید صاحب! آپ اس یقین کے ساتھ یہاں سے رخصت ہوں کہ پچھلے ایک سال سے راشد نے

تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں، میں نے آپ کی تمام تر ہدایات کو ذہن نشین کر لیا ہے۔“

میں نے اسے ”شاباشی“ دی۔ رخصت ہونے سے قبل اس نے ایک لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

”یہ آپ کے لیے ہے وکیل صاحب۔“

”ارے..... یہ کیا ہے۔“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”دو کلو گرام مٹھائی تو آپ پچھلی بار دے گئے تھے!“

”وہ مٹھائی تو کیس کی کامیابی پر منہ میٹھا کرنے کے لیے تھی۔“ وہ پُر جوش انداز میں بولا۔ ”اس لفافے کے اندر آپ کی فیس ہے۔ میں آپ کی محنت اور تعاون کا حق تو ادا نہیں کر سکتا۔ بس، میں جو پیش کر رہا ہوں آپ اسے قبول کر لیں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔“

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ گزشتہ ملاقات میں یہ وقت رخصت اس نے دروازے سے پلٹ کر وعدہ کرنے والے انداز میں کہا تھا..... حیدر آباد سے واپسی پر مجھے ایک ضروری کام کرنا ہے یعنی آپ کی فیس ادا کرنا ہے۔ آج اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔

میں نے اس کی خوشی کی خاطر وہ لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور بغیر کھولے یا رقم گنے مذکورہ لفافے کو اپنی میز کی دراز میں ڈال دیا۔ گویا میں نے اس کی پیشکش کو قبول کر لیا تھا۔

☆☆☆

فرید احمد مجھے جو لفافہ دے کر گیا تھا اس میں اتنی رقم موجود تھی جو میری فیس کے اریب قریب ہی تھی۔ میں تو یہ ذہن بنائے بیٹھا تھا کہ اگر وہ فیس کی مد میں مجھے ایک روپیہ بھی نہیں دے گا، تب بھی ٹھیک ہے اور اگر اس نے مجھے فیس دے دی تھی تو بھی اس کی خوشی کی خاطر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

لگ بھگ دو ہفتے کے بعد وہ مجھ سے ملنے آیا تو خوشی اس کے چہرے پر چمک رہی تھی۔ رسی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا۔

”آج تو آپ بڑے شاداں و فرحاں دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا کوئی اہم خبر لائے ہیں؟“

”جی وکیل صاحب۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ان دونوں مردودوں سے نجات مل گئی۔ اب

”کیا بعد میں کچھ برا ہونے والا ہے.....؟“ وہ فکر مندی سے مستفسر ہوا۔

”دیکھیں..... آپ انعام درانی سے وعدہ کر آئے ہیں کہ رجسٹرڈ ڈاک سے آپ راشد کے لیے ڈیڑھ لاکھ مالیت کا پوسٹ ڈیٹڈ چیک بھیج دیں گے۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”وہ دو تین یا زیادہ سے زیادہ چار پانچ روز تک آپ کی رجسٹری کا انتظار کرے گا۔ اس کے بعد پتا ہے، وہ کیا کرے گا؟“

”جب اسے مذکورہ چیک نہیں ملے گا تو ظاہر ہے وہ مجھے فون کرے گا۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”اور مجھ سے پوچھے گا کہ چیک کا کیا ہوا.....!“

”یقیناً یہی ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اس صورت حال میں آپ اسے کیا جواب دیں گے؟“

”میں چند روز تک تو اسے حیلوں بہانوں سے ٹھلاتا رہوں گا۔“ فرید نے بتایا۔ ”اور جب وہ چیک کے لیے زیادہ اصرار کرے گا تو میں صاف الفاظ میں کہہ دوں گا کہ چیک ویک کو بھول جاؤ اور راشد سے کہو کہ وہ حیدر آباد کی عدالت میں دوبارہ مجھ پر مقدمہ دائر کر دے۔“

”آپ کے اس لا جواب جواب پر انعام درانی کے تن بدن میں مرچیں لگ جائیں گی۔“ میں نے کہا۔ ”اور جب وہ آپ کے چھوٹے سالے راشد کو اس صورت حال سے آگاہ کرے گا تو ذرا تصور کریں، اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ وہ تو ڈیڑھ لاکھ روپے کی امید لگائے بیٹھا ہے۔“

”ان دونوں شیطانوں نے مل کر پورے ایک سال تک مجھے جو اذیت دی ہے اس کا حساب تو خاصا طویل ہے۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ”اس کے مقابلے میں انہیں میری جانب سے ملنے والی تکلیف تو کچھ بھی نہیں ہے وکیل صاحب۔“

”میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور آئندہ کے لیے محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہوں۔ اس بات کے بہر حال امکانات موجود ہیں کہ آپ انہیں جو زخم دیں گے وہ انہیں چاٹتے رہیں گے اور ہو سکتا ہے، وہ پلٹ کر آپ پر کوئی اوچھا وار کر دیں۔ ایسے کسی ناخوشگوار موقع پر یہ کیسٹ اور ایگریمنٹ آپ کے بہت کام آئیں گے۔ اگر معاملہ کورٹ کچہری تک چلا گیا تو آپ ان دونوں چیزوں کی مدد سے راشد اور انعام درانی کو ٹھگ ثابت کر سکتے ہیں۔“

”میں آپ کی بات سمجھ گیا وکیل صاحب۔“ وہ

”بس جناب! میں نے تو آپ کی ہدایت پر عمل کیا ہے۔“ وہ سادگی سے بولا۔ ”باقی کے کام خود بہ خود ہوتے چلے گئے۔“

”اگر آپ آئندہ بھی میری باتوں کو غور سے سنیں گے اور ان پر عمل بھی کریں گے تو کبھی گھائے میں نہیں رہیں گے۔“ میں نے کہا۔

”جی بالکل..... ضرور.....“ وہ بڑی سرعت سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”آپ حکم کریں، آگے مجھے کیا کرنا ہے؟“

”آپ اس ایگریمنٹ اور ریکارڈ ڈکیسٹ کو اپنے پاس کسی محفوظ مقام پر رکھ دیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اللہ نہ کرے کہ آپ کو کبھی ان چیزوں کی ضرورت پیش آئے لیکن بد باطن لوگوں سے کچھ بعید نہیں ہے۔“

”میں سمجھا نہیں وکیل صاحب۔“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ”آپ اس بات کی وضاحت کریں تو مہربانی ہوگی۔“

”آپ یہ تو مانتے ہیں نا کہ راشد اور انعام درانی بے ضمیر اور کمینے انسان ہیں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی۔ میں دل و جان سے اس بات کو مانتا ہوں۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”اور ان کے مقابلے میں، میں ایک دم زیر و ہوں۔“

اس نے رعایت لفظی سے کام لیتے ہوئے خود کو زیرو کہا تھا یا اسے درحقیقت اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میری نظر میں یہ اس کا انکسار تھا۔ میرے جی میں تو آئی کہ اس سے کہوں، تم زیرو نہیں بلکہ انتہائی بے وقوف انسان ہو مگر میں نے اپنے جی کی نہیں مانی کیونکہ اردو زبان میں احق اور بے وقوف کا مہذب متبادل بھی موجود ہے۔ میں نے متبادل راستے کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔

”آپ زیرو نہیں بلکہ ہیرو ہیں فرید صاحب۔ باقی جہاں تک انعام درانی اور راشد جیسے شاطر افراد سے مقابلے کی بات ہے تو میں اس سلسلے میں آپ کو سادہ اور بھولا بھالا ہی کہوں گا۔“

”جی شکریہ۔“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

”اب بتائیں، میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”فی الحال آپ اس کیسٹ اور ایگریمنٹ کو اچھی طرح اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیں۔“ میں نے کہا۔ ”بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“

حیدر آباد کی ایک عدالت میں آپ کے خلاف جو کیس دائر کر رکھا ہے، کل صبح وہ کیس واپس لے لیا جائے گا۔ اسی کیس کی ابتدائی کارروائی کے نتیجے میں آپ کی مرحومہ بیوی اور راشد کی بہن نفیسہ کے بینک والوں نے متوفی کا اکاؤنٹ فریز کر رکھا تھا۔ حیدر آباد کی عدالت سے یہ کیس خارج ہو جانے کے بعد کراچی کے بینک والے آپ کے ساتھ بھرپور تعاون کریں گے۔“

فرید نے انعام درانی کا شکریہ ادا کیا اور حیدر آباد سے کراچی لوٹ آیا اور اب وہ میرے سامنے بیٹھا روداد سنار ہا تھا۔ میں نے اس کی بات پوری توجہ سے سنی اور ایگریمنٹ کی کاپی کا بھی یہ غور جائزہ لیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ ٹیپ ریکارڈ کہاں ہے.....؟“

میں نے حیدر آباد روانہ ہونے سے پہلے فرید احمد کو ایک مٹی ٹیپ ریکارڈ رکھ دیا تھا۔ مذکورہ ٹیپ ریکارڈ میرا ایک دوست سوزر لینڈ سے میرے لیے لایا تھا۔ ان دنوں اس سائز کے ٹیپ ریکارڈ پاکستان کی مارکیٹ میں فروخت نہیں ہوتے تھے۔ باہر سے کوئی لے آیا تو لے آیا۔ میں نے اپنے دوست کے دیے ہوئے اس تحفے کو فرید کی سیفٹی کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ خیال فرید کی حماقت نما سادگی کو دیکھتے ہوئے اچانک ہی میرے ذہن میں آ گیا تھا۔ میں نے فرید کو اس کی ریکارڈنگ کا طریقہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا اور ساتھ ہی دو تین کیسٹ بھی دے دیے تھے۔ وہ بہ آسانی اس مٹی ٹیپ ریکارڈ کو اپنی جیب میں چھپا کر نزدیک بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص یا اشخاص کی گفتگو ٹیپ کر سکتا تھا اور وہ اس مشن میں کامیاب لوٹا تھا۔

اس نے مذکورہ ٹیپ ریکارڈ اور دو کیسٹ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دونوں خالی ہیں۔ تیسری کیسٹ ٹیپ ریکارڈ کے اندر لگی ہوئی ہے۔ اس کیسٹ کی A سائڈ پر میری اور انعام درانی کی ہونٹ والی گفتگو ریکارڈ ہے اور B سائڈ پر انعام درانی کے آفس میں ہمارے مابین ہونے والی بات چیت محفوظ ہے۔“

مجھے فرید سے اس کارنامے کی کوئی زیادہ توقع نہیں تھی۔ اس نے میری امید سے بڑھ کر کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں نے کیسٹ کی دونوں سائڈز کو پلے کر کے دیکھا۔ عمدہ ریکارڈنگ کی گئی تھی۔ میں نے فرید کی جانب دیکھتے ہوئے تحسین بھرے انداز میں کہا۔

”آپ نے تو کمال کر دیا فرید صاحب.....!“

میں پرسکون ہو گیا ہوں۔“

میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ دو روز کے بعد ہی انعام درانی کا فون آنا شروع ہو گیا تھا۔ پہلے تو وہ اسے ٹالتا رہا پھر دو ٹوک انداز میں کہہ دیا کہ جہنم میں جاؤ تم دونوں اور بینک میں رکھے تین لاکھ بھی مجھے کسی چیز کی کوئی پروا نہیں۔ راشد بڑے شوق سے دوبارہ حیدر آباد کی عدالت میں میرے خلاف کیس کر دے۔

”آپ کی اس جھنجلاہٹ پر انعام درانی نے کیا رد عمل ظاہر کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ”ہمارے بیچ فون پر بات ہو رہی تھی۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی آواز سے مجھے یہی محسوس ہوا کہ میرے ٹکے سے جواب پر وہ مجھ کو رہ گیا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر رابطہ موقوف کر دیا..... فرید صاحب! میں تو آپ کا بھلا کرنے کی سوچ رہا تھا۔ خیر، آپ کی مرضی ہے۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ میں اب آپ کے کسی معاملے میں نہیں پڑوں گا۔“

”اس واقعے کے بعد سے انعام درانی یا راشد نے آپ سے کوئی رابطہ کیا؟“ اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”پچھلے ایک ہفتے سے ادھر مکمل خاموشی چھائی ہوئی ہے۔“ ”چلیں، یہ معاملہ بھی خوش اسلوبی سے منٹ گیا۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ مزے کریں۔“

وہ مزید کچھ دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا۔ اس کے بعد سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

ایک لحاظ سے فرید احمد کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ میں بھی مطمئن تھا کہ اس نے جس مقصد کی خاطر میری خدمات حاصل کی تھیں، وہ پورا ہو گیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد میں اسے بھول گیا۔ روزمرہ کی مصروفیات میں پیش نظر معاملات ہی کو یاد رکھا جاسکتا ہے۔

”کہانی“ بڑی عجیب شے ہے اور انسانی زندگی کی کہانی تو عجیب ہونے کے علاوہ خاصی پیچ دار بھی ہوتی ہے۔ فرید کی کہانی نے بھی اچانک ایک نیا موڑ لے لیا تھا۔

فرید سے آخری ملاقات کے کم و بیش تین ماہ بعد اچانک مجھے اس کا خیال آ گیا اور اس کا ایک خاص سبب تھا۔ ایک روز میں دفتر سے جلدی فارغ ہو گیا تو سوچا گھر کا

رخ کرنے سے پہلے ایک کام نمٹا لیتا ہوں۔ مذکورہ کام کا تعلق جو نامارکیٹ سے تھا۔ میں اپنے دفتر سے نکلا اور جوڑیا بازار سے ہوتے ہوئے جو نامارکیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے مارکیٹ میں اپنا کام نمٹایا اور واپس ایم اے جناح روڈ کی طرف جانے کے بجائے میں نے نشتر روڈ کا رخ کیا۔ جب میں شو مارکیٹ کے نزدیک پہنچا تو آپوں آپ میرے ذہن میں فرید احمد کی صورت اچاگر ہو گئی۔ وہ شو مارکیٹ کی ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتا تھا۔ مذکورہ بلڈنگ کا نام میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ میں نے سوچا کہ ادھر سے گزر رہا ہوں تو اس کا حال چال ہی پوچھ لوں۔

وہ آج کی طرح کا سیلوگر زمانہ نہیں تھا کہ میں سیل فون سے کال کر کے اسے اپنی گاڑی میں بلا لیتا اور اس سے تھوڑی گپ شپ کر کے آگے بڑھ جاتا۔ میں نے اپنی کار کو ایک مناسب اور محفوظ جگہ پر پارک کیا اور بلڈنگ کے زینے طے کر کے اس کے فلیٹ کے سامنے پہنچ گیا پھر میں نے اطلاعی گھنٹی بجادی۔

فلیٹ کے اندر گھنٹی کی آواز سنائی نہیں دی۔ میں نے دو تین بار یہی عمل دہرایا لیکن نتیجہ وہی برآمد ہوا جو پہلی مرتبہ سامنے آیا تھا۔ یہی بات سمجھ میں آئی کہ شاید گھنٹی میں کوئی خرابی ہے۔ اپنی آمد کی اطلاع کا دوسرا راستہ اپناتے ہوئے میں نے فلیٹ کے داخلی دروازے پر دستک دی۔ تیسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ فرید کا نہیں بلکہ اس کے سامنے والے فلیٹ کا۔ میں نے ایک بارگی مڑ کر اس دروازے کی طرف دیکھا۔ میری نظر ایک ادھیڑ عمر شخص پر پڑی۔

مذکورہ شخص نے صاف ستھرا شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے آس پاس رہی ہوگی۔ اس نے آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس نے سر تا پا میرا جائزہ لیا اور شائستہ لہجے میں استفسار کیا۔ ”اگر آپ فرید سے ملنے آئے ہیں تو آپ کو مایوسی ہوگی۔“

”اوہ.....“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

میرے چہرے پر فکر مندی کی جھلک کو دیکھ کر اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یقیناً آپ سوچ رہے ہوں گے کہ فرید کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ اگر میں آپ کو بتاؤں کہ فرید کا انتقال ہو گیا تو لغوی اعتبار سے یہ غلط نہیں

ہوگا۔ بہر حال، میں آپ کو کسی پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتا یوں سمجھیں کہ فرید احمد منتقل ہو گیا ہے یعنی اس نے شفٹنگ کر لی ہے۔“

”آئی سی.....!“ میں نے ایک اطمینان بھری گہری سانس خارج کی۔ ”انتقال کا ذکر کر کے تو آپ نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“ لمحاتی توقف کر کے میں نے پوچھا۔ ”آپ کی تعریف.....؟“

”میرا نام سعید زمان ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میرا تعلق درس و تدریس سے ہے۔ میں ایک مقامی کالج میں لیکچرر ہوں۔“

”آپ کے انداز گفتگو سے میں سمجھ گیا تھا کہ آپ ایک پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ انسان ہیں۔“ میں نے مصالحتی کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“

اس نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملا پایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا.....!“

”میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پیشے کے لحاظ سے میں ایک وکیل ہوں۔ فرید نے آپ سے میرا ذکر کیا ہوگا!“

”بالکل نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”فرید بڑا عجیب و غریب انسان تھا۔ بہت کم آمیز اور اپنی ہی دھن میں زندگی گزارنے والا۔ وہ اپنے ذاتی معاملات کی کسی کو ہوا نہیں لگنے دیتا تھا جیسے اسے ڈر ہو کہ لوگ اس کے دشمن ہو جائیں گے جبکہ اس کے حالات کسی نہ کسی طرح آؤٹ ہو ہی جاتے تھے۔ پتا نہیں، وہ کون سے خطبہ میں مبتلا تھا۔ ایسے شکی لوگ کبھی کسی کو اپنا دوست نہیں بنا پاتے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ”کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہاں سے شفٹ ہو کر وہ کہاں گیا ہے؟“

”آپ کے پاس چند منٹ کی فرصت ہو تو اندر آ جائیں۔“ اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ جیسے معزز انسان کو دروازے پر کھڑا رکھنا اچھا محسوس نہیں ہو رہا۔ ویسے بھی آپ نے جو سوال کیا ہے اس کے بارے میں میری بیوی آپ کو زیادہ بہتر طور پر بتا سکتی ہے۔“

سعید زمان کی فرمائش پر میں اس کے ڈرائنگ روم

گریبان

میں پہنچ گیا۔ اس سے بات کر کے فرید کے حوالے سے میرے اندر تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا لیکن جلد ہی واپس لوٹ آیا اور بولا۔

”میری بیوی چند منٹ میں آرہی ہے۔ جب تک اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بتائیں کہ فرید سے آپ کس سلسلے میں ملنے آئے تھے؟“

”چند ماہ پہلے میں نے ایک کیس میں فرید کی قانونی مدد کی تھی۔“ میں نے بتایا۔ ”اس کی مرحومہ بیوی کے اکاؤنٹ میں تین لاکھ کی رقم پڑی تھی جو ایک لیگل پروسیس سے گزرنے کے بعد ہی اسے مل سکتی تھی۔ آج اتفاق سے میں ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا، اس کی خیریت دریافت کر لوں۔“

”آپ بڑے انسان دوست اور وضع دار وکیل ہیں بیگ صاحب۔“ وہ ستائشی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ورنہ بے حد معذرت کے ساتھ میں یہ کہوں گا کہ آپ کے پیشے میں حد درجہ بے مروتی پائی جاتی ہے۔“

”میں آپ کی بات کا برا نہیں مانوں گا۔“ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ وکیل کسی کو اپنا بخار بھی مفت میں نہیں دیتے۔ اپنی ہاؤ، جس طرح ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح ہر پیشے سے وابستہ افراد بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔“

پھر میں نے سعید زمان کو انعام درانی کے کالے کرتوتوں کی کتھا سنا ڈالی۔ ہمارے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ سعید زمان کی بیوی چائے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس نے مجھے سلام کیا اور چائے کی پیالیوں کو میز پر سجا دیا۔ وہ شوگر پاٹ الگ سے ساتھ لائی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ چائے کی پیالیوں میں پھینکی جائے گی۔ لوازمات کے طور پر ایک پلیٹ میں دو تین قسم کے بسکٹ بھی موجود تھے۔

سعید زمان کی بیوی کا نام نرجس تھا۔ وہ درمیانے قد اور بھرے جسم کی مالک ایک دلکش خاتون تھی۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ ان کی شادی کو پچیس سال گزر چکے تھے اور یہ کہ..... وہ ایک بے اولاد جوڑا تھا۔

چائے پیتے کے دوران میں ہمارے بیچ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ نرجس نے مجھے بتایا کہ وہ یہ تو نہیں جانتی کہ فرید نے کہاں شفٹ کیا تھا۔ بس اسے اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ قدرے صاف ستھرے علاقے میں گیا ہے تاکہ

سکون نہیں مل سکتا۔“

”کیا فرید ماں کا احترام نہیں کرتا تھا؟“ میں نے بے یقینی سے سعید زمان کی طرف دیکھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....!“

”وہ آپ سے ایک کلاسٹ کی حیثیت سے ملا ہوگا اس لیے آپ اس کے گھریلو معاملات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے وکیل صاحب۔“ نزجس نے افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”حقیقت کیا ہے، میں جاننا چاہوں گا۔“ میں نے باری باری ان میاں بیوی کی جانب دیکھا۔ ”میں جس حد تک فرید کو سمجھ پایا ہوں، میری نظر میں وہ بنیادی طور پر ایک احمق اور بے وقوف انسان ہے لیکن اگر کوئی اس کی لگام کو ہاتھ میں رکھ کر کنٹرول کرے تو پھر وہ ڈھنگ کا کام بھی کر جاتا ہے۔“

”نفسیہ بے چاری تو بہت سیدھی سادی اور خدمت گزار عورت تھی۔“ نزجس ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”ہو سکتا ہے، نئی آنے والی اس کی لگام کھینچ کر رکھے۔“

”کل کیا ہوگا، یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔“ میں نے سعید زمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے ماں کا احترام نہ کرنے کا قصہ سنارہے تھے.....؟“

ان میاں بیوی کی باتوں نے میرے اندر حد درجہ بے چینی اور اضطراب بھر دیا تھا۔ میں فرید کو چند سمجھ رہا تھا مگر یہاں تو وہ خاصا نامعقول ثابت ہو رہا تھا۔ سعید زمان نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”فرید اکثر و بیشتر اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ بدتمیزی کرتا رہتا تھا۔ ہم چونکہ اس کے سامنے والے فلیٹ میں آباد ہیں اس لیے اس کے گھر کے اندرونی حالات کی کچھ کچھ خبر ہمیں بھی ہوتی رہتی تھی۔ ابھی میں جس شرمناک واقعے کا ذکر کرنے جا رہا ہوں وہ نفسیہ کی موت سے دو ماہ پہلے کا ہے.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس روز فرید نے اپنی ماں کے ساتھ حد سے زیادہ بدتمیزی کی تھی۔ گالم گلوچ کی باقاعدہ آوازیں ہماری سماعت تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ ناہنجار یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس کے سامنے وہ عظیم ہستی کھڑی ہے، دین نے جس کے قدموں تلے جنت کی بشارت دی ہے۔ اس نوعیت کا ناروا سلوک تو کوئی کسی غیر کے ساتھ بھی نہیں کرتا کجایہ کہ

اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکے۔“

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے نزجس کے لہجے میں تلخی کھل گئی تھی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیسا مشن؟“

”مشن سیکنڈ میرج۔“ نزجس کے بجائے سعید زمان نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”اوہ.....“ میں نے حیرت بھری نظر سے باری باری ان میاں بیوی کی طرف دیکھا اور بے ساختہ کہا۔ ”ریٹلی.....؟“

”جی بالکل!“ نزجس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ فرید نے کس لیگل پروسیس سے گزر کر نفسیہ والے تین لاکھ حاصل کیے تھے لیکن پیسا آتے ہی اس کی جون بدل گئی تھی۔ ہم نے اڑتی اڑتی سنی کہ وہ دوسری شادی کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہا ہے اور رہائش بھی وہ اسی مقصد سے تبدیل کر رہا ہے کہ وہ جتنے اچھے علاقے میں ہوگا، اسے اتنا ہی اچھا رشتہ ملے گا۔“

”یہ سب میرے لیے دلچسپ اور انکشاف انگیز ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں جس فرید کو جانتا ہوں وہ ایسا انقلابی تو نہیں تھا۔ مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا۔“

”اگر آپ اس کے وہ رنگ ڈھنگ دیکھ لیتے جو آخری دنوں میں ہم نے دیکھے ہیں تو دانتوں تلے انگلیاں داب لیتے۔“ نزجس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اس نے نوجوانوں کی طرز کا چست اور شوخ لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ اس پر ڈانس جیسا چشمہ۔“

”بالکل..... فرید نے مائیکل جیکسن جیسا کالا چشمہ لگانا شروع کر دیا تھا اور سچی بات پوچھیں تو اس ٹائپ کے بلب گلاسز فرید پر بہت برے لگتے تھے۔ مجھے تو وہ کوئی جو کر محسوس ہوتا تھا۔“ اس کے شوہر نے کہا۔

”دوسری شادی کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں سمجھتا ہوں، اس فیصلے سے اس کی پریشانیاں کم ہونے کے بجائے بڑھ جائیں گی۔ اگر اس کی اکیلی جان ہوتی تو دوسری بات تھی مگر یہاں تو اس کے ساتھ ایک بوڑھی والدہ اور چار بیٹیاں بھی ہیں جن میں چھوٹی بیٹی محض دو سال کی ہے.....“

”اگر اس کی اکیلی جان بھی ہوتی تو اسے جوتے ہی پڑنا ہیں۔“ سعید زمان نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔ ”جو شخص ماں کا احترام نہ کرتا ہو، وہ کہیں بھی چلا جائے اسے

ماں.....“ وہ تھوڑی دیر کے لیے تھما پھر ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔

”آپ کو یقین نہیں آئے گا بیگ صاحب! اس گدھے نے اس روز اپنی ماں پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا اور دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا تھا۔“

”واقعی مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بیٹا اس حد تک بھی گر سکتا ہے..... مجھے تو یہ کوئی نفسیاتی مریض لگتا ہے۔“

”ہماری اس سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے جو اس کے خلاف اس قسم کی باتیں کریں۔“ نزجس گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”آپ چاہیں تو اس بلڈنگ کے کسی بھی فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹا کر اس واقعے کی تصدیق کر لیں۔ سب جانتے ہیں کہ اس روز بلڈنگ میں کون سا اندوہناک تماشا ہوا تھا۔ آنسو بہاتی ہوئی ریحانہ بیگم کو میں ہاتھ سے پکڑ کر اپنے گھر لائی تھی۔“

”جب فرید کی ماں ریحانہ کی حالت قدرے سنبھلی تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اسے بڑی بہو کے گھر چھوڑ آؤں۔“ سعید زمان نے بتایا۔ ”فرید کا بڑا بھائی نوید کسی خلیجی ملک میں ہوتا ہے۔ نوید کی بیوی فرزانه اور ان کے بچے ناظم آباد میں رہائش پذیر ہیں۔ میں نے ریحانہ کو رکشا میں بٹھایا اور نوید کے گھر ناظم آباد پہنچا دیا۔ ریحانہ بہت صبر والی عظیم عورت ہے۔ اس موقع پر اس نے ناخلف بیٹے کو کوئی بددعا نہیں دی بلکہ اس کا ظرف ملاحظہ کریں کہ جب نفسیہ کا انتقال ہو گیا اور بعض لوگوں نے ریحانہ سے کہا کہ نفسیہ کی بچیوں کو دادی کی ضرورت ہے تو وہ اللہ کی بندی بیٹے کے برتاؤ کو بھول بھال کر دوبارہ یہاں آ گئی اور ہمت نہ ہونے کے باوجود بھی وہ اپنی پوتیوں کی دیکھ رکھ میں لگ گئی.....“

”اس دنیا میں انسانوں کے بیچ جتنے بھی رشتے پائے جاتے ہیں ان میں سب سے عظیم اور بے مثال رشتہ صرف اور صرف ماں کا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کاش! یہ حقیقت اولاد کی سمجھ میں بھی آ جائے.....!“

نزجس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری پھر گلوگیر آواز میں بولی۔ ”ماواں، ٹھنڈیاں چھاواں.....!“

سعید زمان کے ڈرائنگ روم کی فضا سوگوار ہو گئی تھی۔ وہاں پر درحقیقت کسی انسان کی موت واقع نہیں ہوئی تھی مگر ہم تینوں کے احساسات دکھی اور جذبات مجروح تھے۔

اس شام میں بوجھل دل اور گھائل جگر کے ساتھ سعید

”شمشال کی سیر“

شمشال ایک زراعت پیشہ اور مویشی پالنے والوں کی آبادی ہے۔ ان کے نفوس کی تعداد گیارہ سو کے لگ بھگ ہے۔ شمشال کے علاقے کا کل رقبہ 2700 مربع کلومیٹر ہے جس میں بے شمار بلند برفانی گلیشیر اور چراگاہیں موجود ہیں۔ ان میں نو چوٹیاں سات ہزار میٹر سے بھی زیادہ اونچائی پر ہیں اور دس ایسے گلیشیر ہیں جن کی لمبائی دس کلومیٹر سے زیادہ بنتی ہے۔ شمشال کے مویشیوں کے علاوہ ان علاقوں میں آئی بیکس، نیلی بھیڑ، جنگلی گدھے، برفانی کوءے، خرگوش، مرغابیاں، بھیڑیے اور برفانی چیتے بھی پائے جاتے ہیں۔ شمشال کی مختصر وادی میں گندم اور جو کاشت کیے جاتے ہیں۔ تاریخی واقعات گیتوں اور کہانیوں کی صورت میں سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں اور ان کے کچھ حصے ڈراموں کی صورت میں میلوں ٹیلیوں اور دیگر تقریبات میں پیش کیے جاتے ہیں ہمارے پیارے وطن کے یہ پیارے علاقے بہت دلفریب، خوبصورت اور توجہ طلب ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کی کتاب

شمشال بے مثال سے انتخاب۔

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

زمان کے فلیٹ سے نکلا اور افسوسناک انداز میں بار بار گردن جھٹکتے ہوئے گھر پہنچ گیا۔ راستے بھر میں فرید کی نالائق بلکہ کمینگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ انسان نہیں کوئی حیوان تھا بلکہ ایک درندہ تھا کیونکہ حیوان بھی اپنے والدین خصوصاً اپنی ماں کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کرتے۔ اس روز میں نے تہیہ کر لیا کہ اگر آئندہ کبھی فرید مجھے نظر آیا تو میں اس کا وہ حشر کروں گا جسے وہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔

☆☆☆

اللہ کا مجھ پر بڑا کرم ہے اور یہ بتاتے ہوئے میں فخر محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے جب بھی کسی کو انجام دینے کا ارادہ کیا، قدرت نے میری بھرپور مدد کی ہے۔ جلد پایہ دیر میں نے اپنے منصوبے کو نمایاں کامیابی کے ساتھ مکمل کیا ہے۔ یہی سب فرید کے معاملے میں بھی ہوا۔

سعید زمان سے ملاقات کو کم و بیش چھ ماہ گزر

چکے تھے۔ اب فرید کو دیکھتے تو دس ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ ایک روز وہ اچانک مجھے نظر آ گیا۔ وہ چھٹی کا دن تھا اور میں اپنے ایک دوست سے مل کر واپس آ رہا تھا۔ جب میری گاڑی طارق روڈ کے سگنل پر رکی تو اس پر میری نگاہ پڑی۔

اس کی حالت بے حد خراب ہو رہی تھی۔ اس کے بال گردوغبار سے اٹے ہوئے تھے۔ بدن پر جو لباس تھا اس پر میل کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا، وہ ایک عرصے سے نہایا ہے اور نہ ہی اس نے لباس تبدیل کیا ہے۔ اس نے آنکھوں پر مائیکل جیکسن اسٹائل کے سیاہ گلاسز بھی لگا رکھے تھے اور وہ اندھے فقیر کی اداکاری کرتے ہوئے بھیک مانگ رہا تھا۔ میں نے گاڑی کو ایک سائیڈ پر لگایا اور سبک قدموں سے چلتے ہوئے اس کے نزدیک چلا گیا۔

میں نے اسے صد فیصد شناخت کر لیا تھا لیکن اس کے انداز سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ اس نے مجھے پہچانا نہیں ورنہ مجھے دیکھ کر وہ ضرور چونک اٹھتا۔ اس سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ واقعتاً اندھا ہو چکا تھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ پھیلا کر صدا لگا رہا تھا۔

”آنکھوں والو..... اس اندھے کو کچھ دے جاؤ..... اللہ آپ کا بھلا کرے گا۔“

میں اس کے انتہائی قریب چلا گیا اور اپنی آواز بدل کر کہا۔ ”فرید! تم یہاں.....؟“

میں نے اپنی آواز کو اس لیے تبدیل کیا تھا کہ وہ مجھے پہچان نہ سکے۔ میرے منہ سے اپنا نام سن کر اس کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ چند لمحات تک وہ گولگو کی کیفیت میں کھڑا رہا پھر میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا مجھ سے پوچھ لیا۔

”آپ کون ہو..... اور مجھے کیسے جانتے ہو؟“

”ارے یار! میں بدرشاہ ہوں۔ تم گولیسار کی ایک دکان پر سیلز مین ہوا کرتے تھے نا۔“ میں نے بہ دستور تبدیل شدہ آواز کے ساتھ اپنا تہ بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہاری دکان پر اپنے بچوں کے کپڑے لینے آیا کرتا تھا مگر پچھلے آٹھ دس ماہ سے تم اس دکان پر نظر نہیں آ رہے ہو.....؟“

وہ کرب میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں نے اس دکان کی نوکری چھوڑ دی ہے صاحب۔“

اگرچہ میرا دل و دماغ فرید کے حوالے سے غصے اور نفرت سے بھرا ہوا تھا لیکن اس کی موجودہ حالت کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا تھا اور اسی تعجب نے میرے اندر تجسس کی آگ کو بھڑکا دیا تھا اور میں حقائق سے مکمل واقفیت حاصل کرنے کے لیے اس کا انٹرویو کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

”تم نے گارمنٹس شاپ کی نوکری چھوڑ دی اس میں کوئی برائی نہیں۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”لیکن یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے..... تم بھیک کیوں مانگ رہے ہو؟“

”صاحب! یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔“ وہ دکھی لہجے میں بولا۔

”کیا تم واقعی اندھے ہو چکے ہو یا تم نے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے یہ سیاہ عینک لگا رکھی ہے؟“ میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔

وہ مائیکل جیکسن اسٹائل کے گلاسز کو اپنی آنکھوں سے جدا کرتے ہوئے زخمی لہجے میں بولا۔ ”آپ خود دیکھ لیں صاحب۔ میں بنا ہوا اندھا نہیں ہوں بلکہ میری آنکھوں کی روشنی واقعی رخصت ہو چکی ہے۔“

میں نے اس کی بے نور آنکھوں میں جھانکا اور یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہو گئی کہ وہ اپنی بینائی کھو چکا تھا۔ میں نے تجسس سے لبریز لہجے میں دریافت کیا۔

”یہ کب ہوا.....؟“

”جس دن اماں کا انتقال ہوا اسی روز میری آنکھوں کی روشنی چھن گئی..... میں اندھا ہو گیا۔“ اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتایا۔

”اوہ.....“ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ”کب ہوا تمہاری والدہ کا انتقال اور کیسے؟“

”چند ماہ پہلے انہیں ہارٹ اٹیک آیا اور چل بسیں۔“ وہ روہانسا ہو گیا۔ ”بس، اسی روز میری آنکھیں بھی مجھ سے جدا ہو گئیں۔“ اس نے بلیک گلاسز لگاتے بتایا۔ ”..... میں اندھا ہو گیا..... ہمیشہ کے لیے۔“

سعید زمان کی زبانی مجھے فرید کی عاقبت نا اندیشی کی جو تفصیل پتا چلی تھی اس کی روشنی میں بڑے وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا تھا کہ ماں ایسی عظیم ہستی کے ساتھ ناروا سلوک کے نتیجے میں قدرت نے اس کی آنکھیں چھین لی تھیں۔ میں نے اپنے اندرونی غصے اور خفگی کو دبا کر فرید سے سوال کیا۔

”اور تمہاری بیچوں کا کیا ہوا؟“

گریبان

”کک..... کیا آپ..... میری بیٹیوں کو جانتے ہیں؟“ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

”ہاں، تم نے ایک دو بار ان کا ذکر کیا تھا۔“ میں نے سپویشن کو سنبھالا دیتے ہوئے کہا۔ ”شاید ان کے نام نورین، نازیہ، کرن اور مسکان تھے۔ تمہاری سب سے چھوٹی بیٹی مسکان میری بیٹی عائشہ کی ہم عمر تھی۔“

اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ مائیکل جیکسن اسٹائل گلاسز کے عقب سے آنسوؤں کا سیل آب رواں ہو گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ ”میری بچیاں رل گئیں صاحب..... وہ آج کل شاید اپنی تائی کے گھر میں ہیں۔ میں نے کافی عرصے سے ادھر چکر نہیں لگایا۔ پتا نہیں، وہ بے چاری کس حال میں ہوں گی.....!“

بے نور آنکھوں سے جاری آنسو بہ زبان خاموشی درد میں ڈوبی ہوئی داستان سن رہے تھے۔ میں نے اس کی حالت سے متاثر ہوئے بغیر پوچھا۔

”تمہاری بچیاں کیوں رل گئیں؟ وہ اپنی تائی کے گھر میں کیوں پرورش پا رہی ہیں؟ تمہاری بیوی کا کیا ہوا.....؟“

”صاحب! میری بیوی کا تو کئی سال پہلے کینسر سے انتقال ہو گیا تھا۔“ وہ غم سے بوجھل آواز میں بولا۔

”کینسر سے انتقال والی بات تم نے مجھے بتائی تھی۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ابھی میں تمہاری دوسری بیوی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ میں نے کسی سے سنا تھا، چھ ماہ پہلے تم نے دوسری شادی کر لی تھی!“

”آپ نے بالکل ٹھیک سنا تھا صاحب۔“ وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ”لیکن میری دوسری شادی ہو نہیں پائی تھی۔“

اس سے پہلے ہی سب کچھ تباہ ہو گیا۔ میں آنا فانا میں آسمان سے زمین پر آن گرا تھا اور میری بربادی کے پیچھے راشد کا ہاتھ ہے..... میرا چھوٹا سالار راشد!“

اس کی زبان سے راشد کا نام سن کر میں چونک اٹھا۔ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”کیا کر دیا تمہارے سالے نے..... تمہاری سسرال تو شاید حیدر آباد میں بھی نا؟“

”ہاں، وہ دونوں ماں بیٹا حیدر آباد ہی میں رہتے ہیں۔“ وہ نفرت آمیز انداز میں بولا۔ ”راشد اور عالیہ نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت میری جی جمائی زندگی کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ خدا انہیں غارت کرے۔“

عالیہ، فرید کی ساس تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ راشد اور عالیہ نے ایک منصوبے سے اسے اس حال کو پہنچایا تھا۔ اس

کی کہانی ایسے موڑ پر آ گئی تھی کہ میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔

”مجھے اپنی بربادی کی تفصیل بتاؤ۔ اس سے تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔“

”کچھ نہیں ہوگا صاحب۔“ وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔ ”دل کا بوجھ ہلکا ہوگا اور نہ روح کا عذاب کم لیکن آپ اتنی ہمدردی اور اپنائیت کے ساتھ مجھے اپنا قیمتی وقت دے رہے ہیں تو میں آپ کو ان دو شیطانوں کے کالے کرتوتوں کے بارے میں ضرور بتاؤں گا۔“

اس کے بعد فرید نے مجھے راشد اور عالیہ کے کارنامے کے حوالے سے جو کچھ بتایا اسے میں مختصر الفاظ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اس واقعے کے اندر درس عبرت چھپا ہوا ہے۔

فرید نے مجھے بتایا کہ آٹھ نو ماہ پہلے ایک روز راشد نے اسے فون کر کے یہ اطلاع دی کہ اس کی والدہ یعنی فرید کی ساس عالیہ کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ اپنی نواسیوں سے ملنے کے لیے ٹپ رہی ہے لہذا فرید بیچوں کو لے کر فوراً حیدر آباد آ جائے۔ اس موقع پر فرید نے اپنی ازلی ابدی حماقت کا ثبوت دیا اور چاروں بیٹیوں کے ساتھ حیدر آباد پہنچ گیا۔ ایک روز وہاں گزارنے کے بعد جب وہ واپس آنے لگا تو عالیہ نے یہ کہہ کر سب سے بڑی بیٹی نورین کو اپنے پاس روک لیا..... آج کل ویسے بھی اسکول کی چھٹیاں ہیں۔ نورین کو چند دن کے لیے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ میرا دل بہل جائے گا۔ یہ شکل و صورت میں بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ میں یہی سمجھوں گی کہ نفیہ میرے لیے زندہ ہو گئی ہے۔

فرید احمد ساس کی چال میں آ گیا۔ چند روز کے بعد حیدر آباد سے راشد نے فون کر کے اسے اطلاع دی کہ نورین کو کسی خطرناک گروہ نے اغوا کر لیا ہے۔ اغوا کنندگان نے دو لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کیا ہے۔ پولیس کو انفارم کرنے یا ان کا مطالبہ پورا نہ کرنے کی صورت میں وہ لوگ نورین کو قتل کر کے اس کی لاش کو کسی گندے نالے میں پھینک دیں گے۔

اس خبر سے فرید کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا۔ اس نے راشد سے کہا کہ وہ فوری طور پر اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ راشد نے انکشاف انگیز لہجے میں اسے بتایا کہ نورین کی زبانی انہیں تین لاکھ کی ریکوری کی کہانی معلوم ہو چکی ہے۔ بچیوں کے حصے کی رقم تو



بیج کا آدمی

ڈاکٹر شیر شاہ سید

زمانہ چاہے جو بھی ہو بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے والے پر دور میں اپنا فرض انتہائی ذمہ داری سے ادا کرتے ہیں۔ اکتوبر میں آنے والا زلزلہ جہاں بے شمار قیمتی جانوں کا دشمن ہوا وہیں کتنے ہی ایسے لوگوں کا کاروبار بھی چمکا گیا... جنہیں اپنے مفاد کے آگے کسی کے غم کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔

محتاجوں کے روپ میں غموں کے سودا گروں کی بے حس کا المیہ

وہ مجھے چکالہ لڑ پورٹ پر ملا تھا۔ بہت دنوں بعد اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی، میں بچپن سے اسے جانتا تھا، ہم دونوں ایک ہی اسکول میں زیر تعلیم رہے تھے۔ پرائمری، سیکنڈری اسکول تک ہر کلاس میں ساتھ رہے۔ اسکول کے بعد میں ڈی جے سائنس کالج میں داخل ہو کر پری میڈیکل پڑھنے چلا گیا جس کے بعد مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ آسانی سے مل گیا تھا۔ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میں ہڈیوں کی بیماری کا ماہر بننے کے لیے

رخصت ہو گئی۔ تم ایک اندھے فقیر کے روپ میں بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے ہو۔ اپنی اس تباہی و بربادی کا سبب جاننا چاہو گے.....؟“

”جی بتائیں صاحب.....“ وہ نجف سی آواز میں بولا۔ ”ٹھیک ہے، تمہاری آنکھیں چلی گئیں۔ تم دیکھ نہیں سکتے۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”لیکن اگر تمہارے احساس کی آنکھیں ابھی کھلی ہیں تو تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگا کہ تمہارا گریبان کس طرف ہے؟“

”جی، مجھے اپنے گریبان کا پتا ہے“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”لیکن آپ میرے گریبان کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟“

”سوال نہیں، صرف عمل۔“ میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔ ”اگر تمہیں اپنے گریبان کا علم ہے تو اسے ہاتھوں میں لے کر مجھے دکھاؤ.....“

اس نے میری ہدایت پر میکا کی انداز میں اپنا گریبان تھام لیا اور بولا۔ ”یہ ہے میرا گریبان۔“

”گریبان کی آئینے کے مانند ہوتا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اسی لیے سیاہی گریبان میں جھانکنے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ انسان کو اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا احساس ہو سکے۔ تم بھی اپنے گریبان میں جھانکو۔“

اس نے کسی روباٹ کے مانند میرے حکم کی تعمیل کی۔ ”اس وقت تک اپنے گریبان میں جھانکتے رہو.....“ ان الفاظ کے ساتھ میں نے اپنی گاڑی کی سمت قدم بڑھا دیے۔ ”جب تک تمہیں یہ یاد نہ آجائے کہ تم نے کب کب اور کہاں کہاں اپنی ماں کی شان میں گستاخی کی ہے۔ جب تمہیں یہ احساس ہو جائے کہ تم بارہا... ماں کے مقدس رشتے کی بے حرمتی کے مرتکب ہوتے رہے ہو تو صدق دل سے اقبال جرم کر لیتا۔ ہو سکتا ہے، قدرت کو تمہارے اقرار گناہ پر رحم آجائے.....!“

میں اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھا تو فرید کی دلخراش چیخ نے میری سماعت پر دھماکا کیا۔ میں نے گردن گھما کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ اپنے گریبان میں منہ ڈالے دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ میں نے خود کلامی کے انداز میں یہ کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی.....

نو منکر قانون مکافات عمل تھا
لے دیکھ ترا عرصہ محشر بھی یہاں ہے
تحریر: حسام بٹ

فلسڈ ڈیپازٹ میں پڑی ہے لیکن تمہارے ذاتی اکاؤنٹ میں ایک لاکھ روپے موجود ہیں۔ تم وہ رقم فوراً حیدر آباد پہنچاؤ۔ ایک لاکھ میں اپنے پاس سے ملا کر اغوا کنندگان کا مطالبہ پورائے کر کے نوین کو بازیاب کرتا ہوں ورنہ وہ ظالم لوگ نورین کو مار ڈالیں گے۔

اس موقع پر اگر فرید میرے پاس چلا آتا تو میں نہ صرف راشد کی سازش کو بے نقاب کر دیتا بلکہ فرید کے پاس ایسے ٹھوس ثبوت موجود تھے کہ جن کی بنا پر میں راشد، عالیہ اور انعام درانی کو ایک طویل عرصے کے لیے جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے پہنچا سکتا تھا۔ یہ سارا ڈراما فرید سے رقم تھہانے کے لیے رچایا گیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ عالیہ اس سازش میں شامل نہ ہو۔ غیر محسوس انداز میں اپنی ماں کو استعمال کر کے اس نے نورین کے اغوا کا کھیل کھیلا تھا جس میں وہ صد فیصد کامیاب رہا تھا۔ ایک بار تو میں نے فرید کو راشد کے ہاتھوں لٹنے سے بچا لیا تھا لیکن دوسری مرتبہ راشد کا داؤ چل گیا اور یہ سنہری مواقع راشد کو فرید کی حماقت نے فراہم کیا تھا۔ اس کی مت ماری گئی تھی جو میرے پاس آنے کے بجائے اس نے بے چون و چرا اس نے راشد کی بات مان لی تھی۔ اگر حقیقت پسندی کی نگاہ سے دیکھا جائے تو فرید کو الزام دینا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ جب قدرت کسی شخص کو نمونہ عبرت بنانے کا فیصلہ کر چکی ہو تو پھر اس سے قدم قدم پر ایسی ہی حماقتیں سرزد ہوتی ہیں۔ مجھے فرید کی حالت پر ترس تو آیا لیکن میں نے اس سے ایگری منٹ اور کیسٹ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ میں اگر چاہتا تو اب بھی ان دو ٹھوس ثبوتوں کی مدد سے راشد اور انعام درانی کے لیے کوئی بڑی پریشانی کھڑی کر سکتا تھا لیکن میں ہرگز ہرگز یہ غلطی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

فرید اپنی ماں کا مجرم تھا اور قانون مکافات کی گرفت میں تھا۔ جب کوئی شخص قدرت کی پکڑ میں ہو تو اس سے کئی کاٹ لینا چاہیے۔ آفاقی معاملات میں مداخلت کرنے سے بعض اوقات انسان کا بیڑا بھی غرق ہو جاتا ہے۔

میں بھی فرید سے شخص اظہار ہمدردی کر کے رہ گیا۔ ”مجھے تمہاری اس حالت پر افسوس ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہاری والدہ چلی گئی، تمہاری بچیاں در بدر ہو گئیں، تم ایک بھاری رقم سے ہاتھ دھو بیٹھے، دوسری شادی کا منصوبہ خاک میں مل گیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ تمہاری بیٹی

انگلینڈ چلا گیا۔ انگلینڈ سے واپس آ کر میں ایک رفاہی ادارے کے اسپتال میں کام کر رہا تھا۔ پہلے میں نے سرکاری ملازمت ہی کی تھی۔ میرا تقرر لاڈکانہ کے چانڈکا میڈیکل کالج میں ہوا، وہاں میں کام نہیں کر سکا بڑی مشکل سے ٹرانسفر کر کر اچچی کے سول اسپتال میں آیا تو یہاں کام کرنے کا انداز میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں نے خاموشی سے سرکاری نوکری چھوڑ دی اور ایک اور رفاہی ادارے سے منسلک ہو گیا۔ میری نئی پریکٹس اچھی چل رہی تھی اور زندگی خاصے آرام سے گزر رہی تھی۔ میڈیکل کے پروفیشن میں شروع کے چند سال مشکل کے ہوتے ہیں، ایک بار کام آ جائے تو پھر نہ کام کی کمی ہے اور نہ ہی دولت کی۔ اگر ایمانداری سے بھی کام کیا جائے تو عزت کے ساتھ زندگی گزاری جاسکتی ہے۔

رفیق نے بھی میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا مگر اس کے بعد ہمارے راستے جدا ہو گئے۔ وہ کامرس میں ڈگری کا امتحان پاس کر کے خاندانی کاروبار میں لگ گیا۔ ان لوگوں کا بڑا کاروبار تھا جو روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ وہ لوگ شہر کے ہی نہیں بلکہ ملک کے بڑے لوگ تھے۔ ہماری کبھی بھی دوستی نہیں رہی۔ اسکول سے کالج تک ہم دونوں ایک دوسرے کو ناپسند کرتے رہے، مجھے یہ جانے کیوں اس کے ساتھ ہمیشہ ایک الجھن سی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے کبھی اس سے دوستی بڑھانے کی کوشش نہیں کی، شاید اس کی وجہ میرا اس سے جھگڑا تھا۔

رفیق سے میرا پہلا جھگڑا اس دن ہوا جب چوتھی کلاس میں اس نے مجھے اپنا پنسل شارپنر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت لکھتے لکھتے میری پنسل ٹوٹ گئی تھی اور میرے پاس شارپنر نہیں تھا۔ میں نے جب اس سے شارپنر مانگا تو نہ صرف یہ کہ اس نے مجھے شارپنر نہیں دیا تھا بلکہ بڑے غصے سے کہا تھا کہ اپنا سامان خود لایا کرو۔ اس دن میں نے تقریباً روتے ہوئے پیپر سے شکایت کی کہ رفیق مجھے شارپنر نہیں دے رہا ہے۔

پیپر نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ میں تمہیں ابھی شارپنر دیتی ہوں اور پھر انہوں نے اپنی دراز سے شارپنر نکال کر مجھے دیا۔ ”رفیق اپنا بخار کسی کو نہ دے، تمہیں اپنا شارپنر کہاں دے گا۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے کچھ عجیب لہجے میں کہا تھا۔ میں یہ بات کبھی نہیں بھولا۔ اس دن کے بعد سے میں نے اس سے کوئی چیز نہیں مانگی اور کبھی اپنے پاس سے کوئی چیز کسی کو دینے سے انکار نہیں کیا۔

عجیب قسم کے تعلقات تھے ہمارے۔ شاید ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی خرابیوں، ناکامیوں اور مایوسیوں کا حساب رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ اسکول کا ساتھ طویل ہوتا ہے اور اس طویل ساتھ میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ہم بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اسکول کے زمانے کا تجربہ تمام عمر ساتھ نہیں چھوڑتا۔ وہ ذہن کے کسی گوشے میں چھپا رہتا ہے اور یکا یک ایک دن یاد آتا ہے کہ ”ارے یہ تو پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اچھا یا برا۔“

شمالی علاقوں میں زلزلے کے بعد پہلے دن ہی میں کچھ دوسرے ڈاکٹروں اور رضا کاروں کے ساتھ ایبٹ آباد روانہ ہو گیا تھا۔ ایبٹ آباد سے ہم لوگ مانسہرہ ہوتے ہوئے مظفر آباد پہنچے۔ پنڈی سے مظفر آباد تک لوگوں کا عجیب حال تھا۔ زلزلے کے اوائل کے دنوں میں ہر شخص کی حالت میں تھا، انجانا خوف، موت سے قربت کا احساس، ہر شخص ایماندار سا ہو گیا تھا۔

مظفر آباد کا برا حال تھا۔ شہر کے اندر ساٹھ ستر فیصد سے زیادہ عمارتیں زمیں بوس ہو گئی تھیں۔ کوئی عمارت محفوظ نہیں رہی تھی۔ بچے اسکول میں، عورتیں گھروں میں، مرد اپنے دفاتروں اور ڈاکٹر نہیں مریضوں کے ساتھ دیواروں چھتوں کے نیچے زندہ دفن ہو گئے تھے۔ ایسی تباہی و بربادی میں نے شاید فلموں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ عمارتیں گر گئی تھیں، پہاڑ پھسل کر زمین پر آ گرے تھے، دریائی نالوں نے راستے بدل لیے تھے۔

مظفر آباد کا میدان میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ سیکڑوں انسان میدان میں زخمی پڑے ہوئے تھے اور ہم چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ زخموں کو صاف کریں، انہیں درد اور انفیکشن کے خلاف دوائیں دیں اور انتظار کریں کہ یہ سارے لوگ مرنے جائیں کہیں، اس وقت تک جب تک کہ اسپتال دوبارہ کام شروع کریں۔ تھیر میں کام شروع ہو جائے۔ پلاسٹر لگنے لگے، مریضوں کو بے ہوش کیا جاسکے، آپریشن کر کے ان کے زخم، جسم و جاں سے مواد مٹی نکالا جاسکے اور ہڈیوں کو جوڑا جائے۔

انسانوں کو اتنا مجبور، لاچار اور مایوس میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ صبح سے شام تک لوگ اپنے گھرے ہوئے گھروں کے سامنے بین کرتے رہتے۔ میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوں۔

لوگ سڑک کے کنارے آنکھوں میں ویرانی لیے بیٹھے ہوئے نہ زبان سے کچھ کہتے اور نہ ہی آواز سے روتے، صرف آنسوؤں کی لڑیاں تھیں جن سے ان کا چہرہ تر رہتا۔ زخمی ہاتھوں سے، ٹھیکے داروں کے بنائے ہوئے مکانوں کے بلے کو اٹھانے کی کوشش کرتے رہنا شاید ان کا کام بن گیا تھا۔ جن لمحوں میں گھر کے مرد بے قراری کے ساتھ اپنے گھر کے بلے کے گرد چکر لگاتے رہتے تھے، ان کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ بلے میں دبے ان کے پیاروں کے چیخنے کی صدا آہستہ آہستہ موت سے ہمکنار ہو گئی تھی۔ وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے، کچھ نہیں کر سکے، صرف اوپر دیکھتے تھے اور بے بسی سے سر جھکا لیتے تھے۔

تین دن میں ہمارا تھیر اور کیمپ اسپتال بن گیا۔ کام اس قدر تھا کہ وقت کے گزرنے کا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ ہمارے علاوہ اور بھی کئی ٹیمیں علاقے میں آ گئی تھیں۔ پاکستان اور پاکستان سے باہر کے لوگ۔ سعودی عرب، ترکی، ایران، امریکا، برطانیہ اور روسی ٹیموں کا آنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن کیوبا اور یوکرین کے رضا کار بھی یہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ان میں خدمت کا جذبہ، ان کے کام کا انداز، نہ کوئی لالچ اور نہ کسی معاوضے کا انتظار۔ یہ سب لوگ عجیب و غریب تھے۔

ہر کوئی اپنے سامان، آلات، دواؤں کے ساتھ تندہی سے کام میں مصروف تھا۔ اتنی بڑی تباہی کے بعد اتنے زیادہ لوگوں کا موبائلز ہونا بھی میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

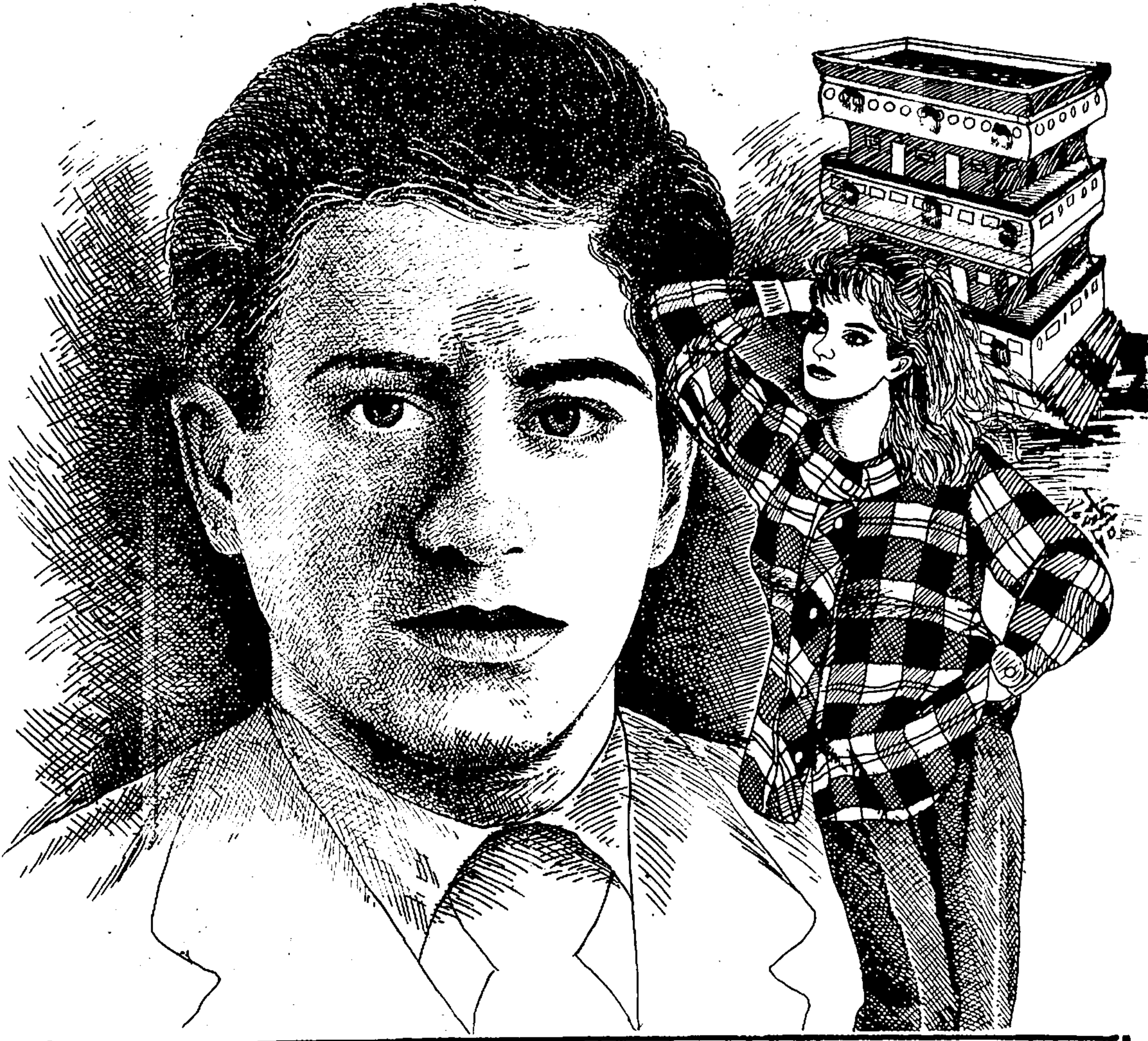
دسویں دن مجھے کراچی جانا پڑ گیا۔ کچھ سامان کی اشد ضرورت تھی اور کچھ لوگوں سے امداد کے سلسلے میں ملنا بھی تھا۔ ایک دوست نے یہ انتظام کر دیا تھا کہ کراچی پہنچنے کے دوسرے دن انر فورس کے جہاز میں سامان لا کر چکالہ ائر پورٹ واپس پہنچ جاؤں۔

رفیق سے ملاقات چکالہ ائر پورٹ پر ہوئی۔ وہ کسی فوجی جزل کے ساتھ تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا، ہم دونوں نے ہاتھ ملایا، حالات پوچھے۔ وہ ایبٹ آباد جا رہا تھا، اس سے زیادہ بات نہیں ہو سکی۔ میں اپنا سامان ٹرک میں لا کر اسی وقت مظفر آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ مظفر آباد کا راستہ کھل چکا تھا اور لوگوں کی آمد و رفت بڑھ رہی تھی۔ زلزلے کے جھٹکوں کا سلسلہ اب بھی جاری تھا جس کی وجہ سے سر اسیمبلی کا عالم تھا، لوگ خوفزدہ تھے اور گھروں کے باہر کھلی جگہوں میں رہ رہے تھے۔ حالات میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔

زلزلہ تو ایک بہانہ تھا، ہزاروں سال کی غربت ایک زلزلے کی امداد سے تو ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ان کے گھر جو خالی تھے وہ گر گئے تھے۔ مرد اور عورتیں جو پہلے ہی بہت کمزور تھے، مر گئے تھے یا زخمی ہو گئے تھے۔ ان کے بچے جن کی نشوونما میں کمی تھی سڑکوں پر کھڑے امدادی سامان جمع کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ خالی گھر، خالی جیب، غربت، مجبوری، ننگے پاؤں، ننگے جسم، ان سب سے تو نمٹا جاسکتا تھا مگر ذہنی افلاس کی بعض شکلیں دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ دنیا بھر کی امداد کے باوجود ذہن کا افلاس ختم نہیں ہو سکے گا۔ ذہن کا وہ افلاس جسے ختم کرنے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ تعلیم جو دماغ کو روشن کرتی ہے۔ زندہ رہنے کے مقصد کا تعین کرتی ہے۔ یہاں تو جاہل لوگ تھے، روایتوں کے غلام اور اپنے آپ کے قیدی۔

اسی افراتفری کے عالم میں مظفر آباد کے خالی گھروں میں ڈاکے پڑے اور چوریاں بھی ہوئیں۔ رات کے سناٹے میں لوگوں نے گھڑی ہوئی گاڑیوں کے پیچھے اتار لیے، شیشے توڑ کر کیسٹ اور ریڈیو نکال کر لے گئے۔ جب کچھ بھی نہ مل سکا تو سیٹیں اتار کر لے گئے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ معاشی طور پر غریب لوگ ذہنی طور پر بھی اتنے غریب ہوں گے۔ ٹرکوں کے پیچھے امدادی سامان کے لیے بھاگتے ہوئے لوگ، مذہبی تعلیم اور مذہب سے وابستہ لوگ بھی اتنے کمتر ہو جائیں گے، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ مذہب انسان کو اندر سے مضبوط بناتا ہے، انہیں اس قابل کرتا ہے کہ وہ حالات سے مقابلہ کر سکیں کیونکہ مذہب کی تو ابتدا ہی یقین سے ہوتی ہے۔ آنکھیں بند کر کے ایک ایسی ذات پر یقین جس کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ملتا، جو صبح کرتا ہے، شام کرتا ہے، جو جان لیتا ہے، تو زندگی بھی دیتا ہے۔ اس ذات پر یقین کے باوجود انسانوں کا اتنا حقیر ہو جانا مجھے اچھا نہیں لگا لیکن میرے اچھا لگنے نہ لگنے سے کیا فرق پڑتا ہے، دنیا کا نظام تو شاید ایسے ہی چل رہا ہے، شاید ایسے ہی چلتا رہے گا، انسانوں کا روگ نہ سمجھ میں آنے والا ہے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ نہ تو دنیا میں پہلے کوئی تبدیلی آئی تھی اور نہ ہی اب آئے گی۔ میں نے دل کو یہ سوچ کر تسلی دی تھی۔

رفیق سے دوسری ملاقات مظفر آباد میں ہی ہوئی۔ وہ عباس میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں ملا تھا۔ میں آپریشن کے بعد



امیدِ دنو

مظہر سلیم ہاشمی

جس طرح الٹے پیروں سے کوئی آگے کی طرف نہیں بڑھ سکتا اسی طرح الٹی گنتی گننے سے انیتوں میں اضافے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اس کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا مگر اچانک الٹی گنتی مکمل ہوتے ہی نئی زندگی کا کچھ یوں آغاز ہوا کہ وہ خود دنگ رہ گئی اور پھر اس کی انیتوں کے سارے کانٹے دھیرے دھیرے نکلتے چلے گئے۔

امیدو... ایک ایسا مضبوط سہارا بن گئی کہ لڑکھڑائے قدموں میں مضبوطی آ گئی

دس..... کے لیے پرجوش تھے، وہاں اس کا دماغ مختلف خیالات کی اٹی نکتی شروع ہو گئی تھی، پرانے سال کے خاتمے کی بھی اور اس کے ذہن کے درپچوں میں اپنی زندگی کی بھی۔ نیویارک ٹائم اسکوائر پر انسانوں کی بھیڑ موجود تھی۔ اس نے سال کی خوشی میں جہاں لوگ آنے والے وقت بارونق ریسٹوران سے وہ اس ہجوم کو نئے سال کو خوش آمدید کہتا

سپینس ڈائجسٹ 151 جنوری 2018ء

”ہاں اس دن چکالہ پر بھی میں نے تمہیں دیکھا تھا ایک جنرل کے ساتھ، وہ کیا چکر تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

”کچھ نہیں“ جنرل صاحب سے تعلقات بنا رہا تھا۔ زلزلے کے شروع کے دن تھے، مجھے پتا تھا، اب سامان کی خریداری کریں گے، کروڑوں اور اربوں روپوں کی خریداری ہوگی۔ دنیا بھر سے ملنے والی امدادی رقوم بینک میں تو نہیں پڑیں رہیں گی۔ سامان آئے گا اور جب سامان آئے گا تو ہمارے جیسے سپلائر کے ذریعے سے ہی آئے گا۔ کیا خیال ہے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا پھر تھوڑی دیر رک کر بولا۔

”یار یہ لوگ ہیں بڑے قسمت والے، بے چارے سیاستدانوں کے ساتھ اوپر والے نے بڑی نا انصافی کی ہے۔ نہ کوئی زلزلہ، نہ کوئی بن لادن، نہ کوئی طوفان، نہ کوئی سیلاب اور نہ ہی کوئی وبائی بیماری کا حملہ، پیسے خریداری کمیشن کا موقع تو ایسے وقت ہی ملتا ہے۔ عیاشی ہو گئی عیاشی ان لوگوں کی اور ساتھ میں میری بھی۔ ایسا کانٹیکٹ ہو گیا ہے میرا نیچے سے لے کر اوپر تک، ہر طرح کے سامان کے حصول کے لیے لوگ مجھے ہی کانٹیکٹ کرتے ہیں پھر میں خریداری کر دیتا ہوں۔“

”اور کیا کیا خریداری کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”نہیں خریداری میں نہیں کر رہا۔ لوگوں کے پاس چیزیں ہیں وہ اپنی چیزیں لے آتے ہیں، کچھ بھی ہوا ایم آر آئی سے لے کر موبائل اسپتال اور ٹینٹ سے لے کر لیبارٹری کا سامان، میں ایسے حالات پیدا کر دیتا ہوں کہ حکومت کے اہلکار ان چیزوں کی ضرورت کو جائز قرار دے دیتے ہیں پھر خریدنے کا فیصلہ بھی ہو جاتا ہے، مجھے کمیشن مل جاتا ہے۔ مجھے تھوڑا کمیشن آگے بھی بڑھانا ہوتا ہے۔ کام ذرا مشکل ہے مگر ہو جاتا ہے۔ میں نے تو ایسی ایسی چیزوں کی خریداری کرادی ہے جن کی شاید کبھی ضرورت ہی نہ پڑے۔ میں ایسے کام کو پینچ سمجھ کر کرتا ہوں۔ حکومت کے پاس پیسہ، لوگوں کے پاس سامان اور میرے تعلقات۔ تعلقات ہیں تو فائدے ہوں گے نا۔“ اس نے ہنستے ہوئے خیر یہ انداز میں کہا تھا۔

اس وقت مجھے اسکول ٹیچر کی بات یاد آ گئی کہ ”رفیق تو اپنا بخار بھی مفت میں نہیں دیتا ہے، پتیل شارپنر کیا دے گا۔“

دوسریضوں کو عباس انسٹی ٹیوٹ کے باہر بنے ہوئے ایک میڈیکل کیپ میں چھوڑ کر واپس آ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ رفیق دوعربوں کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ سے باہر نکل رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی مگر وہ رکا نہیں۔ میرے سامنے لمبی لمبی چار گاڑیوں کے کارواں میں بیٹھ کر شاید وہ لوگ پنڈی کی جانب واپس چلے گئے تھے۔

بعد میں پتا چلا کہ وہ عرب شیوخ عباس انسٹی ٹیوٹ کے لیے الٹرا ساؤنڈ مشین، ایم آر آئی یا سی ٹی اسکین اور لیبارٹری کا سامان دینے آئے تھے۔ میں نے دل میں سوچا کہ ابھی اس قسم کی چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ سی ٹی اسکین کا کیا ہوگا اور ہائی کلاس لیبارٹریز کا کیا کام ہے۔ ابھی تک عباس انسٹی ٹیوٹ کے اندر اور باہر لوگ زمین پر پڑے ہوئے ہیں، ان کے پاس چادر، کمبل، لحاف اور کفن تو ہے مگر بستر نہیں ہے۔ جو ٹھنڈ میں پڑے ہیں، ان کے پاس ہیٹر نہیں ہیں۔ سلیپنگ بیگ نہیں ہیں۔ میں نے سوچا کہ جس ملک میں عام حالات میں لوگ لیبارٹری نہیں چلا سکتے وہ اس ایمرجنسی کی صورت میں کیا چلائیں گے۔ جہاں نرس مہیا نہیں، وہاں سی ٹی اسکین کے ٹیکنیشن کہاں سے آئیں گے۔ میرے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا، سوالات بے شمار تھے مگر ان سب کا جواب کوئی نہیں ملا۔

ایک ہفتے بعد رفیق سے پھر ملاقات ہو گئی۔ میں ایک مریض کو، جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، پنڈی چھوڑ کر آ رہا تھا۔ مانسہرہ سے نکل کر شاہنواز چوک کے آگے گرین ویلی ریسٹورنٹ میں ایڈمی ایسولینس کے ڈرائیور اور رضا کاروں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ ٹویوٹا کی فور وکیل ڈرائیور دو شاندار گاڑیاں آ کر رکیں۔ اس میں سے رفیق کچھ اور لوگوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ وہ لوگ اندر کمرے میں چلے گئے مگر رفیق مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گیا تھا۔

”کراچی سے زیادہ یہاں ملاقاتیں ہو رہی ہیں ہماری۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”صحیح کہہ رہے ہو، وہاں ہم لوگ ایک دوسرے کا راستہ بھی نہیں کاٹتے۔ یہاں کیسے آنا ہو گیا؟“ میں نے اس سے پوچھا تھا۔

”ارے یہ ورلڈ بینک کے لوگ ہیں، انہوں نے... بالکوٹ کے لیے ایک موبائل اسپتال جرمنی سے خریدا ہے، کروڑوں کا سودا ہے، میں اسی لیے ان کے ساتھ ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

دیکھ سکتی تھی۔ اپنی روم میٹ رینا کے کہنے پر وہ آتوگئی تھی لیکن اب تنہائی کا احساس بڑی شدت سے عود آیا تھا۔ شراب کے نشے میں دھست..... ارد گرد تھمتلتے چہرے بھی اسے خوش کرنے سے قاصر تھے۔ ناچتے، گاتے اور خوشیاں مناتے لوگ اس کے درد میں اضافے کا سبب بن رہے تھے۔ ویسے بھی وہ اپنے علاوہ کوئی ایسا شخص نہیں دیکھ پارہی تھی جو اس کی طرح ہاتھ میں بیڑی جگہ کوک کی بوتل لیے گھوم رہا ہو۔

دعا چودھری ایم فل اسکالر شپ ہولڈر..... امریکا آکر پاکستان کو تو بھول گئی تھی لیکن اپنی ذات سے چاہنے کے باوجود پاکستانیت نہ نکال پائی تھی مقیدس مکمل کرنے کے بعد اس نے یہاں ایک جاب کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ پانچویں جماعت کی طالبہ تھی جب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اس نے اپنے والدین کو کھو دیا تھا۔ والدین کی حادثاتی وفات کے بعد اس نے بڑا کڑا وقت دیکھا تھا۔ چچا اپنی ذمہ داری سمجھ کر اسے اپنے گھر تو لے گئے لیکن چچی کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ”ارے اپنے بچوں کا پورا کریں ہم یا اب اس یتیم کو پالیں.....“ چچی کی اپنی سہیلیوں سے کی گئی باتیں کسی نشتر کی طرح اس کے سینے میں کھتی محسوس ہوتی تھیں۔ گو وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد نہ تھی لیکن ٹریفک حادثے میں اس نے والدین کے ساتھ اپنے چھوٹے بھائی علی کو بھی کھو دیا تھا۔ اس لیے اس کی کمی کو دور کرنے کے لیے وہ اپنے عم زادوں کے ساتھ بہت مانوس ہو گئی۔ وسیم اور کلیم اگرچہ اس سے چھوٹے نہ تھے لیکن انہوں نے بھی اس کو بہن کے رتبے سے نوازا اور زندگی کی تنخیاں کچھ کم ہونے لگیں.....

بچپن سے جوانی کتنی تیزی سے آئی تھی وہ یہ اندازہ نہیں کر پاتی تھی لیکن چچی کی دور بین نگاہیں اب ایک مستقل عذاب گلے پڑنا محسوس کر رہی تھیں۔ ”یہ گھر میں دو پٹا تیز سے لیا کر۔“ بات کچھ غلط نہ کی تھی لیکن چچی کے انداز نے دعا کا جی ملول کر دیا تھا۔ بچپن میں کام کرتے..... گرمی سے بے حال ہو کر اس نے دو پٹا ایک طرف لٹکا دیا تھا۔ رونی دینے کے لیے وہ جب اپنے چچا اور کزنز کے پاس آئی تو جلدی میں مناسب انداز میں نہ اوڑھ سکی تھی۔

چچی نے بھی باقی لوگوں کی موجودگی کا لحاظ کیے بنا اسے بے نقط سادی تھیں۔ چچی کی کبھی بات سے زیادہ اسے دکھ اس بات کا ہوا تھا کہ اسے اپنے بھائیوں جیسے کزنز کے سامنے

ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔

”بچی ہے زبیدہ..... پیار سے سمجھا دیا کرو.....“ چچا نے اپنی بیگم کی اس ڈانٹ پر دعا کی طرف داری کرنے کی کوشش کی۔

”ارے بچی ہی تو نہیں رہی..... کتنا سمجھاتی ہوں اس کو پر اس کے تو کان پر جوں تک نہیں رینگتی.....“ وہ اس کے سراپا... پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولیں۔ ”اب کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو سب نے مجھے ہی الزام دینا ہے کہ میں اس کی ماں تو تھی نہیں اس لیے اس کی تربیت پر دھیان نہ دیا.....“

اس سے زیادہ سننے کی تاب دعا میں نہ رہی اور وہ کچن میں واپس آگئی..... روتے بلکتے اس نے باقی کام نٹائے..... اس دوران اس نے ایک فیصلہ کیا اور پھر اس پر عمل بھی کر ڈالا۔ اس دن کے بعد اس نے اپنے کمرے سے باہر جب بھی قدم باہر نکالا حجاب کے ساتھ ہی نکالا۔ گرمی ہو یا سردی دوپٹا اس کے جسم کا ایک لازمی جز بن کر اس کے ساتھ رہتا تھا.....

سات..... ”وسیم اور کلیم کے ساتھ اکیلے وقت گزارنا بند کر دو..... بڑے ہو گئے ہیں اب وہ..... اور تم بھی.....“ چچی کے لہجے میں ایک جھین سی تھی جس نے اس کی روح تک کو پھلتی کر دیا۔ ”پر چچی میرے بھائی ہیں وہ.....“ اس نے دے لہجے میں احتجاج کا آغاز ہی کیا تھا کہ چچی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بھائی نہیں ہیں..... چچا زاد ہیں تمہارے..... جوان ہو گئے ہیں..... کل کلاں کو کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو میں خاندان بھر میں کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہوں گی.....“ وہ اس کی ذہنی حالت کی پروا کیے بغیر اپنی ہی دھن میں بولے چلے جا رہی تھیں۔

وسیم دعا سے کوئی آٹھ ماہ بڑا تھا اور کلیم چھ ماہ چھوٹا تھا۔ آٹھ سال پہلے جب وہ چچا کے گھر مستقل آئی تھی تو محض گیارہ برس کی تھی۔ ان آٹھ برسوں میں اس نے کبھی بھائیوں سے بڑھ کر ان دونوں کے بارے میں کچھ نہ سوچا تھا لیکن چچی اپنی باتوں سے کچھ کے لگانے سے باز نہ آتی تھیں۔

تینوں اب کالج کے طالب علم تھے لیکن..... بھائی بہنوں والی اپنایت سے رہتے تھے۔ دعا دونوں بھائیوں کے کام ایسے بھاگ بھاگ کر کرتی تھی جیسے ان کی سگی بہن ہو اور وہ بھی سگی اس کو بہن سے کم کا درجہ نہ دیتے تھے۔ رشتوں کا تقدس ہمیشہ قائم رہتا تھا لیکن چچی کی گاہے بگاہے کی گئی باتیں بعض اوقات اس پر عجیب سی کیفیت طاری کر دیتی تھیں..... ایک عجب سی پھانس تھی جو سینے میں اٹک جاتی تھی..... ایک

احساس تھا جو اسے گناہ جیسا لگتا تھا..... وہ اس کیفیت کو کبھی کوئی نام نہ دے پائی تھی۔

پچھلے تین سال سے وہ مسلسل حجاب لینے کی عادی تھی۔ اس دوران چچی نے سب کے سامنے بائیں سنانے والا کام تو بند کر دیا تھا لیکن تنہائی ملتے ہی وہ اس کو یہ باور کراتی رہتی تھیں کہ وہ ان کے بیٹوں سے زیادہ میل جول نہ رکھا کرے۔ شاید ان کا دل نہیں مانتا تھا کہ اپنے شہزادے جیسے بیٹوں کے لیے ایک ایسی یتیم لڑکی کو بہو بنالائیں جو انہی کے ٹکڑوں پر پل رہی تھی۔ ”جی چچی..... آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا.....“ وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔

چھ..... آج وہ بہت خوش تھی..... اس کا بی ایس سی کا رزلٹ فرسٹ گریڈ رہا تھا۔ اب اس کا اپنے پسندیدہ شعبے میں داخلہ لینے کا امکان بڑی حد تک بڑھ گیا تھا۔ یونیورسٹی کا بہترین ڈیپارٹمنٹ مائیکرو بیا لوجی ہونے کے باعث اکثر طلبہ و طالبات اسی کا..... انتخاب کرتے تھے لیکن ہر سال مقابلہ سخت ہی ہوتا جا رہا تھا۔

کالج سے واپسی پر وہ چچا کو یہ خبر سنانے کے لیے جا ہی رہی تھی کہ ان کے کمرے سے آنے والی آوازیں سن کر ٹھٹک کر رک گئی۔

”وسیم کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے..... ساری عمر بہن بنا کر رکھا اور اب اسی سے بیاہ رچانے کی فرمائش کر بیٹھا ہے.....“ چچی کی آواز میں دنیا بھر کا زہر بھرا تھا۔ ”لیکن اس کی سگی بہن تو نہیں ہے..... یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتی ہو زبیدہ.....“ چچا نے قطعیت سے کہا، دعا کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔

”لوگ کیا کہیں گے..... یتیم لڑکی کی پرورش اس لیے کی کہ اپنے ہی بیٹے سے بیاہ کر اس کی جائیداد پر قبضہ جما لیا.....“ چچی نے فوراً پیترا بدل کر وار کیا۔ ”ہم..... یہ تو ہے.....“ چچا کسی سوچ میں پڑ گئے تھے۔

”ویسے بھی جمیلہ شاید اپنے بیٹے کے لیے اسے نظر میں رکھے ہوئے ہے.....“ چچی نے انہیں نرم پڑتے دیکھا تو ان کی بہن کے حوالے سے ایک ہوائی اڑادی۔

دعا وہاں سے بوچھل قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی..... اس کو یہ باتیں بالکل بھی بری نہ لگتیں لیکن رات کو اس نے چچی کو وہ سب کہتے سنا جو اسے بالکل نہیں سننا

چاہیے تھا۔

”ارے تم کیا جانو میں نے کتنا اس کمینی سے کہا کہ وسیم اور کلیم تمہارے بھائی ہیں لیکن مجال ہے جو اس چالباز لڑکی پر کوئی اثر ہوا ہو..... بہن بھائیوں والی حیا شرم تو باقی نہیں رہی اس میں..... جانے کیا جادو کیا ہے میرے معصوم دل پر کہ وہ اس کے کن گاتا شادی کی فرمائش کر بیٹھا ہے.....“ سچ کہا تھا تم نے..... اس کو اپنے بیٹوں سے دور ہی رکھوں تو بھلائی ہے ورنہ اس نے ان کو پھانس لیتا ہے..... ویسے بھی میرے بیٹے کے ساتھ کیا جوڑ بنتا ہے..... چند ماہ چھوٹی ہے اس سے..... کچھ ہی عرصے میں پڑھی لکھنے گی.....“ چچی غالباً فون پر اپنی بہن سے باتیں کر رہی تھیں لیکن چھریاں دعا کے دل پر چل رہی تھیں۔

پانچ..... وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ مائیکرو بیا لوجی میں دعا جیسا لائق اسٹوڈنٹ کوئی بھی نہ تھا۔ وسیم کی شادی اس کی خالہ زاد لائبرے ہونے کے بعد وہ چچا کے گھر سے لائق سی ہو گئی تھی۔ یہ کہنا زیادہ بہتر تھا کہ اسے لائق کر دیا گیا تھا۔ وہ تو چچی اور لائبرے کی وجہ سے مستقل ہاسٹل شفٹ ہو جانا چاہتی تھی لیکن چچا کے کہنے پر رک گئی۔

تعلیمی معاملات میں اس کی والدہ کے آبائی گھر سے وصول ہونے والا کرایہ مددگار تھا۔ معاشی حالات اس کے چچا کی فیملی سے بہت بہتر تھے لیکن جذباتی معاملات میں وہ کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ سسٹی، لپٹی رہنے والی وہ یونیورسٹی میں اچھے دوست بھی نہ بنا سکی۔

”میں الگ گھر میں رہنا چاہتا ہوں..... ویسے بھی اس ساڑھے تین کمروں کے مکان میں رہنا مشکل ہوتا جا رہا ہے.....“ وسیم نے کھانے کی ٹیبل پر یہ مطالبہ کسی ہم کی طرح پھوڑا تھا۔

اس بات پر بہت ہنگامہ ہوا۔ چچی جو اپنی بھانجی پر جان چھڑکتی تھیں ایک دم ہی نراس ہو گئیں۔ بہتیری کوششوں کے باوجود وسیم اپنی بیگم کے ساتھ علیحدہ گھر میں منتقل ہو گیا۔ گھر کی آمدنی بھی آدھی رہ گئی اور اس پر مستزاد چچی کو جذباتی صدمہ بھی شدید پہنچا تھا۔ دعا نے ان کی ہر طرح سے خدمت کی..... چچی اب اس کے ساتھ بری زبان استعمال نہیں کرتی تھیں..... لیکن دعا کے دل میں چھپی پھانس کیسے نکلتی، وہ خود بھی یہ بات نہیں جانتی تھی.....

چار..... ”چچا میرا اسکالر شپ ہو گیا ہے.....“ اس نے بڑی خوشی کے ساتھ اپنے چچا کو بتایا۔

”بہت بہت مبارک ہو میری بیٹی کو..... مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ میری بیٹی بہت قابل ہے.....“ چچا نے حقیقی مسرت کا اظہار کیا۔

چچی نے بھی مبارک تو دی تھی لیکن بڑے بچے دل کے ساتھ..... وہ خوش نہیں لگ رہی تھیں۔

امریکا کا فل برائٹ اسکا لرشپ دعا کے علاوہ اس کی ایک اور کلاس فیلو کو بھی ملا تھا۔ اس کے والد نے تمام بیرونی امور اپنے ہاتھ میں لے لیے اور ویزے کا جھٹ پٹ انتظام کر دیا تھا۔

جہاں اعلیٰ تعلیم اتنے اعزاز سے حاصل کرنے کی خوشی تھی وہاں پر دعا کو چچا سے دور جانے کا غم بھی کھائے جا رہا تھا۔ چچی تو کم صدم تھیں ہی لیکن کلیم نے بھی بات چیت اس سے کم کر دی تھی۔

”تم کیوں منہ پھلائے رہتے ہو مجھ سے؟“ دعا نے ایک دن آخر پوچھ ہی لیا۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا..... امی اور ابو ہی آج تمہیں بتا دیں گے.....“ وہ زخمی لہجے میں بولتا وہاں سے اٹھ گیا۔ دعا ہکا بکا اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

”بیٹا..... میں چاہتا ہوں کہ جانے سے قبل تمہارا نکاح کلیم سے کر دیا جائے.....“ چچا بولے تو دعا چونک کر رہ گئی اور حیرانی سے چچی کی جانب دیکھا جو نظریں جرا رہی تھیں۔

”میں تو چاہتا تھا کہ تم وسم کی دہن بنیں لیکن اچھا ہی ہوا جو اس ناخلف کا بیاہ تمہارے ساتھ نہ ہو سکا..... ورنہ میں تمام عمر پچھتا تا رہ جاتا..... تمہاری چچی کے علاوہ کلیم کی بھی یہی مرضی ہے..... اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے..... تم کیا کہتی ہو؟“ چچا کی باتیں اسے زیر بار کرتی چلی جا رہی تھیں۔

ایک نظر چچی کی جانب اس نے دیکھا..... آج موقع ملا تھا اسے برسوں کی پھانس دل سے نکالنے کا..... آج وہ اپنا سارا حساب چکاتا کر سکتی تھی.....

کتنی اذیتیں..... کتنے طعنے سنے تھے اس نے..... سب کا بدلہ اتارنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

”میں کیسے کلیم سے شادی کر سکتی ہوں؟ وہ تو میرا بھائی ہے.....“ اس کے لہجے میں چھپا طنز بیدہ بیگم محسوس کیے بنانہ رہ سکی تھیں۔

”شادی تو جوڑ والیوں کے ساتھ ہونی چاہیے..... اور میں تو اس سے چھ ماہ بڑی ہوں..... کچھ عرصے بعد ہی میں بوڑھی لگنے لگوں گی..... اور بے چارے کلیم کا تماشا لگ جائے گا.....“ وہ چچی کی کئی باتوں کو بھی دہرا رہی تھی لیکن آج یہ الفاظ

اس کی ذات کو اذیت نہیں دے رہے تھے..... البتہ چچی کی حالت دیدنی تھی جو ان الفاظ کو سن کر ہوئی تھی۔

اس نے دو ٹوک انکار کر دیا..... گرین کارڈ کے لیے وہ کسی کی سیڑھی نہیں بن سکتی تھی لیکن جانے یہ سب کچھ کرنے کے باوجود اس کے دل میں چچی پھانس نکلنے کے بجائے مزید گہری ہو گئی تھی۔

امریکا پہنچ کر روٹین تو بدل گئی تھی لیکن خیالات کی رو بارہا پاکستان میں بھٹکنے لگتی..... چچا کا اپنی عزت کی حفاظت کا درس، چچی کی معذرتیں اور سب سے بڑھ کر کلیم کی وارفتگی بھری زخمی نگاہیں اسے بے کل کیے رکھتی تھیں۔ ان سب چیزوں سے بچنے کی خاطر اس نے اپنا سارا وقت اور توجہ حصول تعلیم میں لگا دیا۔

تین.....

احمد علی البورا کسی طوفان کے مانند اس کی بے رنگ زندگی میں داخل ہوا تھا اور اس کی ساری پیش بندیوں کو پھلانگتا دل کے نہاں خانوں پر دستک دینے لگا تھا۔ استنبول سے وہ بھی حصول تعلیم کے لیے امریکا آیا تھا اور دعا کی لیب میں ہی پی ایچ ڈی کے آخری سال میں تھا۔

عموماً یہ وقت عشق عاشقی کا نہیں ہوتا لیکن دعا کی معصومیت آمیز پاکیزگی اس کے دل کو چھو گئی تھی۔ ایک آزاد معاشرے کا عادی ہونے کے بعد وہ اب دوسرے آزاد معاشرے کا باسی بن گیا تھا۔ اسی روا روی میں وہ ایک ویک اینڈ دعا کو ڈیٹ کی دعوت دے بیٹھا۔

”کیا آج شام میرے ساتھ کھانے پر چلنا پسند کریں گی؟ اس کے بعد ہم مووی دیکھنے چلیں گے.....“ وہ ایک نئی ریلیز ہونے والی فلم کا نام لیتے ہوئے بولا۔

”نہیں.....“ دعا مختصر جواب دے کر پھر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔ احمد نے قدرے اہانت محسوس کی کہ یہ کیسی لڑکی ہے جس نے بغیر وجہ کے نہ صرف انکار کیا بلکہ کوئی وضاحت بھی نہیں کی۔

”معاف کیجیے گا..... میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“ مائیکرو اسکوپ پر جھکی دعا سے وہ ایک بار پھر مخاطب ہوا۔

”ہفففف.....“ دعا نے ہونٹ سکڑے ایک ہنکارا بھرا اور احمد کی جانب متوجہ ہوئی..... ”مسٹر احمد علی البورا صاحب..... میں جہاں سے آئی ہوں وہاں یہ ڈیٹ کرنے کا کلچر ہے اور نہ ہی میری اسلامک روایات اس بات کی اجازت دیتی ہیں.....“ وہ سانس لینے کے لیے رکی اور پھر گویا ہوئی۔

”یہ جو جواب میں نے اڈر رکھا ہے فیشن کے لیے نہیں

ہے..... میں یہاں تعلیم کے لیے آئی ہوں..... اور آپ کو تو بطور مسلم ان باتوں سے آگاہ ہونا چاہیے تھا.....“ اس نے صراحت کے ساتھ اپنی بات بیان کر دی۔

احمد اس کی بات پر شرمسار تو ہوا لیکن اس نے پیچھے ہٹنے کے بجائے اپنی کوششیں تیز کر دیں..... محفل کا کوئی بھی لمحہ ہوتا وہ ہمیشہ اس کے قریب رہنے کو ترجیح دیتا۔ لیب کے کاموں اور تھیسس لکھنے میں بھی متعلقہ سائنسی مقالات اس تک پہنچانے میں پیش پیش رہتا۔

بڑے عرصے بعد ایسی کوئی لڑکی ملی تھی جس نے اسے اس کی بنیاد یاد دلائی تھی..... ایسے ذہانت اور متانت بھرے حسن کو وہ کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ دعا کے مزاج کو سمجھتے ہوئے وہ غیر محسوس انداز میں پیش قدمی کر رہا تھا جس کا جواب بھی اسے مثبت مل رہا تھا۔ دعا بھی اب اس کی وجاہت اور شریفانہ رویے سے متاثر ہونے لگی تھی۔

جولائی کی وہ ایک خوشگوار شام تھی۔ دعا بے حد خوش تھی کہ اس نے اے ون گریڈ میں ایم فل مکمل کر لیا تھا۔ نہ صرف اس کے پروفیسر نے اس کو بے انتہا سراہا تھا بلکہ اپنی ہی لیب میں ریسرچ آفیسر کی جاب کی پیشکش بھی کر دی تھی جسے اس نے خوش دلی سے قبول کر لیا تھا۔ لیب کے سب ساتھی پارٹی کر رہے تھے کہ اچانک احمد نے اس کا ہاتھ تھام کر کرسی پر بٹھا دیا اور گھٹنے کے بل جھک کر اس نے روایتی انداز میں وہ سوال کر دیا جو ہر لڑکی اس عمر میں سننے کی متمنی ہوتی ہے.....

”مس دعا چودھری..... کیا تم تمام عمر کے لیے میری نصف بہتر بنتا پسند کرو گی؟“

دعا کی تو جیسے سانس ہی بند ہونے لگی تھیں..... آنکھوں کے سامنے خوبصورت آنکھیں میں جڑا ہیرا نگا ہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

دو.....

اسے بڑی ہی افراتفری میں پاکستان آنا پڑا تھا۔ اچانک آنے والی افتاد نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ وہ فوراً چھٹی کی درخواست دے کر پہلی فلائٹ سے چلی آئی تھی۔

”یہ سب کیا ہو گیا چچا.....؟“ وہ رندھے ہوئے الفاظ میں ان سے مخاطب تھی۔

”بس بیٹا..... جو رب چاہے وہی ہوتا ہے۔ ہم تو اس کے عاجز بندے ہیں اور اس کی رضا میں راضی رہنے والے.....“ دو سال میں چچا کافی نحیف ہو گئے تھے۔

کلیم کی فون کال آتے ہی اس نے اپنی ردائی کا بندوبست کر لیا تھا۔ بقول اس کے چچا کینسر کی آخری اسٹیج پر

تلاش

میں ساری زندگی دو بندوں کو تلاش کرتا رہا لیکن ناکام رہا۔

1۔ وہ شخص جس نے اللہ کے نام پر دیا ہو اور وہ غریب ہو گیا ہو۔

2۔ وہ جس نے ظلم کیا ہو اور اللہ کی پکڑ سے بچ گیا ہو۔ (شیخ سعدی)

(مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ پاکپتن شریف)

مرمت

ایک دوست دوسرے دوست سے۔ ”اگر تمہیں چھپر پھاڑ کے دولت مل جائے تو تم سب سے پہلے کونسا کام کرو گے؟“

”چھپر کی مرمت۔“

”کیوں؟“ پہلا دوست۔

”اس لیے کہ یہ مہربانی دوبارہ بھی ہو سکتی ہے۔“ دوسرے دوست نے مسکراتے ہوئے... جواب دیا۔

تیاری

باپ بیٹے سے۔ ”میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم اچھے نمبروں سے ایف ایس سی میں پاس ہو گئے تو تمہیں موٹر سائیکل خرید کر دوں گا۔ مگر تم فیل ہو گئے۔ مجھے ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم سارا سال کیا کرتے رہے؟“

بیٹا معصومیت سے۔ ”ابا جان! دراصل میں پورا سال موٹر سائیکل چلانا سیکھتا رہا ہوں۔“

فرمائش

دادا جان نے ٹھنڈی سائس لے کر پوتے سے کہا۔

”آج کل لڑکیاں تو کسی بات پر شرماتی ہی نہیں۔ ہمارا زمانہ اور تھا۔ لڑکیاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی شرماتی تھیں اور ان کے چہرے شرم سے سرخ ہو جاتے تھے۔“

پوتا۔ ”دادا جان! کیا آپ مجھے وہ چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں بتائیں گے؟“

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

تھے اور ڈاکٹر ز نے جواب دے دیا تھا۔ مرنے سے پہلے وہ ایک بار اپنی پیاری بیٹی کا دیدار کرنا چاہتے تھے جو کہ امریکا جا کر انہیں تقریباً بھول ہی چکی تھی۔

دعا ان کو ایسے ترپتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جو اس سے بن پڑا وہ اس نے کر ڈالا۔ اس نے امریکا میں اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے پتا کرایا تو یون میر وٹرانسپلائٹ کی ایک سہولت نظر آرہی تھی پر علاج بہت مہنگا تھا۔ دعا نے بنا کسی تردد کے اپنا مکان بیچ ڈالا اور خوش قسمتی سے اسے قیمت بھی بہت اچھی مل گئی تھی۔ وہ فوراً معالجے کے لیے ویزے کے حصول میں لگ گئی۔

کلیم، چچی اور چچا بھی اس کی کوششوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ وسیم نے تو خیر کب کی اپنے والد کی زندگی پر فاتحہ پڑھ لی تھی لیکن کلیم نے علاج کے لیے حتی الامکان کوشش کر ڈالی تھی۔ علاج جب اس کی پہنچ سے باہر ہوا اور پاکستان میں معالجوں نے بھی ہاتھ کھڑے کر دیے تب ہی اس نے مایوس ہو کر دعا کو کال کی تھی۔ جب دعا نے انتظامات کے لیے مکان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم اس کے ہاتھ میں رکھی تو وہ ممنونیت کے مارے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔

”اتنا حیران ہو کر کیوں دیکھ رہے ہو؟“ دعا نے مسکراتے ہوئے کلیم سے پوچھا۔

”حیران نہ ہوں تو کیا ہوں؟ امی کے اتنے ناروا سلوک کے باوجود تم صرف ایک فون کال پر چلی آئیں..... حالانکہ جن حالات میں تم گئی تھیں لگتا نہیں تھا پلٹ کر واپس آؤ گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں بھی تم سے اس قدر دل برداشتہ ہوا تھا کہ شاید فون نہ کرتا مگر ابانے مجھے مجبور کر دیا.....“ کلیم جواب تک چپ تھا، بولنے پر آیا تو سارے گلے شکوے کر بیٹھا۔

”میں..... میں شرمندہ ہوں..... چچی نے جو کچھ اتنا عرصہ کیا وہ ان کا ظرف تھا..... لیکن میں یہ بھی خیال نہ کر پائی کہ چچا نے اس وقت میرے سر پر ہاتھ رکھا جب کوئی اس ذمے داری کے لیے تیار نہ تھا..... کاش میں نے ان کا ہی مان رکھ لیا ہوتا..... لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا.....“ وہ ہاتھ میں جگمگاتے..... انگوٹھی کے ہیرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہونے کو تو سب کچھ ہو سکتا ہے.....“ وہ اس کے اشارے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا قصور بس اتنا ہے کہ وقت پر اپنے جذبات کا اظہار نہ کر سکا..... پہلے وسیم بھائی بازی لے گئے اور اس کے بعد تمہاری اسکا لرشپ.....“ وہ دل فگار لہجے میں بولا۔

”اور کیا تم یقین کرو گی کہ یہ سب میں نے گرین کارڈ

کے لیے نہیں کیا تھا..... امی جتنا ہم بھائیوں سے کہتی تھیں کہ تم ہماری بہن ہو..... اتنا ہی وہ اس تاثر کو واضح کرتی تھیں کہ ہم دراصل سگے بہن بھائی نہیں ہیں..... امی نے ہمارے کچے ذہنوں میں یہ زہر اس قدر انڈیلا تھا کہ ہم دونوں بھائی ہی تمہاری محبت میں مبتلا ہو گئے..... وسیم بھائی نے تو راہیں جدا کر لیں لیکن میں آج بھی تمہارا منتظر ہوں.....“ کلیم نے اس کے سامنے سینہ کھول کر رکھ دیا تھا اور وہ ان انکشافات پر لرز کر رہ گئی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کلیم نے بیچ چور ہے پر اس کے کسی راز کا پردہ فاش کر دیا ہو۔

”اب بہت دیر ہو گئی اس سب کے لیے.....“ وہ ہٹکے ہٹکے لہجے میں بولی اور کلیم کے سامنے سے اٹھ گئی۔

وہ اپنی رواں زندگی میں کوئی زلزلہ نہیں لانا چاہتی تھی۔ مگر بھونچال بتا کر کہاں آتے ہیں، وہ بھی ایک تلاطم کی زد میں آ چکی تھی لیکن اس حقیقت سے فی الحال آشنا نہ تھی۔

اسے پاکستان آئے تیسرا ہفتہ تھا۔ اللہ کے کرم سے چچا کی صحت بحال ہو رہی تھی اور ان کا ویزا بھی لگ کر آ گیا۔ پر یہ سب چراغ بجھنے سے پہلے کی آخری پھر پھڑا ہٹ ثابت ہوئی..... چچا ایک رات سوئے تو پھر اٹھ نہ سکے..... وہ بہت روئی..... بہت زیادہ روئی۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کا احساس کیسا ہوتا ہے یہ آج اس نے بیچ منٹوں میں پہلی بار محسوس کیا تھا.....

ایک..... سال کا آخری پل آن پہنچا تھا اور اس کی سوچ کے بہتے دھارے بھی ماضی سے حال تک آ گئے تھے۔ چچا کی وفات کے بعد کلیم اور چچی نے بہتیرا اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانی۔ جب چچی بے حد اصرار کے باوجود اسے روک نہ سکیں تو اس کی مکان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم لے آئیں۔

”چچا پر جیسے میرا حق تھا ان کے گھر والوں پر بھی ویسے ہی ہے..... ان کے علاج کی غرض سے کی گئی کوشش کے بعد اب آپ لوگوں کے پاس گروی شدہ مکان اور قرض کے سوا کچھ نہیں بچا..... میں چچا کے لیے کچھ نہ کر سکی لیکن کم از کم ان کے پیاروں کے لیے تو کچھ کر ہی سکتی ہوں.....“ اس نے وہ رقم لینے سے انکار کر دیا۔

چچی اس بات پر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ دعا نے محسوس کیا کہ اس کے سینے کی پھانس ختم تو نہیں ہوئی لیکن اس کی چھین میں خاطر خواہ کمی آ گئی ہے۔

”اسے واپس رکھ لو..... میں ذہنی طور پر اس قدر منتشر ہوں کہ تمہاری محبت کا جواب محبت سے نہیں دے پاؤں

گی.....“ امریکا واپسی پر اس نے احمد کو انگوٹھی واپس کرتے ہوئے کہا۔

احمد نے بھی خاموشی سے انگوٹھی رکھ لی۔ اسے لگا تھا کہ چچا کی وفات نے دعا کو شدید ذہنی صدمہ پہنچایا ہے..... اسے سنبھلنے کے لیے وقت درکار تھا اور ایک اچھے، سمجھ دار منیگیر ہونے کا ثبوت دینے کے لیے اس نے وقت دیا۔ بغیر کچھ توقع رکھے وہ اس کی دلجوئی کی کوشش میں لگا رہا۔ دعا کا بدلتا رویہ سو یاں روح تھا لیکن کم از کم وہ اس کے سامنے تو تھی۔

دعا بھی سنبھلنے لگی تھی اور لیبارٹری کے کاموں میں جب وہ پوری طرح مصروف ہو گئی تو اسے لگا کہ اب صحیح وقت ہے دعا سے تجدید محبت کرنے کا۔ اگلی صبح وہ جب لیب پہنچا تو یہ خبر اس کے ذہن پر کسی ہتھوڑے کی طرح برسی کہ دعا نے اپنے پروفیسر سے کہہ کر دوسری لیب میں تبادلہ کر لیا ہے۔

”کیوں دعا..... میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہو؟“ وہ اس کے فلیٹ کے باہر پہنچ گیا تھا۔

”پتا نہیں کیوں کر رہی ہوں..... یہ حقیقت ہے کہ میں تمہارے رکھ رکھاؤ، رویے سے بہت متاثر ہوئی۔ تم ایک بہترین دوست ہو..... لیکن شاید میرے لیے زندگی بھر کا ساتھ دینے کے لیے کافی نہیں ہو.....“ وہ جذبات سے عاری لہجے میں احمد پر لفظوں کے تیر چلا رہی تھی۔

”مجھے تم سے محبت ہے..... اور میں تمہارا انتظار کروں گا.....“ احمد نے جذبات سے معمور لہجے میں اس کے انکار پر جواب دیا۔

”بہت بڑا دعویٰ ہے یہ..... کوئی کسی کا انتظار نہیں کرتا..... میں بھی دیکھوں گی۔“ دعا نے اس کے جانے کے بعد خود کلا کی کی۔

پچھلے پندرہ ماہ سے اس نے خود کو کوکھو کا بیل بنا لیا تھا۔ ہر جذباتی تعلق اور رابطے کو اس نے اپنی زندگی سے بیچ کر باہر نکال دیا تھا۔ وہ ایسا کس لیے کر رہی تھی، خود بھی نہیں جانتی تھی..... خود کو کس بات کی سزا دے رہی تھی..... یہ بھی معلوم نہیں تھا..... بس زندگی کو گزارنے کے بجائے وہ ٹھہرنے میں مشغول تھی اور زندگی گھسٹی چلی جا رہی تھی۔

آج جب اسے نیوا ایر پارٹی کے لیے اس کی روم میٹ ریٹا نے اصرار کیا تو وہ انکار نہ کر سکی۔ اب وہ اس پارٹی کے ماحول میں آ کر پچھتا رہی تھی۔

”یہ میں نے کیا کر دیا..... کس کے لیے احمد جیسے شاندار شخص کو انکار کیا؟“ اسے ایسا لگا تھا کہ احمد بھی پارٹی میں ہے لیکن وہ نظر نہ آیا۔

اپنے بوائے فرینڈ کے گلے کا ہار بنی ریٹا کو دیکھ کر اسے شدید جلن کا احساس ہوا۔

”یہ سب میرا بھی تو ہو سکتا تھا..... یہ خوشی کے لمحے میں بھی تو اپنے کسی چاہنے والے کے ساتھ مناسکتی تھی.....“ ذہنی رواں جانب چلی تو وہ بس یہی سوچنے لگی۔

اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ اپنی زندگی کے خوبصورت پل جانے کس انا کے خول میں قید ہو کر برباد کر رہی ہے..... اسے لوگوں کے اسے پُر ہنگم ہجوم میں اپنا دم گھٹنا محسوس ہوا۔

”یہی حال ہوتا ہے کفران نعمت کرنے والوں کا.....“ اس سوچ کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ باہر جانے کا راستہ دیکھنے ہی والی تھی کہ ایک دم چونک گئی۔

اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ وہ مانوس چہرہ اس کے سامنے ایک ٹانگ کا گھٹنا موڑے..... ہاتھ میں ایک دلکش انگوٹھی لیے بیٹھا تھا..... انگوٹھی پر لگے ہیروں سے زیادہ اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔

زیر و..... پپی نیوا ایر نئے سال کی مبارکبادوں کا شور اتنا بلند تھا کہ آنسوؤں کے سنگم میں..... اس کی اقرار میں کہی گئی ہاں بھی اس میں مدغم ہو گئی۔ وہاں موجود جوڑے نئے سال کی آمد پر اپنی اپنی مستیوں میں ڈوب گئے۔ دعا نے ریٹا کو دیکھا تو وہ بھی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک جان دو قالب بننے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اتنی دیر کیوں کر دی آنے میں؟“ طوفان بدتمیزی کا شور ذرا کم ہوا تو وہ انگوٹھی ہاتھ میں پہنتے ہوئے بولی۔

”خود کو تمہارے قابل بنانا اور پھر امریکا آنا اتنا آسان تو نہیں تھا.....“ کلیم اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔

”اور میں اسی دوران کسی اور کی ہو جاتی تو.....؟“ دعا کے لہجے میں شکایت تھی۔

”میری ہوتے ہوئے تم کسی اور کی کیسے ہو سکتی تھیں؟“ کلیم کے لہجے کا تین ہی دعا کو عرش پر لے گیا..... اس کا من ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ ایک نئی امید اس کے دل میں گدگدانے لگی تھی۔

برسوں کی دل میں دلی پھانس کا کہیں کوئی نام و نشان نہ رہا تھا کہ تیزی میں ترس کھا کر کسی کا اپنے گھر میں پناہ دے دینا اور کسی کا محبت سے سر آنکھوں پر بٹھا کر اپنے دل اور گھر کی ملکہ بنانے میں بہت فرق ہوتا ہے..... آج اس نئے سال کی ابتدا میں اسی فرق نے اسے فرش سے عرش پر بٹھا دیا تھا۔

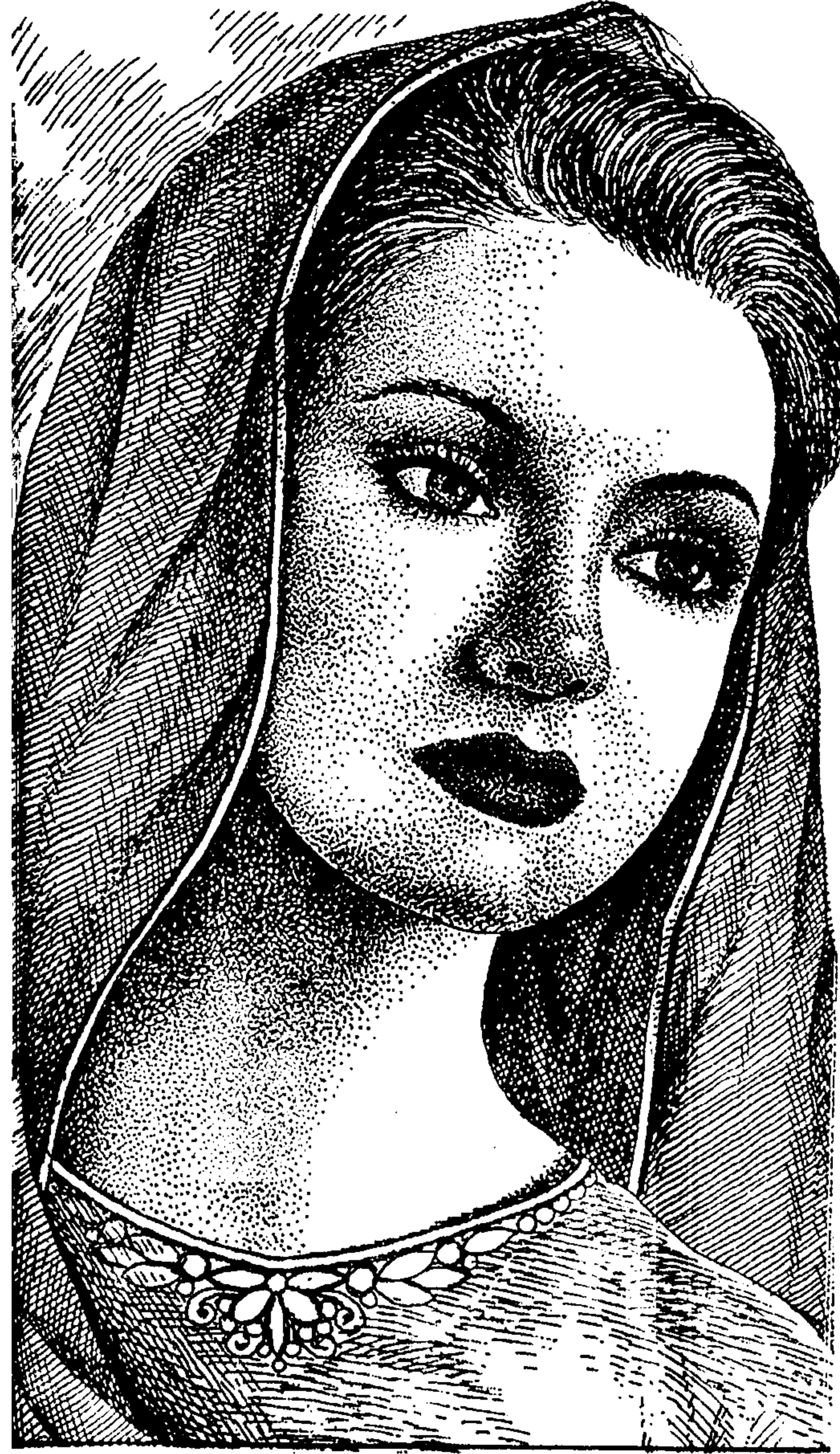
ہدفِ شہر و سخن

✽ عتیق الرحمان سمندری فیصل آباد
ہم با وفا تھے اس لیے نظروں سے گر گئے
شاید انہیں تلاش کسی بے وفا کی تھی
✽ ملائکہ حریم حجرہ شاہ مقیم
ڈھلتا گیا یادوں کی شفق میں ترا پیکر
احساس نے جب حسن کی توصیف رقم کی
✽ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان فورٹ عباس
ترک تعلق کا گلہ اب کس سے کریں ہم
وہ شخص تو اب ہم کو پہچانتا نہیں



✽ اشفاق شاہین لاہور
صبح سفر کی رات بھی تارے تھے اور کچھ ہوا
سایہ سا ایک دیر تک بام پر رہا
✽ بابر عباس، مسز بابر عباس کھاریاں
ایک وقت ایسا تھا جب تیرے علاوہ بھی
کچھ اداس لمحوں کا رابطہ رہا مجھ سے
✽ ماہین بابر، فضل عباس کھاریاں
کنج نفس میں جسوں کے لاشے لیے ہوئے
خوش ہیں پرند قبر کا سامان ہو گیا
✽ مرزا طاہر الدین بیگ میرپور خاص
بہت سے لب پہ شکوے ہیں اجازت ہو اگر ان کی
بہت کچھ ان سے کہنا ہے اگر ان تک رسائی ہو

✽ جاوید اختر رانا پاکپتن شریف
بہت کوشش میں کرتا ہوں اندھیرے ختم ہو جائیں
کہیں جگنو نہیں ملتا، کہیں پر چاند آدھا ہے
✽ محمد شہباز اکرم نوئی ڈھکی، پاکپتن شریف
تیرے ہاتھوں پہ لگی مہندی سے آتی ہے خوں کی بو
سچ بتا کس کے خونِ دل سے گوندی ہے یہ حنا؟



✽ حنین عباس، کمیل عباس کھاریاں
امیر شہر بناؤ ثبوت دیکھ لیا
گلی گلی پہ مسلط سکوت دیکھ لیا
ڈرا ہوا ہے ہر اک فرد اس طرح سے یہاں
کہ جیسے خواب میں بچے نے بہت دیکھ لیا
✽ عبد الجبار رومی انصاری قصور شہ
برہی اس کی سدا مجھ کو مزہ دیتی رہی
کر چکا تھا اس لطف کا وہ عادی مجھ کو
مسکرا کے وہ کھلے دل سے ملا ہے اب کے
جانے کیا سوچ کے اس نے یہ سزا دی مجھ کو
✽ ریاض بٹ حسن ابدال
تم نے انداز محبت دیکھا ہے اندازِ وفا نہیں
پنجرے کھول بھی دو تو پرندے جایا نہیں کرتے

✽ نوید حسین کراچی
دل کے زخموں کا اندازہ کب ہوتا ہے چہرے سے
ساحل سے کیا جان سکو گے سمندر کتنا گہرا ہے
✽ انجم اکبر حیدر آباد
ہجر کی شامیں دھیان میں رکھنا
اک دیا بھی مکان میں رکھنا
✽ افشاں یاسر جھنگ
جن کے چہرے ہوں چاند کی صورت
اُن کے دل میں بھی داغ ہوتے ہیں
✽ ارم یاسر چنیوٹ
تیرے بغیر اگر زندگی کی خواہش ہو
خدا کرے کہ مجھے زندگی نہ راس آئے
✽ نوشہہ گلزار بھکر
میں اپنی زندگی کی آخری سیڑھی پہ بیٹھا ہوں
مجھے مہلت ذرا سی ہے بھی ملنے چلے آؤ
✽ وزیر محمد خان بٹل ہزارہ
میں کیوں نہ ترک تعلق کی ابتدا کرتا
وہ دور دلس کا باسی تھا کیا وفا کرتا
وہ مرے ضبط کا اندازہ کرنے آیا تھا
میں ہنس کے زخم نہ کھاتا تو اور کیا کرتا
✽ عالیہ خان کوئٹہ
کس قدر بے ساختہ پن چاہتی ہے زندگی
شاخ سے اڑتا پرندہ دیکھنا تو سوچنا
✽ دلدار علی نواب شاہ
شہرِ دل میں ایک ایسا بھی رستہ ہے
جس پر برسوں سے ایک چہرہ بیٹھا ہے
سوچ رہا ہوں میں بھی اس کے ساتھ چلوں
اس نے مجھ سے گھر کا رستہ پوچھا ہے
✽ کا شان احمد پشاور
ہمارے پاؤں اٹے تھے فقط چلنے سے کیا ہوتا
بہت آگے گئے لیکن بہت پیچھے نکل آئے
✽ کاشف غائر کراچی
یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر بھی رہا کرو
دہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

✽ محمد حسان گل، علیہ فاطمہ روہڑی
بھلا بیٹھا ہوں میں تم کو مگر میرا دل نادان
تمہیں جب یاد کرتا ہے تو اکثر یاد کرتا ہے
✽ مہوش نورین خان قولہ شریف بائی پاس
کچھ اس طرح سے نظر انداز ہو گئے
جیسے اضافی حرف تھے تیری کتاب میں
✽ اوریس احمد خان ناظم آباد، کراچی
طوفان کی طرف بڑھتے ہی جاتے ہیں سفینے
کیا جلیے کیا بھول کناروں سے ہوئی ہے
✽ محمد صفدر معاویہ خانیوال
رات خالی ہی رہے گی میرے چاروں جانب
اور یہ کرا میرے خوابوں سے بھر جائے گا
✽ نذیر خان ٹنڈوالہار
ہم ایسے نہیں ہیں کہ جو آنکھ جھپک جائے
گو برق سی ہر دم تری شمشیر سے چمکے
یہ آگ نہیں وہ کہ بجھا دے جسے پانی
عشق اور مرے گریہ کی تاثیر سے چمکے
✽ سائرہ نواب پشاور
جو پائی بزم میں ساقی تری جگہ خالی
بھر آیا دیکھ کے دل ساغر و سبو کی طرف
نہ اس کی بزم میں آنسو بہاؤ اے چشم
نگاہ رکھو ذرا میری ابرو کی طرف
✽ شاہین بسم ٹنڈوالہار
کھینچتے ہی تیر سینے سے جائے گل دم نکل
ایسا نہ ہو کہ تم یہ کہیں تیر کھینچ لو
ہے صبح کوچ حضرت دل جب تلک ہے رات
دو چار اور نالہ شب گیر کھینچ لو
✽ ذیشان علی سکھر
آنکھوں کو التماس بہت دیکھنے میں تھے
کل شب عجیب عکس ہرے آئینے میں تھے
✽ نورین احمد ملتان
کیا ہے جو رکھ دیں آخری داؤ میں نقدِ جاں!
ویسے بھی ہم نے کھیل یہ ہارا ہوا تو ہے
✽ بابر علی ٹوبہ ٹیک سنگھ
ابھن تمام عمر یہ تارِ نفس میں تھی!
دل کی مراد عاشقی میں یا ہوس میں تھی!

کسی چھوٹے سے قصبے میں خاموش اور الگ تھلگ زندگی گزاروں گا۔“

اس پر وہ کہتے۔ ”وہاں تو بہت سردی ہوتی ہے۔ پورے موسم سرما میں برف باری ہوتی رہتی ہے۔“ میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”گزشتہ تیس سالوں کے دوران مجھے دنیا کے مشکل ترین مقامات پر بھیجا گیا جن میں زیادہ تر گرم علاقے تھے۔ میں گرمی سے تنگ آچکا ہوں۔ اس کے مقابلے میں سردی بہتر ہے۔ میں مٹی سونا میں پیدا ہوا تھا۔ سرد موسم میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔“

مدد

شرعباس

تمام عمر انتہائی انہماک سے کام کرنے کے بعد جب انسان ریٹائرمنٹ کے مرحلے سے گزرتا ہے تو نہ صرف ذہن ماضی کی گلیوں میں بھٹک کر کچھ گمشدہ لمحات ڈھونڈنے کی گتھی میں الجھا رہتا ہے بلکہ آنے والے دنوں میں اپنی ذات کے مصرف کی گرہ کو بھی کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب ایسا ہی ایک مقام اس کی زندگی میں بھی آیا تو اس نے ایک تیر سے دو شکار انتہائی خوب صورتی سے کر ڈالے، لوگوں کی مدد بھی کی اور اپنی زندگی بھی سنوار لی۔

خوش اخلاقی سے دل جیتنے والے ایک عقلمند انسان

کی کامیابی کا راز

کئی برسوں کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد حسب دستور میرے اعزاز میں بھی ایک چھوٹے سے آئرش پب میں الوداعی پارٹی دی گئی۔ اس میں وہ تمام لوازمات اور تحائف موجود تھے جو اس قسم کی پارٹیوں کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ میں ایک کونے میں خاموش اور تنہا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میرے دفتر کے ساتھی باری باری آکر ایک ہی روایتی اور گھسا پٹا سوال پوچھ رہے تھے۔ ”ہنری! اب تم کیا کرو گے؟“ میں سب کو ایک ہی جواب دیتا رہا۔ ”نیوہمشائر کے

شاہدہ جنید..... کراچی

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد یہ معلوم کہ تو نہیں تھا تیرے ساتھ اک دنیا تھی

فرحانہ عاصم..... سکھر

چلے ہیں رات کو چوری سے ہم اس ماہ کے گھر میں چراغ ماہ کو کر دے تو اے چرخ کہن ٹھنڈا

راحیل..... کراچی

توڑ کر زنجیر کو دیوانہ نہ بھاگا ہو کہیں دیکھو غل ہے پڑا خانہ زنداں میں کیا

اسد علی..... ملتان

خاک آرام مرے دل کو دل آرام کر دیا دل لیا ایک تو اور دوسرے الزام دیا

محمد شفیق حسین..... نیوکراچی

اندیشہ جدائی بھی تھا یقین وفا بھی اک خوف نے جینے نہ دیا، اک یقین نے مرنے نہ دیا

اولیس احمد..... حیدرآباد

چھوٹی سی زندگی ہے کس کس کو خوش کریں جناب جلاتے ہیں اگر چراغ تو اندھیرے برامان جاتے ہیں

متین احمد..... ٹنڈو محمد خان

دوستی اس دشمن جاں نے نباہی تو سہی گو بھی ظلم و ستم کے ساتھ اچھی نبھ گئی

حنّا خان..... گجرانوالہ

یہ نہیں معلوم وہ تقدیر میں ہے یا نہیں ایک وصل یار کی ہم آرزو رکھتے تو ہیں

ثانیہ خورشید..... منڈی بہاؤ الدین

کیا کرے گا اشک باری ابر میرے سامنے میری نادانی ہے گر میں فکر بیش دم میں ہوں

شمالہ سلمان..... کورنگی، کراچی

نہ کوئی آیا ساتھ ہمارے نہ گیا کوئی ساتھ دیکھ کے ایلکلا آپ تو کہہ دے مل اپنے ہاتھ

منظہر خان..... نواب شاہ

زمین جلتی ہے اور آسمان ٹوٹتا ہے مگر گریز کریں ہم تو مان ٹوٹتا ہے

رفیق احمد..... ملتان

کسی ترنگ، کسی سرخوشی میں رہتا تھا یہ کل کی بات ہے، دل زندگی میں رہتا تھا

عمر احمد..... گجرات

تم کیا جانو لفظوں کے آزار کی شدت کو یادیں تک سوچوں کی آگ میں جلنے لگی ہیں

ناہید یوسف..... اسلام آباد

موسم کا زہر اب کے فضاؤں میں یوں گھلا تلی کی سرد لاش پڑی ہے گلاب پر

صباحر..... کراچی

اک موج ہاتھ کاٹ کے ساحل پہ رکھ گئی ٹوٹی پڑی ہے ناؤ میں چوار دیکھنا

ایشا طارق..... ڈیرہ اسماعیل خان

یہ دل ہے اور یہ زخم یہ آنکھیں ہیں اور یہ تم یہ شہر دیکھ لو تو یہ بازار دیکھنا

جنید ملک..... کراچی

جب تک سورج اور ہوا میں کوئی بیر نہیں پیاں ریت پہ دریا کا ہر نقش عبوری ہے

اتیاز احمد..... پھالیہ

جانی پہچانی تھی منزل اور سفر تازہ نہ تھا راستے انجان نکلیں گے یہ اندازہ نہ تھا

فیاض احمد..... فیصل آباد

کہتا ہے مجھ سے پھر دل بے تاب چل دیں کیا جانے مدعا ہے اب اس مدعی کا کیا

خالد خان..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

دل نہ پھرتا تجھ سے گر ہوتی تجھے الفت کی قدر اے سنگر باعث نا قدر دان پھر گیا

محفلِ حوشت

کوین

برائے

شمارہ

فروری

2018

نام:

پتا:

جنوری 2018ء

160

سپینس ڈائجسٹ



اس کے بعد ایک اور سوال ہوا۔ ”نیوہمشائر میں تم کیا کرو گے؟“

میں نے جو جواب دیا، اس پر کسی کو یقین نہیں آیا۔

”ایک پک اپ ٹرک خریدوں گا اور اسے خود چلاؤں گا۔“

اس سے پہلے یہی سوال مجھ سے آؤٹ پروڈنگ سینٹر میں بھی پوچھا گیا تھا اور وہاں بھی میں نے اس کا یہی جواب دیا۔ مجھ سے انٹرویو کرنے والی ایک عورت تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”ریٹائر ہونے کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہے ہنری؟“

”نیوہمشائر میں پرسکون زندگی گزاروں گا۔“

”تمہارے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ خاصا بورنگ لگتا ہے۔“

”مجھے ایسی ہی زندگی پسند ہے۔“

وہ اپنے کمپیوٹر کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں کئی ایسی کمپنیوں کا پتا بتا سکتی ہوں جو تمہیں بہت اچھی تنخواہ دیں گی۔“

”مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔“

”تم سفر کرنا نہیں چاہتے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہیے۔ تم میرے کاغذات مکمل کر دو۔“

”اچھا۔“ یہ کہہ کر وہ کاغذات تیار کرنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے پوچھا۔

”تم اس چھوٹے قصبے میں جا کر کیا کرو گے؟“

”ایک ٹرک خریدوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اور اسے اپنے کام کے لیے استعمال کروں گا۔“

”کس قسم کا کام؟“

”جو میں نے ہمیشہ کیا ہے۔“ میں بولا۔

جب میں وہاں سے رخصت ہونے لگا تو کورین نے مجھے اپنا کارڈ دیا اور بولی۔ ”یہ رکھ لو ممکن ہے کہ تمہارا ارادہ بدل جائے۔“

”شکریہ۔“

اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ”اس کی پشت پر میرے گھر اور سیل نمبر دونوں درج ہیں۔“

”تمہارا بہت بہت شکریہ۔“

میں نے نیوہمشائر کو اس لیے منتخب کیا کہ اس کی سرحد کینیڈا سے ملتی ہے اور میں وہاں رہ کر بہ آسانی کیوبک سٹی جاسکتا ہوں جو میری نظر میں دنیا کا خوب صورت ترین شہر ہے۔ اس کے علاوہ میں ایسے قصبے میں رہنا چاہتا تھا جو ہائی وے جھیلوں، پہاڑیوں اور کسی اچھے میڈیکل سینٹر سے قریب

ہوتا کہ ہنگامی حالت میں علاج کے لیے وہاں جاسکوں۔ ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ٹریٹمنٹ کا انتخاب کیا۔ وہاں کی آبادی چار ہزار کے لگ بھگ تھی اور یہ میرے لیے ایک قابل قبول جگہ تھی۔ وہاں مجھے ایک معقول مکان مل گیا جہاں سے جھیل کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔

انرپورٹ پر اترنے کے بعد میں ٹیکسی کے ذریعے ایک قریبی شیور لیٹ ڈیلر کے پاس گیا اور ایک گھنٹا بعد میں سرخ رنگ کی چمچاتی ہوئی شیور لیٹ سلویرا ڈو چلا رہا تھا۔ اس کے بعد میں ایک اور شاپ پر گیا۔ دکاندار نے میری خواہش کے مطابق ایک ہل دے دیا جسے پک اپ کے آگے لگا کر برف ہٹائی جاسکتی تھی۔ باہر آ کر میں نے دونوں چیزوں کو دیکھا زرد رنگ کا ہل سرخ رنگ کی پک اپ سے خوب میچ کر رہا تھا۔ ہل کے وسط میں دو ہیڈ لائٹس نصب تھیں۔ میں نے ٹرک میں بیٹھ کر اندر کا جائزہ لیا۔ ڈیش بورڈ سے ایک ہانڈ براک سسٹم منسلک تھا جو ہل کو چلاتا تھا۔ اس میں ایک جوئے اسٹک لگی ہوئی تھی جو ہل کو اوپر نیچے اور دائیں بائیں حرکت دیتی تھی۔

ٹریٹمنٹ پہنچنے کے بعد میں اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس گیا۔ اس سے گھر کی چابیاں لیں اور اگلے چند روز اسے ٹھیک کرنے میں لگ گئے۔ میرے گھر کے برابر میں ایک جھکی ہوئی عمارت تھی جس میں پرانی چیزوں، خالی ڈرموں اور ربر کے پائپوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ موسم بہار شروع ہونے پر اس جگہ کی صفائی کر دوں گا پھر میں ایک مقامی لائبریری میں گیا اور وہاں ایک گھنٹا کمپیوٹر پر گزارا۔ اگلے روز میں ایک کاؤنٹی انٹیلیبل شیلٹر گیا اور وہاں سے ایک اچھی نسل کا کتا لیا۔ اس کا نام میں نے ایرک رکھا۔

ٹریٹمنٹ واپس آتے ہوئے وہ چپ چاپ برابر والی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”پینتیس سال پہلے میرے پاس ایک کتا تھا لیکن ملازمت کی نوعیت ایسی تھی کہ میں اسے اپنے ساتھ نہ رکھ سکا۔ یہ ساتھ دوبارہ شروع ہو رہا ہے کیونکہ اب مجھے کہیں نہیں جانا۔“

میرے نئے دوست نے کھڑکی سے باہر دیکھ کر اپنا سرواٹیکس ہلایا۔

”لیکن مجھے امید ہے کہ تمہیں رات کے پچھلے پہر اٹھنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ کبھی بھی رات کو بھی برف گرتی ہے۔ اس وقت صرف میں اور تم ہی باہر سڑک پر برف صاف کر رہے ہوں گے۔“

وہ چپ چاپ بیٹھا رہا اور مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا

کہ وہ دروازے اور کھڑکیوں کی طرف نہیں دوڑ رہا تھا۔ اسے گھر میں چھوڑ کر میں مقامی پولیس اسٹیشن چلا گیا۔ خوش قسمتی سے چف وہاں موجود تھا جس نے نیلے رنگ کی یونیفارم پہن رکھی تھی اور اس کی قمیص کے کالر پر دو ستارے چمک رہے تھے۔ مصافحہ کرنے کے بعد میں نے کہا۔

”چف! میں اس قصبے میں نیا ہوں اور اپنا تعارف کروانا چاہتا ہوں۔ میرا نام ہنری کون وے ہے۔“

”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“ اس نے کہا۔ ”کہاں رہ رہے ہو؟“

”فورٹین۔ ماسٹ روڈ۔“

چف نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”پارکنسن پلس۔“

میں اس کی بات سمجھ گیا۔ ان چھوٹے قصبوں میں مکانات کی پہچان پتے سے نہیں بلکہ مالکوں کے نام سے ہوتی تھی۔

”تم کہاں سے آئے ہو؟“

”میں سرکاری ملازم تھا۔ ہمیشہ ایک شہر سے دوسرے شہر جاتا رہا۔ اب ریٹائر ہو گیا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اب مزید سفر کرنے کا ارادہ نہیں۔“

چف مسکراتے ہوئے بولا۔ ”پھر تم صبح جگہ پر آئے ہو۔ یہ پرسکون قصبہ ہے۔ مجھے یہاں ایک سال ہو گیا لیکن جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔“

”یہ سن کر خوشی ہوئی۔“

”یہاں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ اس موسم سرما میں برف ہٹانے کا کام کروں۔“

وہ طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”واقعی۔“

اس میں کوئی برائی نہیں ہے لیکن تم ایسے شخص نہیں لگتے جسے حکومت سے پنشن مل رہی ہو اور وہ سڑکوں سے برف ہٹانے کا کام کرے۔“

”تمہیں حیرت ہو رہی ہے۔“

”تمہارا خیال ہے کہ رات کے وقت بستر سے اٹھ کر ٹرک اسٹارٹ کرو گے اور برف کے طوفان میں کام کرو گے؟“

”میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھی تبدیلی ہوگی۔“

”تمہیں اس کام کا کوئی تجربہ ہے؟“

”کالج کے دنوں میں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے میں برف ہٹانے کا کام کیا کرتا تھا۔“

”اس بات کو تو عرصہ گزر گیا۔“

”لیکن برف باری اب بھی اسی طرح ہوتی ہے۔“

اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ ریٹائرمنٹ نامی شخص اس قصبے میں چار سال سے یہی کام کر رہا ہے۔ شاید اسے یہ اچھا نہ لگے کہ تم اس کا کام چھیننے کی کوشش کرو۔“

”مجھے یقین ہے کہ ہم اس کا کوئی حل نکال لیں گے۔“

چف نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا خیال ہے کہ تم اسے کوئی پیشکش کرو گے اور وہ انکار نہیں کرے گا۔“

”اس بارے میں پہلے سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے کہا۔

دوسرے دن ایک ڈیلیوری ٹرک ڈرائیوے میں آ کر رکا۔ ایرک دوڑتا ہوا آیا اور ڈرائیور کو دیکھ کر دم ہلانے لگا۔ اس شخص کی عمر تقریباً تیس برس تھی اور اس نے آدھی آستین کی قمیص اور شارٹس پہن رکھے تھے۔ اس نے ٹرک کے پچھلے حصے سے کتابوں کے چھ باکس اتارے اور پورچ میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم کوئی لائبریری کھول رہے ہو؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ میں نے اپنے پڑھنے کے لیے منگوائی ہیں۔“

”واقعی؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”ہاں۔ تیس برس تک مجھے کچھ پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ اب ساری کسر پوری کروں گا۔“

ڈرائیور نے میرے ٹرک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تم نے اپنے لیے منگوایا ہے یا تمہارا ارادہ دوستوں اور پڑوسیوں کے گھر کے سامنے سے بھی برف ہٹانے کا ہے؟“

”یہاں میرا کوئی دوست نہیں البتہ پڑوسی ہیں۔ میرا یہی ارادہ ہے۔“

ڈرائیور اپنے ٹرک کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

”پھر تمہیں ریٹائرمنٹ سے بہت محتاط رہنا ہوگا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی یہاں اجارہ داری ہے۔ ممکن ہے کہ وہ تم سے بحث کرے۔ وہ بڑے بھڑنے میں ماہر ہے۔“

”مشوے کا شکریہ۔“ میں نے کہا۔

”یہ مشورہ ہمیں بلکہ اطلاع ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

اگلے چند روز میں پمفلٹ بنانے میں مصروف رہا جن میں اپنا تعارف کرواتے ہوئے پیشکش کی گئی تھی کہ پہلی برف باری پر پہلی مرتبہ برف ہٹانے کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا۔ میں نے یہ پمفلٹ ٹاؤن ہال، مرکزی لائبریری، سروس اسٹیشن، دکانوں اور سپر مارکیٹ پر لگا دیے۔ میرے پاس گاہکوں کے فون آنے لگے۔ میں لکڑی کی دکان پر گیا

اور وہاں سے چار فٹ لمبے تختے لیے۔ ان پر نارنجی رنگ کیا اور انہیں گاہکوں کے ڈرائیو سے پر نصب کر دیا تاکہ جب ہر چیز برف سے ڈھکی ہوئی ہو تو مجھے مظلومہ جگہ تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔

پمفلٹ لگانے کے دو دن بعد کچھڑ میں لت پت ایک نیلے رنگ کی فورڈ ویکن میرے گھر کے سامنے آ کر رکی۔ اس میں بھی فشر پلو لگا ہوا تھا گوکہ اس کا زرد رنگ اڑ گیا تھا اور درمیان میں رنگ کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ اس میں سے ایک بھاری بھر کم آدمی اتر اور میری جانب پڑھنے لگا۔ اس نے میلی جینز، سیاہ بوٹ اور ہرے رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کی سیاہ ڈاڑھی سینے کے وسط تک آ رہی تھی پونی ٹیل میں سفیدی جھلک رکھی تھی۔ میں گھر سے باہر آ کر پورچ میں کھڑا ہو گیا۔

اس کے ہاتھ میں ایک پمفلٹ تھا جسے اس نے موڑ توڑ کر زمین پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارا پمفلٹ ہے؟“ ”پہلے تھا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن جب میں نے اسے بورڈ پر لگا دیا تو میرا نہیں رہا پھر تم نے اسے وہاں سے اتار کر اپنے قبضے میں لے لیا تو یہ تمہارا ہو گیا اور اب تم یہاں گندگی پھیلا رہے ہو۔“

وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ شاید اس نے ایسی گفتگو پہلے نہیں سنی تھی۔ میں نے اسے دباؤ میں لانے کے لیے کہا۔ ”تم ریٹائرڈ گریڈ ہوتا؟“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”اور جاننا چاہتا ہوں کہ کیوں.....؟“

”ریٹائرڈ! میرے پاس فریج میں بہت عمدہ بیر ہے۔ آؤ اندر چلتے ہیں پھر میں تمہاری بات سنوں گا۔“

اب وہ واقعی پریشان نظر آنے لگا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اندر آ جاؤ ریٹائرڈ۔ باہر سردی ہو رہی ہے۔“ میں اسے سیدھا کچن میں لے گیا۔ فریج کھول کر اس میں سے دو بوتلیں نکالیں پھر پاپ کارن کا پیکٹ کھول کر اسے پیالے میں ڈالا اور وہیں میز پر بیٹھ گئے۔

اس نے بیر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو دوست، بیر بہت اچھی ہے لیکن.....“

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے سودا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے بتاؤ کہ گزشتہ برس تم نے اس کام سے کتنے پیسے کمائے تھے۔ میں تمہارا نقصان پورا کروں گا۔“

ریٹائرڈ نے ایک ساتھ دو گھونٹ لیے اور بولا۔

”تمہاری عمر کافی زیادہ ہے۔ اتنا کام کیسے کرو گے؟“ ”اتنا بوڑھا بھی نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم کہہ سکتے ہو کہ میں کافی عرصے سے یہ کام کرنا چاہ رہا تھا۔“ اس نے ایک اور گھونٹ لیا۔ یوں لگا جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ گیا ہے۔ اس نے کہا۔ ”پانچ ہزار ڈالر۔“

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں ابھی تمہیں یہ رقم دے رہا ہوں۔ اس کے عوض تم گھر پر بیٹھو گے اور میں اس موسم سرما میں ٹریسٹن اور اس کے قرب و جوار میں برف ہٹانے کا کام کروں گا۔“

جب وہ اس پر غور کر رہا تھا، میں دوسرے بیڈ روم میں گیا اور سیف میں سے سو سو ڈالر کے پچاس نوٹ لے کر واپس آ گیا اور میں نے انہیں میز پر پھیلا دیا۔

”کیسا لگ رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ اس نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے سارے نوٹ اٹھائے اور انہیں جیب میں رکھ لیا۔

اس نے کہا۔ ”اگر میں انکار کر دیتا پھر تم کیا کرتے؟“ ”میں کچھ رقم اور بڑھا دیتا۔“

”فرض کرو۔ میں پھر بھی انکار کرتا۔“ ”پھر میں تمہیں قتل کر دیتا۔ اس طرح کہ یہ حادثہ نظر آئے۔“

وہ لمحہ بھر کے لیے سکتے میں آ گیا۔ پھر میں نے ایک زوردار تہقہ لگایا اور اس نے بھی میرا ساتھ دیا اور پھر وہ چلا گیا۔

ایک ہفتے بعد رات دو بجے الارم کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے انگڑائی لی اور بستر سے اتر آیا۔ ایرک نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ”آ جاؤ میرے دوست۔ ہمیں کام پر جانا ہے۔“

لباس تبدیل کرنے کے بعد میں کچن میں آیا اور ایک کپ میں کافی انڈیلی۔ ایرک کو بھی ایک بسکٹ کھلایا اور باہر آ گیا۔ برفباری زوروں پر ہو رہی تھی اور موسم کی پیش گوئی کے مطابق یہ سلسلہ صبح پانچ بجے تک جاری رہتا۔ میں نے سراو پر اٹھایا تو برف کے ٹکڑے میرے چہرے پر آن کر گرے۔

میں نے ٹرک کا انجن اسٹارٹ کیا۔ ایرک برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کافی کا ایک گھونٹ لیا اور ٹرک کو لے کر سڑک پر آ گیا۔ برف سے ڈھکی ہوئی سڑک پر ٹرک چلانا بہت خطرناک تھا۔ چند اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں جبکہ زیادہ تر مکانات اور عمارتیں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں اپنے پہلے گاہک کے پاس پہنچا۔ وہ ایک شادی شدہ جوڑا تھا۔ بیوی میڈیکل سینٹر اور شو ہرکتا یوں کی دکان

پر اسٹنٹ نیجرتھا۔

میں نے مکان کے ڈرائیو سے پر جا کر برف ہٹانا شروع کر دی۔ پہلے ڈرائیو سے پردائیں سے بائیں اور پھر بائیں سے دائیں برف ہٹائی اور اتنی جگہ بنادی کہ ڈاکیا لیٹر بس تک جاسکے پھر میں نے گیراج کے دروازے سے برف ہٹائی اور وہ جگہ بھی صاف ہو گئی پہلی رات کا تجربہ بہت کامیاب رہا۔ دوسری رات بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے اپنے گاہکوں کے بارے میں بھی جاننے کا موقع ملا جو لوگ اسپتالوں، دفاتروں، دکانوں اور اسٹینٹ اینجنی میں کام کرتے تھے، انہیں صبح جلدی جانا ہوتا تھا۔ لہذا میں اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ ان کے گھر کے آگے سے پہلے برف ہٹائی جائے۔ ریٹائرڈ اور تنہا لوگ دیر سے سو کر اٹھتے تھے۔ اس لیے ان کے دروازے سے برف ہٹانے کا کام بعد میں ہوتا۔ میں نے اپنے پورچ میں لکڑی کا باکس لگوا دیا تھا جس میں میرے گاہک چیک یا نقدی ڈال دیا کرتے تھے۔ ادھار کرنے والوں کے لیے میں نے ایک رجسٹر بنادیا تھا لیکن ان میں سے بھی زیادہ تر ایک دو دن میں ادائیگی کر دیا کرتے تھے۔

رات کو ایرک کے ساتھ گھر سے باہر نکل کر ہر گھر کے سامنے سے برف صاف کرنا ایک تفریح تھی۔ آہستہ آہستہ میں اپنے گاہکوں کو بہتر طریقے سے جاننے لگا۔ اگر لیونگ روم سے ٹیلی وژن کی روشنی باہر آ رہی ہوتی تو میں سمجھ جاتا کہ مسٹر لوپیز کو پھر بے خوابی کی شکایت ہو گئی ہے۔ دوسری منزل کے بیڈ روم سے آنے والی روشنی بتاتی تھی کہ آج مسز ہوسٹر ڈائنر سے جلدی واپس آ گئی ہے اور مسٹر ہوسٹر سے باتیں کر رہی ہے۔ لیکن ہاؤس کے ڈائننگ روم سے روشنی آنے کا مطلب تھا کہ ان کی بیٹی ٹریسی ابھی تک پڑھ رہی ہے۔

لیکن ٹریسن جیسے چھوٹے قصبے میں بھی سب کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ اس کی دو مثالیں سامنے آئیں۔ پہلی روبرٹ مورسین کی ہے جو مجھ سے بیس سال بڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی تہقہ لگانا شروع کر دیتا۔ اس نے مجھے ایک دفعہ بھی ادائیگی نہیں کی تھی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اس سے تقاضا کروں لیکن اس نے اپنے دروازے پر امریکی جینڈے کا اسٹیکر لگا رکھا تھا اور اس پر لکھا تھا۔ ”میرا پوتا امریکی فوج میں ہے۔“

ایک دن میں پبلک لائبریری کے باہر کھڑا ہوا تھا کہ میں نے مورسین کو اپنے ایک دوست سے کہتے سنا کہ اس ریٹائرڈ شخص نے ریٹائرڈ سے برف ہٹانے کا کام چھینا ہے۔ اگر اس نے اپنی سرگرمی جاری رکھی تو وہ پوری سردیوں میں

اسے ایک پیسا نہیں دے گا۔ اس کے بعد میں کبھی اس طرف نہیں گیا۔

دوسری مثال اس سے بھی زیادہ سخت تھی۔ میکس اسٹیک پول، کیپ کوڈ میں رہتا تھا جہاں تین نامکمل مکان بنے ہوئے تھے۔ وہ پیسے کے لحاظ سے پلمبر تھا اور اس کے پاس کام پر جانے کے لیے ایک سفید رنگ کی وین تھی جس پر ڈینٹ پڑے ہوئے تھے۔ جب میں پہلی بار اس کے گھر کے سامنے سے برف ہٹانے کے لیے گیا تو وہ باہر نکل آیا اور تیز لہجے میں بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم اس احقر ریٹائرڈ گریڈ سے بہتر کام کرو گے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ برف کو ایک طرف کر دے لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔“ میں نے اپنی ٹھوڈی کھجائے ہوئے کہا۔ ”دائیں طرف کروں!“

”ہاں۔ بائیں جانب ڈھیر لگاؤ گے تو گیراج کا راستہ بند ہو جائے گا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اسے دائیں طرف کر دو تاکہ میں صبح شام دریا کا نظارہ کر سکوں۔“

میرا دل چاہا کہ اسے اس بدتمیزی کا مزہ چکھا دوں لیکن کوئی اور بھی مجھے دیکھ رہا تھا، اس کی عمر پچیس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے جینز اور گرے رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے ایک بچی کو اپنے کولہے اور دوسری کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ اپنے دروازے پر کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ چاہ رہی ہو کہ میں مزید کچھ دیر وہاں رکوں۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”دوست تم فکر نہ کرو۔ میں برف کو دائیں جانب ہی کر دوں گا۔“

میکس مطمئن انداز میں مسکرایا۔ اس کی بیوی مسلسل مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”اس کے علاوہ تمہاری کوئی اور مدد کر سکتا ہوں؟“

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔ بس یہ خیال رکھنا کہ میری کسی چیز کو نقصان نہ پہنچے۔ سمجھ گئے؟“ میں نے اس کے پیچھے کھڑی ہوئی اس کی بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سمجھ گیا۔“

تیسری بار جب میں میکس کے صحن سے برف ہٹانے گیا تو برفباری تھم چکی تھی اور ہلکی پھلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں نے دوبارہ برف ہٹائی اور کافی پینے کے لیے رک گیا۔ اچانک ہی ایرک نے ریں ریں کرنا شروع کر دیا۔ وہ مکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے لائٹ جل رہی تھی۔ ایک بار پھر ایرک نے منہ بسورا۔ میں نے کھڑکی کا

شیخ ہٹایا تو مجھے چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں ٹرک سے اترا اور برف میں چلتا ہوا پورچ تک گیا اور دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں آیا تو میں نے دوبارہ زور سے دروازہ بجایا پھر مجھے کھڑکی کے پیچھے ایک سایہ نظر آیا۔ دروازہ کھلا اور میکس نے باہر جھانک کر دیکھا اور بولا۔ ”کیا مسئلہ ہے۔ ہمیں تمہارا ادھار دینا ہے یا کوئی اور بات ہے؟“

میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے چیخ کی آواز سنی ہے۔“

”اوہ۔“ اس نے کہا۔ ”ٹی وی کی آواز ہوگی۔“ میں ایک قدم آگے بڑھا اور اس کے پیچھے دیکھا۔ اس کی بیوی جن میں تھی۔ اس نے سفید ٹائٹ گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس نے اپنا سر نیچے کیا اور چلی گئی۔

میں نے کہا۔ ”میں نے کسی کے چلانے کی آواز سنی ہے۔ وہ ٹیلی وژن کی آواز نہیں تھی۔ میں دونوں کا فرق سمجھتا ہوں۔“

اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور وہ بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہاری سماعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ کیا سن رہے ہو۔“

”نہیں۔ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ تین دن بعد میں نے اس کی بیوی کو قریبی سپر مارکیٹ میں شاپنگ کرتے دیکھا دونوں بچیاں بھی اس کے ساتھ تھیں۔

”مسز میکس۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔“ وہ اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ”میرا نام بیٹھ ہے۔“

”بیٹھ۔“ میں نے کہا۔ ”اچھا نام ہے۔“ اس نے ایک نظر اپنے سامان پر ڈالی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ابھی رو دے گی۔ میک اپ کے باوجود اس کے بائیں گال پر نشانات نظر آ رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ وہ لٹی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا۔“

”میرا خیال ہے کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔“ اس نے ایک ہلکا سا تہقہ لگایا اور بولی۔ ”یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور یہاں ہر کوئی ایک دوسرے کے بارے میں جانتا ہے جبکہ تم باہر سے آئے ہو۔“ اس نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر کہا۔ ”کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا۔“

اسی روز سہ پہر میں ایک بڑے اسٹور پر گیا اور وہاں سے ایک ڈسپوزیبل سیل فون خریدا۔ وہاں سے میں پبلک لائبریری گیا اور فون بک سے کچھ نمبر نوٹ کر لیے۔ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا لیکن پھر میں نے سوچا کہ بہت کچھ ہو سکتا ہوں اگر بیٹھ آگے آئے اور کسی سے مدد مانگے۔

دوسرے روز میں پولیس چیف سے اس کے دفتر میں ملا۔ وہ میری تعریف کرنے لگا کہ میں کتنے اچھے طریقے سے برف ہٹانے کا کام کر رہا ہوں۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوا، میں نے کہا۔ ”میں میکس اسٹیک پول کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”کیا؟“ وہ اپنی بیوی کو مارتا رہتا ہے۔“ میں نے کہا۔ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میں نے بھی سنا ہے۔“

”پھر تم اس سلسلے میں کیا کر رہے ہو؟“ ”تم کیا کہتے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا کام ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسے گرفتار کرنا ہی مناسب ہوگا۔“

”یقیناً۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن اس کے لیے کوئی گواہی یا شکایت ضرور ہونی چاہیے یا پھر میکس میرے سامنے اپنی بیوی کو مارے۔ اس کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

”اس کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”سو کہ کوئی ثبوت نہیں لیکن تم اسے انکم ٹیکس چوری کرنے یا کسی اور گھٹیا الزام میں پکڑ سکتے ہو تا کہ وہ سیدھے راستے پر آجائے یا کم از کم اسے قائل کر سکتے ہو کہ وہ بیوی کو مارنا چھوڑ دے۔“

چیف نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ”میکس کا چچا سلیکشن بورڈ کا چیئرمین ہے لیکن وہ بھی اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“

ان ناخوشگوار واقعات کے بعد مجھے اس کام سے اکتاہٹ ہونے لگی اور میرا اطمینان و سکون رخصت ہو گیا۔ جب بھی برف گرتی اور میں اسٹیک پول کے دورازے کے سامنے سے برف ہٹاتا تو مجھے یہی امید ہوتی کہ ایرک اندر سے آنے والی چیخوں کا کوئی جواب نہیں دے گا اور اس کے خاموش رہنے پر میں اپنے آپ کو ایک ایسے بزدل شخص کی

طرح محسوس کرتا جو کسی کی مدد کرنے کے بجائے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ میں نے ایرک کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”دوست، سبق سکھانے کا وقت آ گیا ہے۔“

چیف سے ملنے کے تین دن بعد ایک بار پھر میرا میکس سے سامنا ہو گیا۔ میں دکان کے سامنے کھڑا شیٹے کے شوکیں میں سبھی ہوئی چیزوں کو دیکھ رہا تھا کہ میں نے اپنے عقب میں ایک وین کے بریکوں کی آواز سنی۔ میرا ہاتھ بے اختیار ہوٹلر کی طرف گیا لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔ میکس نے کھڑکی کا شیشہ گرایا اور تیز لہجے میں بولا۔ ”میں نے سنا ہے کہ تم میرے معاملات میں مداخلت کر رہے ہو۔“

”معاف کرنا۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا اور میں اس معاملے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔“

میکس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میرے معاملات سے دور رہو۔“

”سوری۔ میں انتظار کروں گا۔“ ”انتظار..... کس بات کا؟“

”یہی کہ تم دھمکی دینے کے بعد کیا کرتے ہو؟“ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”تم چاہو تو یہ انتظار ختم ہو سکتا ہے۔ ہم ایک سودا کر لیتے ہیں۔ تم میرا اور میری بیوی کا پیچھا چھوڑ دو۔ ورنہ مستقبل میں تمہارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔“

اس نے میرے ٹرک کے عقبی حصے کی طرف دیکھا جہاں ایرک سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا وہ بولا۔ ”اچھا کتا ہے۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔“

میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں شاید معلوم نہیں کہ شکار کے دوران کیسے کیسے حادثات ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کسی ہرن یا بھیڑیے کا نشانہ لیتے ہیں اور کتے کو گولی لگ جاتی ہے۔“ میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ”میکس کہہ دو کہ تم مذاق کر رہے ہو۔ تم سنجیدہ نہیں ہو۔“

اس نے زمین پر تھوکا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ تم دیکھو اور انتظار کرو۔“

میں اپنے ٹرک پر گیا۔ دروازہ کھول کر سامان اندر رکھا۔ ایرک میرے پاس آیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم نے سنا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ سنجیدہ ہے۔“ میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”لہذا میں بھی سنجیدہ ہوں۔“

ایک ہفتے کے بعد میں نے گودام کا چکر لگایا جس پر مجھے موسم بہار میں کام کرنا تھا پھر میں بڑے اسٹور گیا اور

وہاں سے دو اہم چیزیں لے کر آیا۔ اب میں موسم کی صورت حال کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ کچھ تاریخی کتابیں بھی پڑھ رہا تھا۔ میں تو نسبتاً پرسکون تھا لیکن ایرک خوش نہیں نظر آ رہا تھا کیونکہ میکس کی دھمکی کے بعد میں اسے زیادہ تر گھر میں رکھتا اور جب باہر جانا ہوتا تو میں اس کی زنجیر پکڑے رکھتا۔

اگر سوتے میں کوئی فون آجائے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ نوے فیصد بری خبر سننے کو ملتی ہے۔ گھڑی میں وقت دیکھا تو چھ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ میں نے کسماتے ہوئے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے چیف بول رہا تھا۔ ایک مختصر گفتگو کے بعد میں بستر سے باہر آ گیا۔ میں نے ایرک کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم یہیں ٹھہرو۔ میں اس سے مل کر آتا ہوں۔“

چیف سے میری ملاقات میکس کی رہائش گاہ پر ہوئی جہاں کافی لوگ جمع ہو گئے تھے وہاں چیف کی گاڑی کے علاوہ ایک ایسولینس اور دو ٹرک بھی موجود تھے۔

جب میں چیف کے قریب پہنچا تو اس نے بتایا۔ ”گزشتہ شب میکس اسٹیک پول کو دو بجے کے قریب راستن سے ہنگامی نوعیت کے کام کے لیے فون آیا۔ وہاں جانے میں تقریباً آدھا گھنٹا لگتا ہے لیکن اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ انہوں نے تین گنا معاوضہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔“ ”یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مقامی لوگوں کی بھی آمدنی میں اضافہ ہو رہا ہے۔“

”ہاں۔“ چیف نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ فون پر جو پتا بتایا گیا، اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ میکس نے اپنی بیوی کو فون کر کے کہا کہ وہ واپس آ رہا ہے۔“

چیف نے ڈرائیوے اور عقبی یارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے اندازے کے مطابق وہ تین بجے یہاں پہنچا اور گاڑی روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کی وین ڈھلوان کی جانب پھسلتی چلی گئی۔“

میں نے پولیس کی گاڑی کے آس پاس دیکھتے ہوئے کہا۔ ”معاف کرنا۔ مجھے اس کی وین نظر نہیں آرہی۔ وہ کہاں چلی گئی؟“

چیف نے کہا۔ ”دریا میں اور وہ بھی اس میں موجود تھا۔“ ”یہ کیا کہہ رہے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”کہیں یہ کوئی مذاق تو نہیں؟“

”میں نے علی الصباح مذاق کرنے کے لیے تمہیں یہاں نہیں بلایا۔“ وہ ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم ان

جانندی کا چھگن

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

حسین چہرے زیور کے محتاج نہیں ہوتے مگر حسن چاہے کتنا ہی زیادہ ہو سنورنے سجنے کا حق تو پھر بھی رکھتا ہے اور معصوم معصوم خواہشیں انسان کے اندر جینے کی امنگیں بڑھادیتی ہیں۔ اس نے بھی ایک چھوٹی سی فرمائش کی تھی بنایہ سوچے کہ اسے پورا کرنے کے لیے اس کے محبوب کو کن کن آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا۔

ایک معمولی سی فرمائش کی غیر معمولی اور خطرناک آزمائش

ساحل کا رخ کرتے، جہاں حدنگاہ پھیلے بحیرہ عرب کی لہریں انہیں پکارتی محسوس ہوتی تھیں۔ یہ لوگ سمندر میں اپنی کشتیاں کھیتے، جال پھینکتے، مچھلیاں پکڑتے اور شام سے پہلے گھروں کو

دور مشرق کی سمت، جہاں حدنگاہ پھیلے بحیرہ عرب کے ساحل اور سمندر پر رات کی دم توڑتی سیاہی میں صبح کا زب کی ابھرتی پھلکی پھلکی سپید روشنی کا ادغام..... عجیب ہو کہ زوہ سامنظر پیش کر رہا تھا۔ ٹھٹھہ کی یہ ساحلی بستی، گوٹھ میرسا کرخان کے قریب اور کیٹی بندر کے کنارے ہی واقع تھی۔ یہ میربحروں کا علاقہ تھا جو برسوں سے یہاں آباد تھے۔ ان کا جدی پشتی پیشہ ماہی گیری تھا۔ یہ محنت کش لوگ، صبح دم جاگ جاتے اور

کے علاوہ کچھ معلوم نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اور بچیاں پوری رات سوتی رہیں اور صبح اٹھ کر اسے پتا چلا کہ میکس گھر پر نہیں ہے۔ تلاش کرنے والے میکس کی وین کو دریا سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان پر لگی کریٹوں نے دریائی پانی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ چیف نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”کچھ عرصہ قبل میں نے تمہارا پس منظر معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ زیادہ معلومات نہ ہو سکیں بس میں وہی کچھ جانتا ہوں جو تم نے بتایا ہے یعنی تم سرکاری ملازمت میں تھے۔“

”ہاں۔ یہ سچ ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم وہاں کس نوعیت کا کام کرتے تھے؟“

”ادھر ادھر کے مختلف کام۔“ میں نے کہا۔ ”ایسے کاموں کی فہرست بہت طویل ہے۔“

”چیف کچھ سوچتے ہوئے بولا۔“ میں جانتا ہوں کہ تم

ایک ہوشیار شخص ہو اور میں بھی اپنے آپ کو کچھ کم ہوشیار نہیں

سمجھتا۔ اس لیے میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ البتہ یہ

ضرور جانتا چاہتا ہوں کہ اب تم کیا کر رہے ہو؟“

ان دونوں ٹوکوں کی کوشش رنگ لائی اور وہ وین کو

دریا سے باہر نکل لائے۔ اس کا اگلا حصہ چکنا چور ہو چکا تھا۔

اس کے سامنے والے حصے میں پانی بھر گیا تھا۔

”اب میں برف ہٹانے کا کام کر رہا ہوں۔“ میں

نے کہا۔ ”میں سڑکوں اور مکانات کے سامنے والے حصے کو

صاف رکھتا ہوں۔“

”کیا تم اس کام کو جاری رکھنا چاہتے ہو؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ بہار کا موسم

شروع ہونے والا ہے اور اس میں برف باری نہیں ہوتی۔

اس کے لیے میں نے دوسرے کام سوچ رکھے ہیں۔“

”چیف کو ان کاموں کی تفصیل بتانا ضروری نہیں تھا۔

میں اسے یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس وقت میں بیٹھ کے علاوہ

کچھ نہیں سوچ رہا۔ وہ مسلسل کھڑکی کے پردے کے پیچھے

کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے بڑی بے چارگی اور بے

بسی سے کہا تھا کہ کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ میں یہ دعویٰ تو

نہیں کرتا کہ مجھے چیخ قبول کرنے کا شوق ہے لیکن ایسے

حالات ضرور پیدا ہو گئے کہ اس کی مدد ہو گئی۔ مجھے یقین ہے

کہ سوگ ختم ہونے کے بعد جب میں اسے پروپوز کروں گا تو

وہ انکار نہیں کرے گی۔

لوگوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ رہے ہو؟“

”ہاں۔ میری آنکھوں میں روشنی پڑ رہی ہے۔“

”جو کچھ بھی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”انہوں نے وین

تلاش کر لی ہے اور اسے نکالنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ میں

صرف امید ہی کر سکتا ہوں کہ وہ اس میں موجود ہو۔ اس سے

زیادہ بری بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کی لاش دریا کی لہروں

پر ڈولتی رہے اور چھ ماہ بعد اس کی باقیات مل جائیں۔“

میں نے مکان کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے ایک

کھڑکی کے پیچھے کچھ نقل و حرکت نظر آئی۔

”مجھے امید ہے کہ تمہاری کوشش کامیاب ہوگی لیکن

اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ایک سوال پوچھوں۔ تم نے مجھے

یہاں کیوں بلایا ہے؟“

”تم جانتے ہو کہ میرے فرائض میں تفتیش کرنا بھی

شامل ہے اور اس وقت میں میکس کی ممکنہ موت کی تحقیقات

ہی کر رہا ہوں۔“

اس نے مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ”میں

جانتا چاہتا ہوں کہ تم گزشتہ رات کہاں تھے۔ مجھے یہ سوال

پوچھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حال ہی میں تمہاری

اکر اسے ایک دو جھڑپیں ہو چکی ہیں۔“

”گزشتہ شب برف باری نہیں ہوئی۔“

”میں نے یہ نہیں پوچھا۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں صرف تمہیں

بتا رہا ہوں کہ جب برف باری ہوتی ہے تو میں برف ہٹانے

کے لیے باہر نکلتا ہوں اور اگر برف باری نہ ہو رہی ہو تو گھر

پر ہی رہتا ہوں۔“

”چیف نے جی ہوئی برف کی طرف ایک قدم آگے

بڑھایا اور بولا۔“ اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں معلوم

ہے کہ صرف ڈرائیو دے اور عقبی صحن میں برف کی تہ جمی

ہے۔ لگتا ہے جیسے کسی نے یہاں پانی کا چھڑکاؤ کیا ہے۔“

”ایسے موسم میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”دریا کے قریب ہونے کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ سورج کی

گرمی سے برف پکھل گئی ہو اور بعد میں سردی پڑنے سے

دوبارہ جم گئی۔“

”نہیں۔ برف کی سطح انتہائی ہموار ہے لگتا ہے کہ کسی

نے یہاں پانی پھیلانے کے لیے مکینیکل اسپرے استعمال کیا

ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ بہت جلدی جم جائے گا۔“

”اس کی بیوی کیا کہتی ہے۔ کیا اس نے کچھ دیکھا یا سنا؟“

”نہیں۔“ چیف نے کہا۔ ”اسے ان دو جھٹی فون کالز

لوٹ آتے تھے۔

بستی کے ایک جھونپڑ نما گھر کی بوسیدہ منڈیر پر مرغ نے ہانگ دی تو اس کے ساتھ ہی بچپن سالہ اللہ رکھو نے اپنی کمزور آنکھیں کھول دیں۔ وہ جھلنگا سی رلی بچھی چار پائی پراٹھ بیٹھا۔ کوٹھڑی کا ایک پٹ دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں پھونس کے چھپرے سے نکلے بدنما بانس پر جھولتی نظر آتی لائین کب کی بجھ چکی تھی۔

”اڑے او..... آربو! اٹھ جا بابا! صبح ہو گئی ہے۔“ اس نے ہانگ لگائی۔ وہ خود جاگ تو گیا تھا مگر ابھی اس نے چار پائی نہیں چھوڑی تھی۔ پیر جھلائے بیٹھا کسلمندی اتار رہا تھا۔

ساتھ کی کوٹھڑی میں اللہ رکھو کا نوجوان بیٹا ارباب علی اپنی نوبہا تہا دلہن کے ساتھ موجود تھا۔ کل رات ہی تو ان کی شادی ہوئی تھی۔ شادی بھی کیا تھی، بس بستی کے چند لوگ شامل ہوئے تھے۔ سفید ابلے ہوئے چاولوں اور پھلی کے سالن سے ان کی تواضع کی گئی تھی اور بیٹھے کے طور پر سفید ابلے چاولوں کو چینی ڈال کر پیش کر دیا گیا تھا۔

ارباب ایک بیس بائیس سالہ دیلا پتلا مگر قدرے دراز قامت جوان تھا۔ رنگت گہری سانولی تھی اور آنکھیں روشن تھیں۔ بال سیاہ اور گھنگرالے تھے جبکہ اس کی دلہن ایک سترہ سالہ معصوم شکل مگر پُرکشش نقوش والی لڑکی تھی۔ اس نے کاسنی رنگت کا چمکدار عروسی جوڑا پہن رکھا تھا۔ ہاتھ پیروں میں رنگ حنا کی سرخی ہنوز تازہ تھی۔ سہاگ رات کی سحر تو یوں بھی بڑی گہری اور نیند سے بوجھل ہوتی ہے۔ بستر چھوڑنے کو دل نہیں کرتا، مگر گھر کے باہر موجوں کی سرگوشیاں اپنے محنت کشوں کو پکار پکار کر بلارہی تھیں اور ان کی پکار پر لیک نہ کہنا ان جھانکوں کا شیوا نہ تھا۔

دلہن کا نام نوری تھا۔ وہ جاگ چکی تھی اور اب اپنا لباس درست کرتے ہوئے، بڑی محبت بھری نگاہوں سے اپنے شوہر کو بے سدھ چار پائی پر لیٹا دیکھ کر آجوں ہی آپ شرماری تھی کہ اس کے کانوں سے سر کی آواز نکلتی تھی۔ اس نے جواب دینے کے لیے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ پھر شرم کی لالی اس کے چہرے پر اور گہری ہو گئی تو آواز گھٹ گئی۔ تب ہی دھیرے سے اپنے شوہر کو جگانے لگی۔

”اٹھو! بابا آواز دے رہے ہیں.....“

بان کی خوب کسی ہونی چار پائی پر گہری نیند میں پڑا ارباب کسمایا اور کروٹ بدل کر اس نے اپنی ایک ٹانگ اور ہاتھ پھیلا یا..... جو خالی جگہ پر پڑا تو اس کی آنکھ فوراً کھل گئی۔ اس کی بے قراری اور بے چینی کو، پاس کھڑی اس کی دلہن

نوری نے فوراً بھانپ لیا اور اس کے نرم لبوں پر بے اختیار معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تم کھڑی کیا کر رہی ہو نوری؟ آؤ نا.....“ وہ لیٹے لیٹے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر اپنی نئی نویلی دلہن سے بولا تو نوری نے بھی مسکرا کر بے اختیار اپنا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور اس کے پاس چار پائی پر تک کر بیٹھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

”رات کہاں، صبح ہو گئی ہے۔ بابا بلارہا ہے تجھے۔ میں غسل کرنے جا رہی ہوں پھر چائے کا پانی رکھتی ہوں۔ تم اب جاگ جاؤ۔“

”ہائے مولا! کیا شادی کی رات کی صبح بھی کوئی کام پر جاتا ہے۔“ ارباب بڑبڑاتے ہوئے اٹھا۔ اس کی بات پر نوری کے دل نے چٹکی لی اور پھر وہ نرم مسکراہٹ اور میٹھی سرگوشی میں بولی۔

”تو پھر بابا سے کہہ کیوں نہیں دیتے..... وہ آج خود ہی چلا جائے۔ میں اسے چائے پانی تیار کر دیتی ہوں۔“

”کہہ تو دوں.....“ ارباب پاؤں جھلائے بیٹھ گیا۔ ”پر نوری! یہ سمندر بابا (بحیرہ عرب) ہے نا..... یہ ہم پر صدیوں سے مہربان چلا آ رہا ہے۔ یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہمیں روز بلاتا ہے اور ہم اس سے..... جب اس کی محبت زیادہ جوش مارتی ہے نا..... پھر یہ ہمیں اپنے سینے میں چھپا لیتا ہے اور کہتا ہے اب آرام کرو میری آغوش میں، بہت محنت کر لی.....“ نوری اس کی بات سن کر دل سی گئی۔ فوراً پریشان ہو کے بولی۔

”ایسا کیوں کہتے ہو.....؟ میرا دل چھوٹا ہونے لگتا ہے۔“ ارباب اس کی بات سن کر ہنسا۔

”میں کب کہتا ہوں، بستی کے سبھی لوگ کہتے ہیں، بابا بھی یہی کہتا ہے۔ سمندر بابا بہت مہربان ہے۔“

اس نے کچھ دیر توقف کیا پھر مزید بولا۔

”اچھا چل آج اپنے پیارے ہاتھوں سے میرے لیے اچھی سی چائے بنا اور تھی والی روٹی۔ میں تب تک تیار ہوتا ہوں۔“ ارباب نے محبت بھری نظروں سے نوری کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بھی اپنے محبوب شوہر کی طرف دیکھ کر مسکرا دی پھر اپنے عروسی آئچل کا ایک پلو اپنی مہندی لگی انگلی کے گرد لپیٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہے؟“ ارباب نے چار پائی سے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

”وہ..... یاد ہے نا... اپنا وعدہ.....؟“ وہ اک ادائے

دلیری سے بولی تو ارباب ہلکا سا قہقہہ لگا کے بولا۔

”اچھی طرح یاد ہے۔ وہ چاندی کا چھکن تو میں خود بھی تیری اس پیاری سی نازک سی ناک پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیوں فکر کرتی ہے، بس دعا کر..... آج نگر اور بہت سارا شکار ہاتھ لگ جائے تو گھر کا رخ اسی وقت کروں گا جب تک میلے کی دکان سے وہ چھکن نہ خرید لوں۔“

”خیر سے جاؤ خیر سے آؤ سائیں.....!“ نوری نے محبت بھری حلاوت سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں باب بیٹا جال سنبھالے، ساحل سمندر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

وہاں اور بھی تنگ دھڑنگ میربحر، چھیرے پہنچ گئے تھے۔ اللہ رکھو اپنی کشتی کی طرف بڑھ گیا اور اس کا بیٹا ارباب جال درست کرنے لگا۔ ٹھیکے داروں کے آدمی وہاں گشت کر رہے تھے۔ سوز و دیاں کھڑی تھیں۔ گھجی کے بڑے بڑے خالی ٹوکڑے پھیلا دیے گئے تھے۔ اب انتظار تھا کہ کون کتنی مچھلی پکڑے ٹوکڑے بھرتا ہے اور کتنے روپے اس کا مقدر بنتے ہیں۔

مگر آج کا دن ہی خراب ثابت ہوا تھا۔ کوئی شکار ہاتھ نہ لگا۔ ماسوائے چھوٹی مچھلیوں کے جو صرف غریب لوگ ہی لے سکتے تھے، وہ بھی مفت میں۔ کوئی ٹھیکے دار نہیں..... وہ تو انہیں فری میں بھی لینا پسند نہ کرتا۔ غصے میں آ کر اللہ رکھو نے وہ ساری مچھلیاں واپس سمندر میں پھینک دیں۔ باپ کی طرح شکار نہ ملنے پر بیٹا بھی پریشان تھا۔ ارباب کے تصور میں وہ چاندی کا چھکن گھومنے لگا جسے لینے کا تقاضا نوری نے اس سے کر رکھا تھا۔ اس سے زیادہ ارباب کو اپنے وعدے کی فکر تھی، کیا سوچے گی نوری؟ شادی کی رات کو ایک ہی وعدہ کیا اور وہ بھی پورا نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ نوری ایسا کچھ نہیں کہے گی، ایک ذرا حرف شکایت تک اپنی نوک زباں تک نہ لائے گی مگر کیا اس کا دل ٹوٹ نہیں جائے گا؟ بس! اسی فکر نے اسے بے چین کر دیا۔

اس نے کشتی کے دنبالے پر کھڑے ہو کر سمندر کی طرف تکتے ہوئے اللہ سے دعا کی کہ شام سے پہلے پہلے کوئی شکار ہاتھ لگ جائے اور وہ اپنی پیاری نوری کے لیے چھکن خرید سکے۔ میلے کی دکانیں رات بھر کھلی رہتی تھیں اور وہ آج ہی اپنا وعدہ نبھانا چاہتا تھا۔

ابھی سورج نصف النہار پر نہیں آیا تھا۔ ارباب اور اس کا باپ جال پھینک پھینک کر اور خالی جال سمیٹ سمیٹ کر شھکن کے مارے نڈھال ہو گئے۔ اللہ رکھو کی حالت

تو زیادہ نازک ہو گئی تھی۔ وہ تو بالکل ہی مایوس ہو گیا تھا۔

”اڑے چھو کر! آج شکار نہیں ملنے کا..... زیادہ آگے نہ جا..... سمندر پھر اہوا ہے۔“ اس کے باپ نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”نہیں بابا! تو فکر نہ کر شکار ضرور ملے گا۔ بس تھوڑا سا اور آگے کشتی کھیتے ہیں۔“ ارباب نے کہتے ہوئے چپو سنبھال لیے۔ اس کے تصور میں نوری کا چہرہ گھومنے لگا۔ اس کی ناک کبھی اسے خالی دکھائی دیتی اور کبھی چاندی کے چھکن سے مزین اور دکتی ہوئی پھراچانک ہی اس کا حسین و معصوم چہرہ مغموم دکھائی دینے لگتا۔

”بس کر پٹ! اور کتنا آگے جائے گا.....؟“ اللہ رکھو نے بیٹے سے کہا۔

”بس بابا! تھوڑا اور..... مجھے یقین ہے کہ یہاں شکار ہمیں ضرور ملے گا۔“ ارباب نے جوش تلے کہا۔ اس کی بات سن کر اللہ رکھو جانے کیوں بڑے غور سے بیٹے کے چہرے کو تنقید لگا۔ اسے آج اپنا بیٹا کچھ زیادہ ہی جوش میں نظر آ رہا تھا۔ آج اس کے حوصلوں کے بادبان کچھ زیادہ ہی بلندی پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ ورنہ تو کہاں شکار کا ذرا بھی آسرا جاتا وہ فوراً گھر لوٹنے کی بات کیا کرتا تھا۔ تو پھر..... آج ایسا کیا ہے؟ کیوں یہ اتنے جوش اور حوصلے کی باتیں کر رہا ہے؟ اللہ رکھو کچھ سوچتا سا بن گیا۔

ایک مقام پر جہاں اٹھلانی موجوں کا جو بن عروج پر تھا، ارباب نے جال پھینک دیا۔

”سمندر بابا.....! آج تیری مہربانی کی زیادہ ضرورت ہے.....“ جال پھینکتے وقت اس نے دل ہی دل میں کہا۔

”اتھلے پانیوں میں مچھلیاں نہیں ملتیں.....“ اللہ رکھو نے اسے سمجھایا۔ ارباب نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جال کھینچا تو چار پلہ، تین بڑے سائز کی رہو اور چھ عدد لیڈی ایسا پیر اس کے جال میں تڑپ رہی تھیں۔ اگرچہ یہ بھی کم ہی تعداد میں تھیں..... مگر اس سے چھکن خریداجا سکتا تھا مگر پیٹ بھرنے اور چولہا جلانے کے لیے ابھی یہ ناکافی تھیں۔ اس نے پھر جال پھینکا مگر اس بار کچھ ہاتھ نہ آیا۔

”بس کر پٹ! اتنا ہی کافی ہے، پیٹ کا دوزخ تو بھر ہی جائے گا۔ کیوں اتنی جان مار رہا ہے؟“ اللہ رکھو بولا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک جال کو نئے سرے سے پھینکنا اور پھر اکٹھا کرنا کتنا دقت طلب کام تھا۔

اس بار جال خالی تھا۔ دو تین بار کی کوششوں کے

باوجود شکار ہاتھ نہ لگا۔ ادھر باپ نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ اب واپس چلو، آج سمندر بابا نامہربان ہے۔ آج اس سے ضد نہ کرو۔

جبکہ ارباب اور گہرے سمندر میں جانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک طریقہ سوچا۔ وہ بہ ظاہر واپسی کے لیے کشتی کھینے لگا۔ جب اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچا تو اس نے کسی بہانے اپنے باپ کو ایک جاننے والے کی کشتی میں سوار کرا دیا اور خود گہرے سمندر کا رخ کر لیا۔

☆☆☆

سورج اب سر پر جھپکنے لگا تھا۔ دھوپ کی تمازت سمندر کی سطح پر پڑتی تو اس کا انعکاس تیز "انی" کی طرح آنکھوں کو چبھتا محسوس ہوتا۔ ارباب پسینے سے تر ہوتا تھا، وہ دو تین بار جال پھینک چکا تھا اور ہر بار شکار پڑنے میں ناکام رہا تھا۔ اس کے پاس کالے ربڑ کا ایک ہی مشکیزہ تھا جس میں نصف پانی ہی بچا تھا۔ سمندر کا کھارا پانی وہ نہیں پی سکتا تھا۔ مٹی بھر بھرنے ہوئے کالے چنوں کی تھیلی تھی، وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ ساگ اور دیسی گھی کی رلی ملی روٹی کی چوری کے ٹکڑے بھی اس کے شکم میں جا چکے تھے۔ اس نے سوچا، پیٹ کا کیا ہے۔ اتنا ہی شکار کافی ہے۔ جھپکنے تو خرید ہی لیا جائے گا۔ روٹی نہ ملے تو کیا ہے۔ گزارہ ہو جائے گا۔ وہ مطمئن تھا کہ نوری سے کیا وعدہ تو آج پورا ہو ہی جائے گا۔ یہ سوچ کر اس نے تھوڑا بہت جو شکار تھا، وہ جال میں لپیٹ لیا۔ پانی کا مشکیزہ سنبھالا اور ابھی چبھتا مٹنے ہی لگا تھا کہ اچانک ایک تیز لہر نے اس کی کشتی الٹ دی لہراتی زور دار تھی کہ وہ خود کو نہ سنبھال سکا اور سمندر میں جا گرا وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا تو اسے جال اور پانی کا مشکیزہ ہی نظر آسکا۔ وہ اس نے دیوچ کر پشت سے جال کی رسی کی مدد سے باندھ لیا۔ اس کی کشتی الٹ کر بہتی ہوئی اس کی پہنچ سے دور جا چکی تھی۔

اسے تیرنا تو آتا ہی تھا مگر اسے یہ احساس بھی تھا کہ وہ ساحل سے بہت دور تھا جبکہ ہوا کا رخ بھی مخالف سمت کی طرف تھا۔ وہ جتنا بھی ہاتھ پاؤں مارتا بہ مشکل آٹھ دس ہاتھ ہی آگے بڑھ سکتا تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ مسلسل ہاتھ مارتا رہے، ورنہ موجیں اسے پھر پیچھے کی طرف دھکیل دیتیں۔ وہ مشین تو تھا نہیں کہ مسلسل تیرا کرے۔

اسے اپنی موت صاف نظر آنے لگی تھی، تب پھر اس نے یہی بہتر سمجھا کہ جان تو بچائی جائے اسے معلوم تھا کہ سمندری ہواؤں کا رخ جس طرف تھا وہ ایک ایسے چھوٹے سے بے آب و گیاہ صحرائی ٹاپو (چھوٹا جزیرہ) کے

ساحل سے لگا سکتی تھی جو زیادہ دور بھی نہ تھا۔ اسے تسلی تھی کہ جھپکنے خریدنے کے پیسوں کا پورا بندوبست اس کے پاس تھا، بس اب جان بچ جائے تو وہ نوری کے پاس پہنچ کر سرخ رو ہو جائے۔ اس نے خود کو موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

موجوں نے اسے جلد ہی مذکورہ ٹاپو کے ریتیلے ساحل پر لا پٹا تھا۔ وہ اوندھے منہ پڑا تھوڑی دیر ہانپتا رہا، اس کے بعد کراہتا ہوا پشت کے بل پلٹا تو عین سر پر جھپکنے سورج کی تیز چمکتی ہوئی روشنی چہرے اور آنکھوں پر پڑی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں میں سوئیاں چبھ رہی ہوں۔ اس نے ریتیلے ساحل پر لیٹے لیٹے گردن موڑ لی۔ دھوپ کی تمازت اب اس کا چہرہ جھلسانے لگی تھی پھر اسے کچھ یاد آیا اور وہ ہڑبڑا سا گیا۔ اس نے نہایت بے قراری سے اپنے گیلے جسم پر ہاتھ پھیرا تو بے اختیار سکون کی سانس لی۔ مچھلیاں اور جال پانی کے مشکیزے سمیت اس کے جسم کے ساتھ بندھا ہوا تھا ٹرڈہ فکر مند سا ہو گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سوچنے لگا کہ ساحل سے دور جاننا بے وقوفی ہوگی۔ یہاں کھڑے رہ کر اسے مدد مل سکتی ہے لیکن اگر ٹاپو کے اندر چلا گیا تو وہیں بھٹکتا رہے گا، مگر مصیبت یہ تھی کہ اسے چھایا چاہیے تھی۔ تیز دھوپ اسے بیمار کر سکتی تھی۔ اس نے ٹاپو کی طرف چہرہ کر کے ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی پر جھجھا سا بنا کر سامنے کا جائزہ لیا تو اسے سارا ٹاپو ہی ویران اور بے آب و گیاہ اور بے سایہ محسوس ہوا۔ تاہم اسے کہیں کہیں ریتیلے ٹیلے، جسے مقامی زبان میں "جبل بھٹ" کہا جاتا تھا نظر آئے۔ اس نے دھوپ کی تیزی سے بچنے کی خاطر یہی فیصلہ کیا کہ وہ ایسے ہی کسی ٹیلے کی آڑ لیے ذرا سستا۔ نے کے لیے بیٹھ جائے گا اور پھر دوبارہ ساحل کا رخ کرے گا۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھا۔

ساحل کی ریت سیاہ ہو رہی تھی۔ جا بجا سپیاں اور گھونگے پھیلے ہوئے تھے۔ ارباب کے مطابق یہ کیاڑی اور بابا بھٹ آئی لینڈ کے قریب کا کوئی گمنام جزیرہ تھا۔ کہیں کہیں روسیدگی نظر آتی تھی۔ سوکھے اور ٹنڈ منڈ درخت بھی پھیلے ہوئے تھے۔ زیادہ تر ٹیلے بے ہی دکھائی دے رہے تھے۔

بالآخر وہ ایک نسبتاً قریبی ٹیلے کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے جال اور مچھلیوں کا جائزہ لیا۔ یہ تو شکر تھا کہ اس نے مچھلیوں وغیرہ کو نمک (مسالا) لگا لیا تھا، اب ان کا گوشت کافی دیر تک محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس نے مشکیزے سے منہ لگا کر چند گھونٹ پانی پیا کہ بس صرف حلق تر ہو سکے، جانے کتنے دن یہاں

ٹھہرنا پڑتا۔ پانی تھوڑا تھوڑا خرچ کرنا مناسب تھا۔ اسے بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ جی میں تو آئی کہ پتھروں کو چھماق کر کے آگ میں کچھ مچھلیاں بھون کر پیٹ کی دوزخ بجھالے مگر پھر اس کی آنکھوں کے سامنے چاندی کا چھکن اور دوسری طرف نوری کا معصوم چہرہ رقصاں ہونے لگتا اور وہ اپنا ارادہ بدل دیتا۔

جزیرہ دور تک ویران اور سنان تھا۔ ساحل اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ جہاں سی ایگل اپنے سفید براق پر پھیلانے اڑان بھر رہے تھے۔ نیلا آسمان دھوپ سے خوب چمک رہا تھا۔

اچانک اس کے کانوں سے ایک آواز نکرائی اور وہ چونک پڑا۔ پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن پھر اس نے دوبارہ آواز پر کان دھرے تو اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس ٹاپو نما جزیرے میں وہ تنہا نہیں تھا بلکہ اور بھی کوئی تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ آواز کی سمت کا اندازہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اسی طرف چل دیا۔ جلد ہی اسے ایک اور ٹیلے کے قریب دو انسان نظر آ گئے۔ ایک مرد تھا اور دوسری عورت مگر نہیں ذرا قریب جانے پر اسے ایک شیر خوار بچہ بھی دکھائی دے گیا جو عورت کی گود میں تھا۔ ارباب اپنی تکلیف بھلا کر تیزی سے ان کی طرف بڑھا تو ان کی حالت زار دیکھ کر چونک پڑا۔ جانے وہ کب سے یہاں بھوکے پیاسے نڈھال اور نیم بے ہوشی کے عالم میں گرم تیتی ریت پر پڑے تھے۔ ننھے منے بچے کی حالت تو زیادہ ناگفتہ بہ تھی۔ وہ عورت کی چھاتی سے بس چمٹا ہوا تھا۔ وہ دودھ پیتا بچہ تھا۔ مرد اور عورت کبھی کبھی منہ سے تیزی آواز نکال لیتے تھے۔

ارباب کو یہ دونوں کسی بھی طرح سے مقامی یاد دہانی نہیں لگے تھے بلکہ اس کے برعکس یہ شہر کے رہنے والے لگتے تھے۔ مرد نے پیٹ ٹرٹ پہن رکھی تھی۔ عورت نے بھی شہری طرز کا قدرے فینشن ایبل لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اب وہ سب پسینے اور ریت سے میلا چیکٹ ہو رہا تھا۔ ان دونوں کے چہرے بری طرح ستے ہوئے نظر آ رہے تھے، ہونٹوں پر پیڑیاں جم گئی تھیں، یہی حالت بچے کی تھی۔ بھوک اور پیاس سے ان پر مردنی اور نقاہت سی طاری تھی۔

ارباب فوراً حرکت میں آ گیا اور اس نے سب سے پہلے پانی کا مشکیزہ بچے کے قریب کیا اور اس کے معصوم پھول

ارجنٹ

ایک سرکاری تل ٹھیک کرنے والے نے ایک گھر پر دستک دی اور پوچھا کیا یہ سیٹھ نذیر صاحب کا گھر ہے۔ اندر سے ایک شخص نے کہا۔ انہیں یہ مکان چھوڑے پورے تین ماہ ہو گئے ہیں۔ تو سرکاری تل ٹھیک کرنے والے نے کہا ایک تو ارجنٹ بلاتے ہیں اور اوپر سے مکان چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

(مرسلہ: غلام حسین اختر۔ سرگودھا)

کنجوس

ایک کنجوس آدمی کو بخار چڑھا تو اس کی بھوک اڑ گئی۔ جب وہ صحت یاب ہوا تو اس نے ڈاکٹر سے پوچھا جناب میری بھوک کیوں اڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا بخار کی وجہ سے۔ کنجوس نے فوراً کہا۔ ڈاکٹر صاحب! براہ مہربانی میرے سب گھر والوں کو بھی بخار میں مبتلا کر دیجیے۔

(مرسلہ: غلام حسین اختر۔ سرگودھا)

عذر

استاد نے شاگرد کو کرکٹ پر مضمون لکھنے کو کہا۔ دوسرے دن شاگرد نے کاپی استاد کے سامنے رکھی۔ اس پر صرف ایک فقرہ لکھا ہوا تھا۔ بارش کی وجہ سے میچ نہیں ہو سکا۔

فلسفی

ایک فلسفی کو لکھو والے سے "تم نے بیل کے گلے میں تھنٹی کیوں باندھی ہوئی ہے؟" کو لکھو والا۔ اس لیے کہ جب میں کسی دوسرے کام میں مصروف ہوتا ہوں تو مجھے پتا چلتا رہتا ہے کہ بیل کہیں رک تو نہیں گیا۔" فلسفی نے کچھ دیر سوچا پھر بولا۔ "اگر بیل کھڑا ہو کر صرف سر ہلاتا رہے تو؟" کو لکھو والے نے جواب دیا۔ "جناب یہ بیل ہے۔ فلسفی نہیں۔" (مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

سے چہرے پر پہلے پانی کے تھوڑے چھینٹے مارے، اس کے بعد اپنے ایک ہاتھ کی ”اوک“ میں تھوڑا تھوڑا پانی اس کے کھلے پڑے منہ سے حلق میں قطروں کی صورت میں ٹپکانے لگا۔ بچے کو ہوش آگیا تو یہی عمل اس نے مرد اور عورت کے ساتھ کیا۔ وہ بھی پوری طرح ہوش میں آگئے۔ اس کے بعد ارباب انہیں باری باری سہارا دیتے ہوئے اپنے ٹیلے کے پاس لے آیا۔ یہ ٹیلا کچھ ایسے رخ پر تھا کہ دھوپ سیدھی اس پر نہیں پڑتی تھی۔ اس نے ان کی چھایا میں ان تینوں کو لا کر ڈھلوانی دیوار سے ٹکا کر بٹھا دیا۔ بچہ ماں کی گود میں ہی تھا۔

”خ خ..... خ خ..... خدا کے لیے ہماری مدد کرو.....“
 ”م..... میری بیوی اور بچہ.....“ مرد کپکپاتے لہجے میں ارباب سے بولا۔

”تم بالکل فکر نہ کرو..... اللہ سائیں سب ٹھیک کر دے گا۔“ ارباب نے اسے تسلی دی۔ اچانک اس نے دیکھا عورت ایک ہاتھ سے اپنے نختہ جگر کو سنبھالتی ہوئی بہ مشکل گھسٹ کر اس کے جال کی طرف بڑھی، جہاں مچھلیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ عورت جنونی انداز میں ایک مچھلی کو نکال کر اسے کچا ہی چبانے لگی۔ ارباب نے یہ دیکھا تو اس کے ہاتھ سے مچھلی جھپٹ لی۔ مرد نے یہ دیکھا تو ارباب کی منت کرتے ہوئے بولا۔

”اے کھانے دو..... تاکہ..... تاکہ وہ بچے کی بھوک مٹا سکے۔“
 ارباب نے مرد سے تشفی آمیز انداز میں کہا۔ ”میں نے کہا نا..... تم اب کسی بات کی فکر نہ کرو..... یہ کچی مچھلی کھائے گی تو اسے قے ہو جائے گی۔ پیٹ الگ خراب ہو جائے گا۔ بس! تھوڑا اور صبر کرو، میں ابھی یہ ساری مچھلیاں آگ پر بھون کر کھلا دیتا ہوں۔ اس طرح یہ جلد ہضم بھی ہو جائے گی اور پیٹ بھی خراب نہیں ہوگا۔“

یہ کہتے ہی ارباب نے فوراً کچھ سوکھی جھاڑیاں اکٹھی کیں۔ چھتاق پتھر تلاش کیے اور آگ جلا کر مچھلیاں بھوننے لگا۔ اس دوران اس کی نظروں کے سامنے پھر چاندی کا وہ چنگن رقصاں ہونے لگا تھا جسے دلانے کا وعدہ اس نے اپنی محبوب اور نوبیا ہتا بیوی نوری سے کر رکھا تھا مگر دوسری طرف تین انسانی جانوں کا سوال تھا۔ اس نے اپنا وعدہ اور چاندی کا چنگن بھلا دیا۔

مچھلیاں پک کر تیار ہو گئیں۔ دونوں مرد عورت اس پر ٹوٹ پڑے۔ ارباب انہیں دیکھتا رہ گیا۔ پیٹ میں خوراک

گئی تو ان کے چہروں پر بھی بشارت دوڑ گئی۔ عورت نے فوراً اپنے معصوم بچے کی بھوک مٹانے کی کوشش کی بچے کو جلد سے جلد دودھ پلانے کی چاہ میں اسے کسی بات کا خیال نہ رہا تھا، مگر ارباب نے فوراً اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

وہ اب مرد سے باتیں کر رہا تھا۔ مرد نے بتایا کہ وہ کراچی کے رہنے والے ہیں۔ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ وہ کیمائری کی بندرگاہ سے ایک مسافر لالچ میں سوار منوڑہ اور دیگر جزیروں کی سیر کو نکلے تھے کہ بد قسمتی سے لالچ زیادہ وزن کے باعث الٹ گئی۔ سارے مسافر کھلے سمندر میں جا گرے تھے۔ خوش قسمتی سے ان کے ہاتھ بڑی ٹائر ٹیوب لگی، جو لالچ کے اندر سے ہی گری تھی۔ باقی مسافر بھی جن کے ہاتھ جوگہ، اسی کے سہارے پر آگئے، کچھ ڈوب گئے۔ یہ تینوں تیرتے ہوئے اس ٹاپو سے آن لگے۔ آج انہیں تیسرا دن تھا بھوکے پیاسے اور بے یار و مددگار..... کہ اللہ نے ارباب کو ان کے لیے فرشتہ بنا کے یہاں بھیج دیا۔

ارباب کو ان کی دکھ بھری کہانی سن کر رنج ہوا..... تاہم اسے حیرت تھی کہ ابھی تک اس طرف کوئی ”ریسکیو پارٹی“ کیوں نہیں آئی تھی۔

مچھلیاں کھانے اور پانی پینے کے بعد ان تینوں کی حالت قدرے سنبھل گئی تھی۔

ارباب ساحل کی طرف جاتا، دور تک دیکھتا اور مایوس واپس لوٹ آتا..... بالآخر جب شام کے آثار دھیرے دھیرے جزیرے میں اترنے لگے تو اچانک اسے ایک موٹر بوٹ دکھائی دی۔ ارباب نے فوراً اپنی قمیض اتار کر اچھل اچھل کر لہرائی شروع کر دی اور ساتھ ہی وہ موٹر بوٹ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے حلق پھاڑ کر چلانے بھی لگا۔ اس نے اپنی قمیض کو آگ بھی لگا دی تھی تاکہ شام پڑتی تاریکی میں روشنی ہو جائے۔

موٹر بوٹ کا رخ چونکہ اسی ٹاپو کی طرف تھا وہ ذرا ہی دیر میں ساحل سے آن لگی۔ موٹر بوٹ کی باڈی پر بے مخصوص نشان اور مونو گرام سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ”ریسکیو پارٹی“ کی موٹر بوٹ تھی۔

ساحل سے لگتے ہی کئی وردی پوش الہکار برآمد ہوئے اور دوڑتے ہوئے ان کی طرف لپکے تو ارباب نے انہیں ساری کہانی بیان کر دی۔

موٹر بوٹ میں ہر طرح کا انتظام موجود تھا۔ ارباب نے ان سے یہ بھی کہا کہ وہ خود ٹھیک ہے مگر ان تینوں کی فوراً مدد کی جائے۔ خاص کر بچے کی حالت نازک ہے۔

ریسکیو پارٹی ان سب کو سوار کر کے روانہ ہو گئی۔ راستے میں ارباب نے درخواست کی کہ اسے مطلوبہ ساحل پر اتار دیا جائے۔ یوں ریسکیو پارٹی نے اسے مطلوبہ ساحل پر اتار دیا اور اس کا شکریہ ادا کر کے آگے روانہ ہو گئے۔

اب شام کا دھند لگا گہرا ہونے لگا تھا۔ ساحل پر عجیب سی ویرانی کا راج تھا۔ ارباب کا دل اداس بھی تھا اور خوش بھی..... خوش اس لیے کہ اس نے تین انسانوں کی جانیں بچائی تھیں، مگر اداس اس لیے تھا کہ..... وہ اب نوری سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس کے لیے آج..... چاندی کا چنگن نہیں خرید سکتا تھا۔ وہ دل مسوس کر سوچنے لگا کہ اب نوری کا سامنا کیسے کرے گا؟ جب وہ خالی ہتھ کے اس کا چہرہ دیکھے گا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی اور خود نوری کے دل پر بھی جب وہ اسے خالی ہاتھ دیکھے گی۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے قریب آن کھڑا ہوا ہے۔ وہ چونک کر پلٹا تو اپنے بوڑھے باپ اللہ رکھیو کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہوا۔

”اڑے..... شکر اللہ سائیں کا..... تو زندہ لوٹ آیا۔“ باپ خوشی سے یہ کہتا ہوا بیٹے سے لپٹ گیا۔ ”چل گھر چل.....“ وہ بولا۔ ارباب بے دلی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ اللہ رکھیو وہ نہ کر بیٹے کا چہرہ دیکھتا جاتا۔ اور اپنا سر دھنسا جاتا۔ بیٹے کو زندہ پا کر اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا۔

ارباب اترے ہوئے چہرے کے ساتھ جب جھونپڑ نما گھر میں داخل ہوا تو سامنے ہی اسے لائین کی روشنی میں..... اپنی محبوب اور نوبیا ہتا بیوی نوری کا چہرہ نظر آ گیا۔ چہرہ کیا تھا جیسے چند ماہ تاب تھا۔ کسی دور اٹھلانی موجوں کے جو بن پر بھیکے آسمان پر نکلے طباق چاندی کی طرح نوری کا رخ ماہ روشن دک رہا تھا اور ارباب اس کے چہرے کو پھٹی پھٹی نظروں سے تکتے جا رہا تھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ قریب کھڑا اس کا باپ اللہ رکھیو ہنوز اپنا سر دھن رہا تھا۔ ارباب کو تو ادھر جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ نوری کی ستواں ناک پر چاندی کا چنگن چمک رہا تھا اور اس کا چہرہ نوری کی طرح دمک رہا تھا۔

”بتانا..... اربو! کیسی لگ رہی ہوں میں.....؟“ نوری نے اٹھلا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ارباب بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ اللہ رکھیو تب تک اپنی کوشٹری کی جانب قدم بڑھا چکا تھا۔

”بہت پیاری لگ رہی ہے تو اس معصوم چاندی کی طرح“

جورات کے آخری پہروں میں بھی سمندر کے آسمان پر ٹکا رہتا ہے مگر اس کی چمک ماند نہیں پڑتی۔“ ارباب نے نوری کو خود سے بھینچتے ہوئے دل کی عین گہرائیوں تلے کہا، پھر پوچھا۔

”نوری! ای ی..... یہ تو بتا..... کہ..... یہ چنگن کہاں سے آیا..... تیرے پاس.....؟“

اس سے پہلے کہ نوری کوئی جواب دیتی کوشٹری سے اس کے باپ کی آواز آئی۔

”اربو! آ.....“ ارباب فوراً باپ کے پاس پہنچ گیا۔ اندر لائین کی روشنی میں اس کے باپ کے بوڑھے چہرے کی جھریوں کی ٹھکن میں ایک عجیب قسم کی طمانیت ہلکورے لیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”پٹ! یہ چاندی کا چنگن میں نے نوری کو دیا ہے۔“ اللہ رکھیو بولا۔ ”پٹ! بڑی عجیب کہانی ہے اس چاندی کے چنگن کی بھی.....“ بوڑھا اللہ رکھیو جیسے سمندر جیسی گہرائیوں والے لہجے میں بولا۔ ”میں اس سے پہلے اسے ایک تحفہ اور ایک نشانی سمجھتا آیا تھا..... مگر آج اس کی اہمیت کا مجھے صحیح طرح اندازہ ہوا ہے کہ یہ ایک امانت بھی تھی۔ اسی لیے میں نے اسے اپنے پاس سنبھال رکھا تھا اب تک۔ میں یہ اپنی بہو نوری کو دینا چاہتا تھا مگر شاید مجھے دیر ہو گئی تھی۔ پٹ! یہ وہ چنگن ہے جس کی خواہش آج سے تیس برس پہلے تیری ماں نے اس وقت مجھ سے کی تھی جب وہ اسی طرح میری دہن بن کے آئی تھی۔ میں بھی تیری طرح اپنا وعدہ پورا کرنے کی خاطر گہرے سمندروں کی طرف چلا گیا تھا اور اپنی جان پر کھیل گیا تھا، بالکل اسی طرح جیسے تو کھیلا ہے۔“

”میں نے تیرا جوش اسی وقت تاڑ لیا تھا جب تو بھکاری کی خاطر گہرے پانیوں میں جانے کا پختہ عزم کر چکا تھا۔ میں اس وقت کچھ زیادہ نہ سمجھ سکا تھا مگر جب گھر لوٹا تو بے چین ہو گیا اور نوری دھنی (بیٹی) سے پوچھا کہ معاملہ کیا تھا تو اس نے مجھے اصل بات بتادی۔“

”ہم دونوں ہی تیری سلامتی کی دعائیں مانگتے رہے۔ اللہ سائیں نے ہماری سن لی اور توجہ سلامت لوٹ آیا لیکن پٹ! اب تو بھی اس امانت کو سنبھال کر رکھنا، کیا خبر یہ عجیب تحفہ آگے چل کر پھر کسی کے کام آ جاوے.....“

ارباب اپنے باپ کی آخری بات کا مطلب سمجھ گیا تھا..... اسی لیے اس نے باپ کے کندھے پر ہولے سے اپنا ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا۔ اللہ رکھیو کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کنسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمررواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاٹو ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

قسط نمبر: 10

وقت

حُما بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب

تھا۔ ایک ایسے پر عزم بازی گر کی بازی گری

..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک

دلربا طویل داستان



اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ”علی“ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو علی سلطان کی نگہداشت میں پایا۔ علی سلطان نیکساس (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو ویل چیرنگ محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی ریٹا میگڈالین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ وقت رخصت ریٹا اپنی اکلوتی بیٹی لٹنی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ کر کچھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمت رکھی ہوئی تھی اور بچپن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد ایسا برتاؤ کرتا تھا جو اسے اکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں بیکروں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے حسن و سمری انکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس پر دباؤ تھا۔ نہایت ہی خوب صورتی سے یہ کہہ کر اسے ٹال دیتا تھا۔ ”میرے بچے! انتظار کرو۔ وقت آنے پر تمہیں سب بتا دوں گا۔“ یہ نفی علی کے تجسس کو ہوا دیتی تھی لہذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے نیکساس کے علاقے اینگلٹن میں واقع ”سرکل اے“ نامی ایک اسٹور پر جزوقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کر لی تو نت نئے ہنگامے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو میکینک لڑکے ڈیکٹ کی نیت سے ”سرکل اے“ میں گھس آئے۔ تمام کیش لوٹنے کے بعد وہ ڈیکٹ علی کے ساتھ موجود بیلز میں نظر کو شوٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنیاد پر علی کو بھی شامل تفتیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں ان دونوں میکینک ڈیکٹ کوئی ٹکس (ایری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج لیک جیکسن (نیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے بی (نیکساس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور لیک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ”وئی لاؤنچ“ نامی ایک ریسٹورنٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک ہسپانوی دوشیزہ شادو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دل نشیں مہ جیس نے علی کے درد پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات وئی لاؤنچ میں جب لیونارڈو نامی ایک میکینک غنڈے اور اس کے حواریوں نے شادو سے بدتمیزی کی کوشش کی تو علی بچ میں کود پڑا۔ اس مارا ماری کو ایک امیر وکیر اسپینش لیڈی ڈیلفینا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا ڈونٹنگ کارڈ علی کو تھما کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی۔ ”مجھے بہادر لوگ بہت پسند ہیں۔ زندگی میں جب بھی میری ضرورت محسوس کرو تو رابطہ کر لیتا۔“ اس واقعے کے بعد گویا لیونارڈو سے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں علی اور لیونارڈو کے غنڈوں میں گاہے بگاہے مڈھ بھڑھوتی رہی۔ لیونارڈو نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے شادو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ وئی لاؤنچ والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شادو کی ریسٹورنٹ والی جاب چھوڑ کر اسے انکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز جب شادو اسپینش اسٹورز سے گریس خریدنے کی ٹولیوٹارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شادو کی تلاش میں بہت نہ ہاری اور شادو کو ڈھونڈتا رہا بالآخر ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دونوں کے بیچ خونیں معرکہ ہوا مگر پیلو، شادو اور لیونارڈو کے حوالے سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا۔ علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر پیلو کو ادھ موا کر دیا۔ آئندہ روز پیلو کے قتل کی خبر لیک جیکسن اور اس کے قریب وجوہات میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ لیک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہذا علی نے انکل سلطان کو صورت حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہنڈائے اسپورٹ کار میں لیک جیکسن سے یوسٹن پہنچ گیا۔ پھر سرخ ہنڈائے کار۔۔۔ میں قاتل کے فرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔ اس سنگین صورت حال میں علی نے ڈیلفینا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیلفینا نے علی کی کھانسنے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر کھنکے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بیٹھنے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر کھنکوں میں ہر پل علی پر حیرتوں کا ایک نیارو اہوتا رہا۔ ڈیلفینا بہت اونچی پہنچ کی مالک ایک پراسرار لیڈی تھی۔ اس نے اپنا اثر سوخ استعمال کر کے علی کو پیلو مرڈر کیس سے اس طرح نکال لیا جیسے کھن سے بال۔۔۔ علاوہ ازیں ڈیلفینا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو، شادو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شادو کو عصمت فروشی کے جہنم میں جمونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیلفینا نے علی کو یقین دلایا کہ اگر وہ بہتر کھنکے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شادو کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ شادو کے حصول کی خاطر علی ڈیلفینا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پریسٹن ہالو والے اس بیٹھنے میں ڈیلفینا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش رہا بہتر کھنکے بڑے رنگین، سنگین، رومان پرور اور ناقابل یقین تھے۔ ڈیلفینا کی شخصیت کسی معیے سے کم نہ تھی۔۔۔ اس پر مستزاد ڈیلفینا نے اپنے ہی ایسی دو پراسرار شخصیات رنی آرک باروخ لاؤ اور یما اپیل بام سے علی کی ملاقات بھی کروادی۔ تب علی پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد یہودیوں کی ایک سکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ”اسکل اینڈ بوز“ سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ یہ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیلفینا کی تمنا تھی کہ علی ان کی شرائط پر صادر کرتے ہوئے ”اسکل اینڈ بوز“ کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سر بہتہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی حالات کی ایک نئی کردٹ اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ انکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور سر بہتہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیویارک (امریکا) مرزا عامریگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامریگ، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے اچانک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامریگ نے بھی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو کوئی انور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامریگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔

مرزا عامریگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکتا تھا۔ اس صورت حال میں علی کا دل علی الاعلان یہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت اس کی ماں ہے۔ علی نے حتی الامکان سرعت سے تیاری کی اور یوسٹن سے کراچی آ گیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نئے ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ اتر پورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنادیا۔ علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہو گئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتہ لگا لیا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہو گئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے بیٹھنے پر رہنے لگا وہیں اسے اطلاع ملی کہ انکل علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہو گیا ہے۔ علی نے ماں کو امریکا ساتھ لے جانے کے لیے وٹ ویزا کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ علی کو ایک رات خواب میں ڈیلفینا نظر آئی۔ اس نے دھمکی دی کہ وہ کہیں بھی چلا جائے اس سے چھٹا نہیں چھڑا سکتا پھر ایک نامعلوم لڑکی کے فون نے علی کو مضطرب کر دیا۔ وہ اس سے ملاقات کرنا چاہ رہی تھی۔ کیا ڈیلفینا کراچی پہنچ چکی تھی؟ اس سوال نے علی کے دگ وپے میں سنسنی دوڑا دی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”یار! تمہیں بتایا تو تھا کہ میں پورے رمضان سحری کرنے کے بعد ہی سوتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”یعنی ساری رات جاگتا ہوں۔“

عظیم نے یہ بات مجھے بتائی ہوئی تھی لیکن اس وقت میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

”کیا تم کیفے یوفوریا کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“

”بہت کچھ جانتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”مسئلہ کیا ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”میں ابھی اس کیفے میں جانا چاہتا ہوں۔“

”خیریت۔۔۔۔۔!“ اس نے حیرت زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ ”کیا دارو وغیرہ کا موڈ ہو رہا ہے؟“

”دارو۔۔۔۔۔ وہاٹ دارو؟“ میں نے ابھن زدہ انداز میں پوچھا۔

”مطلب۔۔۔۔۔ ڈرنکس وغیرہ!“

”اوہ۔۔۔۔۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”کیا یہ کیفے کوئی پب ہے؟“

”پب بھی سمجھ لو۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”یہ کیفے لٹی پر پز ہے۔ وہاں پر لٹچ اور ڈنر کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ لوکل کھانوں کے علاوہ ساؤتھ ایشیائی ڈشز بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ ساؤتھ ایشیائی ڈشز میں تھائی فوڈ ان کی اسپیشلٹی ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کے مشروب وہاں مل جاتے ہیں۔ بس یا کچھ اور۔۔۔۔۔؟“

”یہ بھی بہت ہے یار۔“ میں نے کہا۔

”کیا بیئر وغیرہ سے دل بہلانے کا موڈ ہو رہا ہے؟“

اس نے متنی خیز لہجے میں پوچھا۔

”نہیں یار۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”کسی نے وہاں بلایا ہے۔۔۔۔۔ ملاقات کے لیے۔“

”یہ ”کسی“ کوئی لڑکی ہے نا۔۔۔۔۔؟“ اس نے پوچھا۔

وہ جو کوئی بھی تھی اس نے اچانک رابطہ منقطع کر کے مجھے ایک دورا ہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس کا قطعی انداز بتاتا تھا کہ اسے اس بات کا کامل یقین ہے کہ میں اس سے ملنے کیفے یوفوریا ضرور پہنچوں گا۔ میں نے اس کے لہجے میں بے پناہ اعتماد پایا تھا۔ وہ ایسی بے تکلفی سے بات کر رہی تھی جیسے ہمارے بیچ دیرینہ شناسائی ہو۔ ان لمحات میں میرا ذہن گہرے تذبذب میں گھر گیا تھا۔ میں اس قسم کی کسی صورت حال کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ ایک خیال یہ آ رہا تھا کہ مجھے اس کی پروا کیے بغیر نیند کو اوڑھ کر سو جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوچ بھی آئی تھی کہ اگر میں کیفے یوفوریا نہیں گیا تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے اس بیٹھنے تک پہنچ جائے گی جہاں اس وقت میں ٹھہرا ہوا تھا اور بقول اس کے، اگر وہ یہاں آگئی تو میرے لیے گہیر مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔

اس پراسرار اجنبی حسینہ کے بارے میں سوچتے ہوئے بار بار میرا دھیان ڈیلفینا کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس دنیا میں ایک وہی ایسی تھی جو اس طرح دھونس جمانے والے انداز میں مجھ سے بات کر سکتی تھی ورنہ شادو کا ایک مخصوص دوستانہ انداز تھا۔ اس نے بھی مجھ سے بدتمیزی سے بات نہیں کی تھی اور پھر اس کے نام کے آخر میں این اے یعنی ”نا“ بھی نہیں آتا جبکہ یہ شناخت ڈیلفینا کے معاملے میں صد فی صد درست نظر آتی تھی۔ کیفے یوفوریا کی جانب جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کرنے سے پہلے میں نے عظیم سے بات کرنا ضروری جانا اور سیل فون کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

پہلی ہی کھنٹی پر اس نے میری کال ریسپونڈ کر لی اور میرے ”ہیلو“ کے جواب میں اس نے بڑی کراچی آواز میں کہا۔

”یس، برو۔۔۔۔۔!“

”کیا تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟“ میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔ ”تمہاری آواز بڑی ہشاش بشاش ہے۔“

وہ بد معاش بہت تیز تھا۔ ان معاملات میں اس کا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کرتا تھا۔ میں نے جواب دیا۔
”ہاں یار..... وہ ایک لڑکی ہی ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہاں جاؤں یا نہ جاؤں!“

”اس میں، سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے برد؟“ اس نے سوال کیا۔ ”کوئی لڑکی آدھی رات کو تمہیں کیفے یو فوریا میں بلا رہی ہے اور تم تذبذب کا شکار ہو۔ جاؤ، انجوائے کرو یار۔ یو فوریا کے ماحول میں بیٹھ کر تمہیں یقین ہو جائے گا کہ ہم کسی بھی طرح امریکا سے پیچھے نہیں ہیں.....“
”تم غلط سمجھ رہے ہو عظیم۔“ میں نے کہا۔ ”میری پرابلم کچھ اور ہے۔“

”کیا پرابلم ہے تمہاری؟ کچھ بتاؤ تو سہی.....!“
”میں اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔“ میں نے بتایا۔

”ارے..... یہ کیا بات ہوئی؟“
”میں سچ کہہ رہا ہوں عظیم۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں جانتا، وہ کون ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی اجنبی سیل نمبر سے میرے پاس اس کی کال آئی تھی۔ اس نے میرے نام سے مجھے مخاطب کیا اور کہا کہ وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔ اس نے مجھے کیفے یو فوریا میں آنے کو کہا ہے۔ وہ مجھ سے کوئی ایسی اہم بات کرنا چاہتی ہے جس میں ہم دونوں کا فائدہ ہے۔ اس نے بڑے واضح الفاظ میں مجھ سے یہ بھی کہا ہے کہ اگر میں اس سے ملنے مذکورہ کیفے نہیں گیا تو پھر وہ مجھ سے ملاقات کرنے اس بیٹکے پر چلی آئے گی اور اس نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اس کا میرے پاس آنا میرے لیے کوئی بھی مشکل کھڑی کر سکتا ہے۔“

میں نے اس پر اسرار کال کے حوالے سے عظیم کو تفصیلاً آگاہ کیا تو اس نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”اس نے اپنا نام کیا بتایا ہے؟“
”کچھ بھی نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔
”کیا مطلب؟“ اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

”اپنے بارے میں اس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ اس کے نام کے آخر میں این اے یعنی ”نا“ آتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یار..... میرا دھیان آئی بی (الہامی بابا) کی طرف جا رہا ہے۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کیا یہ ان دو عورتوں میں سے کوئی ایک تو نہیں جن کے بارے

میں ہمارے الہامی بابا یعنی مقبول بھٹی نے تمہیں بتایا تھا کہ ان میں ایک بہت جلد کراچی میں تم سے ملنے والی ہے.....“
لحاحی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”ذرا سمجھو ان دونوں خواتین کے نام تو بتاؤ۔“
”شاروا اور ڈیلیفینا۔“ میں نے بتایا۔
”استاد! ڈیلیفینا کے نام کے آخر میں بھی تو این اے یعنی ”نا“ آتا ہے۔“ وہ سنسناتی ہوئی آواز میں بولا۔
”کہیں یہ وہی تو نہیں؟“

”این اے کے الفاظ سے میرا دھیان بھی ڈیلیفینا ہی کی طرف گیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس نام معلوم لڑکی کی آواز ڈیلیفینا سے بہت مختلف تھی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم ڈیلیفینا ہو اور یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے..... کیا تم لہجہ بدل کر بات کر رہی ہو؟ تو اس نے فون بند کر دیا۔“
”تم اس کا نمبر مجھے دو۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

”میں ابھی چیک کرتا ہوں۔“
میں نے عظیم کو اس پر اسرار حسینہ کا نمبر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بتایا کہ اس نے تین چار بار ٹرائی کیا ہے لیکن وہ کال ریسپونڈ نہیں کر رہی۔ ”مگر میں ہمت ہارنے والا نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں اسے چیک کرتا رہوں گا۔“
”اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے دوستانہ انداز میں اس سے مشورہ کیا۔

”تمہیں اس سے ملنے کیفے یو فوریا جانا چاہیے۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولا۔ ”ہم بھی پہنچ رہے ہیں۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“
”ہم..... مطلب تمہارے ساتھ اور کون آ رہا ہے؟“ میں نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

”اس وقت ارباب میرے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔“ عظیم نے بتایا۔ ”ہم دونوں آ رہے ہیں۔“
”اچھا..... تمہارا وہ انسپکٹر کزن۔“ میں نے کہا۔
”ارباب تو پولیس کی وردی میں ہوگا۔ اس سے کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو جائے گی؟“

”کچھ نہیں ہوگا برو.....!“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ”اول تو یہ کہ ارباب اس وقت ڈیوٹی پر نہیں اس لیے وہ عوامی لباس میں ہے۔ دوم، ہم وہاں کوئی ہنگامہ آرائی کرنے یا کوئی قانونی کارروائی کرنے نہیں جا رہے۔ یہ سارا انتظام تمہاری سیفٹی اور سکیورٹی کے پیش نظر ہے۔“
”اوکے.....!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا

وقت

پھر پوچھا۔ ”تمہارے ذہن میں کیا پلان ہے؟“
”پلان بہت سادہ اور سہل ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جتنا وقت ہمیں یہاں سے کیفے یو فوریا تک پہنچنے میں لگے گا، کم دیش تمہارا واکنگ ڈسٹینس بھی اتنے ہی وقت کا ہے۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ تم بھی بیٹکے سے نکل کر مین روڈ پر آ جاؤ۔ یہ روڈ زمرہ بیوارڈ کہلاتی ہے۔ تم اس سڑک پر، اپنی ہی سائڈ پر خراماں خراماں آگے بڑھتے جاؤ۔ تمہارا انداز ایسا ہونا چاہیے جیسے تم نائٹ واک کر رہے ہو۔ کچھ آگے جا کر سسٹھ گمرشل اسٹریٹ آ جائے گی۔ تمہیں اس اسٹریٹ پر مڑ جانا ہے لیکن.....“ اس نے ذرا دیر کو رک کر ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ ہدایات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”لیکن تمہیں اس وقت تک کیفے کے اندر داخل نہیں ہونا جب تک میں تمہیں ایسا کرنے کو نہ کہوں۔ پہلے ہم دونوں کیفے کے اندر جا کر وہاں کے ماحول کا جائزہ لیں گے اور کسی ایسی ٹیبل پر جم کر بیٹھ جائیں گے جہاں سے پورے کیفے پر گہری نگاہ رکھی جاسکے۔ اس دوران میں ہم یہ تاڑنے کی کوشش کریں گے کہ وہاں پر کون خاتون اکیلی بیٹھی ہوئی ہے اور محو انتظار ہے۔ یقیناً وہ داخلی دروازے کی جانب رخ کیے بیٹھی ہوگی تاکہ یہ آسانی تمہیں دیکھ سکے۔ پھر جب تم کیفے میں داخل ہو گے اور اس لڑکی سے ملو گے تو تمہاری یہ ملاقات ہماری نظروں کے سامنے ہوگی۔“

”گڈ آئیڈیا۔“ میں نے سر اپنے والے انداز میں کہا۔ ”لیکن اگر میں پہلے اس کیفے تک پہنچ گیا تو تمہاری آمد تک کا وقت کہاں گزاروں گا؟“
”کیا تم ابھی تک گھر کے اندر ہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔
”ہاں۔ میں اپنے بیڈروم میں بیٹھا تم سے بات کر رہا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم شارع فیصل تک پہنچ گئے ہیں۔“ اس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ہم تم سے پہلے کیفے یو فوریا میں بیٹھے سی فوڈ کے سوپ سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔“

”اوکے برو..... میں بھی نکل رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔
ہمارے بیچ سیلوں کا رابطہ ختم ہوا تو چند سوالات میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ نمبر ایک، میں ماں کو بتا کر بیٹکے سے نکلوں یا ایسے ہی روانہ ہو جاؤں؟ کیونکہ یہ بات تو طے تھی کہ میں کیفے یو فوریا ضرور جاؤں گا۔ نمبر دو، اگر ماں کو نہ بتاؤں تو پھر کیا جمشید کے علم میں لا کر جاؤں؟ جمشید کو بتانے

کا مطلب یہی تھا کہ جیسے ہی ماں سے اس کا رابطہ ہوگا، وہ انہیں مکمل رپورٹ پیش کر دے گا۔ اس کا تجربہ میں پچھلی رات بہ خوبی کر چکا تھا۔ نمبر تین، میں نہ تو ماں کو کچھ بتاؤں اور نہ ہی جمشید کو اپنی روانگی سے آگاہ کروں۔ مجھے چپ چاپ دیوار پھلانگ کر نکل جانا چاہیے۔ اس آپشن کے جلو میں یہ خطرناک سوال چھپا ہوا تھا کہ اگر اس وقت ماں اپنے بیڈروم میں جاگ رہی ہوئیں تو میرا دیوار بھاندنا ان سے پوشیدہ نہیں رہ سکے گا۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ بیٹکے کے مختلف حصوں میں سی سی ٹی وی کیمرے نصب ہیں جن کی کارکردگی کو ماں اپنے بیڈروم میں بیٹھ کر دیکھتی رہتی ہے۔ اگر میں یوں چوروں کی طرح بیٹکے سے نکلوں گا تو میرا ”فرار“ ماں کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہے گا.....!

میں نے اس ایٹو پر چند لمحے غور کیا اور پھر حتمی فیصلے تک پہنچ گیا کہ مجھے جمشید کو بتا کر بیٹکے سے نکل جانا چاہیے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے لباس تبدیل کیا پھر اپنا والٹ اور سیل فون اٹھایا اور دے قدموں گیٹ پر پہنچ گیا۔ جمشید اپنے مخصوص کیمین میں پوری مستعدی کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کے سلام کا جواب دیا اور کہا۔

”جمشید! میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ چند منٹ میں واپس لوٹ آؤں گا۔“

”سر! خیریت تو ہے نا۔“ اس نے بڑی اپنایت سے پوچھا۔ ”آپ اس وقت باہر کیوں جا رہے ہیں اور وہ بھی گاڑی کے بغیر..... کوئی کام ہو تو مجھے حکم کریں۔“

”کام دام کوئی نہیں ہے یار۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے بتایا۔ ”بس، آج ڈنر خاصا ہیوی ہو گیا ہے۔ کافی بوجھل محسوس کر رہا ہوں۔ میں روڈ تک جاؤں گا، تھوڑی چہل قدمی کروں گا اور واپس آ جاؤں گا۔ اس مقصد کے لیے گاڑی کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو، مجھے اس کام کے لیے گاڑی لے کر جانا چاہیے؟“

آخری جملہ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں سر..... آپ ٹھیک کہہ رہے۔ واکنگ کے لیے گاڑی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر میڈم آپ کے بارے میں پوچھیں تو کیا بتاؤں؟“

”میرا اندازہ تو یہی ہے کہ میڈم سبکی سوچکی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ اب تک انہیں سی سی ٹی وی کیمرہ کی نوازش سے میری نقل و حرکت کی خبر ہو چکی ہوتی اور وہ تم سے

JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS

Convey Your Message to
Millions of Our Readers,
World Wide
Through



JASOOSI DIGEST SUSPENSE DIGEST MONTHLY PAKELZA MONTHLY SARGUZASHT

63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.

PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551

Email : jldgroup@hotmail.com

مجھے چیلنج کیا تھا..... بچو! مجھ سے کہاں تک بچو گے۔ تم اس دنیا یا اس دنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاؤ، مجھے تمہارے قریب آنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور اس کے لیے مجھے کوئی خاص کوشش بھی نہیں کرنا پڑے گی کیونکہ یہ دنیا گول ہے اور تم ایک دائرے میں بھاگ رہے ہو۔ میں اگر کسی ایک مقام پر بھر بھی جاؤں تو تم لامحالہ مجھ سے آکر ٹکراؤ گے۔ بھاگو..... جتنا تیز بھاگ سکتے ہو..... مجھ سے دور ہونے کے لیے تم اپنے جسم کی ساری توانائی صرف کر ڈالو..... میں کسی نہ کسی طرح تم تک پہنچ ہی جاؤں گی.....“

میں ڈیلفینا کی اس دھمکی سے قطعاً خوفزدہ نہیں تھا۔ میری زندگی ہنگاموں سے پُر تھی اور جب سے ڈیلفینا سے میرا ”تعارف“ ہوا تھا ان ہنگاموں میں بہت زیادہ تیزی آگئی تھی اور میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ ہنگامہ خیزی عنقریب کسی دیوقامت طوفان میں تبدیل ہونے والی تھی۔

ڈیلفینا کے خیالوں سے دھینگامشتی کرتے ہوئے میں سبک خرامی سے زمزمہ بلیوارڈ کے کنارے چل رہا تھا۔ ڈیلفینا سے میری پہلی ملاقات لیک جیکسن میں ہوئی تھی۔ میں نے لیونارڈ وسمیت اس کے پالتو غنڈوں کی اچھی خاصی درگت بنا دی تھی۔ یہ پھڈاشاروں کی وجہ سے ہوا تھا۔ لیونارڈ وسمیت نے شارو کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ میں دنی لاؤنچ میں ان لوگوں سے نمٹنے کے بعد جب شارو کے ساتھ باہر سڑک پر آیا تھا تو لیونارڈ وسمیت کے ساتھیوں نے ایک مرتبہ پھر ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ اس بار وہ موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر آئے تھے اور ان کے ارادے بڑے خطرناک دکھائی دیتے تھے۔ میں ان شیطانوں کے ساتھ نبرد آزما ہی تھا کہ اچانک ڈیلفینا اپنی چار چھلوں والی شاندار گاڑی ”اوڈی“ میں وہاں پہنچ گئی تھی۔ ڈیلفینا کے مسلح گارڈ کی مداخلت نے غنڈوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس موقع پر ڈیلفینا نے میری بہادری کی تعریف کرتے ہوئے اپنا وزینگ کارڈ مجھے دیتے ہوئے کہا تھا کہ..... زندگی میں اگر کوئی ضرورت ہو تو مجھے یاد کر لیتا!

مذکورہ وزینگ کارڈ میں گیلوسٹن (لیکاس) کا ایڈریس تھا۔ وہ سی وال بلیوارڈ پر واقع سان لوئی ریزورٹ میں رہتی تھی اور اس وقت میں اس کے بارے میں سوچتے ہوئے کراچی کی ڈیفنس سوسائٹی میں زمزمہ بلیوارڈ کے کنارے ڈاکنگ میں مصروف تھا۔

اچانک میرے خیالوں کا تانتا ٹوٹ گیا۔ ایک گاڑی میرے نزدیک آ کر رک گئی تھی۔ میں بھی رک گیا اور پلٹ کر

پوچھ چکی ہوتی کہ میں اس وقت گیٹ پر کیا کر رہا ہوں۔ خیر، وہ اگر تم سے میرے بارے میں کوئی سوال کریں تو جو ج ہے تم انہیں بتا دینا۔ اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟“ ”ٹھیک ہے سر!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ اطمینان سے ٹھہر لگا کر واپس آ جائیں۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔“

میں ہنچنے سے نکل آیا۔ ماحول ایک دم ساکت اور گھٹن زدہ تھا۔ اگرچہ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی لیکن فضا میں موجود نمی نے اچھا خاصا جس پیدا کر رکھا تھا۔ یہ ایک گرم اور مرطوب رات تھی۔ میں اس پر اسرار حسینہ کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنی گلی سے نکل کر زمزمہ بلیوارڈ پر آ گیا اور سڑک کے کنارے، ٹھہرنے والے انداز میں سکستھ کمرشل اسٹریٹ کی جانب بڑھنے لگا۔

اگرچہ ان لمحات میں، میں اجنبی حسینہ پر ہی غور کر رہا تھا لیکن وقفے وقفے سے میرا یہ غور اس نامعلوم خاتون سے سلپ ہو کر ڈیلفینا کی طرف چلا جاتا تھا۔ شاید اس کا ایک سبب یہ تھا کہ ایک تو مقبول بھٹی نے جو پیش گوئی کی تھی اس کے مطابق، یہ لڑکی ڈیلفینا کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتی تھی۔ جہاں تک اس کی آواز کے بدلاؤ کی بات تھی تو ڈیلفینا کو میں اب تک جتنا جان سکا تھا اس کے مطابق، وہ ہر فن مولا قسم کی عورت تھی۔ آواز، انداز اور نگاہ بدلنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنی طاق تھی کہ کسی وقت کچھ بھی کر سکتی تھی..... کچھ بھی!

ڈیلفینا کی جانب بار بار دھیان جانے کا دوسرا سبب وہ معنی خیز خواب تھا جو گزشتہ رات میں نے دیکھا تھا۔ یہ خواب ڈیلفینا کی تاج پوشی کے حوالے سے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سیکرٹ سوسائٹی کے ایک کرتادھر تاربی آنرک نے اسے سب سے اونچی ڈگری ”تھرٹی تھری“ سے نوازا دیا تھا۔ جس طرح عام پڑھائی میں، کسی بھی مضمون کے حوالے سے ایک ”ماسٹر ڈگری“ ہوتی ہے، بالکل اسی طرح ”اسکل اینڈ بوز“ سیکرٹ سوسائٹی میں ”تھرٹی تھری“ ڈگری کی بھی ویسی ہی اہمیت ہے۔ تھرٹی تھری ڈگری حاصل کرنے والا شخص شرف یافتہ کہلاتا ہے اور ڈیلفینا نے یہ اعزاز یروشلم کی کسی قدیم تاریخی عمارت میں حاصل کر لیا تھا۔ اس شاندار تقریب کے اختتام پر ڈیلفینا نے براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر جو کچھ کہا تھا وہ گویا میری یادداشت سے چپک کر رہ گیا تھا۔ اس کے سنسنی خیز الفاظ کی گونج میرے ذہن کو بے چین کیے ہوئے تھی۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

ریٹورنٹ چلاتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”ورنہ میرے ذہن میں تو یہی تھا کہ وہاں تم بھی میڈم جیسا ہی کوئی بزنس چلا رہے ہو گے اسی لیے میں نے تم سے تصدیق کی ہے۔“

اس نے بڑی گہری اور چھینے والی بات کی تھی۔ اس کے الفاظ نے میرے تن بدن میں ایک جہنم بھڑکا دیا لیکن میں نے دلی کیفیت کو اپنے چہرے سے عیاں نہیں ہونے دیا۔ اس نے مجھے ایک غلیظ گالی دی تھی لیکن انسانی نفسیات کی روشنی میں، میں اسے تصور وار نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے شخص ایک حقیقت بیان کی تھی۔ ممکن ہے، وہ کسی مصلحت یا منافقت سے کام لیتے ہوئے مجھ سے یہ بات نہ کہتی بہ شرط یہ کہ اسے میرے اور میڈم سلٹی کے باہمی رشتے سے آگاہی ہوئی۔ وہ اس سچائی سے بے خبر تھی کہ اس کی میڈم میری سگی ماں ہیں لہذا سچ بے دریغ اس کے منہ سے نکل گیا تھا اور کوئی مانے یا نہ مانے، سچ بڑا ہی کڑوا اور تلخ ہوتا ہے۔

میں نے کافی کے گھونٹ میں اس کے الفاظ کی ساری کڑواہٹ اور تلخی کو گھول کر حلق سے نیچے اتارا اور نہایت ہی معتدل انداز میں پوچھا۔ ”تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، میرے سیل فون پر میسج ٹون بجی۔ میں نے چیک کیا۔ وہ عظیم کا ٹیکسٹ تھا۔ میں نے مذکورہ ٹیکسٹ کو پڑھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”برو، داش روم جانے کے بہانے تھوڑی دیر کے لیے یہاں سے اٹھو۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔“

میں نے رپلا کی میں ”اوکے“ لکھ کر فون ایک طرف رکھا اور اپنے سامنے بیٹھی ہوئی مصری کی ڈلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“

”تمہارے پاس جواب سننے کی فرصت ہے جو میں کچھ بولوں۔“ اس نے غصے کی آمیز لہجے میں کہا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ میری سیلر مصروفیات سے بور ہو رہی ہے۔ میں نے کافی کا آخری گھونٹ بھر کر خالی کپ میز پر رکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”میں داش روم سے ہو کر آ رہا ہوں۔ پھر اطمینان سے بیٹھ کر تمہاری بات سنوں گا جب تک تم میرے سوال کا جواب اچھی طرح سوچ لو۔“

میں داش روم جانے کے بہانے اس کی نظر سے ادجھل ہوا تو عظیم کی کال آگئی۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”برو! مجھے تو یہی لگتا ہے کہ اس لڑکی نے فون کر کے تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔ وہ اب تک کہنے یو فور یا پچنی ہے اور نہ ہی اس کی آمد کی کوئی امید نظر آ رہی ہے۔“

”مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ وہ بولا۔ ”جب سے تم نے مجھے اس پر اسرار لڑکی کا فون نمبر دیا ہے، میں وقفے وقفے سے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جب تک ہم یہاں نہیں پہنچے تھے وہ میری کال اٹینڈ نہیں کر رہی تھی اور جب سے ہم گیفے میں بیٹھے ہیں، اس کا فون آف آ رہا ہے۔ لگتا ہے، تمہیں الوبنا کر وہ مزے کی گہری نیند سو رہی ہوگی۔“

”اس پر لعنت بھیجو یار۔“ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”میں نے آپ لوگوں کو خواہ مخواہ زحمت دی۔ چاہو تو تم واپس چلے جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد میں بھی اٹھ جاؤں گا۔“

”غیروں والی بات نہیں کرو یار۔“ عظیم نے پُر خلوص انداز میں کہا۔ ”ہمیں یہاں آنے میں کوئی زحمت و حمت نہیں ہوئی۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ارباب نے اس فراڈن کا نمبر اپنے سسٹم میں ایک ذمے دار شخص کو دیے دیا ہے۔ کل تمہیں اس چلتر باز لڑکی کے بارے میں تفصیلی رپورٹ مل جائے گی۔ جب وہ مکار ٹریس ہو جائے گی تو پھر اس سے اس بھیانک مذاق کا بدلہ بھی لیں گے۔“

”ٹھیک ہے یار، تم لوگ نکل جاؤ۔“ میں نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔

”اور تم اپنی حسین ساتھی کی صحبت میں انجوائے کرو۔۔۔۔۔!“ اس نے ذومعنی انداز میں کہا۔

میں نے ”اوکے“ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ اگر میں اس کے تبصرے پر اپنی کوئی رائے دیتا تو یقیناً بات طویل ہو جاتی اور میں اس وقت ایسے موڈ میں نہیں تھا۔ جب میں داش روم کی جانب سے واپس آیا تو عظیم اور ارباب والی ٹیبل خالی نظر آئی۔ میں اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

”تم خاصے لکھے ہوئے اور ذہنی دباؤ میں لگ رہے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”تمہارے ساتھ کیا پریشانی ہے؟“

”میرے ایک عزیز کا انتقال ہو گیا ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔

”اوہ۔۔۔۔۔!“ اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی اور کہا۔ ”یہاں پاکستان میں یا ادھر جدہ میں؟“

”میں جہاں سے آیا ہوں وہاں۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔ ”وہ میرے ایک مہربان بزرگ تھے۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”دو دن پہلے انہیں ہارٹ ایک ہوا تھا۔“ میں نے

وقت

جواب دیا۔ ”اٹھائیس جون کی رات میں۔“

”بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔“ وہ ہمدردی بھرے لہجے میں بولی۔

”اسی لیے مجھے نیند نہیں آرہی تھی اور میں ٹہلنے کے لیے باہر نکل آیا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔

”تم نے میرے سوال کا جواب سوچ لیا؟“

”تم نے پوچھا تھا کہ میرا کام کیسا چل رہا ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ میرا کام تو ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے لیکن۔۔۔۔۔!“

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی تو میں نے پوچھا۔

”لیکن کیا؟“

”لیکن یہ کہ۔۔۔۔۔ میں ٹھیک نہیں چل رہی۔“ وہ دھکی لہجے میں بولی۔

”میں کچھ سمجھا نہیں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”علی! میں گناہ کی اس زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔“ وہ زخمی لہجے میں بتانے لگی۔ ”اس پیشے میں پیسا ہے، ایک مخصوص حلقے میں بڑی عزت اور آؤ بھگت بھی ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ میرے خریدار مجھ سے نہیں، میرے بدن کی شادابی سے محبت کرتے ہیں۔ وہ میرے حسن کی رعنائی کے پیاسے ہیں۔ ان کے اندر مجھے حاصل کرنے کی بھوک ہے۔ کوئی میرے دل کو، میرے جذبات کو نہیں سمجھتا۔ سب ہوس کے پجاری ہیں۔ مصنوعی پیار جتا کر اپنی حیوانی غرض پوری کرتے ہیں۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی ہے۔ کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں انسان نہیں ہوں۔۔۔۔۔“ وہ سسک اٹھی۔ ”میں ذلت بھری اس زندگی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنا چاہتی ہوں۔ میں کب تک ایک مردہ جانور کے مانند درندوں کے انوہ میں پڑی رہوں گی اور وہ حسب ضرورت مجھے نوچتے، کھسوتے اور بھینھوڑتے رہیں گے۔۔۔۔۔؟“

یہ اس کے اندر کی عورت بول رہی تھی۔ انسان چاہے کتنا بھی برا کیوں نہ ہو اس کے اندر ایک کھرا انسان چھپا ہوتا ہے۔ جب کوئی حادثہ اس کھرے انسان کو باہر لے آتا ہے تو وہ سچ ہی بولتا ہے۔ ان لمحات میں اس کھرے انسان کو یہ پردا نہیں ہوتی کہ اس کا سچ کسی کو پسند آئے گا یا نہیں۔ وہ تو اپنی ذمے داری پوری کر رہا ہوتا ہے۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی وہ خوب رو، خوش خصال عورت بھی اسی نوعیت کی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس کا جسم آئے دن

گناہ کی ایک نئی منزل سے گزرتا ہوگا، اس کا ذہن اذیت کی ایک نئی سولی پر چڑھتا ہوگا، اس کی اتار ریزہ ریزہ ہوتی ہوگی مگر ان کرب ناک اور عذاب آفریں روز و شب میں زیست کرنے کے باوجود بھی اس کا دل آئینے کی طرح صاف تھا، اس کی روح گلاب کی پتھریوں کے مانند پاکیزہ، معطر اور تروتازہ تھی۔

”تم یہ بار بار کہنے کے داخلی دروازے کی طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟“ اس کے سوال نے مجھے چونکا دیا۔ یہ سچ ہے کہ میں وقفے وقفے سے کہنے کے داخلی دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید یہ میری لاشعوری حرکت تھی۔ بے خیالی میں مجھے اس لڑکی کی آمد کا انتظار تھا جس نے فون کر کے بڑے ڈرامائی انداز میں مجھے کہنے یو فور یا میں بلایا تھا۔ اس گھائل یوریشمین دوشیزہ نے بڑی مہارت سے میری چوری پکڑ لی تھی جس سے اس کی ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ میں نے صورت حال کو سنبھالا دیتے ہوئے کہا۔ ”شاید تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”علی! غلط فہمی مرد کو ہوتی ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے بولی۔ ”عورت کو ہمیشہ یقین ہوتا ہے اور۔۔۔۔۔ اسی یقین کی بنا پر میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ تمہیں کسی کا انتظار ہے۔۔۔۔۔!“

”میں تمہارے اس دعوے کو چیلنج نہیں کروں گا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔“

”شاید نہیں۔۔۔۔۔ یقیناً۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہیں جس کا انتظار ہے وہ نہیں آئے گی۔“

”وہ کیوں نہیں آئے گی؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”اس لیے کہ وہ کہنے یو فور یا میں آچکی ہے۔“ اس نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ”اور اس وقت تمہارے سامنے بیٹھی ہے۔۔۔۔۔!“

”اوہ مائی گاڈ!“ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”بیٹا! ایک لمحے کے لیے بھی میرا دھیان تمہاری طرف نہیں گیا تھا۔“

”اس کا ایک سبب ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”تمہارے ذہن میں چار سو کی ڈیلیفینا کے خیالات چکراتے رہتے ہیں۔ کسی بیٹا کی طرف دھیان کیسے جاسکتا تھا۔۔۔۔۔“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس

خارج کی پھر بڑے تیکھے انداز میں مستفسر ہوئی۔

”بائی دی دے..... یہ ڈیلفینا ہے کون؟“

”میری ایک بہت اچھی دوست ہے۔“ میں نے بتایا۔

”کیا یہ بھی ادھر جدہ ہی میں ہوتی ہے؟“

”ہاں، یہ بھی ادھر ہی رہتی ہے جدھر سے میں آیا

ہوں۔“ میں نے جی بر مصلحت سچ بولتے ہوئے کہا۔ ”جب

میں پاکستان آ رہا تھا تو اس نے کہا تھا کہ وہ کسی بھی وقت

میرے پیچھے یہاں پہنچ کر مجھے حیران کر دے گی۔ جب تمہارا

فون آیا اور تم نے بڑے پراسرار انداز میں مجھے گھر سے

نکلنے کی کوشش کی تو میرا ڈیلفینا پر خشک گیا تھا۔ پھر جب تم

نے بتایا کہ تمہارے نام کے آخر میں این اے لیتی ”نا“ آتا

ہے تو مجھے یقین ہو گیا کہ ڈیلفینا پاکستان پہنچ گئی ہے۔“

”اور تم نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ میری آواز کو کیا

ہوا ہے؟ کیا میں دانستہ لہجہ بدل کر بات کر رہی ہوں؟“ پینا

نے بتایا۔ ”چلو، پینا ہو یا ڈیلفینا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ڈیلفینا تمہاری دوست ہے لیکن پینا بھی تمہاری

دشمن تو نہیں ہے۔ تم مجھے بھی اپنا دوست ہی سمجھو۔“

بات کے اختتام پر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا

تاکہ ہماری دوستی پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے۔ میں نے

بڑی گرم جوشی سے اس کا مرمریں ہاتھ تھام لیا۔ اس کے

بدن کے گداز نے میرے رگ دے میں سنسنی سی دوڑا دی۔

اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور نہ میں نے

چھوڑنے کی۔ چند لمحات تک ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے

ایک ٹک ایک دوسرے کو تکتے چلے گئے پھر میں نے پوچھا۔

”تم نے میرا نمبر کہاں سے لیا؟“

”تمہارے سیل فون سے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے

میں بولی۔

”میں سمجھا نہیں؟“ میرے استفسار میں الجھن تھی۔

پینا نے مجھے سمجھایا۔ ”علی! تمہیں یاد ہوگا، دوپہر میں

جب ہم سب لوگ میڈم کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے

تھے تو تم میرے انتہائی قریب تھے اور ہم دونوں سے زیادہ

نزدیک ہمارے سیل فون سینئر ٹیبل پر موجود تھے۔ ہمارے

سیل فونز ایک ہی کمپنی اور ایک ہی ماڈل کے ہیں۔ جب تم

میڈم سے گفتگو میں مصروف تھے تو میں نے بڑی ہوشیاری

سے تمہارا سیل فون اٹھا کر اس میں اپنا نمبر ڈال کیا پھر

تمہارے سیل فون کے ڈائلنگ کالز ریکارڈ میں سے اپنا نمبر

ڈیلیٹ کر کے تمہارا سیل فون جیکے سے واپس میز پر رکھ دیا

تھا۔ تمہیں کانوں کان خبر نہ ہوئی، کسی اور کا بھی میری طرف

دھیان نہیں گیا اور تمہارا نمبر میرے سیل فون میں پہنچ گیا۔

میرا سیل فون چونکہ سائیلنٹ موڈ پر سیٹ تھا اس لیے اس میں

کھنٹی نہیں بجی اور میرا مقصد پورا ہو گیا۔“ لمبے بھر کو تم کو اس

نے اپنی سانس ہموار کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بتایا۔

”میں کافی دیر سے تمہارے زمزمہ بلیوارڈ تک پہنچنے کا انتظار

کر رہی تھی۔ جب تم مجھے نظر آئے تو میں اپنی گاڑی لے کر

تمہارے قریب پہنچ گئی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ

تمہارے سامنے ہے۔“ بات کے اختتام پر وہ فاتحانہ نظر

سے مجھے ٹکنے لگی۔

”پینا! تم تو بہت تیز ہو.....“ میں نے حیرت بھرے

لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ”تم نے یہ سب کیوں کیا تھا؟“

”اس لیے کہ تم مجھے اچھے لگے تھے۔“ وہ بے دھڑک

بولی۔ ”میں تم سے دوستی کرنا چاہتی تھی۔ تمہیں دیکھتے ہی

میرے دل نے کہا کہ تم میری مدد کر سکتے ہو۔ اگر تم میرا

ساتھ دو تو میں میڈم سسلی کے اس جہنم سے نجات حاصل کر سکتی

ہوں.....“ ایک لمبے کو رک کر اس نے امید بھری نظر سے

مجھے دیکھا اور بڑے آس بھرے لہجے میں بولی۔

”علی! مجھے تم سے بس اتنا تعاون چاہیے کہ تم اس گناہ

کی زندگی سے مجھے نکال دو اور میرے سچے دوست بن کر

رہو۔ میں کبھی تم پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ مجھے تمہارا بے لوث

اور مخلص سہارا چاہیے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں..... کیا تمہیں

میری دوستی قبول ہے؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے اپنے

سیل فون سے عظیم کا نمبر ڈال کیا اور رابطہ ہونے پر کہا۔ ”اس

نمبر کے لیے کسی ریسرچ کی ضرورت نہیں۔“

”کیا تم نے اس تک رسائی حاصل کر لی ہے؟“ عظیم

نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

”ہاں!“ میں نے کہا۔ ”تفصیل کل بتاؤں گا۔“

”اد کے برو..... ایز یووش“ عظیم نے کہا۔

رابطے کے اختتام پر میں نے سیل فون ایک طرف

رکھا تو پینا نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

”علی! یہ سب کیا تھا؟“

”علی نے تم سے دوستی نہائی ہے۔“ میں نے معنی خیز

انداز میں کہا۔ ”اب تم اپنا سیل فون آن کر لو۔ تمہارے لیے

کوئی پریشانی کھڑی نہیں ہوگی۔“

وہ ہکا بکا رہ گئی پھر بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اگر تم نے واقعی مجھے اپنا دوست مان لیا ہے تو پھر بتاؤ، ابھی

تم نے کس سے بات کی ہے؟“

جواب میں نے پینا کو تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

”علی! تم بھی کچھ کم تیز نہیں ہو.....!“ وہ اپنی

مقتناطیسی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

”شاید میرا جواب تمہاری توقعات پر پورا نہیں

اترا.....!“ میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال

ہوئے کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

”مطلب یہ کہ.....“ میں نے وضاحت کرتے

ہوئے کہا۔ ”تم نے تو مجھے بدھو، کاٹھ کا الو اور پتا نہیں، اسی

قسم کی کوئی چیز سمجھ رکھا تھا اور میں بہت ”تیز“ نکل آیا!“

حالانکہ میں نے یہ بات خاصی سنجیدگی سے کی تھی لیکن

وہ قہقہہ مار کر بڑی دلیری سے بولی۔ ”تم صرف تیز ہی نہیں

بلکہ اچھے خاصے بد معاش بھی ہو۔“

”شکریہ!“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”تمہارا

دیا ہوا بیہ ٹائٹل میرے بہت کام آئے گا۔“

”کون سا ٹائٹل؟“ وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

”کہ میں بد معاش بھی ہوں۔“

”اس ٹائٹل سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟“ اس کے

سوال میں حیرت تھی۔

”اس لائسنس کی برکت سے میں جب چاہوں،

تمہارے ساتھ کوئی بھی بد معاشی کر سکتا ہوں۔“

”واہ جی.....!“ وہ اترائی۔ ”اندھی لگی ہوئی ہے کیا!“

”اندھی نہیں، دو آنکھوں والی لگی ہوئی ہے۔“ میں

نے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پینا کی مسکراہٹ بڑی دلکش

اور ہنسی دل آویز تھی۔ سماعت کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جل

ترنگ بج اٹھے ہوں۔ پتا نہیں، وہ کون سی منحوس گھڑی تھی

جس نے پینا کو گناہ کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ وہ معاشرتی

یکچڑ میں کھلنے والا کنول کا پھول تھی۔

ہمارے درمیان اچھی خاصی بے تکلفی پیدا ہو گئی تو پینا

نے مجھے بتایا کہ وہ یاں کی طرف سے جرمن اور باپ کی

جانب سے پاکستانی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا باپ مظفر

روزگار کے سلسلے میں یورپ گیا تھا اور جرمنی کے شہر فریٹکفرٹ

میں اس نے قیام کیا تھا۔ وہیں پر اس نے ایلس نامی ایک

جرمن عورت سے شادی کر لی تھی جس سے پینا پیدا ہوئی۔

بعد ازاں یہ لوگ پاکستان شفٹ ہو گئے تھے۔ اس موقع پر

پینا ایک سٹی سی پنٹی تھی۔ پاکستان میں بعض عوائل کے پیش نظر

ایلس ایڈ جسٹ نہ کر سکی اور میاں بیوی کا رشتہ ختم ہو گیا پھر

وقت

ایلس واپس اپنے ملک جرمنی چلی گئی تھی۔ پینا کی پرورش

جیسے تیسے باپ نے کی اور جب اس نے شعوری منزل پر قدم

رکھا تو مظفر کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ اب اس بھری دنیا

میں پینا کا کوئی بھی نہیں تھا۔

”علی! مجھ سے وعدہ کرو کہ جب تک تم پاکستان میں

ہو، مجھ سے گا ہے بہ گا ہے ملتے رہو گے۔“ وہ میرے ہاتھوں

کو تھامتے ہوئے بے حد جذباتی لہجے میں بولی۔ ”میں تم سے

بہت ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں اپنے بارے میں

بہت کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم

ایک مخلص اور ہمدرد دوست ہو۔ میں تمہارے تعاون سے

گناہوں کی اس دلدل سے نکلتا چاہتی ہوں اور مجھے یقین

ہے کہ تم ضرور میری مدد کرو گے..... کرو گے نا؟“

اس کے آخری جملے میں ملتمس استفسار تھا۔ اس مختصر

سے فقرے میں دنیا جہان کی امید بھری ہوئی تھی۔ وہ اتھاہ

تیار کی سے نکل کر روشنی کا سفر شروع کرنے کا ارادہ رکھتی

تھی۔ وہ غلاطت بھری زندگی کو خیر باد کہہ کر خود داری اور

خود شامی دالی باعزت و بادقار زندگی کا آغاز کرنے والی

تھی۔ اس نیک مقصد میں بھلا میں کیسے اس کی مدد سے انکار

کر سکتا تھا۔ میں تعمیری ذہن رکھنے والا ایک مثبت انسان تھا،

انسانیت کی تعمیر و ترقی میں اپنا حصہ ڈالنا میرے لیے ایک

فرض کی حیثیت رکھتا تھا لہذا میں نے اس کے گداز ہاتھوں کو

دباتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

”پینا! میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک پاکستان میں

ہوں، موقع مل دیکھ کر تم سے ملاقات کرتا رہوں گا اور جس

حد تک میرے بس میں ہوا، ضرور تمہاری مدد بھی کروں گا۔“

”تھینک یو۔“ وہ تشکر آمیز لہجے میں بولی پھر کہا۔

”مجھ سے یہ وعدہ بھی کرو کہ ہمارے بیچ ہونے والی باتوں اور

ملاقاتوں کے بارے میں تم میڈم کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔ میں

نہیں چاہتی کہ ہماری دوستی کے بارے میں میڈم کو کچھ

پتا چلے۔ اگر انہیں بھنک بھی پڑ گئی کہ میں ان کے سیٹ اپ

سے اڑنے کے لیے پرتول رہی ہوں تو وہ میرے اس

منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار نہیں ہونے دیں گی اور.....“

لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر

اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے پُر عزم لہجے میں بولی۔

”اور میں نے جو ٹھان لی ہے، ہر قیمت پر اسے

کر کے رہوں گی، چاہے اس کے لیے مجھے کیسا بھی بھاری

نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اس مقصد کے لیے اگر مجھے

اپنی جان کی قربانی بھی دینا پڑی تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔“

”تم بے فکر ہو جاؤ۔“ اس کے مصمم ارادے کو دیکھ کر میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”میں نے تم سے دوستی کی ہے تو مجھے دوستی نبھانا بھی آتی ہے۔ میڈم سلی کو ہمارے تعلقات، ہماری دوستی اور تمہارے مشن کا کبھی علم نہیں ہو سکے گا۔“

وہ منونیت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔
”یہ ہوئی ثبات!“

ان لمحات میں بیٹا کے چہرے اور آنکھوں سے مسرت کی ایسی کرنیں پھوٹ رہی تھیں جیسے کسی روتے بسورتے بچے کو اچانک اس کا من پسند کھلونا مل جانے پر خوشی محسوس ہوتی ہے۔ بیٹا کی عمر چوبیس پچیس سے زیادہ نہیں تھی تاہم خوشی کے اس موج پر وہ کلپٹنگ کرتی ہوئی ایک تین سالہ بھی منی بچی نظر آتی تھی۔

بیٹا نے جتنی ہمت کے ساتھ مجھے اپنے عزم سے آگاہ کیا تھا اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ میرے اور اپنی میڈم سلی کے اصل رشتے سے واقف نہیں تھی۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں اس کی میڈم کا بیٹا ہوں تو وہ اس معاملے میں مجھ پر قطعاً اعتماد نہ کرتی اور یہ اچھا ہی تھا کہ وہ اس حوالے سے مکمل بے خبر تھی۔ کسی سائنے کا قول ہے کہ..... بے خبری بھی ایک نعمت ہے! اس قول کی صداقت پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ بیٹا نے اس گناہ آلود زندگی کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اپنی ناسمجھی میں وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اگر میڈم کو اس کے ارادے کا پتا چل گیا تو..... یہ قول کسے، میڈم، بیٹا کے پر کاٹ دے گی۔ اس بے چاری کو یہ علم نہیں تھا کہ اس کی میڈم تو اس سے بہت پہلے ”اس دنیا“ سے ناساتوا توڑ چکی ہے.....!

ماں نے مختلف لوگوں کو مختلف کہانیاں سنائی تھیں جیسے نگینہ آنٹی کو انہوں نے بتایا تھا کہ وہ عمرہ کرنے رمضان کے آخری عشرے میں سعودی عرب جا رہی ہیں اور ان کی واپسی عید کے بعد ہوگی۔ نادر شاہ سے ماں نے کہا تھا کہ انہوں نے میرے ساتھ مستقل طور پر دہلی میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کیا ہے اور جو حقیقت تھی وہ ماں نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔ بیٹا کی معلومات کے ذرائع یا تو نگینہ آنٹی تھی اور یا پھر ماں تھی اس لیے وہ مجھے اپنی ماں کا کوئی عزیز سمجھ رہی تھی جس کا جدہ میں ریسٹورنٹ تھا۔ وہ جو بھی سمجھ رہی تھی، ٹھیک ہی تھا مگر حسب وعدہ مجھے اس کی مدد کرنا تھی اور اس کام کے لیے ماں کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ صبح اس موضوع پر ماں سے تفصیلی بات کروں گا۔

کیفہ بند ہونے سے چند منٹ پہلے ہم اٹھ گئے۔ میں

نے بل ادا کرنے کی کوشش کی تو بیٹا نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ”نہیں علی! میں تمہیں لے کر آئی ہوں اور اپنی گاڑی میں بٹھانے سے پہلے میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ میں تمہارے ریال خرچ نہیں کراؤں گی۔ یہ کافی میری طرف سے ہے۔“

”تم اس طرح ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور دوسری طرح بھی یہ ٹھیک ہی لگتا ہے۔“

”دوسری طرح..... کیا مطلب ہے؟“ وہ اپنی سرخ کلنٹس کو کمرشل اسٹریٹ سے نکال کر زمزمہ بلوارڈ پر چڑھاتے ہوئے مجھ سے مستفسر ہوئی۔

”مطلب یہ کہ.....“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ایک پراسرار کردار بن کر بڑے ڈرامائی انداز میں مجھے کیفہ یوفوریا میں بلایا تھا۔ اس پوٹیشن میں تم میری میزبان اور میں تمہارا مہمان ہوں۔ کیفہ میں میری خاطر داری کرنا تو تمہارے فرائض کا حصہ ہونا.....!“

”بہت خوب!“ وہ ایک زندہ و تابندہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”اگر تم چاہو گے تو یہ خاطر داری کیفہ تک محدود نہیں رہے گی۔ تم میرے دوست ہو۔ میں ہر وقت اور ہر جگہ تمہاری تواضع کے لیے تیار ہوں۔“

بیٹا کی بات کے اختتامی الفاظ میں معنی خیزی کا خزانہ چھپا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں خطرے کی ایک گھنٹی بجتی محسوس کی تاہم چہرے سے میں نے اپنے تاثرات کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور نہایت ہی سادہ انداز میں کہا۔

”حساب دوستانہ در دل۔“

”ٹھیک کہا تم نے۔“ وہ بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی دوستوں کے حساب کو دل کے اندر ہی رکھنا چاہیے۔ ”پھر اس نے پوچھا۔ ”پتا ہے، کیوں؟“

”کیوں؟“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ وہ جذب کے عالم میں بولی۔ ”جو تیرے دل کے اندر ہو اسے کسی بدخواہ کی نظر نہیں لگتی۔“

”زبردست آئیڈیا ہے۔“ میں نے تائیدی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”گویا جس شے کو نظر بد سے بچانا مقصود ہو، اسے دل میں چھپا کر رکھنا چاہیے۔“

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

بیٹا نے مجھے میری اسٹریٹ کے کنارے پر ڈراپ کیا اور میں نے ماں کے بنگلے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ماں نے مجھے بتایا تھا کہ بیٹا، سحرش، روبی، شلا اور آرزو ایک

نزدیکی بنگلے میں رہتی تھیں اور وہ بنگلاماں نے کرائے پر حاصل کر رکھا تھا۔ مذکورہ بنگلے پر ان پانچوں لڑکیوں کی دیکھ رکھ کا نسلی بخش بندوبست موجود تھا۔ بیٹا بڑی مربوط پلاننگ کر کے بنگلے سے نکلی تھی جس کی تفصیل کیفہ میں نشست کے دوران میں اس نے مجھے بتادی تھی۔

میں بنگلے کے گیٹ پر پہنچا تو جمشید نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ”سر! آپ کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”میں آج کل ایک جادوگر سے غائب ہونے کا عمل سیکھ رہا ہوں۔“ میں نے سنجیدہ صورت کے ساتھ اس سے مذاق کیا۔ ”لگتا ہے، میری ٹریننگ مکمل ہو گئی ہے اور میں نے اس عمل کے ذریعے غائب ہونے کی صلاحیت حاصل کر لی ہے۔“

”سر.....!“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔
”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“

میں نے اس شریف، ایماندار اور وفا شعار انسان کو زیادہ دیر تک تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور زیر لب مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

”ارے نہیں یار..... میں نے تم سے مذاق کیا ہے۔“
”میں تو ڈر گیا تھا سر۔“ وہ سادگی سے بولا۔ ”ایک تو میں پہلے ہی آپ کی غیر حاضری سے پریشان بیٹھا تھا۔ ہر لمحے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر میڈم نے آپ کے بارے میں پوچھا تو انہیں کیا جواب دوں گا۔ اوپر سے آپ نے غائب ہونے والے جادو کی کہانی سنادی۔ میرا ذہن بری طرح الجھ گیا تھا۔“

”اپنے ذہن کو فوراً سے پیشتر سلجھا لو کیونکہ میرے جادو سیکھنے کی کہانی میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ بس، میں سڑک کے کنارے ٹہلتے ہوئے کافی دور نکل گیا تھا۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے تمہیں فکر مند ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ باقی جہاں تک میڈم کی انکوائری کے حوالے سے ہر مل تمہیں دھڑکا لگا رہنے کا معاملہ ہے تو مجھے بتاؤ، اس دوران میں انہوں نے تم سے میرے بارے میں کیا پوچھا اور تم نے انہیں کیا جواب دیا؟“

”کچھ نہیں سر!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
”انہوں نے اس بیچ میں مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔“

”اس کا مطلب ہے، وہ گہری نیند سو رہی ہیں!“ میں نے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے تم بھی آرام کرو اور میں بھی سونے جا رہا ہوں۔“

سسپنس ڈائجسٹ 191 جنوری 2018ء

سسپنس ڈائجسٹ 190 جنوری 2018ء

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

میں اپنے بیڈروم میں پہنچا اور سونے کے لیے بستر پر دراز ہو گیا۔ نیند کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے مینا میری سوچ کا مرکز تھی۔ اس نے جس ڈرامائی انداز میں میری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا وہ بڑا سنسنی خیز اور چونکا دینے والا تھا اور دلچسپ بات یہ کہ وہ اپنے اس مقصد میں صد فی صد کامیاب بھی ہو گئی تھی۔ میں اس کا دوست بن چکا تھا اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے مشن کی کامیابی کے لیے میرے بس میں جو بھی ہوگا وہ ضرور کروں گا۔ یہ میرا کوئی خالی خولی، ٹر خانے والا وعدہ نہیں تھا بلکہ میں حتی الامکان حد تک دل و ذہن سے اس کی مدد کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔

بیٹا نے ذلت و رسوائی کی نگری سے منہ موڑ کر ایک باعزت، شریفانہ زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس شخص مشن میں اس کی دل جوئی اور عملی معاونت کرنا ایک عظیم نیکی تھی۔ میں نے اسی لمحے یہ ٹھان لی تھی کہ کل کوئی مناسب موقع دیکھ کر میں بیٹا کے حوالے سے ماں سے بات کروں پھر ان کے مشورے کی روشنی میں آئندہ کالائیکٹ عمل تیار کیا جائے گا۔

ممکن ہے، یہ میری غلط فہمی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، وہ بیٹا کا فطری بے باک انداز ہو یا پھر حالات کے پیش نظر اس کا جذباتی رد عمل مگر مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے مجھ میں اس کی دلچسپی دوستی سے آگے کی کوئی چیز ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے جذب کا ایک عالم دیکھا تھا۔ اس کی نگاہ میں دوستانہ لم اور محبوبیت زیادہ تھی اسی لیے جب اس نے بڑے توانا لہجے میں یہ کہا کہ... ”تم میرے دوست ہو۔ اگر تم چاہو گے تو یہ خاطر داری کیفہ تک محدود نہیں رہے گی۔ میں ہر وقت اور ہر جگہ تمہاری تواضع کے لیے تیار ہوں.....“ تو میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

حقیقت کیا تھی اس کا فیصلہ تو آنے والے وقت ہی نے کرنا تھا کیونکہ وقت اپنا فیصلہ سنانے کے لیے عدالت لگا کر فریقین کے دلائل نہیں سنتا اور نہ ہی وہ کسی سے مشورہ کرنے کا محتاج ہے۔ یہ سفاک منصف اپنی مرضی کے فیصلے صادر فرماتا ہے اور پھر اس فیصلے کو اپنی طاقت سے نافذ العمل بھی بناتا ہے۔ بڑے بڑے سوراؤں کو اس فیصلوں پر صاد کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس کے صادر کردہ فیصلوں کے خلاف اپیل کا کوئی آپشن نہیں ہوتا۔

یہ ضروری نہیں تھا کہ بیٹا کے حوالے سے میں جو سوچ رہا تھا، یہ بین اس کے ذہن میں بھی سب کچھ ایسا ہی چل رہا

سسپنس ڈائجسٹ 191 جنوری 2018ء

سسپنس ڈائجسٹ 190 جنوری 2018ء

ہوتا ہم میں ”احتیاط علاج سے بہتر ہے“ کے فارمولے کا حامی تھا۔

☆☆☆

امریکا کے اندر اور امریکا سے باہر بے پناہ افرادی قوت کے بل بوتے پر ایف بی آئی اینڈ سی آئی اے کا نظام جاسوسی اتنا زیادہ فعال اور دیانت دار نہیں ہے جتنا ماں نے اپنے بچے میں قائم کر رکھا تھا اور وہ بھی صرف ایک فرد کی قوت سے..... جس کا نام تھا، جشید!

جب دوپہر میں ماں سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے رسمی علیک سلیک کے بعد کھوجنے والی نظر سے مجھے دیکھا اور معنی خیز لہجے میں استفسار کیا۔

”آدھی رات کے بعد کہاں کی سیر ہو رہی تھی؟“ توقع کے عین مطابق، میری شب نوردی کا قصہ ماں تک پہنچ چکا تھا۔ اس سوال کے جواب میں، نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں، میں نے ماں کو گزشتہ رات پیش آنے والے حالات سے آگاہ کر دیا۔ انہوں نے گہری دلچسپی اور سنجیدگی سے میری بات سنی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”پتا دوسری لڑکیوں سے کافی مختلف ہے۔“ ”ماں!“ میں نے سمجھ انداز میں کہا۔ ”آپ نے گناہ کی زندگی کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کے ثمرات بھی نظر آنے لگے ہیں۔ آپ دیکھ لیں، رات بپنا نے بھی آپ کے نقش قدم پر پاؤں رکھ دیا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو میرے بچے!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولیں۔ ”نیکی اور بھلائی کے کسی بھی کام کا یہی اصول ہے۔ بس، کوئی پہل کرنے والا ہونا چاہیے پھر ایک سے دو اور دو سے گیارہ کا سلسلہ چل نکلتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک قافلہ بن جاتا ہے۔ میری ایک بات ذہن میں رکھنا علی.....! لچاتی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولیں۔

”کسی بھی نیک کام کے لیے جب تک اللہ کی جانب سے توفیق نہ ہو، انسان کبھی بھی ایسے کسی فیصلے تک پہنچ ہی نہیں سکتا اور کارخانہ قدرت میں ہر شے اور ہر کام کا ایک خاص وقت مقرر ہے۔ جب میرے سنہلنے کا وقت آیا تو میں نے اس زندگی کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کیا، جب پتا کی اصلاح کا وقت آ گیا تو وہ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔“

”میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں ماں!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”رات بپنا سے کینے میں

میری جوابات ہوئی ہے اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ اس زندگی سے قطعی خوش نہیں۔ ہر نعمت اور سہولت میسر ہونے کے باوجود بھی وہ ایک قسم کے روحانی عذاب سے گزر رہی ہے اسی لیے اس نے اس اذیت ناک دنیا سے منہ موڑ کر ایک نئی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”کوئی بھی عورت اس پیشے میں اپنی مرضی سے یا راضی خوشی نہیں آتی۔“ ماں نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ”عورت کے حالات اسے اس جہنم میں دھکیل دیتے ہیں پھر رفتہ رفتہ وہ اپنے ماحول کی عادی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس دنیا میں سانس لیتے ہوئے چاہے اسے جہاں بھر کی خوشیاں، اختیار اور اقتدار بھی کیوں نہ حاصل ہو جائے، اس کا اندرون گھائل ہی رہتا ہے۔ دنیا کی تمام آسائشیں اور عیش و آرام اس کے زخم کو مندمل نہیں کر سکتا۔“

بات کے اختتام پر ماں کے چہرے سے گہرے دکھ کا اظہار ہونے لگا تھا۔ وہ اپنے ماضی کو یاد کر کے رنجیدہ ہو گئی تھیں۔ میں اپنی ماں کو طول اور افسردہ نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ارے..... میں آپ کو ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔“ میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے یکا یک مجھے کچھ یاد آ گیا ہو۔ انہوں نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

”کون سی بات؟“ ”ماں! آپ کے لیے خوشخبری ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”یو ایس کونسلٹ جنرل سے آپ کے انٹرویو کی تاریخ آگئی ہے۔“

”ویری گڈ!“ وہ سنہل کر دلچسپی لیتے ہوئے بولیں۔ ”مجھے کس دن انٹرویو کے لیے جانا ہوگا؟“

”انہوں نے منگل آٹھ جولائی اور بدھ نو جولائی کی تاریخیں آفر کی ہیں اور ان دونوں تاریخوں میں تین چار آپشنز ٹائم کے بھی ہیں۔“ میں نے انہیں بتایا۔ ”میں جب سو کر اٹھا تو امریکی ایجینسی سے ای میل آئی ہوئی تھی۔ اب آپ ان دونوں میں سے جو بھی تاریخ اور اس تاریخ کے اوقات میں سے جو بھی وقت چنیں گی، ہمیں اسی تاریخ کو مقررہ وقت پر وہاں پہنچنا ہوگا۔“

”میرے خیال سے آٹھ جولائی منگل ساڑھے دس بجے کا وقت ٹھیک رہے گا۔“ انہوں نے کہا۔ ”یعنی آج سے ٹھیک ایک ہفتہ بعد تمہاری کیا رائے ہے؟“

”میں آپ کے خیال سے متفق ہوں ماں۔“ میں نے کہا۔

وقت

”اس ایک ہفتے میں تم بھی اچھی طرح انٹرویو کی تیاری کروا دینا۔“ وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولیں۔ ان کی آنکھوں میں امید کے دیے روشن ہوتے دیکھ کر میرے جگر کو ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ”جی سرور!“ اس کی آواز میں سنجیدگی تھی۔

ماں نے میری کیفیت کو فوراً بھانپ لیا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کریدنے والے انداز میں بولیں۔ ”کیا بات ہے میرے بچے، تم اچانک اداس کیوں ہو گئے؟“

”بس..... انکل سلطان کی یاد آگئی تھی.....“ میں نے خود کو سنہلاتے ہوئے کہا۔

وہ چند لمحات تک شک زدہ نظر سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہیں پھر پوچھا۔ ”یہ اچانک تمہیں علی سلطان کیوں یاد آ گئے۔ کیا زیر بحث موضوع سے ان کا کوئی تعلق ہے؟“

یہ سچ ہے کہ ماں کے چہرے پر دکھائی دینے والے حزن و ملال نے مجھے دل گرفتہ کر دیا تھا اور یہ بھی سچ تھا کہ ان لمحات میں انکل سلطان بھی مجھے بے طرح یاد آ رہے تھے۔ ان دونوں سوچوں نے مل کر میری کیفیت کو اپنی جگہ میں لے لیا تھا۔ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں ماں..... بڑا گہرا تعلق ہے۔“ وہ میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولیں۔ ”مثلاً کیا تعلق؟“

میں نے بتایا۔ ”ماں! انکل سلطان نے جب مجھے آپ کی خیریت کا پتا لگانے کے لیے پاکستان آنے کو کہا تو مجھے ایک مشورہ بھی دیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کسی طرح کوشش کر کے آپ کو امریکا کی امیگریشن کے لیے ضرور اہلائی کراؤں۔ اس سلسلے میں آپ کو امریکا میں جس بھی قسم کی قانونی مدد کی ضرورت ہوگی اس کا بندوبست وہ کرویں گے۔ وہ آپ کے اسپانسر بن کر کسی بھی بنیاد پر آپ کو مستقل طور پر امریکا بلانے کی خواہش رکھتے تھے۔“

”میں زندگی میں علی سلطان سے کبھی نہیں ملی لیکن اس شخص نے تمہاری پرورش اور تعلیم و تربیت کے سلسلے میں جو قربانیاں دی ہیں، میں انہیں اپنی زندگی کی آخری سانس تک فراموش نہیں کر پاؤں گی۔ اللہ اس نیک انسان کی مغفرت فرمائے۔“ ماں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”علی سلطان اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اس کے خواب کو انشاء اللہ! ضرور تعبیر ملے گی۔ تمہاری کوششوں سے میں بہت جلد

گدھے اور گھوڑے کا فرق

ایک انگریز نے حضرت حسن نظامیؒ سے پوچھا۔ ”سارے انگریزوں کا رنگ ایک جیسا ہوتا ہے لیکن پتا نہیں کیوں سارے ہندوستانیوں کا رنگ ایک سا نہیں ہوتا۔“

خواجہ حسن نظامیؒ نے جواب دیا۔ ”گھوڑوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں لیکن سارے گدھوں کا رنگ ایک سا ہوتا ہے۔“

دیگ اور چمچے

ایکشن کے دن قریب آ رہے تھے۔ ایک بڑی شخصیت اپنے پسندیدہ امیدوار کی تعریف ہی کرتے جا رہے تھے۔

”یہ سمندر ہیں، ہم ان کی نہریں ہیں۔ یہ سورج ہیں، ہم ان کی کرنیں ہیں۔ یہ پھول ہیں، ہم ان کی خوشبو ہیں۔“

اچانک چمچے سے آواز آئی۔ ”یہ ایک دیگ ہیں اور ہم ان کے چمچے ہیں۔“ (مرسلہ: ریاض بیٹ۔ حسن ابدال)

دلچسپ اور حیران کن

☆ ایک سال کی جنٹری بیسیویں سال پھر استعمال ہو سکتی ہے۔

☆ ہر سال کا پہلا دن اور آخری دن ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔

☆ فروری، مارچ اور نومبر ہر سال ایک ہی دن سے شروع ہوتے ہیں۔

☆ اپریل اور جولائی ایک ہی دن سے شروع ہوتے ہیں۔

☆ ستمبر اور دسمبر ایک ہی دن سے شروع ہوتے ہیں۔

(مرسلہ: غلام حسین اختر۔ سرگودھا)

جانے

کسی نے پوچھا چائے فائدہ دیتی ہے یا نقصان۔ میں نے کہا..... کوئی پلا دے تو فائدہ اگر پلائی پڑ جائے تو نقصان۔

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ)

”میں اس خرابی کے بارے میں جاننا چاہوں گا جس کا آپ نے ذکر کیا ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے ماں کی طرف دیکھا۔

”ان لڑکیوں کی میرے گھر میں زیادہ آمد و رفت نہیں ہے۔“ ماں نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ”جب انہیں کوئی بہت ہی ضروری بات سمجھانا ہوتی ہے تو میں پانچوں کو ایک ساتھ بلا لیتی ہوں جیسا کہ کل دن میں بلایا تھا۔ بیٹا اکیلی یہاں آتے ہوئے کترائے گی، وہ بھی اس صورت میں کہ وہ مجھ سے چھپ کر تم سے ملنا چاہتی ہے اور اس کی خواہش ہے کہ تم دونوں کے بیچ ہونے والی باتوں کا مجھے پتا نہیں چلنا چاہیے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ تم سے کسی ایسے مقام پر ملنا پسند کرے گی کہ مجھے اس ملاقات کی خبر نہ ہو۔“

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے ماں۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس بات کا تو اس نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ اس کے مشن کی آپ کو بھنک نہیں پڑنا چاہیے ورنہ آپ اس کے پرکاٹ کر اسے پرواز کے قابل ہی نہیں چھوڑیں گی۔“

”ایسا سوچنے میں وہ حق بہ جانب بھی ہے کیونکہ وہ نہیں جانتی کہ میرے دل میں ان پانچوں کے لیے کیا ہے.....!“ ماں نے کہا۔

ماں نے آخری جملہ بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔ ”آپ کے دل میں ان پانچوں کے لیے کیا ہے؟“

”میری دعا ہے کہ یہ پانچوں کی پانچوں راہ راست پر آجائیں۔“ ماں نے گھبرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بیٹا نے گناہ آلود زندگی سے بغاوت کی ٹھان لی ہے۔ اللہ چاروں کو بھی توفیق عطا فرمائے۔ میں نے سوچ رکھا ہے کہ یہاں سے روانہ ہونے سے پہلے میں فرداً فرداً ان پانچوں کے بینک اکاؤنٹس میں ایک بینڈسم اماؤنٹ ڈیپازٹ کرادوں گی۔ یہ اتنی رقم ہوگی کہ اگر یہ نئی شریفانہ زندگی شروع کرنا چاہیں تو انہیں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں ہوگا۔ بس بچکے کی فروخت کا معاملہ فائل ہو جائے اور میرے ہاتھ میں ایکسٹرا پیسے آجائیں پھر پہلی فرصت میں مجھے یہ نیک کام کرنا ہے۔“

ماں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے اکاؤنٹ میں اس وقت پچاس لاکھ سے زیادہ پیسے پڑے ہوئے تھے۔ اب وہ مکان کی فروخت کے ساتھ ان پانچوں لڑکیوں کو دی جانے والی مجموعی رقم کو نکھی کر رہی تھیں۔ اس کا ایک ہی مطلب نکلتا

اس سلسلے میں تم نے کیا لائحہ عمل بنایا ہے؟“

”میرا خیال ہے، ایک دو سٹنڈز میں معاملات کھل کر سامنے آجائیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”پہلے مجھے یہ سمجھنا ہے کہ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ پھر مجھے یہ دیکھنا ہے کہ میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ اس کے بعد یہ طے کرنا ہے کہ مجھے اس کے لیے جو کچھ بھی کرنا ہے وہ کیسے کیا جاسکتا ہے؟“

”کیا تم نے اس حوالے سے بھی کچھ سوچا کہ بیٹا سے تمہاری ملاقاتیں ہوں گی کہاں؟“ ماں نے ایک اہم سوال کیا۔

”یہ تو اسی وقت طے کیا جاسکے گا جب میری اس سے بات ہوگی۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔

”آپ کیا چاہتی ہیں؟“

”میں جو کچھ چاہتی ہوں اس میں سے کچھ تو ممکن ہے اور کچھ ممکن نہیں۔“ انہوں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یایوں سمجھ لو کہ کچھ مناسب نہیں ہے.....!“

”میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکا؟“ میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

”نمبر ایک، میں چاہتی ہوں کہ تم رات کی تاریکی میں زیادہ دیر کے لیے گھر سے باہر نہ نکلو اور میری اس خواہش کو تم بہ آسانی پورا کر سکتے ہو۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ ”نمبر دو، میں یہ چاہتی ہوں کہ بیٹا کو ہمارے بیچ اصل رشتے کی کبھی خبر نہ ہو اور یہ بھی ہم دونوں کی کوشش سے ممکن ہو جائے گا۔ نمبر تین، میں یہ چاہتی ہوں کہ تمہاری جب بھی بیٹا سے ملاقات ہو، وہ میرے علم میں رہے۔ کیا یہ بھی ممکن ہے؟“

انہوں نے آخری جملے میں مجھ سے سوال کیا تو میں نے کہا۔ ”یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب بھی میں بیٹا سے ملنے جاؤں تو آپ کو بتا کر جاؤں اور جب واپس آؤں تو آپ کو آگاہ کروں کہ ہم نے کہاں ملاقات کی ہے اور ہمارے بیچ کیا باتیں ہوئی ہیں یا پھر.....“

کسی فوری خیال کے تحت میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو ماں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ”یا پھر کیا.....؟“

”یا پھر یہ کہ ہماری ملاقات اسی بیچکے پر ہوتا کہ آپ کو ہر حوالے سے تسلی رہے۔“ میں نے اپنے ذہن کی بات کو زبان سے ادا کر دیا۔

”بالکل، میں بھی یہی چاہتی ہوں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولیں۔ ”لیکن اس میں ایک خرابی ہے۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے میں نے نامناسب والی بات کی تھی، وہ یہی ہے۔“

ٹھیک ہے کہ آپ نے میری جدائی میں بڑا کٹھن وقت گزارا ہے لیکن آپ کو بھی یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ میں بھی آپ کی یاد میں بہت تڑپا ہوں۔ آپ کو کم از کم یہ تو معلوم تھا کہ میں زندہ ہوں اور آپ سے دور بڑے مضبوط اور محفوظ ہاتھوں میں ہوں جبکہ میں تو اپنے والدین کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، اپنے والدین کی صورت دیکھنے کو ترس رہا تھا۔ بچپن سے جوانی تک میری تعلیم و تربیت اور پرورش ایک ایسے مربی و مہربان شخص نے کی جس کے ساتھ میرا کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس شخص اور ہمدرد انسان نے مجھے کبھی والدین کی کمی محسوس نہیں ہونے دی لیکن یہ محرومی تو ہر لمحہ میرے اندر جاگزیں رہی ہے۔ ہر روز ایک بے نام، اُن جان اور عجیب سی بے چینی میرے وجود میں پھیلتی چلی جاتی تھی.....“ میں تھوڑی دیر کے لیے رک رک کر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اس لیے میں آپ کو کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اب ہماری باقی کی زندگی ایک ساتھ، ایک دوسرے کی نگاہوں کے سامنے گزرے گی۔ آپ اپنے ذہن کو ہر قسم کے اندیشے، خدشے، خطرے اور دباو سے پاک کر دیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمارے بیچ کسی بھی شکل کی کوئی دیوار کھڑی نہیں کر سکتی۔“

ماں نے بے ساختہ مجھے اپنے سینے سے لگایا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مجھے پیار کرنے لگیں۔ ان لمحات میں، میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین بچہ محسوس کر رہا تھا جسے اپنی ماں کو بھرپور مامتا میر سٹی۔ انسان جتنے زیادہ دنوں کا بھوکا ہوتا ہے، اسے کھانے کے اندر اتنی ہی زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے۔

میں کافی دیر تک ماں کے سینے سے لگا رہا..... وہ اپنے شفقت بھرے ہاتھوں سے میرے سر کے بالوں کو سنوارتی اور پیٹھ کو سہلاتی رہیں۔ کچھ وقت کے لیے زندگی ایک مقام پر رک گئی تھی۔ ہم دونوں کی یہی خواہش تھی کہ زندگی یوں ہی رہے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ جب تک انسان کی سانس چلتی رہتی ہے، اس کی زندگی کی گاڑی بھی روتاں دواں رہتی ہے۔ زندگی کے ٹھم جانے کا ایک ہی مطلب ہے کہ اب انسان کو زندگی کی ضرورت نہیں رہی۔

ہم دونوں جیتے جاگتے انسان تھے لہذا لمحاتی جذباتی کیفیت سے گزرنے کے بعد ہم ایک بار پھر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ماں نے مجھ سے پوچھا۔

”تم نے بیٹا سے آئندہ بھی ملنے کا وعدہ کر لیا ہے۔“

امریکا پہنچ جاؤں گی۔“

”انشاء اللہ.....!“ میں نے تہ دل سے کہا۔

ماں نے پوچھا۔ ”تم نے بیٹا کو ہمارے رشتے کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا.....!“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ماں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں بھلا ایسی غلطی کیسے کر سکتا ہوں۔ وہ بس اتنا ہی جانتی ہے جو کہانی آپ نے نگینہ آئنی کو سنائی ہے یا پھر آپ نے گزشتہ روز ان پانچوں کو میرے بارے میں جو بھی بتایا ہوگا۔“

”نگینہ اور ان لڑکیوں کو صرف اتنا ہی پتا ہے کہ تم میرے ایک عزیز صدیقی علی کے بیٹے رفیق علی ہو اور میں تمہیں ”علی“ کہہ کر پکارتی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ رمضان کے آخری عشرے میں عمرہ کرنے جا رہی ہوں۔ تم وہاں جدہ میں ایک ریسٹورنٹ چلاتے ہو۔ عمرہ کے علاوہ میرے پاس جتنا بھی وقت بچے گا وہ میں تمہارے ساتھ جدہ میں گزاروں گی اور میری واپسی عید کے بعد ہوگی۔“

”ہاں۔ وہ بھی بس اتنا ہی جانتی ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

”وہ تم سے کس قسم کی مدد چاہتی ہے؟“ ماں نے پوچھا۔ ”کیا اس بارے میں بیٹا نے تمہیں کچھ بتایا ہے؟“

”اس حوالے سے اس نے کوئی واضح بات نہیں کی۔“ میں نے کہا۔ ”بس، وہ یہ چاہتی ہے کہ گناہ کی دلدل سے باہر نکلنے کے لیے میں اس کی مدد کروں۔ جب دوبارہ ملاقات ہوگی تو میں اس سے پوچھوں گا کہ وہ مجھ سے کس نوعیت کا تعاون چاہتی ہے۔“

”کسی کو دلدل سے کھینچ کر باہر نکالنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھانا پڑتا ہے علی!“ وہ معنی خیز انداز میں بولیں۔ ”ہم ماں بیٹا بس، دس پندرہ دن پاکستان میں ہیں۔ پھر ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔ بیٹا کی مدد کرنے کے لیے بہت سوچ سمجھ کر ہاتھ بڑھانا..... میں نے بڑی مشکل سے تمہیں پایا ہے، اس بات کو ذہن میں رکھنا۔“

میں ماں کی بات میں چھپی گہرائی کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ یہ ایک ماں کی اپنے بیٹے کے لیے فکر تھی۔ اس معاملے میں ساری دنیا کی مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ انہیں ہر لمحے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کوئی دوسری عورت ان کے بیٹے کو کہیں چھین نہ لے.....!

”آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ماں۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”یہ

تھا کہ وہ ان لڑکیوں کو جو رقم دینے والی تھیں اس کا تخمینہ پچاس لاکھ سے اوپر بنتا تھا۔

”جب انسان کی نیت صاف اور مقصد نیک ہو تو مالک ضرور مدد کرتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ آپ نے ان پانچ لڑکیوں کے فیوچر کے حوالے سے جو سوچ رکھا ہے اس میں آپ کو لازمی کامیابی ملے گی۔ باقی جہاں تک پینا سے میری ملاقات کا تعلق ہے تو.....“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”میں یہ سمجھتا ہوں کہ پینا کا یہاں آنا مناسب نہیں ہوگا۔ ہم باہر ہی نہیں ملیں تو اچھا ہوگا تا کہ وہ آزادانہ طور پر مجھے اپنے منصوبے سے آگاہ کر سکے۔“

”میں تمہیں اس سلسلے میں فری ہینڈ دیتی ہوں۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔ ”تمہیں جو ٹھیک لگے، وہ کرو لیکن تمہیں میں رات کو زیادہ دیر تک گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ مامتا کو اپنی اولاد کے حوالے سے بے پناہ تحفظات ہوتے ہیں۔ اولاد ماں کی نظر کے سامنے ہو یا ہزاروں کلومیٹر دور، ماں کو ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ نہ ہو جائے، کہیں وہ نہ ہو جائے..... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

بات ختم کر کے انہوں نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ”جی۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

وہ مطمئن ہو گئیں۔ میں نے ماں کے انٹرویو کے لیے آٹھ جولائی منگل صبح ساڑھے دس بجے والے آپشن کو کفرم کر دیا۔ میں نے انٹرویو کے حوالے سے ماں کو چند ٹیکنیکل چیزیں سکھانا بھی جس کے لیے ایک ہفتے کا وقت کافی تھا۔

کچھ دیر کے بعد عظیم کا فون آ گیا۔ رسی حال احوال کے بعد اس نے پوچھا۔ ”رات کب تک اس بوم شیل کے ساتھ بیٹھے رہے تھے؟“

”کیفے بند کروا کے ہی اٹھے تھے۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا پھر اسے بتایا۔ ”اس لڑکی کا نام پینا ہے اور اس نے یہ پیشہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے لہذا اس کے لیے ”بوم شیل“ کا لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔“

”آئی ایم سوری برو!“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں نے تو اس لڑکی کی اٹھان اور رعنائی کو دیکھتے ہوئے یہ ٹائٹل دیا تھا۔ ہالی ووڈ کی کسی ایکٹریس کے نام کے ساتھ جب تک ”بوم شیل“ نتھی نہ ہو، اس کے ہٹ ہونے کا معاملہ پینڈنگ

ہی میں رہتا ہے۔ اپنی ہاؤ..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم سے ملاقات کے بعد اس کے اندر اتنی بڑی تبدیلی آگئی ہے۔“

عظیم کسی زمانے میں ”پلے بوائے“ رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں نا، چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ عظیم کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ خوب صورت اور پرسکش لڑکی کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی تھی اور وہ اسے کوئی نہ کوئی ٹائٹل دینا نہیں بھولتا تھا۔

”پینا کے اندر یہ تبدیلی مجھ سے ملاقات سے پہلے آچکی تھی۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اسے اس گند خانے سے نکالوں۔ وہ میرے تعاون سے غلاظت بھری زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے۔“

”اور تم نے اسے اپنے تعاون کا یقین بھی دلادیا ہوگا!“ وہ معنی خیز لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”تمہارے سینے میں ایک ہمدردی بھر ا دل دھڑکتا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں..... تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے سینے میں ہمدردی بھر ا دل ہے یا نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے لیکن میں اپنے مزاج اور فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں کہ کسی ضرورت مند کی جائز ضرورت کو پورا کرنے میں، میں کسی کوتاہی یا سستی سے کام نہیں لیتا لہذا میں نے اس کی بھرپور مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ بھی استوار ہو چکا ہے۔“

”گڈ! یہ تو اچھی خبر ہے۔“ وہ سراہنے والے انداز میں بولا۔ ”پینا اگر تمہاری دوست ہے تو میری بھی دوست ہے۔ اسے گناہ آلود زندگی سے نکال کر ایک معزز معاشرتی مقام دینے کے سلسلے میں اگر میرے تعاون کی ضرورت ہوگی تو میں حاضر ہوں۔“

”اس حوالے سے تم میرے ذہن میں ہو۔“ میں نے کہا۔ ”پہلے میں یہ معلوم کر لوں کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ اس کے بعد کوئی لائحہ عمل ترتیب دوں گا۔ میں تو ویسے بھی چند دن ہی یہاں ہوں۔ جو بھی کرنا ہے، وہ تمہارے ہی توسط سے ہوگا۔“

”تم فکر نہیں کرو یار، میں اس معاملے کو بے غوی ہینڈل کر لوں گا۔“ وہ فراخ دلی سے بولا پھر پوچھا۔ ”اس لڑکی کے بارے میں تو کچھ بتاؤ جس نے کل رات بڑے ڈرامائی انداز میں تمہیں کیفے یونیورسٹی میں بلایا تھا۔ تم نے بتایا تھا کہ

اس کے بارے میں کسی تحقیق کی ضرورت نہیں کیونکہ تم نے اس کا پتہ لگا لیا ہے.....!“

”ہاں۔ میں نے تم سے غلط بیانی نہیں کی تھی۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے واقعی اس پر اسرار لڑکی کا کھوج لگا لیا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“ اس نے اضطرابی لہجے میں استفسار کیا۔

”پینا..... یعنی بی بی نا!“

”اوہ فٹاسک!“ وہ جو شیلے لہجے میں بولا۔

”سویکٹ اینڈ اسمارٹ۔ اس نے تم سے دوستی کرنے اور تمہاری ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے کیسا زبردست پلان تیار کیا ہے..... مائنڈ بلونگ برو.....!“

”وہ کتنی کیوٹ، اسمارٹ اور مائنڈ بلونگ ہے اس کا حساب تم فرصت میں بیٹھ کر لگاتے رہنا۔“ میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ”میں تو آٹھ، دس یا زیادہ سے زیادہ پندرہ دن مزید کراچی میں ہوں۔ اس کے بعد یہ حسینہ تمہارے ہی حوالے ہوگی۔“

”ڈونٹ دری یار! میں اسے سنبھال لوں گا۔“ عظیم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ انٹر سٹڈ ہوگی تو کسی سے اس کی شادی بھی کروادوں گا۔ وہ بہت پرسکش اور نظر فریب حسن کی مالک ہے۔ ایسی دلنشین لڑکی سے تو درجنوں لوگ شادی کے لیے تیار ہو جائیں گے۔“

”مگر ظاہر ہے، وہ درجنوں سے نہیں، کسی ایک ہی مرد سے شادی کے لیے راضی ہوگی، وہ بھی اگر اس کا ایسا کوئی ارادہ ہوا تو.....“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ورنہ درجنوں والے تلخ تجربات سے تو وہ کئی بار گزر چکی ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو یار۔“ وہ کبھی لہجے میں بولا۔

”میری دعا ہے اور میں کوشش بھی کروں گا کہ اسے کوئی معقول اور سمجھ دار شریک زندگی مل جائے جو اس کے گھناؤنے ماضی کو یکسر فراموش کر کے سہانے اور سنہرے مستقبل کی جانب جانے والی راہ گزر پر اس کا ہم سفر بن جائے۔“

”اور یہ ”کوئی“ عظیم احمد کپور تو نہیں ہوگا؟“ میں نے اس کے چٹکی لی۔

”توبہ کرو یار..... کیوں مجھے گھر سے نکلوانا چاہتے ہو؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”ایک گھر سے نکالے جاؤ گے تو دوسرے گھر میں پناہ مل جائے گی۔“ میں نے شرارتی انداز برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”کسی بوم شیل دو شیزہ کو حاصل کرنے کے لیے تھوڑی

بہت قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے نا.....!“

”نہیں یار!“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ بیوی کے ساتھ میرا ہر معاملے میں اختلاف رہتا ہے اور ہر جھگڑے پر یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے لیکن میں زندگی میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔“

”بڑا عجیب معاشرہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اتنی گھٹن کے باوجود بھی لوگ زندہ ہیں۔“

”زندہ ہیں اور اکثر اس زندگی پر شرمندہ ہیں۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ ”جن لوگوں کے پاس وسائل ہیں وہ اس معاشرے کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ باقی کی مجبوری ہے۔“

میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اسے بتایا۔

”آٹھ جولائی کو ماں کا انٹرویو ہے، صبح ساڑھے دس بجے۔“

”ویری گڈ!“ وہ مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”یہ تو خوشخبری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر آئی سلسلی کا انٹرویو کیلکٹر ہو جاتا ہے تو دس، گیارہ جولائی کو امریکا کا ملٹی پل ویزا والا اسٹیکران کے پاسپورٹ پر پیسٹ ہو چکا ہوگا۔“

”انشاء اللہ!“ میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

اس نے پوچھا۔ ”برو! آج تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”میں آج کا دن مکمل آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”تم کیا کر رہے ہو؟“

”پاپا کی خدمت میں حاضر ہوں۔“ وہ مسکینی بھرے لہجے میں بولا۔ ”بھائی تو ادھر راولپنڈی میں ہے اس لیے پاپا کی ساری توپوں کا رخ میری ہی طرف ہے۔“

”انجوائے کرو یار.....!“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

”انجوائے کیا کرنا ہے۔“ وہ بیزاری سے بولا۔

”عظیم! میں جس حد تک تمہارے بھائی علی کو سمجھ پایا ہوں اس کے مطابق، وہ نہ تو تم سے نفرت کرتا ہے اور نہ ہی وہ تمہیں اپنا دشمن سمجھتا ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ وہ پاپا کی باتوں کے سامنے ”ہاں، ہاں“ کرتا ہوگا لیکن دل سے وہ تمہارے خلاف نہیں سوچتا۔ وہ تمہارا خیر خواہ ہے۔ پاپا کی صحت اور موجودہ حالات کے پیش نظر وہ مصلحت سے کام لیتے ہوئے ان کے ساتھ سخت رویہ نہیں اپناتا۔ تم بھی یہی کیا کرو۔ مالک نے آخردکان کس لیے دیے ہیں؟ سننے کے لیے تو ایک کان ہی کافی تھا۔ دوسرے کان کا مصروف یہ ہے کہ لوگوں کی کبھی ہوئی جو باتیں آپ کو پسند نہ ہوں انہیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال باہر کرو۔“

”یار مجھ سے یہ کھلی منافقت نہیں ہوتی۔“ وہ دھکی لہجے

میں بولا۔

”نام تبدیل کرنے سے کام آسان ہو جائے گا۔“

میں نے کہا۔
وہ اچھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”برو! میں سمجھا نہیں؟“

”جس طرح اینٹی بائیوٹک دوا کی کمپنی بدلنے سے اس کا نام تبدیل ہو جاتا ہے اور یہ تبدیل شدہ نام دوا کی وہی اینٹی بائیوٹک کھانے سے مرخص کو فائدہ پہنچاتا ہے بالکل اسی طرح اگر تم منافقت کا نام تبدیل کر کے مصلحت رکھ لو اور دونوں کانوں کا بھرپور استعمال کرو تو سمجھو بیڑا پار ہے.....!“

”سمجھ گیا.....!“ وہ بڑے توانا لہجے میں بولا۔
الوداعی کلمات کے بعد ہمارے درمیان سیلور رابطہ منقطع ہو گیا۔

☆☆☆

شام سے تھوڑی دیر پہلے نادر شاہ آ گیا۔
ماں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا پھر مجھے بھی وہیں بلا لیا۔ ماں نادر شاہ پر بے پناہ بھروسہ کرتی تھیں۔ وہ ان کے لیے ایک قابل اعتماد شخص تھا۔ وہ ایک خطیر رقم اس کے حوالے کر کے یہاں سے جانا چاہتی تھیں۔ ماں کے منصوبے کے مطابق، اس رقم کی مدد سے نادر شاہ نے کراچی میں میرے مرحوم والد کی یاد میں ایک ٹرسٹ قائم کرنا تھا۔ ”حیدر علی ٹرسٹ“ نامی یہ فلاحی ادارہ بے کس ولا چار لوگوں کی مدد کرتا۔ ماں نے بہت ہی نیک اور مفید کام کا منصوبہ بنایا تھا۔ ماں کی غیر موجودگی میں ٹرسٹ کا انتظام و انصرام نادر شاہ ہی نے چلانا تھا۔

”سلٹی بہن! میں نے بیٹکے کی فروخت کے سلسلے میں تمام تر ورکنگ کر لی ہے۔“ نادر شاہ نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بتایا۔ ”بس، آپ کے مشورے کی ضرورت ہے۔“
”کیسا مشورہ شاہ جی؟“ ماں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس وقت میرے پاس آپ کے بیٹکے کو خریدنے کے لیے دو پارٹیاں تیار کھڑی ہیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ان میں سے آپ نے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ اس کے بعد دیگر مراحل طے کیے جائیں گے۔“

”دونوں پارٹیوں کی تفصیل کیا ہے؟“ ماں نے پوچھا۔
اس دوران میں، میں چپ بیٹھا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ نادر شاہ نے ماں کے سوال کے جواب میں بتایا۔

”آپ کے بیٹکے کی اس وقت مارکیٹ ویلیو سترہ کروڑ کے آس پاس ہے۔ میں نے جن دو پارٹیوں کا ذکر کیا ہے

ان میں سے ایک نے پندرہ کروڑ کی آفر دی ہے اور دوسری پارٹی کی پیشکش بیس کروڑ ہے۔“

”یعنی پورے پانچ کروڑ کا فرق۔“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ کیا کہانی ہے شاہ جی؟“

”علی بیٹا! ان دونوں آفرز میں موڈ آف بے منٹ کا فرق ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جو پارٹی پندرہ کروڑ دینے کو تیار ہے وہ چوبیس گھنٹے کے اندر ادائیگی کر دے گی جبکہ بیس کروڑ والی پارٹی ففٹی پرسنٹ رقم ایڈوانس دینے کو تیار ہے اور باقی ففٹی پرسنٹ کے لیے وہ دو ماہ کی مہلت مانگ رہی ہے۔“

”ہوں.....“ ماں گہری سوچ میں ڈوب گئیں پھر پوچھا۔
”شاہ جی! آپ کا کیا مشورہ ہے؟“

”اگر آپ کو بہت جلدی ہے اور آپ کسی کھٹ راگ میں نہیں پڑنا چاہتیں تو پھر پندرہ کروڑ والی پیشکش کو قبول کر لیتا چاہیے۔“ اس نے اپنی ماہرانہ رائے دی۔ ”اور اگر آپ دو ماہ تک انتظار کر سکتی ہیں تو پھر یقیناً بیس کروڑ والی آفر میں زیادہ کشش ہے۔“
”دو ماہ کافی طویل عرصہ ہے۔“ ماں نے کہا۔ ”میں بس، دس سے پندرہ دن اور یہاں ہوں۔ پھر روانہ ہو جاؤں گی۔“

”اگر آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تو پھر پندرہ کروڑ والی پارٹی کو ڈن کر دیتے ہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔
”آپ اپنی موجودگی میں یہ کام نمٹا کر یہاں سے جائیں۔“
”اگر آپ پر بھروسہ نہ ہوتا تو میں علی کی بازیابی کے بارے میں آپ کو کچھ نہ بتاتی۔“ ماں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور نہ ہی ”حیدر علی ٹرسٹ“ والا کروڑوں کا پروجیکٹ آپ کے سپرد کرنے کے بارے میں سوچتی۔ آپ میرے بھروسے کی نگر نہ کریں اور اگر آپ کے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہے تو کھل کر مجھ سے بات کریں۔“

”آپ کی فوازش ہے جو آپ مجھ پر اتنا بھروسہ کرتی ہیں۔“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بھی آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچے دوں گا۔ مجھ پر اعتبار کر کے آپ کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ کا یہ اندازہ درست ہے کہ مکان کی فروخت کے سلسلے میں میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔“

”میں وہی آئیڈیا تو سننا چاہتی ہوں۔“ ماں نے کہا۔
”آپ جانتی ہیں کہ میں سا لہا سال سے ریل اسٹیٹ کا کام کر رہا ہوں اس لیے میں اپنے تجربے کی بنا پر

کہہ سکتا ہوں کہ بیس کروڑ والی پیشکش ہمارے لیے زیادہ سودمند ثابت ہوگی۔“

”لیکن میں دو ماہ تک یہاں بیٹھی تو نہیں رہ سکتی.....!“ ماں نے کہا۔

”آپ کو یہاں بیٹھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟“
”پھر میری غیر موجودگی میں یہ معاملہ کیسے نمٹے گا؟“
ماں نے پوچھا۔

”اس مسئلے کا حل پاور آف اٹارنی ہے۔“ نادر شاہ نے بتایا۔

ماں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔
”میں سمجھی نہیں شاہ جی؟“

”آپ میرے نام پر ”پاور آف اٹارنی“ بنوادیں۔“
وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”اس ڈاکیومنٹ کی رو سے مجھے آپ کا یہ بنگلا فروخت کرنے کا کلی اختیار حاصل ہو جائے گا۔ آپ ففٹی پرسنٹ رقم یعنی دس کروڑ روپے اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کریں اور اطمینان کے ساتھ اپنے مشن پر روانہ ہو جائیں۔ آپ کے حقوق کے تحفظ کے لیے میں یہاں بیٹھا ہوں۔ دو ماہ کے بعد باقی کے دس کروڑ بھی پارٹی سے وصول کر کے اسے بیٹکے کا قبضہ دے دوں گا اور یہ رقم بھی آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کرادی جائے گی۔“

”آپ کا آئیڈیا بہت اچھا ہے شاہ جی۔“ ماں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”میں جب تک یہاں ہوں، آپ ٹرسٹ کے حوالے سے تمام ضروری ڈاکیومنٹس بھی تیار کروالیں اور ٹرسٹ کا ایک بینک اکاؤنٹ بھی کھلوالیں۔ میں اس بیٹکے کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم میں سے صرف ایک کروڑ روپے لوں گی، باقی تمام پیسے ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں جائیں گے۔ اس ایک کروڑ سے میں بعض لوگوں کی مالی مدد کرنا چاہتی ہوں۔“

”سلٹی بہن! یہ ساری رقم آپ کی ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ چاہیں گی تو بیس کے بیس کروڑ آپ کے اکاؤنٹ میں جمع کروادے جائیں گے۔“

”نہیں۔ میرا کام صرف ایک کروڑ سے ہو جائے گا۔“
ماں نے پوری قطعیت سے کہا۔ ”باقی ساری رقم ٹرسٹ کے پلیٹ فارم سے مستحق افراد کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوگی۔“

”جیسے آپ کی مرضی بہن۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔ ”میں تو آپ کی خواہش کی تکمیل کے لیے دن رات کوشاں ہوں۔ میری ذات سے آپ کو ہمیشہ فائدہ ہی پہنچے گا۔“

خوب صورت باتیں

☆ جب سکون کی کمی محسوس ہو تو اپنے رب سے توبہ کیا کرو۔ کیونکہ یہ انسان کے گناہ ہی ہیں جو اسے بے چین رکھتے ہیں۔

☆ اپنی روح کے باغ میں مبرکی کھیتی کاشت کرو بے شک اس کا بیج کڑوا ہے لیکن پھل میٹھا ہے۔

☆ زندگی میں دو لوگوں سے دور رہنا، ایک معروف اور دوسرا مغرور کیونکہ معروف اپنی مرضی سے بات کرتا ہے اور مغرور اپنے مطلب کے لیے یاد کرتا ہے۔

☆ جو نصیب میں ہے وہ چل کر آئے گا جو نہیں ہے، وہ آ کر بھی چلا جائے گا اس لیے خود کو پریشانی میں مت ڈالو۔ اس دنیا سے زندہ بچ کر کوئی نہیں جائے گا اور یہ سچ ہے کہ اگر زندگی اتنی اچھی ہوتی تو ہم اس دنیا میں روتے ہوئے نہ آتے اور یہ بھی سچ ہے کہ اگر یہ زندگی بری ہوتی تو ہم جاتے جاتے لوگوں کو رولا کر نہ جاتے۔

☆ اعتبار ایک روح کی طرح ہے جو ایک بار چلا جائے تو پھر لوٹ کر نہیں آتا۔
☆ آنسوؤں کا کوئی وزن نہیں ہوتا لیکن ان کے گرنے سے دل ضرور ہلکا ہو جاتا ہے۔
☆ انسانیت وہ چیز ہے جو دشمن کو بھی سہارا دینے پر مجبور کر دیتی ہے اور احساس وہ چیز ہے جس میں غیروں کا دکھ بھی آپ کو اپنا لگتا ہے۔

☆ بہترین لوگ بہترین نیت رکھتے ہیں جس کی وجہ سے رب ان کے تمام کاموں کو سنوار دیتا ہے اور جس کام کو رب سنوار دے پھر اسے بھلا کون بگاڑ سکتا ہے۔

(مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری۔ قصورٹی)

ریورس گینز

ہم تک بڑ گنتنا نے والا ایک ایسا پرندہ ہے جو یکسر پیچھے کی جانب بھی اڑ سکتا ہے۔ جس طرح آپ کارگور یورس گیر لگا کر پیچھے ڈرائیو کر سکتے ہیں، وہ بھی اپنے پروں کو یورس گیر لگا کر پیچھے کی طرف اڑ سکتا ہے۔

(مرسلہ: غلام حسین اختر۔ سرگودھا)

سہلی بہن! میں آپ کا سچا وفادار ہوں۔“

نادر شاہ نے اپنی گفتگو کے دوران میں متعدد بار اپنے قابل بھروسہ ہونے، لائق اعتبار ہونے، ماں کے وفادار ہونے کا ذکر کیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس سے شاہ جی کا مقصد کیا تھا۔ ممکن ہے، یہ اس کی عادت ہو لیکن میرے ذہن میں اس وقت خلیل جبران کا ایک قول تازہ ہو گیا تھا۔ خلیل جبران کہتا ہے۔ ”اس نے کہا، میں نے ماں لیا۔ اس نے زور دے کر کہا، مجھے شک ہوا۔ اس نے قسم کھائی، مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔“

”کیا یہ ممکن ہے کہ میری یہاں موجودگی کے دوران میں آپ پاور آف انارنی سمیت تمام ضروری ڈاکیومنٹس تیار کروالیں۔“ ماں نے نادر شاہ سے پوچھا۔ ”اس میں ٹرسٹ کے حوالے سے تمام اہم قانونی کاغذات بھی شامل ہیں؟“

”سہلی بہن! کاغذ کے نوٹوں میں بڑی طاقت ہے۔ اگر یہ کسی بھی کام کی گاڑی میں پیہوں کی جگہ لگا دیں تو وہ کام پلک جھپکتے میں ہو جاتا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا.....؟“

”اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔“ ماں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ان پیہوں کی آپ فکر نہ کریں۔ میرے مقصد کے ٹرالر کو جتنے بھی پیہوں کی ضرورت ہوگی، میں پیش کر دوں گی۔“

”بس تو پھر آپ مطمئن ہو جائیں کہ آپ کے، یہاں سے جانے سے پہلے ہی آپ کی تمام خواہشات کی تکمیل ہو جائے گی۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

اسی لمحے میرے سیل فون پر پینا کی کال آگئی۔ میں ”سوری“ کہہ کر وہاں سے اٹھ گیا اور اپنے کمرے میں آ کر اس کی کال ریسیو کی۔

”ہیلو علی!“ اس کی مترنم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”کیا کر رہے ہو؟“

”میں تو ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہوں۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”کیا اس ”کچھ نہ کچھ“ میں ڈنر کرنا بھی شامل ہے؟“ اس نے متنی خیز انداز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”پینا! میں تمہاری بات کو سمجھ نہیں سکا!“

”اب تم اتنے بھی نا سمجھ نہیں ہو۔“ وہ ایک خاص ادا سے بولی۔ ”ڈنر کا مطلب ڈنر ہی ہوتا ہے۔ کیا آج تم میرے ساتھ ڈنر کرنا پسند کرو گے؟ میں تمہارے ساتھ بہت ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

”او کے..... میں تھوڑی دیر میں تمہیں کنفرم کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”جانا کہاں ہوگا؟“

”ارے، زیادہ دور نہیں جائیں گے۔“ اس نے بتایا۔ ”کیفے یو فور یا تمہیں کیسا لگا؟“

”فتنا شک!“ میں نے راست گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ”بس، تو پھر وہیں چلیں گے۔“

”او کے!“ میں نے یہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

”میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔“ میں اپنے بیڈ روم سے نکلا تو سامنے سے ماں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ میں نے پوچھا۔

”کیا شاہ جی رخصت ہو گئے؟“

”ہاں۔ وہ ابھی گئے ہیں۔“ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ ”لیکن تم اچانک وہاں سے کیوں اٹھ گئے تھے؟ کس کا فون تھا؟“

میں نے ان کے دونوں سوالوں کا جواب ایک لفظ میں دیا۔ ”پینا!“

”کیا کہہ رہی تھی؟“ ماں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”مجھے ڈنر کرنا چاہتی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”پھر تم نے اسے کیا جواب دیا؟“

”میں نے کہا ہے، تھوڑی دیر میں بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں“ کیسے کہہ سکتا ہوں۔“

”شاہ باش میرے بچے!“ وہ بڑے فخر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولیں پھر پوچھا۔ ”وہ تمہیں ڈنر پر کہاں لے جانا چاہتی ہے؟“

”کیفے یو فور یا۔“ میں نے جواب دیا۔

”جاؤ، اس کی بھی سن لو۔“ ماں نے فراخ دلی سے مجھے اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تین باتوں کا خاص خیال رکھنا۔“

میں نے سوالیہ نظر سے ماں کی طرف دیکھا۔ ”کون سی تین باتیں؟“

”نمبر ایک!“ وہ انگلیوں پر گناتے ہوئے بولیں۔

”تم زیادہ دیر تک کیفے میں نہیں روکو گے۔ پینا سے جو بھی بات کرنا ہے وہ ڈنر کے دوران میں ہی کر لینا اور جیسے ہی کھانا ختم ہو، واپس لوٹ آنا۔ نمبر دو۔ تم اسے میری گاڑی میں لے کر جانا۔ اس مقصد کے لیے پینا کی گاڑی استعمال نہیں کرنا۔ نمبر تین۔ ڈنر کا بل تم اپنی جیب سے ادا کرنا۔“

”ٹھیک ہے ماں!“ میں نے سعادت مندی سے

کہا۔ ”میں آپ کی ان تینوں ہدایات کو اپنے ذہن میں تازہ رکھوں گا۔“

”جیتے رہو میرے لعل!“ فرط جذبات سے انہوں نے میرا ہاتھ چوم لیا۔

☆☆☆

رات کے نو بجے تھے۔ میں پینا کے ساتھ کیفے یو فور یا میں بیٹھا تھا۔ میں نے دانستہ نان اسموکنگ ایریا کا انتخاب کیا تھا۔ اس کیفے کے ماحول نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ وہاں کی فضا بڑی سکون بخش اور کیف آور تھی۔ دھیمے سڑوں والے میوزک اور دل فریب لائٹس نے کیفے کے اندرونی ماحول کو رومان پرور اور نشاط انگیز بنا دیا تھا۔ یہ کسی پسندیدہ شخصیت کی معیت میں گزارے گئے لمحات کو یادگار بنانے کے لیے ایک عمدہ اور محفوظ پوائنٹ تھا جہاں پر ہر ذوق کے افراد کی تفریح طبع کے لیے مواقع موجود تھے۔ اسموکرز کے لیے شیشیا کی سہولت بھی مہیا تھی جس کے مختلف فلیورز دل و دماغ میں نت نئی انگلیں، ترنگیں اور ولولے جگاتے تھے۔

میں پینا کو آج ماں کی ہدایت کے مطابق، انہی کی کار میں لے کر آیا تھا جو کیفے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ویلے کے سپرد کر دی تھی۔ ”ویلے“ کار پارکنگ کے سلسلے میں گاڑی کو ہینڈل کرنے والی ایک سروس ہے۔ آپ اپنی گاڑی کی چابی ویلے والوں کے حوالے کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ واپسی پر ویلے اسٹاف کا آدھی کار کو پارکنگ سے نکال کر آپ کے حوالے کر دیتا ہے۔

پینا اگر میک اپ نہیں بھی کرتی تو اس کا شمار خوب صورت عورتوں میں ہوتا تھا۔ اس وقت اس نے ہلکا پھلکا ٹچنگ والا میک اپ کر رکھا تھا۔ وہ سادہ مگر پُر وقار لباس میں ملبوس تھی اور بڑی زبردست لگ رہی تھی۔ ہمارے بیچ گفتگو کا آغاز ہوا تو اس نے شرارت بھرے انداز میں پوچھا۔

”علی! ایک بات سچ بتاؤ گے؟“

”ہاں، بتاؤں گا.....!“

”آج شام میں جب میں نے تمہیں فون کیا اور ڈنر ایک ساتھ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو تم نے کہا تھا کہ تھوڑی دیر میں کنفرم کرتا ہوں۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم نے میڈم سے اجازت لینے کے لیے وقت لیا تھا؟“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ میری میزبان ہیں۔ میں ان کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ اخلاقیات کا تقاضا یہی ہے کہ میں گھر سے نکلتے

بحث

ایک صاحب کی دو بیویاں تھیں، ایک دن وہ گھر میں داخل ہوئے تو دونوں بحث کر رہی تھیں۔

نوبت ہاتھ پائی تک آپہنچی تو میاں درمیان میں کود پڑے اور پوچھا۔ ”آخر تم لڑکیوں رہی ہو؟“

بڑی بیوی نے کہا۔ ”میں کہتی ہوں آج منگل ہے اور یہ احمق کہہ رہی ہے آج بدھ ہے۔“

میاں نے کہا۔ ”تو کیا میں پاگل ہوں جو جمعہ پڑھ کے آرہا ہوں؟“

سادگی

کھلاڑی ریس میں دوڑ رہے تھے۔ ریس دیکھتے ہوئے سردار صاحب نے پاس کھڑے ہوئے آدمی سے پوچھا۔ ”انعام کس کو ملے گا؟“

”سب سے آگے والے کو۔“ آدمی نے جواب دیا۔

”تو پھر پیچھے والے کیوں بھاگ رہے ہیں؟“ سردار نے حیرت سے پوچھا۔

پکنک

تین سردار پکنک منانے شہر سے کہیں دور گئے۔ وہ سموے، نمکو اور چھپس وغیرہ ساتھ لے گئے۔ وہاں جا کر انہیں یاد آیا کہ وہ پیپسی لانا تو بھول گئے ہیں۔ انہوں نے سب سے چھوٹے سردار سے کہا۔ ”تم شہر جا کر پیپسی اور برف لے آؤ۔“ اس نے کہا۔

”اس شرط پہ جاؤں گا کہ میری واپسی تک تم دونوں کوئی چیز نہیں کھاؤ گے۔“ انہوں نے کہا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔ ہم کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ وہ چلا گیا۔ دو تین چار، چھ گھنٹے گزر گئے یہاں تک کہ شام ہو گئی، پر وہ نہ آیا۔ تو انہوں نے کہا۔ ”لگتا ہے وہ نہیں آئے گا۔ اب یہ چیزیں کھائیں اور واپس چلیں۔“ انہوں نے چیزوں کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ درختوں کی اوٹ سے چھوٹا سردار نکل کر سامنے آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”اگر تم ایسا کرو گے تو میں تو نہیں جاؤں گا۔“

عقل

شوہر: ”بیگم یہ مسئلہ لڑائی سے نہیں اکٹھے بیٹھ کر عقل سے حل کرتے ہیں۔“

بیگم: ”ہاں.....! تاکہ تم جیت جاؤ۔“

تفسیر: بیگمیں بولیں

وقت انہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کروں۔“

”اوہ.....!“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میڈم کو بتا کر آئے ہو کہ میرے ساتھ ڈنر کرنے جا رہے ہو جبکہ میں نے گزشتہ رات تمہیں سختی سے منع کیا تھا کہ میڈم کو ہماری ملاقاتوں کی خبر نہیں ہونا چاہیے.....!“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔“ میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ”کیا غلط سمجھ رہی ہوں۔ تم مجھے سمجھاؤ، صحیح کیا ہے؟“

”پہلی بات تو یہ کہ میں نے میڈم کو صرف اتنا بتایا ہے کہ میں کیسے یو فوریا میں ڈنر کرنے جا رہا ہوں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ کس کے ساتھ ڈنر کا پروگرام ہے لہذا تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ دوسری بات یہ کہ.....“

”لحاحی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”جب ہمارے درمیان یہ طے ہو گیا تھا کہ ہمارے تعلقات کا تمہاری میڈم کو پتا نہیں چلے گا تو پھر تمہیں مجھ پر ٹرسٹ کرنا چاہیے۔ اگر تم ان معاملات کے بارے میں اپنی میڈم کو کچھ نہیں بتاؤ گی تو پھر میں بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

”تم پر ٹرسٹ ہے تو اس وقت تمہارے ساتھ بیٹھی ہوئی ہوں نا!“ وہ ایک اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”پتا نہیں کیوں، میں نے زندگی میں اتنا بھروسہ کسی پر نہیں کیا جتنا تم پر کر رہی ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ قدرت نے کسی خاص مقصد کے تحت تمہیں مجھ سے ملوایا ہے۔ تم میرے لیے نجات دہندہ کا کردار ادا کرنے والے ہو۔“

”جب تمہیں اپنے دل کی آواز پر اتنا پختہ یقین ہے تو پھر اس متوقع نجات دہندہ کو خشک کی نظر سے نہ دیکھو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرے بس میں جو بھی ہوا، تمہارے لیے ضرور کروں گا۔“

”آئی ایم رینلی ویری سوری، اگر میری کوئی بات تمہیں بری لگی ہو کیونکہ جو میرے دل میں تھا وہ میں نے تمہیں ایک دوست جانتے ہوئے کہہ دیا۔ اس سے ہرگز میری یہ مراد نہیں تھی کہ میں تمہاری نیت پر شک کر رہی ہوں۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ”اور تمہارا بہت شکریہ کہ ان حالات میں تم میرا ساتھ دے رہے ہو۔“

”نوا بیٹو..... اس اوکے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”لیکن اس ملاقات میں تم کھل کر مجھے بتاؤ گی کہ تمہارا پلان کیا ہے۔ تم مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتی ہو؟“

”پہلے آرڈر کرویں، پھر بات کرتے ہیں۔“

پینا نے کہا تو میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ مینیو کو کھولتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا کیا کھانے کا موڈ ہے۔ اس کیفے کے... کوزین میں تھائی، اٹالین، کانسٹیبل، باربی کیو..... سب شامل ہے۔“

”میرا موڈ تو یہ ہے کہ ڈنر کے معاملات کو ہم بانٹ لیتے ہیں۔“ میں نے اپنے والے مینیو پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”آدھا کام تمہارے ذمے اور آدھا کام میرے ذمے۔“

”میں سمجھی نہیں!“ وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

”میں سمجھاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کھانے کا آرڈر تمہاری مرضی اور پسند کا ہوگا اور بل میں ادا کروں گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ وہ دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”ڈنر کی آفر میں نے کی تھی۔ بل بھی مجھے ہی پے کرنا چاہیے۔“

”نہیں!“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”آج تم میرے ساتھ آئی ہو اس لیے میرے ڈسپوزل پر ہو۔ ڈشز کا انتخاب تم کرو گی۔ کھانے کا بل میں پے کروں گا۔ ہاں..... البتہ، ویٹر کو ”ٹی آئی پی“ تم دو گی۔ از اٹ کلیئر؟“

”تم بہت ضدی ہو علی.....!“ وہ اپنے زیریں شکر فی ہونٹ کو موتیوں جیسے دانتوں کی گرفت میں دیتے ہوئے بولی۔ ”چلو، میں تمہاری مان لیتی ہوں۔“

”کسی سے اپنی منوانے کے لیے اس کی ماننا پڑتی ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”لیکن یہ راز بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ زیادہ تر اسی وہم میں مبتلا ہیں کہ مان لینے میں مان چلا جائے گا۔“

”تم سے باتوں میں جیتنا مشکل ہے۔“ وہ خلکت خوردہ انداز میں بولی پھر مینیو کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”تھائی لیتے ہو؟“

”یس..... تھائی ڈشز مجھے پسند ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہ میں نے اس لیے پوچھا کہ۔“ تھائی فوڈ“ اس کیفے کی اسپیشلیٹی ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”ایک تھائی ڈش منگواتے ہیں، باقی کس آئٹمز کا آرڈر کرتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

وقت

مجبور کر دیا۔

کھانے کے دوران میں ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ میں نے کہا۔ ”پینا! تم نے گناہ آلود زندگی کو ہمیشہ کے لیے ترک کرنے کا فیصلہ تو کر لیا ہے لیکن آگے کیا کرنا چاہتی ہو، مجھے اس کے بارے میں کچھ بتاؤ.....!“

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور سر جھکا کر کھانے میں مصروف رہی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ بولنے سے پہلے ذہن میں موجود مختلف خیالات کو ایک نقطے پر مرکوز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”اگر تم نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

اس نے ایک جھٹکے سے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بے یقینی سے لبریز لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ”کیسی مدد؟“

”یہاں کراچی میں کچھ ایسے لوگوں سے میری جان پہچان ہے جو اس معاشرے میں بہت اثر رسوخ رکھتے ہیں۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”ان کا سوشل سرکل بڑا وسیع ہے۔ میں ان کے تعاون سے کسی بھی معقول انسان سے تمہاری شادی کروا سکتا ہوں۔“

وہ یک ٹک مجھے دیکھتی چلی گئی۔ اس کی نگاہ میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔ میں ایسا کوئی دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میں اس کی نیت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ہاں، البتہ..... اس کی آنکھیں بے زبان خاموشی یہ ضرور کہہ رہی تھیں۔

”علی! کیا تم خود کو معقول انسان نہیں سمجھتے ہو؟“

پینا کی متوقع سوچ کا تصور کر کے میں ایک لمحے کے لیے چکرا کر رہ گیا۔ قبل اس کے کہ میں کچھ بولتا، وہ بڑی رسان سے کہنے لگی۔

”علی! سردست میرے ذہن میں شادی کا کوئی دھندلا سا تصور بھی نہیں ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ یہ خانہ سرے سے بند ہی ہو چکا ہے لہذا تمہیں میری شادی کے حوالے سے تو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے تمہاری شادی کے معاملے پر چوڑی ماردی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آگے بولو..... تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میں یہاں سے کہیں دور چلی جانا چاہتی ہوں۔“ وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ ”اتنی دور جہاں میری جان پہچان کا کوئی شخص موجود نہ ہو۔“

”میں نے آج کے ڈنر کے حوالے سے اپنے خیال کی اتھارٹی تمہیں سونپ رکھی ہے۔“ میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ”تم جو بھی کھلاؤ گی، میں سر جھکا کر صبر شکر سے کھاؤں گا۔“

”ڈنر اسے بازی کوئی تم سے سیکھے۔“ وہ ایک ادا سے بولی۔ ”علی! تم صورت سے جتنے سیدھے نظر آتے ہو، ایسے ہو نہیں۔ میں انسان کو ایک نگاہ میں پہچان لیتی ہوں۔“

”ظاہر ہے.....“ میں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”تم پینا ہو..... ناپینا نہیں!“

وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر ویٹر کی آمد پر اس نے کھانے کا آرڈر کر دیا اور مجھے کھانوں کے متعلق بتانے لگی۔

جب پینا آرڈر کر مجھے بتا رہی تھی تو چند لحظات کے لیے میرا دھیان ڈیلفینا کی طرف چلا گیا۔ ڈیس میں پریسٹن ہالو والے بیٹگلے پر قیام کے دوران میں ایک رات میں ڈیلفینا کے ساتھ ڈنر کرنے ”پی۔ ایف۔ جینگز“ نامی ریسٹورنٹ میں گیا تھا اور ڈیلفینا نے مجھے دہاں کی اسپیشلیٹی کے بارے میں ایسے ہی آگاہ کیا تھا جیسے آج پینا مجھے بتا رہی تھی۔

”کہاں کھو گئے؟“ پینا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”کیا ڈیلفینا کی یاد آ رہی ہے؟“

”ہاں..... تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت میں ڈیلفینا کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا۔“

”نام سے یہ کوئی عرب تو نہیں لگتی۔“ وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔ ”کیا یہ بھی جدہ ہی میں ہوتی ہے؟“

”ہاں۔ ڈیلفینا بھی وہیں ہوتی ہے جہاں سے میں آیا ہوں۔“ میں نے مصلحت آمیز انداز میں جواب دیا۔

”اور تمہارا یہ اندازہ بھی صد فی صد درست ہے کہ وہ عرب النسل نہیں۔ ڈیلفینا ہسپانوی ہے۔“ پھر میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ”کیا تمہیں فٹس بہت پسند ہے؟“

وہ سمجھ گئی کہ میں دانستہ ڈیلفینا کے موضوع سے کئی کاٹ رہا ہوں۔ میں نے کئی معاملات میں دیکھا تھا کہ وہ بہت جلد سچویشن کو بھانپ لیتی تھی۔

”بہت زیادہ.....!“ وہ صورت حال کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ”آئی فوٹس..... اسی لیے تو آج کے مینیو میں فٹس فارم کی جھلک نظر آ رہی ہے۔“

اس کے ریمارکس نے بے ساختہ مجھے مسکرانے پر

”مطلب یہ کہ کراچی سے باہر کسی دوسرے شہر میں جیسے لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد..... وغیرہ؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”نہیں۔ اس سے بھی زیادہ دور۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

”یعنی پاکستان سے باہر کسی اور ملک میں؟“

”ہاں..... میری یہی خواہش ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس مقصد کے لیے تو دینی سب سے بیٹ ہے۔“

”بیٹ ہوگا مگر میں وہاں مستقل رہائش اختیار کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“ وہ مجروح لہجے میں بولی۔ ”میڈم اسکن بزنس کے سلسلے میں زیادہ تر ہمیں دینی اور دیگر خلیجی ممالک کی طرف ہی بھیجتی ہیں۔ وہاں کافی لوگ میرے صورت آشنا ہیں۔ کسی کا مجھ پر دھیان پڑے یا نہ پڑے لیکن ہر لمحے مجھے یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ احساس بھی جاگے گا کہ وہ مجھے بری نظر، غیظ نیت اور مکروہ عزم کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ میں نے جس نیک مقصد کی خاطر اس ذلت بھری زندگی کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے، دینی شفٹ ہونے سے وہ مقصد فوت ہو جائے گا۔ میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیلنے جا رہی ہوں اور اس بازی میں ناکامی... کا مطلب ہے..... موت! ایک نقصان زدہ رسوائی بھری موت..... میں ایسا نہیں کر سکتی علی۔“

”پھر تم کیا چاہتی ہو؟“ میں نے الجھن بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی۔ ”میں مستقل طور پر جدہ شفٹ ہونا چاہتی ہوں اور اس سلسلے میں تم میری مدد کرو گے کیونکہ یہ خیال تمہیں دیکھنے اور تمہارے بارے میں جاننے کے بعد ہی میرے ذہن میں آیا ہے اور..... اب تو ہم دوست بھی بن چکے ہیں۔“

”اوکے.....“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے مان لیا کہ تم جدہ جانا چاہتی ہو۔ کیا وہاں تمہارا... جاننے والا کوئی نہیں ہوگا؟“

”میں سمجھتی ہوں، بالکل نہیں۔“ وہ قطعی انداز اختیار کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے قوی امید ہے کہ وہ دھرتی میرے لیے اور میں اس دھرتی کے لیے یلغار اجینی ہوں گے۔ اس لیے مجھے وہاں نئی زندگی شروع کرنے اور ایڈجسٹ ہونے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے

گا.....“ لمحاتی توقف کرنے کے بعد وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولی۔

”جدہ سے اللہ کا گھر تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔ خانہ خدا تک میری رسائی بھی آسان ہو جائے گی۔ کیا تم مجھے کسی طرح جدہ بلوا سکتے ہو؟“

اس سوال کے جواب میں، میں نے کہا۔ ”جدہ جانا تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ اگر تم کسی بھی ٹریول ایجنٹ کے ذریعے عمرہ کے ویزے کے لیے کوشش کرو تو تمہیں بہ آسانی ویزا مل جائے گا۔ اس ویزا کے اپروول میں کم و بیش پانچ ورکنگ ڈیز لگتے ہیں اور تین چار دن مزید پروکس میں یعنی زیادہ سے زیادہ دس دن میں تمہیں ویزا مل جائے گا۔ پھر تم جدہ جاؤ، مکہ جاؤ یا مدینہ جاؤ، تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔“

”یہ سب میں بھی جانتی ہوں لیکن شاید تم نے میرے الفاظ پر غور نہیں کیا۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے لفظ ”شفٹ“ استعمال کیا تھا یعنی میں مستقل طور پر وہاں رہائش اختیار کرنا چاہتی ہوں اور اس سلسلے میں تم میری مدد کرو گے دوست۔“

”ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے اپنے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی دے دینا یا یہ دونوں چیزیں اسکیں کر کے مجھے ای میل کر دینا۔ میں تمہارے لیے بھرپور کوشش کروں گا لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم جدہ جا کر کروگی کیا؟“

”ارے یار کچھ بھی کر لوں گی۔“ وہ دوبارہ انرجی پکڑتے ہوئے بولی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ خاصی ڈاؤن ہو رہی تھی۔ ”اور کچھ ہونہ ہو، تمہارے ریسٹورنٹ میں ویٹرس کی جاب ہی کر لوں گی۔ تم اتنا فیور تو دے ہی دو گے.....!“

”ہاں..... کیوں نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”میرے ذہن میں ایک پلان ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بتانے لگی۔ ”یہاں پر میں نے کچھ رقم پس انداز کر کے ایک اپارٹمنٹ خرید لیا تھا جو اس وقت میں نے کرائے پر اٹھا رکھا ہے۔ وہاں میری ایک دوست رہتی ہے جو آج کل اسلام آباد کئی ہوئی ہے۔ مذکورہ اپارٹمنٹ سمندر کے کنارے پوش ایریا میں واقع ہے۔ وہ کم از کم دو کروڑ میں فروخت ہو جائے گا۔ اس رقم سے جدہ میں سیٹل ہونے میں مجھے آسانی حاصل ہو جائے گی۔“

”ویری گڈ!“ میں نے اطمینان بھرے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں

وقت

ڈال کر اضافہ کیا۔ ”وہی میرا علم یہ کہتا ہے کہ آنے والے چند دنوں میں تمہیں کوئی ٹھنڈی رقم ملنے والی ہے۔“

”تمہارا علم؟“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ ”کون سا علم علی؟“

”میں تھوڑی بہت پامسٹری جانتا ہوں۔“ میں نے اس سے تفریح لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے ہاتھوں کی لکیروں پر میری نظر پڑی تھی۔ یہ بات میں نے انہی لکیروں کو دیکھ کر کہی ہے۔“

”زبردست..... تو تم دست شناس بھی ہو؟“ وہ جوش بھرے لہجے میں بولی۔

”میں کوئی پیشہ ور فوجی نہیں ہوں۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”بس، یہ میرا شوق ہے۔ ہاتھوں کی لکیروں کو پڑھنے کا تھوڑا بہت فن مجھے آتا ہے۔“

وہ دونوں ہاتھ میرے سامنے پھیلاتے ہوئے بولی۔

”میرے فیوچر کے بارے میں اور کچھ بتاؤ.....!“

”میں نے کہا، میں اس علم کا ماہر نہیں ہوں۔“ میں نے ٹالنے کی کوشش کرنے کے دوران میں ہی اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر مختلف لکیروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”باقی میرے پاس جتنا بھی علم ہے اس کے مطابق، تمہارا فیوچر بہت برائنٹ ہے اور ابھی چند دنوں میں تمہیں کہیں سے ایک بینڈسم اماؤنٹ بھی ملنے والا ہے۔“

”کہیں یہ وہی رقم تو نہیں جو اپارٹمنٹ کو فروخت کرنے کے بعد مجھے حاصل ہوگی؟“ اس نے ایک اہم سوال کیا۔

”نہیں!“ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے جس رقم کا ذکر کیا ہے وہ غیر متوقع ہوگی جبکہ فلیٹ کی فروخت تو تمہارا اپنا سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔“

”جی بات تو یہ ہے کہ مجھے کوئی پامسٹری و امسٹری نہیں آتی تھی۔ پینا سے غیر متوقع رقم حاصل ہونے کی بات میں نے اس بنا پر کی تھی کہ ماں نے دن میں مجھے بتایا تھا کہ وہ پاکستان چھوڑنے سے پہلے ان پانچوں لڑکیوں کے اکاؤنٹس میں اچھی خاصی رقم ٹرانسفر کریں گی تاکہ ان کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ اسی سلسلے میں ماں نے نادر شاہ سے ایک کروڑ روپے بھی مانگے تھے۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، وہ ہر لڑکی کے اکاؤنٹ میں بیس لاکھ ڈالنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ ویسے ایک بات میرے تجربے میں آئی ہے کہ پامسٹری کا علم اس لحاظ سے خاصا مفید ہے کہ اس کے بہانے حسیناؤں کے ہاتھ پکڑنے میں بڑی آسانی حاصل ہو جاتی ہے۔“

”چلیں دیکھتے ہیں کہ مستقبل میں کیا پیش آتا ہے۔“ پینا نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے تم تو میری مدد کرنے کے لیے تیار ہونا؟“

”بالکل!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اس سلسلے میں تمہیں مطمئن رہنا چاہیے۔ میں نے جو کہا ہے وہ کروں گا بھی۔“

اور وہ واقعی مطمئن ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم کیفے سے نکل آئے۔ زمزمہ بلوارڈ پر آنے کے بعد میں نے کہا۔ ”کل رات تم نے مجھے ڈراپ کیا تھا، آج میں تمہیں ڈراپ کروں گا۔ تمہیں جہاں آسانی ہو، بتا دیتا۔“

”اگر تمہارے پاس پندرہ بیس منٹ ہوں تو میں ایک ضروری کام لوں.....؟“ وہ معتدل انداز میں بولی۔ ”پھر واپس چلیں گے۔“

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم کام بتاؤ؟“

”کام تمہیں نہیں، مجھے کرنا ہے۔“ وہ بڑی ادا سے ہنس کر بولی۔ ”تم بس میری ہدایت پر گاڑی ڈرائیو کرتے جاؤ۔“

”اوکے میڈم۔“ میں نے کسی پیشہ ور ڈرائیور کے انداز میں کہا۔

پینا کی گائیڈینس میں، میں ماں کی گاڑی کو مختلف سڑکوں پر دوڑانے لگا۔ ساتھ ہی وہ مجھے راستے میں آنے والی جگہوں کے بارے میں بھی بتاتی جا رہی تھی۔ چند منٹ کے بعد ہم چائنا ٹاؤن کے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہ علاقہ ساحل سمندر کے کنارے پر واقع تھا۔ پینا نے مجھے ایک گٹھری بلڈنگ کے سامنے گاڑی روکنے کو کہا۔

وہ ایک کثیر المنزلہ اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی۔ میں نے گاڑی مذکورہ بلڈنگ کی باؤنڈری وال کے ساتھ لگادی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور کوئی حکم.....؟“

”مجھے آٹھویں فلور کے ایک اپارٹمنٹ میں جانا ہے۔“ پینا نے کہا۔ ”مشکل سے دس منٹ کا کام ہے۔“

”تو کیا میں گاڑی میں بیٹھ کر تمہاری واپسی کا انتظار کروں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ تم بھی میرے ساتھ اوپر جاؤ گے۔“ اس نے کہا۔

ہم دونوں گاڑی سے باہر نکل آئے۔ بلڈنگ کے سکیورٹی گارڈ نے مجھے اور پینا کو سلام کیا۔ پینا کے لیے گارڈ کی آنکھوں میں شناسائی کے تاثرات کو میں نے نوٹ کر لیا۔ اس کا مطلب تھا، وہ اس بلڈنگ میں آتی جاتی رہتی

نظریہ اضافیت جسے آئن اسٹائن نے آج سے تقریباً 90 سال پیش پیش کیا اس کی رو سے کشش ثقل بھی وقت میں خم پیدا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ یعنی کشش ثقل کی زیادتی وقت کی رفتار کو کم کر دیتی ہے۔ کشش ثقل جس مقام پر زیادہ ہوگی وہاں وقت اتنا ہی سست رفتار ہوگا زمین سے زیادہ بلندی پر گھڑیاں زمینی گھڑیوں کے مقابلے میں سست چلیں گی۔ بعض سیاروں پر کشش ثقل زمین کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے وہاں وقت سست رفتار ہوتا ہے۔ کچھ ایسے ستارے بھی کائنات میں موجود ہیں جہاں کشش ثقل بے حد حساب ہے اور کمیت بھی انتہا کو ہے ان ستاروں پر روشنی کی شعاعوں کا خم بھی اتنا ہے کہ روشنی ان سے گزرنے کے بجائے ان میں دفن ہو جاتی ہے اور وقت بھی۔ چونکہ ان ستاروں سے ٹکرا کر روشنی واپس ہی نہیں آتی بلکہ ایک طرح سے ان میں دفن ہو جاتی ہے۔ لہذا یہ ستارے سیاہ حلقوں کی طرح نظر آتے ہیں جنہیں Black Hole کہا جاتا ہے۔ ان Black Holes میں وقت خانے کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ وقت کا ختم Time Warp میں مقید ہو جاتا ہے۔

Black Hole ابدیت کے نزدیک ترین راستے کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں اس مادی کائنات کے تمام اصول ختم ہو جاتے ہیں۔ گویا یہاں مادہ عدم کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ سعید الطفر صدیقی کی کتاب ماورائے گل سے اقتباس اعروج کا تعاون..... کراچی سے

وہ رات کا وقت تھا۔ تاریکی کے لبادے میں لپٹا ہوا سمندر بڑا ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ اس کے بے کراں سینے میں پتا نہیں کتنے راز پنہاں تھے۔ بعض لوگ سمندر سے بھی زیادہ گہرے اور راز داں ہوتے ہیں۔

پینا اپنے کام سے فارغ ہوئی تو ہم گیلری سے ہٹ گئے۔ بیڈروم سے گزرتے ہوئے اس نے سرسری لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

”علی! ڈرنک لو گے؟“

”سافٹ یا ہارڈ؟“ میں نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

”ارے یار! سافٹ ڈرنک تو بچے پیتے ہیں۔“ وہ بے

تکلفی سے بولی۔ ”میں ہارڈ ڈرنک کی بات کر رہی ہوں۔“

”تو پھر تم بھی ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ میں کبھی تمہارے بھروسے کو ٹھیک نہیں پہنچاؤں گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری زندگی کا ہر راز ایک امانت کے طور پر میرے ذہن میں محفوظ رہے گا۔“

”تھینک یو علی۔“ وہ تشکر آمیز لہجے میں بولی۔ ”میں تمہاری نیت پر شک نہیں کر رہی۔ بس، میں اپنے حالات کے پیش نظر شاید بہت زیادہ حساس ہو گئی ہوں۔“

”شاید نہیں یقیناً۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”لیکن تم فکر نہیں کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”بس..... یہ سب تمہی نے ٹھیک کرنا ہے۔“

”کروں گا..... بابا کروں گا۔“ میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

پینا جن حالات سے گزر رہی تھی ان میں انسان کے ذہن کی ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے۔ اس پر مستزاد جو اس نے ہنگامی فیصلہ کیا تھا اس نے اسے بے حد محتاط اور ہنگامی بنادیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں پینا کے ساتھ صد فی صد مخلص تھا اور اپنی بساط بھراس کی مدد بھی کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے کیے گئے عہد کے برعکس میں ماں کے علم میں یہ بات لے آیا تھا کہ پینا نے اپنی زندگی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ ماں نے مجھے اس سے ملنے اور اس کی مدد کرنے کی اجازت دے دی تھی لیکن میں یہ ساری باتیں پینا کے علم میں نہیں لاسکتا تھا کیونکہ وہ اس راز سے واقف نہیں تھی کہ ماں یعنی اس کی میڈم تو خود اپنے اندر ایک انقلاب لا چکی ہے اور جلد از جلد اس ماحول سے نکل کر میرے ساتھ امریکا جانے کے لیے پر تول رہی ہے۔

ماں نادر شاہ پر بے پناہ اعتماد کرتی تھی۔ وہ برسوں کا ان کا دیکھا بھالا تھا لیکن انہوں نے احتیاطاً شاہ جی کو اپنے امریکا والے پروگرام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ماں نے نادر شاہ کو دینی میں سیٹل ہونے کی کہانی سنائی تھی اور پینا سے تو میری نئی نئی ملاقات تھی۔ میں اپنے سارے پتے کس طرح اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتا۔ ویسے میرے ذہن میں یہ تھا کہ جب میں ماں کو لے کر بہ خیر و عافیت امریکا پہنچ جاؤں گا تو اس کے بعد پینا کو سب کچھ بتا دوں گا۔

جس دوران میں پینا گیلری میں رکھے پودوں کو پانی دیتی رہی، میں اپارٹمنٹ کے بیرونی نظارے میں کھویا رہا۔ یہ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے آٹھویں فلور پر واقع تھا اور اس میں دو ٹیکسٹائل تھیں۔ میں اس وقت جس گیلری میں کھڑا تھا وہاں سے ٹھانیں مارتا ہوا سمندر دور تک بڑا واضح دکھائی دیتا تھا۔

اس نے مجھے بتایا۔ ”میری دوست نادیا نے اس اپارٹمنٹ میں ایک بہت بڑا فٹ ایکوریم بنا رکھا ہے جس میں مختلف رنگوں اور نسلوں کی مچھلیاں ہیں۔ نادیا کی غیر موجودگی میں ان مچھلیوں کی خوراک وغیرہ کا خیال مجھے ہی رکھنا پڑتا ہے۔“

”گڈ! یہ تو بہت نیک کام ہے۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”مالک تمہیں اس کا اجر دے گا۔“

”اس کے علاوہ نادیا کو پودوں سے بھی بہت لگاؤ ہے۔“ پینا نے بتایا۔ ”اس نے اپارٹمنٹ کی گیلریز میں پودوں کے گیلے رکھ چھوڑے ہیں۔ اس کے غیاب میں ان گملوں کی آب یاری کا کام بھی میرے ہی ذمے ہے۔“

”زبردست!“ میں نے توصیفی لہجے میں کہا۔

اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی پینا نے سننگ روم کی لائٹ آن کر دی تھی پھر ہم کچن کی طرف چلے آئے تھے۔ یہاں سے اس نے مچھلیوں کی خوراک کی پھروفٹش ایکوریم کی جانب بڑھ گئی اور ساتھ ہی اس نے اپارٹمنٹ کی دیگر لائٹس بھی آن کر دیں۔ پورا گھر روشن ہو گیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ موڈ کر رہا تھا۔

وہ ایک چھوٹا مگر شاندار اپارٹمنٹ تھا۔ دو بیڈروم اور ایک کشادہ سننگ روم والے اس اپارٹمنٹ کی ہر چیز سے سلیقے اور نفاست کا اظہار ہوتا تھا جو پینا کی دوست نادیا کے اعلیٰ ذوق کا آئینہ دار تھا۔

وہ مچھلیوں کو خوراک دینے کے بعد بولی۔ ”یہ بات میڈم کے علم میں نہیں کہ میں اس اپارٹمنٹ کی مالک ہوں۔ امید ہے، تم یہ راز ان سے شیئر نہیں کرو گے!“

”اس کا مطلب ہے، تم نے ابھی تک دل سے مجھے اپنا دوست تسلیم نہیں کیا!“ میں نے شاکی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایسی بات نہیں ہے علی۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میں نے تمہیں دل، جگر اور دماغ سے اپنا دوست مانا ہے تو تم پر بھروسہ کر رہی ہوں نا.....!“

”انسان کو یا تو کسی پر مکمل بھروسہ کرنا چاہیے یا پھر بالکل نہیں کرنا چاہیے۔“ میں نے اس کے ساتھ گیلری کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”ادھورا بھروسہ ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اور..... یہ بات سمجھ لو کہ میں نے تم پر اندھا یعنی مکمل بھروسہ ہی کیا ہے۔“

تھی۔ ہم لفٹ کے ذریعے آٹھویں فلور پر پہنچ گئے پھر ایک مختصر سی راہ داری کو عبور کرنے کے بعد وہ ایک اپارٹمنٹ کے دروازے کے سامنے پہنچنے کے بعد بولی۔

”میں نے کیفے میں بیٹھے ہوئے اپنے جس اپارٹمنٹ کا ذکر تم سے کیا تھا وہ یہی ہے۔“

”اوہ.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بتایا تھا کہ یہ اپارٹمنٹ تم نے اپنی ایک دوست کو ریٹنٹ آؤٹ کیا ہوا ہے جو آج کل اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔“

”ہاں۔ میں نے یہی کہا تھا۔“ وہ اپنا پرس کھولتے ہوئے بولی۔

”جب تمہاری دوست یہاں موجود ہی نہیں تو پھر تم اس اپارٹمنٹ پر کیا کرنے آئی ہو؟“ میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

”جو بھی کروں گی، تمہارے سامنے ہی کروں گی۔“ وہ اپنے پرس میں سے کی رنگ برآمد کرتے ہوئے بولی۔

”اس اپارٹمنٹ کی ایک چابی میرے پاس ہوتی ہے۔“ وہ..... کی چین کو میری نگاہ کے سامنے جھلانے کے بعد اپارٹمنٹ کے دروازے کی جانب بڑھی اور کہا۔ ”میں اپنی دوست کی غیر موجودگی میں بھی کسی ضروری کام سے یہاں آ سکتی ہوں۔“

پینا کی باتوں میں حد درجہ معنی خیزی جھلکتی تھی۔ میں نے محتاط لہجے میں دریافت کیا۔ ”بائی داوے..... اس وقت تم کون سا ضروری کام کرنے یہاں تشریف لائی ہو؟“

”ادھر کیفے میں، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ آئی لو فٹ!“ وہ دروازے کے کی ہول میں چابی گھماتے ہوئے بولی۔ ”بتایا تھا یا نہیں؟“

”ہاں..... مجھے یاد ہے۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ”تم نے یہ بات کی تھی۔“

وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ ”بس، مچھلیوں کی محبت مجھے کھینچ کر یہاں لے آئی ہے۔ اندر آ جاؤ۔“ اس نے مجھے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے لیے اشارہ کیا اور کہا۔

”مچھلیوں کے علاوہ مجھے پودوں سے بھی بہت پیار ہے۔“ اس کی معنی خیز باتوں کو میں کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا تاہم میں اس کے اشارے کو فالو کرتے ہوئے اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہو گیا۔

پینا نے داخلی دروازے کو بند کیا اور میرا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”آؤ، میں تمہیں کچھ دکھاتی ہوں۔“

میں نے چپ چاپ اس کی تقلید کی اور ہم کچن میں پہنچ گئے۔

”سوری پینا! میں ڈرنک نہیں کرتا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر مجھے ایسا کوئی شوق ہوتا تو اس کام کے لیے کیفے یونیورسٹی میں اچھا خاصا ماحول بنا ہوا تھا۔“

”میں کبھی کبھار ایک آدھ ڈرنک لے لیتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”اس سے دماغ کے خوابیدہ سیل بیدار ہو جاتے ہیں اور انسان کی ذہنی اور جسمانی کارکردگی میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔“

”سب کہنے کی باتیں ہیں پینا۔“ میں نے اس کے پہلو میں چلتے ہوئے کہا۔ ”ڈرنک کرنے والے شخص کی مجموعی صحت جب تک ساتھ دیتی ہے وہ شراب نوشی کی ایک ہزار ایک خوبیاں بیان کرتے تھکتا نہیں ہے لیکن جب سالہا سال تک اس عادت میں مبتلا رہنے کے بعد وہ اپنے جگر، دل اور گردوں کا سوا ستیاناس..... مار دیتا ہے تو پھر پتا چلتا ہے کہ یہ کم بخت بہت بری بلا ہے۔ جس کو چمٹ جائے اس کی جان لے کر ہی چھوڑتی ہے۔“

”تمہاری عمر تو اتنی نہیں ہے جس حساب سے تم اپنے تجربات بیان کر رہے ہو۔“

اس نے بڑی جاذب نظر سے مجھے دیکھا اور یکا یک مجھ پر ڈھسے گئی۔ میں پینا سے ایسی کسی حرکت کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کے اچانک عمل نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میں اپنا توازن کھو بیٹھا اور اس کے بدن کو اپنے جسم پر سہارتے ہوئے بستر پر جا گر۔ وہ میرے اوپر لد گئی۔

”تم تو بن پیے ہی لڑکھڑاہی ہو۔“ میں نے خود کو اس کے نیچے سے نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”جب پتی ہوگی تو پھر تمہارا کیا حال ہوتا ہوگا؟“

”پھر یہ حال ہوتا ہے.....!“ اس نے مختصر سا جملہ ادا کیا پھر اس جملے کی تشریح کے طور پر اپنے شکرنی لب میرے ہونٹوں میں پھوست کر دیے۔

میں نے اپنے بازو اس کی کمر کے گرد حائل کر دیے اور شہد کی مکھی کا کردار ادا کرنے لگا۔ چند لمحات گھنگھٹے پنکھڑیوں کا رس چوسنے میں گزر گئے پھر میں نے اسے اپنی بانہوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔

وہ چڑھی ہوئی بے ترتیب سانسوں کے بیچ بولی۔ ”مجھ میں کیا کمی ہے؟“

”کوئی نہیں.....!“ میں نے راست گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم زبردست ہو..... ایک دلکش ناشپاتی۔“

”کیا ڈیلیفینا مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟“ اس

نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

ان نازک لمحات میں مصلحت کا کبھل اوڑھنا لازمی ٹھہرا تھا۔ اس کے سوال سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ڈیلیفینا سے غائبانہ طور پر حسد کرنے لگی تھی۔ اس میں پینا کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ عورت کی مخصوص نفسیات کے سامنے مجبور تھی۔

”نہیں.....!“ میں نے اس کی جلن پر الفاظ کا مرہم رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم اس سے زیادہ دلکش اور دلنشیں ہو۔“

وہ چند لمحات تک اپنی سانسوں کو میری سانسوں میں گھولتی رہی پھر میرے چہرے کو اپنے سینے میں چھپاتے ہوئے بولی۔ ”جب میرے پاس ہوتے ہو تو ڈیلیفینا کے بارے میں سوچا بھی نہ کرو۔ تمہاری توجہ صرف اور صرف مجھ پر مرکوز رہنا چاہیے۔ ڈیلیفینا کیا، کسی کو بھی تمہارے خیالوں میں نہیں آنا چاہیے۔ سمجھ گئے نا؟“

”اچھی طرح سمجھ گیا۔“ میں نے فرماں برداری سے کہا۔

”میں نے کئی دنوں سے نہیں پی۔“ وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔ ”لیکن جب سے تمہیں دیکھا ہے تو ذہن و دل پر

ایک عجیب سانشہ طاری ہے۔ اب جام سے پینے کی خواہش نہیں رہی۔ تم ہی میرا ساغر ہو اور تم ہی میرا ساگر ہو۔ مجھے

اپنے اندر سمیٹ لو اور پھر میرے اندر نمٹ جاؤ اپنی ذات سے مجھے اتنی پلاؤ کہ میں خود کو بھی بھول جاؤں.....“

بولتے بولتے وہ خاموش ہو گئی۔ زبان پر تالا پڑا تو بدن کے سارے نقل کھل گئے۔ خود سیر دی کی حالت میں وہ مجھے دریافت کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اس تلاش میں بڑے خلوص سے میں نے اس کا خیر مقدم کیا۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی سہانی اور مست تھی۔ گزشتہ رات میں نے بڑی گہری اور پرسکون نیند لی تھی اس لیے اس صبح ذہن ہشاش بشاش اور جسم چاق و چوبند تھا۔ چائنا ٹاؤن والے اپارٹمنٹ پر پینا نے مجھے جن پُرمسرت اور ہیجان خیز منزلوں سے گزارا تھا وہ تجربہ میرے لیے نیا نہیں تھا لیکن ہر علاقے اور خطے کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے، ایک منفرد آب و ہوا، ماحول اور فضا ہوتی ہے، ایک خاص درجہ حرارت ہوتا ہے ورنہ اگر دنیا کا ہر مقام ایک جیسا ہوتا تو ٹورازم ڈیپارٹمنٹ کا بھٹا بیٹھ جاتا.....!

آئندہ چند روز میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا تاہم بہت سے اہم کام نمٹ گئے تھے۔ نادر شاہ نے مختلف اداروں کو نوٹوں کی سلامی دے کر بڑی پھرتی سے اپنے ذمے لیے ہوئے تمام کاموں کو مکمل کر دیا تھا۔ ”حیدر علی

جنوری 2018ء

وقت

ٹرسٹ“ کے ڈائریکٹس تیار ہو گئے تھے۔ ٹرسٹ کے آفس کے لیے جگہ دیکھ لی گئی تھی بلکہ اس آفس کو خرید بھی لیا گیا تھا۔ ٹرسٹ کا بینک اکاؤنٹ بھی کھل چکا تھا۔ بیٹکے کی فروخت کے سلسلے میں جو دس کروڑ ملے تھے ان میں سے ایک کروڑ اپنے پاس رکھ کر باقی نو کروڑ ماں نے ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں ڈال دیے تھے۔ جو ایک کروڑ ماں نے اپنے پاس رکھا تھا اس میں سے بیس بیس لاکھ ان پانچوں لڑکیوں کے اکاؤنٹس میں ٹرانسفر کر دیے گئے تھے۔ گویا میں نے پینا کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر اس کے بارے میں جو ”پیش گوئی“ کی تھی وہ پوری ہو گئی تھی۔

اس دوران میں آن اینڈ آف عظیم سے بھی ملاقات اور بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ جب بھی ملتا، کسی نہ کسی حیلے بہانے سے پینا کے بارے میں ضرور پوچھتا تھا۔ ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی تھی کہ پینا، عظیم کے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔ اس میں عظیم کا کوئی قصور نہیں تھا۔ پینا مقناطیسی بدن کی مالک ایک ہوش ربا دوشیزہ تھی۔ اس کا چپکنا اور ہوش و حواس کو معطل کرنا مجھ سے زیادہ اور کون جانتا تھا!

پینا نے مجھے اپنے شاختی کارڈ اور مکمل پاسپورٹ کی کٹرفوٹو کاپی نکلا کر دی تھی تاکہ میں اسے مستقل طور پر جگہ میں سیٹل کرنے کے لیے پروس شروع کر دوں۔ وہ اب بھی مجھ سے ایک آدھ دن چھوڑ کر مل رہی تھی اور ہم تنہائی میں گزرنے والے لمحات کو یادگار بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتے تھے۔ مگر میرے پاؤں میں ایک جکڑ تھا اس لیے میں اسے اپنے پیروں کی زنجیر نہیں بنا سکتا تھا۔ جب تک میں کراچی میں تھا اسے گلے کا ہار بنانے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا البتہ، یہ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اسے ایک پرسکون اور خوشگوار زندگی دینے کے لیے بھرپور کوشش کروں گا۔ جدہ نہ سبھی، اسے دنیا کے کسی بھی ملک میں سیٹل ضرور کروں گا۔

ماں کو میں نے پینا کے عزائم کے بارے میں کھل کر بتا دیا تھا تاہم بہت سی رنگین اور سنگین ایسی باتیں بھی تھیں جنہیں میں نے دانستہ گول کر دیا تھا۔ ماں کو میں نے انٹرویو کی تیاری بھی بڑے بھرپور انداز میں کرا دی تھی۔

ماں کو آٹھ جولائی کی صبح امریکن کونسلٹ جانا تھا۔ سات جولائی کی رات عظیم کی کال آ گئی۔ رسی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

”برو! تمہیں آئی بی بہت یاد کر رہا تھا۔“

”آئی بی“ مطلب الہامی بابا۔ عظیم نے یہ ٹائٹل

مقبول بھی کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”بھئی صاحب مجھے کیوں یاد کر رہے تھے؟“

”آج وہ پاپا سے ملنے آیا ہوا تھا۔“ عظیم نے بتایا۔ ”بڑا دلچسپ بندہ ہے یار۔ گھر سے روانہ ہونے سے پہلے کہہ دیتا ہے کہ میں آ رہا ہوں۔ میرے لیے دال چاول اور آلو کے چپس تیار کروالیں۔“

”اور ظاہر ہے، تمہارے پاپا ان کی یہ فرمائش لازمی پوری کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”پاپا آئی بی کا بڑا احترام کرتے ہیں۔“ عظیم نے بتایا۔ ”ہر طرح سے اس کا خیال رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج آئی بی نے ایک عجیب بات کی ہے۔“

”کیا؟“ میں نے پوچھ لیا۔

”مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں کینیڈا چلا جاؤں۔“ اس نے بتایا۔ ”وہاں میرے لیے کوئی گوری چٹی لڑکی انتظار کر رہی ہے۔ اگر میں کینیڈا پہنچ گیا تو وہ لڑکی مجھے بہت سارا پیسا اور پیار دے گی اور مجھ سے شادی بھی کر لے گی۔“

”نہیں بھئی صاحب ٹائبر کی بات تو نہیں کر رہے؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”وہ جس سے آج کل تمہارا انیئر بھی چل رہا ہے..... وینکوور انٹرپورٹ والی امیگریشن آفیسر؟“

”پتا نہیں یار۔“ وہ بیزار سے بولا۔ ”میں اس شخص کی باتوں کو زیادہ سیریس نہیں لیتا۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ کہہ رہا تھا کہ میں ملائیشیا میں مستقل رہائش اختیار کروں گا اور صوم و صلوة کی پابند کوئی باحیا اور پردہ دار عورت مجھ سے شادی کرے گی۔“

”یار! تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔“ میں نے اسے چھیڑا۔ ”اب تو بھئی صاحب ایک ایسی لڑکی کا نام لے رہے ہیں جس پر تم رتجھے بیٹھے ہو.....!“

”پتا نہیں یار، کیا ہونے والا ہے۔“

”کیا تم نے بھئی صاحب کے سامنے ٹائبر کا ذکر کیا تھا؟“ میں نے ایک اہم سوال کیا۔

”کبھی نہیں یار۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ بات تو ایک راز ہے جو میرے اور ٹائبر کے علاوہ صرف تمہیں اور فرحان کا مرید کو معلوم ہے۔“

”تم نے ان سے پوچھا نہیں کہ پہلے تو آپ مجھے ملائیشیا پہنچا رہے تھے۔ اب جہاز کا رخ کینیڈا کی سمت کیوں موڑ دیا؟“

”میں نے پوچھا تھا۔“ عظیم نے بتایا۔ ”کیونکہ کینیڈا

اور گوری چٹی لڑکی کا ذکر سن کر مجھے ایک جھٹکا لگا تھا۔“
میں نے پوچھا۔ ”پھر انہوں نے کیا جواب دیا۔“
”یار! تمہیں پتا ہے، وہ سامنے والے کی کم سنتے ہیں
اور اپنی زیادہ بولتے ہیں۔“ وہ ہنسنے لگے۔
”بس، جواب میں وہ اپنے مخصوص الفاظ دہراتے رہے۔۔۔۔۔
سائیکس! میں اللہ کا بندہ ہوں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ اللہ سب
جانتا ہے۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ!“
”اچھا یہ بتاؤ، بھٹی صاحب مجھے کیوں یاد کر رہے
تھے؟“ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔
”یہ بھی مجھے نہیں پتا۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔
”بس یہی کہہ رہے تھے کہ وہ تمہیں کسی جی ایم صاحب سے
ملوانا چاہتے ہیں جو تمہارے مسئلے کو حل کر سکتا ہے۔“
”یہ جی ایم صاحب کون ہیں بھائی؟“ میں نے
چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”ان صاحب کا پورا نام غلام مصطفیٰ ہے مگر وہ ”جی ایم
سر“ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔“ عظیم نے وضاحت
کرتے ہوئے بتایا۔ ”کراچی کے کسی ریجنل چینل میں کام
کرتے ہیں۔ وہ لائیو ٹرانسمیشن کے کنٹرولر ہیں اور آئی ٹی
کے معاملات کے بھی ہیڈ ہیں۔“
”کسی ٹی وی چینل کی لائیو ٹرانسمیشن یا آئی ٹی
ڈیپارٹمنٹ سے میرا کیا لینا دینا بھائی؟“ میں نے کہا۔ ”اور
میرا ایسا کون سا مسئلہ ہے جس کے حل کے لیے بھٹی صاحب
مجھے جی ایم سر سے ملوانا چاہتے ہیں۔“

”یار! آئی بی نے کھل کر تو کوئی بات نہیں کی۔“ وہ
بولا۔ ”بس اتنا کہا ہے کہ اسد صاحب امریکا سے جس مائی کو
اپنے پیچھے لگا کر یہاں تک پہنچے ہیں اس کا توڑ صرف جی ایم
صاحب ہی کے پاس ہے۔“

عظیم کی بات سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے
اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ”یار، مائی سے بھٹی صاحب
کا کیا مطلب ہے؟“

”برو! مائی سے آئی بی کی مراد۔۔۔ عورت ہے۔۔۔۔۔!“
وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”تم نے بتایا تھا نا، کوئی ڈی
تمہارے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔“

”ہاں، میں نے بتایا تھا اور بعد ازاں وضاحت بھی
کردی تھی کہ اس ”ڈی“ کا مطلب ہے، ڈیلیفینا۔“ میں نے
کہا۔ ”اور یہ بات تمہیں بھی معلوم ہے۔“

”ہاں، میں جانتا ہوں۔“ وہ ایک گہری سانس خارج
کرتے ہوئے بولا۔ ”کل آئی بی سے میٹنگ رکھتے ہیں۔ تم

آ جاؤ، پھر فیس ٹوفیس بات کرتے ہیں۔ ممکن ہے وہ ڈیلیفینا
کے حوالے سے کوئی سنسنی خیز انکشاف کرنے والا ہو۔“
”صبح ماں کا انٹرویو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”سمجھ لو کہ دن
کا فرسٹ ہاف تو اسی چکر میں گزر جائے گا۔ تم بھٹی صاحب
سے رات کا کوئی ٹائم فکس کر لو پھر ملاقات کرتے ہیں۔“
عظیم نے میری بات سے اتفاق کیا۔ تھوڑی دیر
مزید گفتگو کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو ”گڈ نائٹ“ کہہ
کر سیلوں پر رابطہ موقوف کر دیا۔

عظیم نے مجھے ایک نئی سوچ میں ڈال دیا تھا۔ یہ
ٹھیک ہے کہ عظیم مقبول بھٹی کی باتوں کو زیادہ سنجیدگی سے
نہیں لیتا تھا لیکن میں نے اس شخص کے اندر ایک خاص قسم کا
کرنٹ دروڑتا ہوا محسوس کیا تھا یا تو وہ روحانیت کے کسی اعلیٰ
درجے پر فائز تھا اور یا پھر۔۔۔۔۔ اس کی معلومات کے ذرائع
بڑے خطرناک تھے۔ بھٹی صاحب سے پہلی ملاقات میں
مجھے ایک لمحے کے لیے ایسا بھی محسوس ہوا تھا کہ کہیں، ان کا
تعلق کسی سیکرٹ سوسائٹی یا ایسے ہی کسی ادارے سے تو نہیں!
حقیقت کیا تھی، یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا
لیکن میں بھٹی صاحب کی ذات کے حوالے سے لاشعوری
طور پر کافی محتاط بہ الفاظ دیگر ہوشیار ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک
نئی بات نکال لائے تھے کہ میں امریکا سے جس مصیبت کو
اپنے پیچھے لگا کر یہاں پہنچا ہوں اس سے صرف جی ایم سر ہی
مجھے نجات دلا سکتے تھے۔ سب کچھ کسی سیکرٹ چین کے ساتھ
بندھا ہوا تھا۔ نہ تو میں کوئی عام انسان تھا، نہ ڈیلیفینا اور نہ ہی
مقبول بھٹی اور جی ایم سر۔۔۔۔۔ گویا نئے ہنگامے میری راہ دیکھ
رہے تھے!

اگرچہ عظیم مقبول صاحب کی باتوں کو سنجیدگی سے
نہیں لیتا تھا لیکن اس شخص کے بارے میں میری رائے عظیم
سے قطعی مختلف تھی۔ میں انہیں انتہائی سیریس لے رہا تھا اور
اس کا سبب یہ تھا کہ میں نے اس کی باطنی قوت کا کمال دیکھا
تھا۔ پہلی ملاقات میں انہوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ
اعلان کر دیا تھا کہ جن تین عورتوں سے میرا گہرا تعلق ہے ان
میں سے دو عورتیں اس وقت پاکستان میں موجود ہیں اور
تیسری ادھر امریکا میں ہے پھر جب میں اپنی ماں سے
ملاقات کر چکا تو اس کے بعد میرے پیہم اصرار پر انہوں
نے صرف اتنا بتایا کہ جو دو عورتیں اس وقت پاکستان میں
ہیں ان میں سے ایک سے میری ملاقات ہو چکی ہے اور
دوسری سے بہت جلد ملاقات ہونے والی ہے اور اب عظیم کی
زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ میں جس عورت کو اپنے پیچھے لگا کر

فرائض انجام دینا ہیں۔“

”اچھا، یہ بات ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا
پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ”جب تمہارے پاپا
میٹنگ سے فارغ ہو جائیں تو تم ان سے معلوم کرنا کہ اگر کوئی
پاکستانی مستقل طور پر سعودی عرب میں رہائش اختیار کرنا
چاہے تو اس کا قانونی پروسس کیا ہوگا؟“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں پاپا سے پوچھ کر تمہیں بتاؤں گا۔“
وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”لیکن جہاں تک میری معلومات
ہیں، کسی پاکستانی کے لیے سعودیہ کی مستقل شہریت حاصل
کرنے کا لیگل پروسس بڑا دشوار گزار ہے لیکن وہاں پر
مستقل رہائش اختیار کرنے کا دوسرا راستہ ہے مگر اس پر اچھا
خاصا خرچہ ہو جاتا ہے۔“

”تم لوگوں سے پوچھنے کا میرا ایک خاص مقصد ہے
عظیم!“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگوں
کو عمرہ اور حج کے حوالے سے مختلف افراد کو سعودی عرب
بھیجنے کا وسیع تجربہ ہے۔ اس لیے جو گا بیڈنس وہ دیں گے وہ
زیادہ قابل بھروسہ ہوں گی۔“ لچائی توقف کر کے میں نے
ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اب تم مجھے بتاؤ کہ وہ دوسرا راستہ کون سا ہے جس کا
تھوڑی دیر پہلے تم نے ذکر کیا تھا؟“

”وہ بہت آسان راستہ ہے۔“ وہ بتانے لگا۔ ”جس
شخص کو بھی مستقل طور پر سعودیہ میں رہائش اختیار کرنا ہے وہ
رقم خرچ کر کے وہاں کا آزاد ویزا خرید لے۔ پھر وہ سعودیہ
کے جس حصے میں رہنے کا خواہش مند ہے وہاں کے کسی
مقامی کے ساتھ پارٹنرشپ میں اپنی گنجائش کے مطابق کوئی
بزنس شروع کر دے۔ اس طرح جب تک اس کے آزاد
ویزا کی میعاد ختم نہیں ہو جاتی، وہ بڑے سکون کے ساتھ
سعودیہ میں رہ سکتا ہے۔ میعاد ختم ہونے سے قبل وہ رقم خرچ
کر کے ویزا کی تجدید کر دے۔“

”اوکے۔۔۔۔۔ عظیم رات کی ملاقات میں مزید بات ہوگی۔“
میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ یہ سارے انتظامات میں
پینا کے لیے کر رہا تھا۔ وہ مستقل طور پر جدہ میں رہائش اختیار
کرنا چاہتی تھی اور میرے اندازے کے مطابق، پینا کی مالی
حیثیت ایسی تھی کہ وہ عظیم کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل
کر کے بہ آسانی جدہ میں سیٹل ہو سکتی تھی۔

یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ پینا نے جدہ کا
انتخاب صرف میری وجہ سے کیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ میری جدہ میں رہائش کے حوالے سے

پاکستان آیا ہوں اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے
مقبول صاحب مجھے کسی جی ایم سر سے ملوانے والے تھے!
میں نے جب ٹھنڈے دل و دماغ سے مقبول
صاحب کی باتوں پر غور کیا تو سارا معاملہ میری سمجھ میں
آ گیا۔ یہ انہی کی پیش گوئی تھی کہ میں اس وقت تین خواتین
کی ایک پہیلی ”سی ایس ڈی“ میں پھنسا ہوا تھا۔ ان کے
مطابق ”سی“ میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی، ”ڈی“ مجھے اپنے
ہاتھ میں کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور میں خود ”ایس“ کی
تلاش میں امریکا سے پاکستان آیا تھا۔ مقبول صاحب کی
بات سے اتفاق کرنا میری مجبوری تھی کیونکہ انہوں نے یہ عین
میرے حالات کا نقشہ کھینچ ڈالا تھا یعنی میں اپنی ماں نسلی
(ایس) کی تلاش میں امریکا سے پاکستان آیا تھا۔ شارو
(سی) میرے ہاتھ سے نکل کر لیونارڈو کے ہاتھ میں پہنچ گئی
تھی اور اس بد ذات نے بڑے مذموم ارادے سے میری
دوست کو کیوبا کے شہر ہوانا پہنچا دیا تھا۔ اب باقی رہ جاتی تھی
ڈیلیفینا یعنی ”ڈی“ جو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی
کہ میں اس کی سیکرٹ سوسائٹی کا ممبر بن جاؤں اور میں اس
کی اس پُرکشش آفر کو اپنے پاؤں تلے روند کر امریکا سے
پاکستان چلا آیا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق،
مقبول صاحب یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ ڈیلیفینا میرے تعاقب
میں امریکا سے پاکستان پہنچ چکی ہے اور کوئی جی ایم سر ہی
مجھے اس کے شر سے بچا سکتا ہے۔

☆☆☆

میں نے ماں کو یو ایس کنسلٹ میں ان کیا اور خود گھوم
پھر کر گردنواح کا جائزہ لینے لگا۔ گاڑی کو میں نے پارکنگ
میں لگا دیا تھا جو کنسلٹ کے داخلی حصے سے کچھ فاصلے پر
تھی۔ پینا کے معاملے پر سوچتے ہوئے مجھے عظیم کا خیال آ گیا
اور اس وقت عظیم کی کال بھی آ گئی۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ برو! تم ایسی ہی پہنچ گئے؟“
”بالکل پہنچ گئے۔“ میں نے بتایا۔ ”ماں اندر جا چکی
ہیں اور میں گھوم پھر کر باہر کا نظارہ کر رہا ہوں۔“

”گڈ!“ وہ خاصی کراری آواز میں بولا۔ ”برو! مجھے
سو فیصد یقین ہے کہ سلی آئی کا پاسپورٹ جمع ہو جائے گا۔“
”ان شا اللہ!“ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”یہ
آج تم اس وقت جاگ رہے ہو۔ کیا رات کو سو گئے تھے؟“

”نہیں یار!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آج
آفس میں کسی پارٹی سے پاپا کی میٹنگ ہے۔ علی ابھی تک
راولپنڈی سے واپس نہیں آیا۔ مجھے پاپا کے ڈرائیور کے

عکس

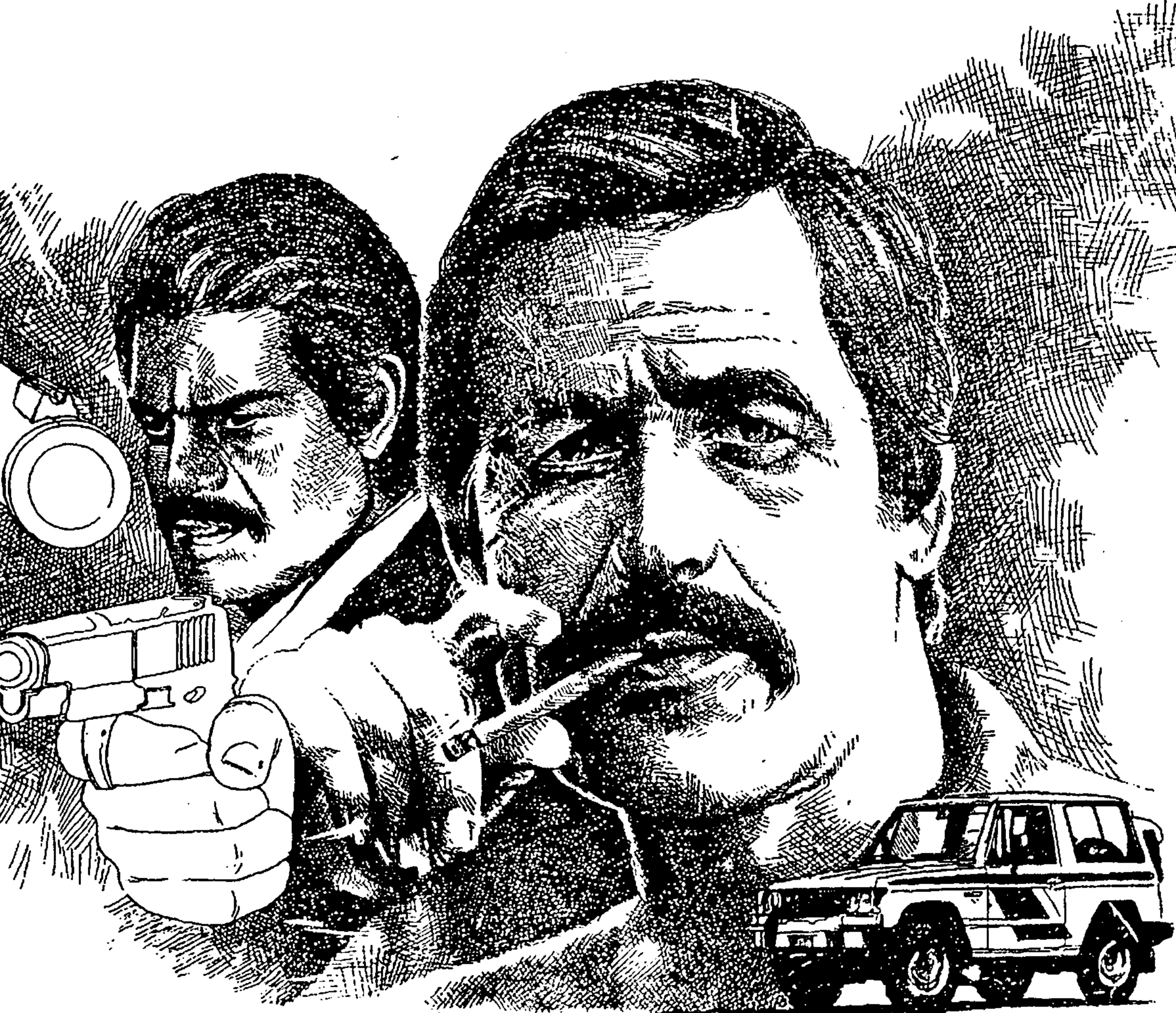
محمد الیاس

جس طرح ایک انسانی جسم مختلف اعضا کا مجموعہ ہوتا ہے، اسی طرح انسانی زندگی بھی مختلف رشتوں سے جینی پڑتی ہے، اس کے علاوہ معاشرتی اقدار اور کچھ مذہبی و فطری قوانین کی پاسداری بھی اس زندگی کی رونقوں کو بڑھا دیتی ہے مگر... افسوس وہ ان تمام خوبیوں کو نظر انداز کرتے رہنے کا عادی تھا اور پھر اچانک ایک ایسا واقعہ ہوا کہ اس کی نظر کا انداز ہی بدل کر رہ گیا۔

ویرانوں کو بسانے والے ایک خطی کا دلی انقلاب

مالی ضرورت سے زیادہ میری مجبوری تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے محکمے کے ملازمین کی کوآپریٹو سوسائٹی میں ملازمت اختیار کر لی۔ سوسائٹی نے شہر سے باہر تقریباً بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایسی زمین خرید لی جس میں

جھاڑ جھنکاڑ کا جنگل اگا ہوا تھا۔ اور نیولوں نے سارے رقبے میں بلیں کھود کھود کر مٹی بھر بھری کر رکھی تھی۔ بلی کی جسامت کے نیولے میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔ سوسائٹی کی انتظامیہ نے خرید کردہ اراضی کو خاردار



میں کہا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”یہ سب تمہاری محنت کا ثمر ہے۔“
”آئیں، باقی باتیں گاڑی میں بیٹھ کر کرتے ہیں۔“
میں نے ماں کے لیے عقبی نشست کا دروازہ کھولا پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے میں نے ماں سے استفسار کیا۔

”انہوں نے انٹرویو میں کیا پوچھا؟“
ماں نے بتایا۔ ”مجھ سے پوچھا گیا کہ اسد علی جن کے پاس آپ امریکا جا رہی ہیں، وہ آپ کے کیا لگتے ہیں؟ میں نے کہا وہ میرے فریبی رشتے دار ہیں اور آج کل پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ انہی کی فرمائش اور ضد پر میں چند روز کے لیے گھومنے پھرنے امریکا جانا چاہتی ہوں۔ اسد علی اس وقت باہر پارکنگ میں موجود ہیں۔ کسی کنفرینس کی ضرورت ہو تو انہیں اندر بلا لیں۔“ وہ لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئیں۔ ”مگر انہوں نے صرف یہ ایک جملہ بول کر میرا پاسپورٹ رکھ لیا۔“ ”نوئیڈ آف کنفرینس!“

ادھر ماں کی بات ختم ہوئی، ادھر میں نے دیکھا کہ ایک موٹر بائیک بڑی تیزی سے ہماری گاڑی کے پہلو میں آئی۔ مذکورہ بائیک پر دو افراد سوار تھے اور دونوں نے ہیلمٹ پہن رکھے تھے۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ میری چھٹی حس نے بتایا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہونے جا رہی ہے۔

میں نے یکایک گاڑی کی رفتار بڑھادی لیکن میری بد قسمتی کہ اسی لمحے ایک ہیوی ٹریلر ہماری گاڑی کے سامنے آ گیا۔ دوسری سمت بھی ایک گاڑی..... بھی اور کٹ مارنے کے لیے ذرا سی بھی جگہ نہیں تھی۔ گویا وقت نے مجھے ایک بندگی میں پہنچا دیا تھا۔

قبل اس کے کہ میرا ذہن بچاؤ کی کسی ترکیب تک رسائی حاصل کر پاتا، پیچھے پیٹھے ہوئے موٹر سائیکل سوار نے گن نکالی اور اس کا رخ ہماری گاڑی کی جانب کر دیا۔ میں نے حلق کی پوری قوت سے چیخ کر کہا۔
”ماں..... نیچے جھک جائیں.....!“

امنگوں، حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلائی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سنائی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

ماں نے اور میں نے پینا سے غلط بیانی کی تھی یہ دروغ گوئی ہماری مجبوری تھی۔ ہم امریکا پہنچنے سے پہلے کسی بھی قیمت پر اس راز کو افشا نہیں کر سکتے تھے ورنہ سارا کھیل بگڑ جاتا اور کوئی بھی شخص اپنے کھیل کو بگڑتا نہیں دیکھ سکتا.....!
چہل قدمی میں یوریت محسوس ہونے لگی تو میں گاڑی میں جا بیٹھا۔ اسی لمحے عظیم کی کال دوبارہ آگئی۔ اس نے بتایا۔
”آئی بی (الہامی بابا مقبول صاحب) سے میری بات ہو گئی ہے۔ اس نے آج رات آٹھ بجے کا وقت فکس کیا ہے۔“
”گڈ!“ میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔
”لیکن مقبول بھائی نے ایک اڑنکا لگا دیا ہے۔“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

”کیسا اڑنکا؟“ میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔
”وہ کہتا ہے، جی ایم سر سے ملاقات کے وقت تمہارے اور سر کے علاوہ اور کوئی تیسرا شخص وہاں موجود نہ ہو۔“ عظیم نے بتایا۔ ”یعنی تم اور جی ایم سرون ٹو ون ملو گے۔ سرنم سے جو باتیں کرنا چاہتے ہیں وہ کسی کے سامنے نہیں ہو سکتیں۔“

”کوئی حرج نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم تینوں جی ایم سر کی طرف روانہ ہوں گے۔ تم گاڑی میں یا چھینل کے آفس میں بیٹھ کر مقبول صاحب کے ساتھ دل بہلانا۔ جب جی ایم سر سے میری میٹنگ ہو جائے گی تو پھر ہم اطمینان کے ساتھ کہیں بیٹھ کر اپنی بات کر لیں گے۔“

”یہی کرنا پڑے گا۔“ اس نے کہا۔
عظیم سے سیلولر رابطہ ختم ہوا تو میں جی ایم سر کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں ان سر کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن ابھی تک ان کے بارے میں جو باتیں مجھ تک پہنچی تھیں ان کی روشنی میں یہ شخص، مقبول صاحب کا بھی گرو لگتا تھا!

لگ بھگ ایک بجے دوپہر ماں ایمپسی سے باہر نکلیں تو ان کے چہرے کی چمک نے مجھے بتا دیا کہ وہ انٹرویو کلیئر کر آئی ہیں۔ میں نے گاڑی میں سے نکل کر ان کا استقبال کیا۔ وہ میرے قریب پہنچ کر بولیں۔

”علی! میرا پاسپورٹ جمع ہو گیا ہے اور انہوں نے یہ ٹوکن دیا ہے۔“

میں نے ان کے ہاتھ سے ٹوکن لے کر دیکھا۔ اس ٹوکن کے مطابق، پاسپورٹ کی ڈیلیوری ڈیٹ دس جولائی تھی یعنی پرسوں۔

”مبارک ہو ماں!“ میں نے مسرت بھرے لہجے

تاروں سے گھیر لیا۔ فرنٹ پر بڑا شان دار گیٹ تعمیر کیا گیا جس کے ساتھ سکیورٹی پوسٹ مع کوارٹر، ساتھ ہی اندر سائٹ آفس، اور میڈواٹر ٹینک اور مسجد کھڑی بنادی گئی۔ قومی اخبارات میں بڑے پُرکشش اشتہارات شائع ہوئے کہ آج مٹی کے بھاؤ پر پلاٹ خریدیں اور مستقبل قریب میں سونے کے مالک بن جائیں۔ پہلے آئیں پہلے پائیں۔ درخواستیں زیادہ وصول ہونے کی صورت میں قمر اندازی کی جائے گی۔

میری مجبوری یہ تھی کہ میں اپنے ہی گھر میں گزشتہ ایک دہائی سے ناپسندیدہ شخصیت بن کے رہ گیا تھا، لہذا رضا کارانہ اپنی پوسٹنگ سائٹ آفس میں کروالی، جہاں ایک لحاظ سے چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی تھی۔ خوب آراستہ دفتر کے ساتھ رہائش کے لیے آرام دہ کمر بھی مل گیا۔ مجھے کے اسٹاف اور افسروں کی اکثریت نے سوسائٹی کی ممبر شپ حاصل کر رکھی تھی لیکن زمین شہر سے زیادہ دور خریدی جانے پر اعتراضات اٹھنے لگے اور بددی سی پھیل گئی۔ جس کے نتیجے میں زیادہ تر ممبران صرف پہلی قسط ہی ادا کر کے ٹھنڈے ہو گئے۔ البتہ اشتہاری مہم سے متاثر ہو کر عام پبلک آنے لگی مگر سائٹ آفس پہنچنے تک ان کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا۔ میں چونکہ یہ سمجھتا تھا کہ انہوں نے یہاں تک پہنچنے میں خاصی مشقت اٹھائی ہے، اس لیے صبر کا دامن نہ چھوڑتا اور حتی الوسع خوش اخلاقی سے پیش آتا۔

وہ دسمبر کی آخری تاریخ تھی۔ سیاہ بادل چھائے ہونے سے سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سہ پہر کے وقت رہائشی کمرے کی کھڑکی سے میں نے ایک سبز رنگ کی بڑی سی کار کو گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں فوراً دفتر میں آ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی سے ایک شخص اتر آیا۔ میں نے دیکھا کہ گوری رنگت کے وجہہ شخص نے شب خوابی کا گاؤں پہن رکھا ہے۔ وہ دفتر میں آنے کے بجائے سکیورٹی گارڈ تلاوت خان کے ساتھ باتیں کرتا ہوا مین بلیوارڈ پر آگے کی طرف چل دیا۔ میں نے آفس بوائے غلام شبیر سے چائے بنانے کو کہا۔

کیتلی میں پانی کھولنے لگا لیکن مہمان آگے ہی آگے چلتا چلا گیا۔ میرے اشارے پر شبیر نے سوچ آف کر دیا۔ میں نے کوٹ کے کالر کھڑے کیے اور مفلر لپٹ کر دفتر سے نکل آیا۔ دور تک نگاہ ڈالی۔ وہ دونوں، اسکیم کی سڑک جہاں تک پہنچتے بنی ہوئی تھی، اس سے بھی کہیں آگے جا چکے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ نرالا شخص ہے، جو خود ہی معائنہ کرنے نکل

پڑا۔ اس کی اتنی پرانی اور قیمتی گاڑی کو بڑی اچھی حالت میں دیکھ کر مجھے گمان گزرا کہ کوئی رئیس ابن رئیس ہوگا۔ مجھے سردی محسوس ہونے لگی۔ دفتر میں چلا آیا اور میٹر کے سامنے کرسی بچھ کر بیٹھ گیا۔ پچیس تیس منٹ کے بعد وہ شخص اندر داخل ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر خیر مقدمی کلمات کہے اور اپنا تعارف کرایا۔ اس نے مصافحہ کرتے ہوئے جواباً ذرا سی بھی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا۔ تاہم اس کے رویے میں سرد مہری اور رعونت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ یوں ملاگویا معمول کی ملاقات ہو۔ لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ اور چہرے پر انجانی چمک دکھائی دی۔ اپنا تعارف کرانے کے بجائے اتنا ہی بولا۔ ”مجھے سرمد کہتے ہیں۔“

میں نے اچھے سلیزین کی طرح اس کے نام کی تعریف کی لیکن وہ شکریہ ادا کرنے کا مکلف نہ ہوا اور کہا۔ ”یہ ہاؤسنگ اسکیم بڑی زبردست ہے۔“ اس سے پہلے کسی کی زبان سے توصیفی الفاظ ادا ہوتے سنے ہی نہ تھے۔ یہی سمجھا کہ طنز اُکھا ہوگا۔ عرض کیا۔

”آج نہیں تو کل یہاں خوب آبادی ہو جائے گی۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، چند سالوں میں انشاء اللہ آپ کا کہا ہوا سچ ثابت ہوگا۔“ وہ بڑی بے ساختگی سے بول گیا۔ ”اللہ نہ کرے۔۔۔۔۔۔“ مسکرا کر ذرا توقف سے دوبارہ بولا۔ ”اس کا اشتہار کئی بار نظر سے گزرا لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ صرف دس منٹ کی ڈرائیو پر ہے تو ایک لحاظ سے شہر کے ساتھ جڑا ہوا ناؤن ہوگا۔۔۔۔۔۔“

میرے نزدیک اس کی باتیں مبہم تھیں۔ صحیح طور پر سمجھ نہ پایا۔ تاہم گاہک پھنسانے کی غرض سے کہا۔ ”دراصل یہاں تک آنے والی سڑک سنگل ہے اور شہر کے گنجان آباد علاقے سے گزرتی ہے۔ یہاں سے بائی پاس روڈ تعمیر کرنے کا عظیم منصوبہ حکومت کے زیر غور ہے۔ ساتھ ہی شہر کو ملانے والی سنگل روڈ بھی ڈبل ہو جائے گی۔ تب انشاء اللہ! آپ کی شیور لیٹ دس منٹ میں یہاں پہنچ جایا کرے گی۔“

اس نے پھر وہی الفاظ اسی بے ساختگی سے بول دیے۔ ”اللہ نہ کرے۔“ میں نے خیر سگالی کے طور پر ہلکا سا قہقہہ لگا دیا۔ دراصل میں سمجھ ہی نہ پایا کہ اس نے بدعا کیوں دی ہے۔

شبیر نے میز پر چائے اور بسکٹ لاکر رکھے۔ سرمد نے فوراً ایک نگاہ لڑکے پر ڈالی اور خوش گوار لہجے میں بولا۔ ”شاباش بیٹا! اس کی بہت ضرورت تھی لیکن میرے کپ میں ایک اور ٹی بیگ ڈالو۔ تب میرے مطلب کی چائے

بنے گی۔“ وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”سڑک ڈبل ہو جائے، تب بھی اسی صورت میں آپ کے بتائے ہوئے وقت میں پہنچا جاسکتا ہے کہ سارے موٹر نکال کر سڑک کو تیر کی طرح سیدھا کر دیا جائے اور شیور لیٹ کے لیے دی آئی پی روٹ لگا کر سڑک ایک سرے سے دوسرے تک خالی کرائی جائے۔۔۔۔۔۔ اللہ نہ کرے وہ برا وقت آئے، ورنہ اس جگہ کا قدرتی حسن تباہ ہو جائے گا۔ یہ خوبصورت مناظر، پُرسکون ماحول اور تازہ ہوا پھر میسر نہ ہوگی۔ اللہ اس برے وقت سے محفوظ رکھے۔ آپ مجھے قبرستان کے لیے مختص جگہ، موقع پر لے جا کر دکھادیں۔ تلاوت خان کو پتا نہیں۔ چائے پی کر چلتے ہیں۔“

میں کھینا سا ہو کر ہنس پڑا اور کہا۔ ”میں دکھا دیتا ہوں۔ ابھی صرف چار برجیاں لگا کر نشان دہی کی گئی ہے۔ آبادی شروع ہی نہیں ہوئی۔ آپ یہاں آباد ہونے کا پہلے فیصلہ تو کر لیں۔ قبرستان کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ اللہ خیر کرے۔۔۔۔۔۔“

وہ کہنے لگا۔ ”پلاٹ سے زیادہ اسی جگہ کی اہمیت ہوتی ہے۔ اصل جائے سکونت۔۔۔۔۔۔ پیدائش دراصل، میرے نزدیک حادثہ ہے، جبکہ موت سانحہ نہیں، جیسے عموماً سمجھا جاتا ہے۔ کسی بھی نوع کے جاندار کا جوڑا اس مقصد کو مد نظر رکھ کر باہم ملاپ نہیں کرتا کہ بچ پیدا کرنا ہے۔ لیکن قدرت اپنے نظام کو بڑھاتے ہوئے اپنا کام کرتی ہے۔۔۔۔۔۔“

میں اس کے فلسفے پر سر جھٹک کر رہ گیا۔ چائے کا مزید گھونٹ بھرنا یاد ہی نہ رہا۔ جبکہ وہ سامنے بیٹھا کامل اطمینان سے چائے پیتا رہا۔ اس نے بسکٹ نہ لیا۔ پیچھے مڑ کر دیوار سے لگی کرسی پر بیٹھے آفس بوائے کو ایک نظر دیکھا اور بولا۔ ”خوش رہو بچے!“

پیدائش کے بارے میں مہمان کے خیالات سے مجھے اختلاف ہوا اور میں خاموش نہ رہ پایا۔ اتنا ہی کہا۔ ”میری ناقص رائے میں پیدائش کا عمل حادثہ نہیں، بلکہ عین امر زبی ہے۔ تمام روحیں اس ذات باری نے تخلیق کی ہیں۔ کائنات کا نظام جس سلیقے سے چل رہا ہے، اس میں کچھ بھی بلا مقصد نہیں۔۔۔۔۔۔“

سرمد مسکرا دیا اور میز پر پڑے اخبار کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے بولا۔ ”ہاں! اس اخبار میں جو تفصیل چھپی ہوئی ہے ”چند سال کے بچے کو زیادتی کے بعد قتل کر کے گٹر میں ڈال دیا“ خیر! چھوڑیں اس قصے کو۔۔۔۔۔۔ میں چلتا ہوں۔ مجھے یہ جگہ اچھی لگی۔ کل آپ کے ہیڈ آفس جاؤں گا، بنگ

کے لیے۔۔۔۔۔۔“ سرمد کے اٹھتے ہی میں اور شبیر بھی کھڑے ہو گئے اور اس کو گاڑی تک رخصت کرنے کی غرض سے ساتھ چل دیے۔ تلاوت خان بھی قریب آ گیا۔ سرمد نے اس کے اور میرے ساتھ سرسری انداز میں ہاتھ ملایا جبکہ شبیر کو دیکھ کر مسکرایا، اس کی پیٹھ پر چھکی دی اور گرم جوشی سے مصافحہ کر کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”قبرستان پھر بھی دیکھ لیں گے۔“

اگلے روز ہیڈ آفس میں چالیس بائی اٹی کے پلاٹ کی یکمشت ادائیگی ہو گئی اور قبضہ دلانے کے لیے عملے کے دو ارکان سرمد کے ہمراہ آ گئے۔ اس نے سائٹ آفس سے پانچ سو گز آگے جہاں تک مین بلیوارڈ بن چکی تھی، وہاں پلاٹ پسند کر کے قبضہ حاصل کر لیا۔ ہمیں یہ جان کر مزید خوش ہوئی کہ وہ جلد از جلد مکان تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ سب انجینئر اور سرویئر نے یقین دہانی کرائی کہ سوسائٹی کی انتظامیہ نے اس سلسلے میں بھرپور تعاون کرنے کے احکامات جاری کیے ہیں۔

چھ ماہ سے بھی کم عرصے میں انتہائی سادہ، صرف تین کشادہ کمرے، کچن، اسٹور، سرونٹ کوارٹر، پورچ، برآمدے اور گیراج پر مشتمل مکان تعمیر ہو گیا اور سرمد نے مختصر سا گھریلو سامان لا کر رہائش بھی اختیار کر لی۔ اس کے ہمراہ دو اور جاندار بھی آئے۔ ایک بوڑھا طوطا اور دوسرا کمیاب نسل کا سفید جرمین شیفرڈ کتا۔ طوطے کو وہ ”چاچا“ کہہ کر پکارتا۔ دونوں آپس میں بے ٹکان باتیں کرتے اور ٹھٹھٹ پتھانی میں ایک دوسرے کو گالیاں دیتے۔ کتے کو وہ ”یورایکسی لینسی“ کہہ کر مخاطب کرتا۔ مجھے اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں ایسا منفرد انسان دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس کے بارے میں جاننے اور قریب ہونے کی دلی خواہش تھی۔ وہ اچھا لگتا لیکن اسی طرح پیش آتا جیسے پہلے روز ملا تھا۔ گرم جوشی نہ سرد مہری۔ اپنے بارے میں کبھی کچھ نہ بتایا۔ کون ہے، کہاں سے آیا۔ سابقہ عمر کہاں اور کیسے گزری۔ ایسا ہر سوال بڑی ہوشیاری سے ٹال دیتا۔ زندگی کے بارے میں عجیب گنجلک فلسفے گھڑ رکھے تھے۔ تقدیر کو مانتا نہ دعا پر یقین ہونے کا اقرار کرتا۔ مختصر جواب دیتا اور بحث کرنے سے کترا جاتا۔ اس کے باوجود اس سے باتیں کرنے اور قریب ہونے کو جی چاہتا۔

جس روز اس کے مکان کا سنگ بنیاد رکھا گیا، سوسائٹی انتظامیہ نے اشتہاری مہم کا آغاز ایک نئے ولولے سے کر

دیا۔ ”تعمیرات شروع، محدود تعداد میں پلاٹ رہ گئے ہیں۔ بکنگ کا آخری موقع۔“ جب مکان آباد ہو گیا تو اشتہارات کی عبارت یوں شائع ہونے لگی۔ ”لوگ امن سکون سے رہ رہے ہیں۔“ تشبیر کا اثر بھی ہوا ہوگا۔ کچھ آس پاس اور سامنے نئی ہاؤسنگ اسکیموں کے بورڈ بھی لگ گئے۔ نتیجتاً چند اور الائیوں نے بھی گھر بنانا شروع کر دیے۔ لیبر آ جانے سے رونق بڑھ گئی۔ انتظامیہ کی طرف سے ملازم رکھا ہوا پیش امام، مولوی علی احمد خود ہی دوبارہ حاضر ہو گیا اور باقاعدگی سے ہجگانہ نماز پڑھانے لگا۔

ایک روز میں نے تعمیراتی کام شروع ہونے پر سرمد سے خوشی اور اطمینان کا اظہار کر دیا۔ وہ لمحہ بھر خاموش رہا اور پھر بولا۔ ”نی الحال تو میرا گھر محفوظ ہی نظر آتا ہے۔ زیر تعمیر مکان گیٹ کے نزدیک ہیں۔ تشویش تب ہوگی، جب یہ سرگرمیاں میرے اڑوس پڑوس تک پھیل جائیں گی۔ پھر سوچوں گا کہ کیا کرنا ہے۔۔۔۔۔“ وہ زیر لب مسکرایا اور ذرا توقف کر کے بولا۔ ”آپ دعا پر یقین رکھتے ہیں۔ میں بھی سچے دل سے دعا کروں گا، آپ بھی کریں۔ اللہ مجھے اس آزمائش سے محفوظ رکھے۔۔۔۔۔“ میں اس کی بات کا کیا جواب دیتا۔ کھیانا ہو کر ہنس دیا۔

آفس بوائے شبیر نے میرے لیے نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ وہ سرمد کا ایسا گرویدہ ہوا کہ اوقات کار کے بعد اس کے پاس چلا جاتا۔ لڑکے کے ہمہ وقت موجود نہ رہنے سے جو میرے چھوٹے موٹے ذاتی نوعیت کے کام کاج آسانی سے ہو جاتے تھے، وہ اب خود کرنا پڑتے لیکن میں اس کو چوبیس گھنٹے حاضر رہنے پر مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے حیرانی بھی ہوا کرتی کہ اٹھارہ بیس سال کا شخص میٹرک پاس لڑکا اس الجھے ہوئے ذہن کے گہرے۔۔۔۔۔ انسان سے کیا گفتگو کرتا ہوگا۔ دونوں میں کون سی قدر مشترک تھی۔ میں سمجھ نہ پایا کہ آخر اس تعلق کی نوعیت کیا ہے۔

ہاؤسنگ اسکیم کے عقی حصے میں زیادہ ہی گھٹنا جنگل بن گیا تھا اور آخری حد پر نصب خاردار تار کہیں کہیں سے ٹوٹ گئے تھے، جس کے نتیجے میں جنگلی جانور اندر آ جاتے۔ حفاظتی باڑ کی مرمت کے مرحلے پر سرمد کی رائے نے درطہ حیرت میں ڈال دیا۔ کہنے لگا۔ ”مجھے جنگلی حیات کی کشش ہی یہاں لے آئی تھی۔ اور تار میں نے خود پلاس سے کاٹے تھے۔ بہتر ہوگا کہ تاری فی الحال اگلے حصے میں لگوائیں، جہاں آبادی ہو رہی ہے۔ وہاں سے اسکیم کی چوڑائی بہت کم ہے۔۔۔۔۔ غالباً عقی حد کا بیسواں حصہ۔ یوں

خرج بھی کم اٹھے گا۔“

میں نے یہ تجویز ہیڈ آفس کو پہنچا دی۔ چیئر مین اور بورڈ کے ارکان ویسے بھی سرمد کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس شخص نے پہل نہ کی ہوتی تو آج بھی منصوبہ وہیں رکا ہوتا۔ انہوں نے اتفاق رائے سے اس تجویز کو منظور کیا اور کام شروع کر دیا۔

ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں سرمد ایک ٹکڑا سا بکرا لایا کرتا اور ذبح کروا کر کم و بیش نصف گوشت شبیر کے ہاتھوں، مزدوروں، مستریوں کو بھجوا دیتا۔ تلاوت خان اور اس کے دونوں ساھی سیکورٹی گارڈز کو بھی حصہ مل جاتا۔ میرے عملے میں چار افراد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ان میں سے صرف دو نچلے درجے کے ملازموں اور سوپر کو بن مانگے دیا جاتا۔ جبکہ مجھے، میرے دونوں نائبین، مولوی صاحب اور چند رہائش پذیر گھرانوں کو سرے سے پوچھا ہی نہ جاتا۔ شبیر کی زبانی سرمد کے خیالات معلوم ہوئے۔ کہنے لگا۔ ”صاحب کا خیال ہے کہ خود اکیلے اچھا اچھا کھانے سے جرم کا احساس ہوتا ہے۔ جو بالکل ہی افورڈ نہیں کر سکتے، ان کو اپنی خوشی اور تسلی کی خاطر کھانا چاہیے۔“

مجھے معقول تنخواہ کے علاوہ اچھی خاصی پینشن بھی ملتی تھی، پھر بھی خواہش بیدار ہوتی کہ اتنا اچھا گوشت مل جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ میں خود کو شرم دلاتا کہ ایسی گھٹیا سوچ زیب نہیں دیتی۔ مجھ سے زیادہ مولوی علی احمد کی ذہنی حالت ابتر ہوتی گئی۔ اس کو ایسا ہوکا لگا کہ تقریباً ہر روز ہی نماز کے بعد میرے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرنے لگا اور میں مزے لیتا۔ مجھے کہتا۔ ”یہ کیسا بے دین شخص ہے۔ ذرا شرم نہیں۔ نماز پڑھتا ہے نہ حق ہمسائیگی کا خیال رکھتا ہے۔ اس کا نام بھی مشکوک ہے۔ اسی طرح کے کسی گمراہ شخص کو حضرت صلاح الدین ایوبیؑ نے قتل کروا دیا تھا۔۔۔۔۔“

میری ہنسی چھوٹ جاتی۔ نماز کے بعد میرا بھی گپ شپ میں اچھا وقت گزر جاتا۔

تعمیراتی کام میں کچھ تیزی آ گئی اور لیبر میں اضافہ ہو گیا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ سرمد نے بکرے کے بجائے دو بہت بھاری مینڈھے منگوا لیے ہیں۔ شبیر نے بتایا کہ گوشت پورا نہیں ہوتا اور بکرا مہنگا بھی ہے۔ مولوی علی احمد کو بڑی دور کی سوچھی۔ میں گزشتہ کئی مہینوں سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ سرمد سے مکالمہ کرنا چاہتا ہے۔ مجھے کئی بار اشتعال دلانے کی کوشش کر دیکھی لیکن میں صرف اس صورت حال سے حظ اٹھانے تک محدود رہا۔ اس نے مجھے اعتماد میں لے کر کہا۔

”ذرا میرے ساتھ چلیں۔ نیکی کا کام ہے۔ سرمد کو نماز کی تلقین کرتے ہیں۔ ممکن ہے یوں اس کو اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو جائے۔۔۔۔۔ اور ایک مجبوری بھی ہے۔ میری زد و جد اور والدہ محترمہ کو جوڑوں کا درد ہے۔ خاص طور پر اس سردی میں تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ دونوں خواتین کو بھیڑ کی کھال استعمال کرنے سے افاقہ ہوگا۔۔۔۔۔“

مجھے گمان گزرا کہ صورت حال دلچسپ رخ بھی اختیار کر سکتی ہے۔ بعید نہیں کہ سرمد کوئی نرالا فلسفہ پیش کر دے۔ فوراً سنجیدگی اختیار کر لی اور مولوی صاحب کو ہمراہ لے کر سرمد کے ہاں جا پہنچا۔ اس کے گھر کا گیٹ اکثر کھلا ملا کرتا۔ پورچ کے اگلے حصے میں سہ پہر کی مری مری پیلی دھوپ پڑ رہی تھی۔ کٹڈے سے لٹکے پنجرے کی طرف دھیان ہی نہ گیا۔ اچانک کانوں میں بڑی تیز زنانہ سی آواز پڑی۔ ”کون ہے اوئے! کدھر جا رہے ہو؟“

چونک کر اوپر دیکھا۔ میں پہلے بھی کئی بار ”چاچا“ کی گالیاں کھا چکا تھا۔ تفریح لینے کی خاطر اس کو ڈانٹ کر کہا۔ ”چپ کر بد معاش!“ بس پھر کیا تھا۔ ایسی گندی گالیاں دیں گویا طوطانہ ہوا، لوفرفنگا مرد ہو گیا۔ میری ہنسی چھوٹ گئی لیکن میرے ساتھی کا چہرہ شرم خجالت اور غصے سے لال ہو گیا۔ اتنے میں اندر سے سرمد نکل آیا۔ ”ہزار کیسی لہنی“ نے صرف ایک بار بھوں کی آواز نکالی لیکن سرمد نے اتنا ہی کہا۔ ”نوو یور ایکیسی لہنی!“ اور وہ چپ ہو گیا۔ جبکہ چاچا ہمیں بے نقط سناتا رہا۔ بلکہ مالک کے ڈانٹنے پر اس کے ساتھ بھی فوراً اپنا پداری رشتہ جوڑ دیا۔ تھوڑی دیر اول فول بکا اور خاموش ہو کر گردن نیچے سکڑ کر بیٹھ رہا۔

دھوپ میں بچھی کر سیوں پر ہم بیٹھ گئے۔ میں نے مولوی صاحب کو بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا اور بات گھما پھرا کر کرنے کے بجائے صاف لفظوں میں ان کی والدہ اور بیوی کی بیماری اور حکیمی نسخے کا حوالہ دے کر کھالوں کا مطالبہ کر دیا۔ اسی رو میں پوچھ لیا۔ ”مینڈھے نظر نہیں آرہے، کہاں ہیں اور کب ذبح کرنے کا ارادہ ہے؟“

سرمد نے بغیر لگی لپٹی کے بولنا شروع کر دیا۔ ”کھالیں شبیر لے جاتا ہے۔ اس سے چھین کے مولوی صاحب کو کس منہ سے دوں؟ ویسے کسی بھی لمحے میری اپنی کھال اترنے والی ہے۔۔۔۔۔ وہ بھی الٹی مگر میرے خیال میں انسانی کھال حرام ہوتی ہوگی۔۔۔۔۔ ہاں! شاید جوتے وغیرہ بنانے میں کوئی قباحت نہ ہو۔۔۔۔۔ مولوی صاحب دیکھ لیں۔ میں نے وصیت پہلے ہی کر رکھی ہے، آنکھیں اور دیگر

جواغ تلے

”مرزا کرتے وہی ہیں جو ان کا دل چاہے۔ لیکن اس کی تاویل عجیب و غریب کرتے ہیں۔ سچ بات کو غلط دلائل سے ثابت کرنے کا یہ ناقابل رشک ملکہ شاذ و نادر ہی مردوں کے حصے میں آتا ہے۔ اب سگریٹ کو ہی لیجیے۔ ہمیں کسی کے سگریٹ نہ پینے پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن مرزا سگریٹ چھوڑنے کا جو فلسفیانہ جواز ہر بار پیش کرتے ہیں۔ وہ عام آدمی کے دماغ میں بغیر آپریشن کے نہیں گھس سکتا۔

مہینوں وہ یہ ذہن نشین کراتے رہے کہ سگریٹ پینے سے گھریلو مسائل پر سوچ بچار کرنے میں مدد ملتی ہے اور جب ہم نے اپنے حالات اور ان کی محبت سے قائل ہو کر سگریٹ شروع کر دی اور اس کے عادی ہو گئے تو انہوں نے چھوڑ دی۔ کہنے لگے۔ ”بات یہ ہے کہ گھریلو بجٹ کے جن مسائل پر سگریٹ پی کر غور کیا کرتا تھا وہ دراصل پیدا ہی کثرت سگریٹ نوشی سے ہوئے تھے۔“

رانگ نمبر

ایک اور سنگین غلط فہمی جس میں خواص و عوام مبتلا ہیں، اور جس کا ازالہ میں رفاه عام کے لیے نہایت ضروری خیال کرتا ہوں، یہ ہے کہ مرغیاں دڑبے اور ٹاپے میں رہتی ہیں۔ میرے ڈیڑھ سال کے مختصر مگر بھرپور تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ مرغیاں دڑبے کے سوا ہر جگہ نظر آتی ہیں اور جہاں نظر نہ آئیں، وہاں اپنے ورد و نزول کا ناقابل تردید ثبوت چھوڑ جاتی ہیں۔ ان آنکھوں نے بارہا غسل خانے سے اٹھے اور کتابوں کی الماری سے جیتے جاگتے چوزے نکلتے دیکھے۔ لحاف سے کڑک مرغی اور دڑبے سے شیو کی پالی برآمد ہونا، وزمرہ کا معمول ہو گیا اور یوں بھی ہوا کہ نیلی فون کی گھنٹی بجی اور میں نے لپک کر ریسور اٹھایا۔ مگر میرے ہیلو! کہنے سے پیشتر ہی مرغ نے میری ٹانگوں کے درمیان کھڑے ہو کر اذان دی اور جن صاحب نے ارزاہ تملطف مجھے پادفرمایا تھا انہوں نے ”سوری! رانگ نمبر!“ کہہ کر جھٹ فون بند کر دیا۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ”چراغ تلے“ سے اقتباس

اعضا عطیہ کرنے کی غرض سے۔ اسی وصیت میں اضافہ کر دوں گا کہ کھال مولوی صاحب کی ہوئی..... ویسے معزز خواتین کے لیے جائے نماز کے نیچے روٹی کے گدے بچھانے سے زیادہ آرام ملے گا۔ اور پھر یہ دونوں بھیڑیں نہیں بلکہ ان کے زہیں۔ کہیں خواتین کے نیچے ان کی کھال بچھانا معیوب نہ ہو۔“

کوشش بسیار سے بھی میں ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ مولوی صاحب نے لال بھوکا ہو کر کہا۔ ”صد افسوس! گھر آئے مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک! آپ جیسے لوگوں سے عالم دین کی قدر کرنے کی توقع رکھنا ہی غلط ہے۔ ساتھ آئے معزز شخص کا تو خیال کر لیتے..... ویسے اس لڑکے سے آپ کا تعلق کیا ہے؟“

سرمہ کے چہرے سے برہمی کا رتی بھرتا اثر نہ ملا۔ اسی سرسری سے لہجے میں بولا۔ ”شبیر اور میرے تعلق کی نوعیت آپ کے فہم و ادراک سے ماورا ہے۔ جو آپ سوچ رہے ہیں وہ میرے مسلک میں ہے ہی نہیں۔ ذہن پر زیادہ زور دے کر پریشان نہ ہوں.....“

اتنے میں گھر کے پچھلے صحن سے یکے بعد دیگرے دونوں مینڈھے بڑی بھاری اور بھدی آواز میں بول پڑے۔ مجھے شرارت سوچ گئی اور ماحول کی کشیدگی کو قدرے زائل کرنے کی غرض سے مولوی صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ ”چلو جی! اب تو کھال والوں نے خود بھی انکار کر دیا ہے۔“

مولوی صاحب نے غالباً سوچ رکھا تھا کہ کھالوں کا عطیہ ملنے کے ساتھ ساتھ باتوں باتوں میں ہر ماہ گوشت حاصل کرنے کی راہ بھی ہموار کر لی جائے گی لیکن معاملہ یکسر الٹ گیا۔ میں صحیح طور پر سمجھ نہ پایا کہ مولوی کو اتنی زیادہ مایوسی کیوں ہوئی ہے۔ ممکن ہے ہنک بھی محسوس کی ہو۔ راستے میں بولنے لگے۔ ”راہ سے بھٹکا ہوا ایسا شخص جس آبادی میں رہے گا، وہاں اللہ کی رحمت بھی نازل نہیں ہوتی۔ پچھلی بقر عید پر اس شخص نے قربانی دی نہیں اور ویسے ہر مہینے بکرا ذبح کرتا ہے۔ الٹی کھوپڑی کا انسان اللہ کا باغی ہے۔ میں چیز مین سے بات کروں گا کہ اگر خیر اور بھلائی چاہتے ہیں تو اس بندے سے نجات حاصل کرنے کا کوئی راستہ نکالیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح ہاؤسنگ اسکیم پر چھائی نحوست چھٹ جائے گی..... غضب خدا کا، معصوم پرندے کو مغالطات سکھا رکھی ہیں۔ ایسی بے ہودگی ہوتے ہی نہ دیکھی تھی۔“

طوطے کی گالیاں مجھے بری نہیں لگتی تھیں۔ ایک روز

سرمہ سے پوچھ لیا کہ ایسی نرالی صلاحیت اس پرندے میں کیسے پیدا ہوگئی۔ کیا بہت زیادہ محنت کرنا پڑی تھی؟ اس نے بتایا کہ طوطا ایک مرحوم دوست کی نشانی ہے۔ جس کی بیماری لاعلاج قرار دیے جانے پر سارا سارا دن اس سے باتیں کرتا یا میرے انتظار میں رہتا۔ میرے جانے پر ہم تین ہو جایا کرتے تھے۔ میری غیر موجودگی میں اس واحد ہم نشین سے باتیں کرتا، گالیاں بکتا اور جواب میں گالیاں سن کر خوش ہوتا۔ بستر پر لیٹے ہوئے اس کو سینے پر بٹھائے رکھتا۔ آخری دنوں میں جب موت کی چاپ آس پاس سنائی دینے لگی اور بولنے کی زیادہ سکت نہ رہی، تب بھی طوطا سینے پر یادائیں بائیں بیٹھا رہتا۔ مرنے سے پہلے مجھے اس کا خیال رکھنے کی بار بار تاکید کی تھی۔ مجھے خود بھی بہت عزیز ہے۔ ہزار کیسی لینس اور چاچا کے سوا میرے پاس اپنا ہے کون؟“

وہ واحد موقع تھا جب سرمہ نے میرے ساتھ کوئی دل کی بات کی اور تمکین ہو گیا۔ چند لمحوں بعد۔ ”بے وفا کی کے حوالے سے ”طوطا چشمی“ کی مثل غلط گھڑی گئی ہے۔ دوست کی وفات کے بعد کئی دن تک چاچا اداس رہا تھا۔ چونچ پروں میں چھپا کر چپ چاپ پڑا رہتا تھا۔ ہم دونوں گالم گلوچ کر کے ہمیشہ کے لیے پھڑپھڑ جانے والے ہم نفس کی یاد تازہ کر لیتے ہیں۔“

شروع میں رات کو کسی وقت سرمہ ہاؤس سے آگے جنگل میں اچانک فائر کی آواز گونج اٹھی۔ سیکورٹی کا عملہ اس کے گھر سے آگے جنگل میں جانے سے انکار کر دیتا۔ جنگل جانوروں کے علاوہ حشرات الارض کا بھی خوف تھا۔ سرمہ نے خود ہی بتا دیا کہ وہ رات کو ہزار کیسی لینس کے ہمراہ گھومنے نکلتا ہے اور جنگل جانوروں کو بھگانے کے لیے صرف ہوائی فائر کرتا ہے۔ عجیب شخص تھا۔ ہاری سمجھ سے بالاتر۔ ایسی پرخطر تفریح سے کوئی جنونی ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

سرمہ کی دعا قبول نہ ہوئی اور ہاؤسنگ اسکیم ترقی کرنے لگی۔ پچھلے حصے سے جنگل کی کٹائی شروع ہوگئی اور گلیاں، سڑکیں پختہ ہونے لگیں۔ حسن اتفاق سے سرمہ ہاؤس کے اڑوس پڑوس میں کسی الاٹی نے گھر بنانے میں دلچسپی نہ لی لیکن سڑک کے پار بالمقابل تین بڑے پلاٹوں پر تعمیراتی کام کا آغاز ہو گیا۔ آبادی میں اضافہ ہونے پر سرمہ نے گزشتہ دو برسوں سے جانور ذبح کرنے کا سلسلہ ترک کر رکھا تھا۔ صرف بکی پکائی دیکھ مٹکوا کر تقسیم کر دیتا..... مسجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھ گئی۔ مولوی علی احمد کی حیثیت میں استحکام آ گیا لیکن شاید وہ کھالوں سے محرومی والا صدمہ بھولا

نہیں تھا۔ موقع ملنے ہی سرمہ کو ہدف تنقید بنا لیتا۔ مجھے بھی گوشت نہ ملنے پر ہلکا پھلکا رنج ضرور ہوا تھا لیکن سرمہ کی شخصیت میں لازماً کوئی ایسی کشش تھی کہ ایک طرفہ طور پر ہی تعلق نباہے چلا گیا۔ اس کا رویہ بدستور وہی رہا۔ گرم جوشی نہ سرد مہری۔

ایک مرتبہ بہت پہلے، طوطے کے حوالے سے مرحوم دوست کا تذکرہ چھڑنے پر سرمہ نے کسی حد تک اپنا دکھ بیان کر دیا تھا لیکن دوست کا نام تک نہ بتایا اور ذاتی زندگی کے بارے میں بھی کچھ نہ بولا۔ ان دنوں نہ جانے کیوں کھلنے لگا اور پتا چل گیا کہ بہت امیر خاندان میں پیدا ہوا۔ باپ نے اس کے دادا کی مرضی کے خلاف کراچی میں منیم ایک گھرانے کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ ابھی یہ چار سال کا تھا کہ باپ حادثاتی موت مر گیا۔ دادا نے بہو کو قبول نہ کیا اور اس کے والدین کو بلا کر بیٹی ان کے حوالے کر دی۔ معقول مالی مدد کے علاوہ ڈھیر ساری دھمکیاں بھی دیں۔ بیوہ نے مجسٹریٹ کے روبرو اپنے بیان حلفی کی توثیق کر دی کہ میں مسماۃ..... بغیر کسی بیرونی دباؤ کے بقائمی ہوش و حواس، اپنی رضا اور رغبت سے بیٹے کو دادا کے حوالے کر رہی ہوں تاکہ اس کی بہتر انداز میں کفالت اور تعلیم و تربیت کی جاسکے اور خود نئے سرے سے گھر بسا کر شرعی تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکوں لہذا کسی قسم کا قانونی سقم باقی نہ رہا۔

سرمہ نے ہر وہ کام کیا جو دادا کو ناپسند تھا۔ جب اسے ماں کے بارے میں صحیح ادراک ہوا تو تیرہ سال کی عمر میں گھر سے موٹی رقم چرا کر ماں کو تلاش کرنے کراچی بھاگ گیا۔ دادا نے کم شدگی کی رپورٹ درج کرادی اور اپنے کارندوں کے ذریعے خود بھی تلاش کروا تا رہا۔ سرمہ پانچ چھ مہینے کراچی میں چھپتا پھرا۔ شمالی علاقہ جات کے رہنے والے مختلف لوگوں سے ملتے ملائے بالآخر ماں کا پتا لگا لیا۔ جو ایک بڑی ٹریول ایجنسی میں بطور ریپرنٹنٹ ملازمت کر رہی تھی۔ دفتر جانے کے لیے کہنی کی گاڑی میں بیٹھنے لگی تھی۔ جدید تراش کی چٹلون پہنے یورپی عورت کے روپ میں ماں کو دیکھ کر مایوسی ہوئی لیکن ان جانی سی خوشی اور کسک بھی محسوس کی۔ البتہ تنہیال والوں نے اسے قبول نہ کیا۔ اسے دادا یہیں لے آئے۔ دادا کا شمار ملک کے بڑے ٹرانسپورٹرز میں ہوتا تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ پوتا زچ کرنے پر تلا ہوا ہے لیکن ہمت نہ ہاری اور بے دریغ پیسا خرچ کرتا رہا۔ بوڑھے شخص کی مجبوری یہ بنی کہ واحد زندہ بچ رہنے والا بیٹا خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا، جس سے صرف تین بیٹیاں بچیں اور بیوہ

بہو سے ماموں بھانجی کا سگارشہ تھا۔ پوتے کو راہ راست پر لانے کی غرض سے نئی حکمت عملی اختیار کی اور فیصلہ کن انداز میں مخاطب ہوا۔ ”تم یہ فضول خیال اپنے دماغ سے نکال دو کہ مجھے توڑ ڈالو گے۔ پورے پنجاب کی سڑکوں پر میری کروڑوں کی لاریاں چل رہی ہیں۔ اللہ نے جتنی دولت اور عزت دی، اس سے بڑا جگر عطا کیا ہے۔ بڑے سے بڑا صدمہ سہنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ بیس سال کے ہو گئے ہو، اب سن بھل جاؤ۔ شریعت کے مطابق یتیم پوتے کا اپنے دادا کی وراثت میں حصہ نہیں بنتا لیکن میں تجھے سب کچھ دینا چاہتا ہوں۔ یہ میرا اختیار ہے۔ تمہاری ماں کے بارے میں میرا فیصلہ درست ثابت ہوا۔ وہ جس طرح کی زندگی گزار رہی ہے، ہم خاندانی لوگ برداشت ہی نہیں کر سکتے.....“

نانا کے بقول، وہ شریف لوگ تھے اور دادا خاندانی۔ سرمہ ذہنی طور پر الجھ گیا کہ وہ خود کون ہے۔ اس نے ماں کے بیان حلفی میں یہ جملہ بھی پڑھا تھا کہ باقی کی زندگی شریعت کے مطابق گزارنا چاہتی ہے۔ دادا بھی شریعت کی باتیں کرتے ہیں۔ جبکہ معاشرے کی اصل تصویر اتنی بھیانک ہے کہ جنگل کا قانون نافذ کرنے کی صورت میں بہتری آنے کا گمان بس گمان ہی رہے گا۔

نقد رقم کے علاوہ، مرحوم باپ کی پسندیدہ گاڑی شیور لیٹ امپالا لے کر سرمہ نے گھر چھوڑ دیا اور کراچی چلا گیا۔ جو اکیلے میں ایسی مہارت حاصل ہوئی کہ کئی کئی دن جان بوجھ کر ہارتا اور جب جی چاہتا، سب کچھ سمیٹ کر چل دیتا۔ جب وہ شفلنگ کرتا تو دیکھنے والے پلک جھپکنا بھول جاتے مگر کبھی پکڑا نہ گیا۔

مخصوص حلقوں میں سرمہ اتنا ہر دل عزیز ہو گیا کہ ہارنے والے بھی بد مزہ نہ ہوتے۔ اونچے طبقے کے مرد و خواتین میں برابر مقبول ہوا۔ بیگمات رمی کھیلنے کے لیے شوق سے بلاتیں۔

کراچی میں طویل قیام کے عرصے میں ماں سے اس کے دفتر میں کئی ملاقاتیں کیں۔ پہلی ملاقات پر جب وہ بیٹے کو باہر رخصت کرنے آئی تو شیور لیٹ امپالا دیکھ کر رو پڑی اور ایک بار پھر سینے سے لگا لیا۔ تمہارا مرحوم باپ اسی گاڑی میں تھا، جب ٹکٹ لینے آیا اور میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں کی اس گاڑی کے ساتھ بڑی یادیں وابستہ ہیں۔“

اس عرصے میں دادا نے دو مرتبہ کراچی آ کر ملاقات کی۔ سرمہ نے دیکھا کہ اس کا دادا واقعی بڑے مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ بوڑھا ہو کر بھی کمزور نہیں پڑا۔ بڑے صدمے

السُّلَامُ
عَلَيْهِ

رضوانہ صاحبہ

پہو۔

مصر کی سرزمین پر فرعونی سازشیں اور

پیغمبر کے معجزات کا احوال



فرعون مصر عیسٰی دوم اپنے درباریوں کے جھرمٹ میں گھرا بیٹھا تھا اور اس عالم میں کہ جو آتا تھا پہلے اسے سجدہ کرتا تھا اس کے بعد اپنی نشست سنبھالتا تھا۔ یہ سجدہ ریزی اس لیے تھی کہ فرعون کو صرف بادشاہ ہی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ”راع“ کا اوتار مانا جاتا تھا اور ”راع“ کا مطلب تھا سورج۔ مصریوں کے عقیدے کے مطابق تربیت کائنات کا معاملہ ”راع“ دیوتا کے سپرد تھا اور دنیا میں اس کا صحیح مظہر فرعون تھا۔

ہم دونوں ہنسنے لگے اور کھانے میں تھپل آ گیا۔ سرمد کہنے لگا۔ ”پہلے طعام پھر کلام۔ فارغ ہو لیں، پھر بتاتا ہوں کہ مسجد جانے کا اصل مقصد کیا ہے۔“

جب تمام درباری حاضر ہو گئے تو اس کا وزیر ہامان بھی درباریوں کا شمار کرنے کے بعد فرعون کے برابر ایک متشکری پر بیٹھ گیا۔ یہ کرتی اسے دوسرے درباریوں سے ممتاز کر رہی تھی۔ دو خادیاں پر دسے سے نمودار ہوئیں اور فرعون کے دائیں بائیں آکر کھڑی ہو گئیں۔ ان کا آنا اس بات کی علامت تھی کہ تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اب فرعون درباریوں سے خطاب کرے گا۔

فرعون نے اپنے درباریوں سے خطاب کرنا شروع کیا۔
”تم سب لوگ جانتے ہو کہ یعقوب (علیہ السلام) کی قوم بنی اسرائیل کے بہت سے لوگ ہماری زرخیز زمین مصر میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اس وقت کا فرعون مصر یعقوب کے بیٹے یوسف (علیہ السلام) پر بہت مہربان تھا۔ اسی کی عنایت سے یہ لوگ جانبان جیسے زرخیز علاقے میں آباد ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ ان لوگوں پر دوسدیاں گزر گئیں۔ اب یہ اپنے علاقے تک محدود نہیں رہے بلکہ پورے مصر میں پھیل گئے ہیں۔ یہ اتنے چالاک اور شریر ہیں کہ انہوں نے مصریوں کا جینا حرام کر دیا ہے۔ ان میں سے اکثریت ان کی ہے جو اب تک اپنے اجداد کے دین پر قائم ہیں اور میرے منکر بنے ہوئے ہیں۔ مجھے مشورہ دو کہ ان پر کیسے قابو پایا جائے۔ اس سرکش قوم کی ناک میں ٹیکل کیسے ڈالی جائے اور انہیں میں اپنا مطیع کیسے بناؤں؟“

سب سے پہلے ہامان نے اپنی رائے دینا ضروری سمجھا۔ ”ان مفسدوں کا صرف ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ ان پر فوج کشی کی جائے۔ ان کی بستیاں مسمار کر دی جائیں۔ ان کا قتل عام کیا جائے تاکہ ان کی تعداد کم ہو جائے، خصوصاً ان جو انوں کو تو کسی حالت میں زندہ نہ چھوڑا جائے۔“

ہامان کی تائید میں بہت سے ہاتھ بلند ہو گئے لیکن فرعون اس رائے سے متفق نظر نہیں آتا تھا۔ آخر اس نے کہنا شروع کیا۔
”جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ اتنی بڑی تعداد کو اپنا دشمن بنالینا دانشمندی نہیں حماقت ہوگی۔ مجھے ”جوشہ“ کی طرف سے کھٹکا لگا رہتا ہے۔ وہاں کا بادشاہ میری شہنشاہیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ میرے مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ وہ حملہ کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہے۔ اگر ہم نے بنی اسرائیل کے خلاف فوجی کارروائی کی تو وہ ہم پر حملہ کرنے میں دیر نہیں لگائے گا اور پھر یہی بنی اسرائیل ہمارا ساتھ چھوڑ کر حبشہ کے حکمران کے ساتھ مل جائیں گے۔ ان کے لیے تو کوئی ایسا طریقہ ہو کہ یہ ناچتے بھی رہیں اور ہم ان کے پاؤں بھی کاٹتے رہیں۔“

تمام درباری آپس میں مشورے کرنے لگے کہ ایسا کیا طریقہ ہو کہ جس سے لاشی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے۔ فرعون زیر لب مسکرا رہا تھا جیسے وہ جانتا ہو کہ جو تجویز اس کے پاس ہے اس تک کوئی بھی نہ پہنچ سکے گا۔ بالآخر سب نے عاجز آکر فیصلہ فرعون پر چھوڑ دیا۔

”دیوتاؤں کے دیوتا، جو حکمت و دانائی آپ کو میسر ہے ہمیں کہاں حاصل۔ ہم تو ہر فیصلہ تلوار سے کرتے ہیں۔ آپ جیسا دماغ مصر کی سرزمین پر کس کے پاس ہے۔ آپ ہی کوئی تجویز دیجیے۔ ہم سب اس پر عمل کرنے کے پابند ہوں گے۔“
”تو سنو.....“ فرعون نے اپنی دائیں آنکھ قدرے دباتے ہوئے کہا۔ ”کسی قوم کی صلاحیتوں کو اگر رنگ لگانا مقصود ہو تو اس کی عزت نفس کو مار دو۔ اسے غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دو۔ ایک عرصے تک غلامی کی زندگی گزارنے والی قوم پست ہمت ہو جاتی ہے۔ اس کے عقائد کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اس کی نظر کمزور ہو جاتی ہے۔ وہ صرف اتنا دیکھ سکتی ہے جتنا اسے دکھانا چاہو۔ فیصلہ کرنے کی قوت کمزور ہو جاتی ہے۔ پھر وہ قوم انسانوں کی قوم نہیں رہ جاتی، چلتی پھرتی کٹھ پتلیاں بن کر حاکم کے حکم کا تماشا دکھاتی پھرتی ہے۔“

”بنی اسرائیل کو بھی اس حال پر پہنچا دو۔ ان سے بیگار لو۔ دن رات مشقت کراؤ۔ انہیں تیسرے درجے کا شہری بنا کر رکھ دو۔ انہیں باور کراؤ کہ تم ہماری زمین پر صرف غلام بن کر رہ سکتے ہو۔ انہیں قدم قدم پر یاد دلاؤ کہ وہ مصریوں سے کم تر ہیں۔ ان کے پیروں میں تشدد کی زنجیریں ڈالے رکھو تاکہ وہ بھاگ بھی نہ سکیں۔ بھاگ گئے تو ہمارے کام کون کرے گا۔“ فرعون نے قہقہہ لگایا۔

”دیوتاؤں کے دیوتا! ہمارے لیے کیا حکم ہے۔ ہم کس طرح بنی اسرائیل کے لاکھوں لوگوں سے بیگار لیں؟“
”مجھے معلوم تھا تم لوگ یہ سوال ضرور کرو گے۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ پہلے ہی بنا رکھا ہے۔ میں دو نئے شہر آباد کرنے والا ہوں۔ ان میں سے ایک شہر کا نام ”پتوم“ ہوگا۔ اور دوسرے شہر کا نام ”رعیم“ ہوگا۔ ان دونوں شہروں کی تعمیر کے لیے بنی اسرائیل کی طرف سے مفت کے مزدور لیے جائیں گے۔ میں ان پر ایسے سخت بیگار لینے والے مقرر کر دوں

گا جو ایذا رسانی میں بے مثال ہوں گے۔ بنی اسرائیل سے کام بھی لیں گے اور ان پر کوڑے بھی برسائیں گے۔“
بنی اسرائیل کے گھروں پر مصری سپاہی دستکیں دیتے نظر آنے لگے جس کو بھی تو مند دیکھا اس تک فرعون کا پیغام پہنچا دیا کہ نئے شہر کی تعمیر میں اسے دوسرے ہم قوموں کے ساتھ ہاتھ بٹانا ہے۔ جس نے انکار کیا، اس پر کوڑوں کی بارش ہونے لگی۔ بنی اسرائیل کو بھیڑ بکریوں کی طرح گاڑیوں میں لا کر اس مقام تک پہنچا دیا گیا جہاں شہر ”پتوم“ کی تعمیر ہونی تھی۔ توریت میں اس شہر کا نام ”پتوم“ تحریر کیا گیا ہے۔

جو مقام اب ”تل مخطہ“ کے نام سے مشہور ہے یہیں پتوم یا برتوم یا پتوم شہر آباد تھا اور جس جگہ اب ”قنیر“ یا قدیم مصری زبان کے اعتبار سے ”خست نقر“ واقع ہے اس مقام پر ”رعیم“ آباد تھا۔
ان شہروں کو آباد کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مصر کی بحری جانب کے وسط میں یہ شہر قلعے کا کام دیں۔ ان شہروں کی چار دیواری کے جو کھنڈر معلوم ہوئے ہیں وہ شہادت دیتے ہیں کہ یہ دونوں شہر مصر کے بہترین حفاظتی قلعے تھے۔

بنی اسرائیل کے خوب صورت تند و مند نوجوان چیری مشقت کرنے لگے۔ بیگار لینے والوں نے گارا اور اینٹ بنوا کر اور کھیت میں ہر قسم کی خدمت لے لے کر ان کی زندگی سخت کر دی۔ ان کے بزرگ جب انہیں اپنے بزرگوں کی زبانی سنی ہوئی کہانیاں سناتے تھے اور بتاتے تھے کہ ہماری قوم کس شان سے مصر میں داخل ہوئی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں کس سرکاری اعزاز کے ساتھ رہتی تھی تو نوجوانوں کی آنکھیں آنسو بہانے لگتی تھیں۔ وہ چھپ چھپ کر موجودہ فرعون کو برا بھلا کہتے تھے لیکن بے بس تھے۔ فرعون نے ظلم کا ایسا بازار گرم کر رکھا تھا کہ کسی کو آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں تھی۔

جب عام لوگوں نے دیکھا کہ سرکاری سطح پر بنی اسرائیل کو حقارت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے تو ان کا رویہ بھی تبدیل ہو گیا۔ بنی اسرائیل کا جو بھی شخص نظر آتا، لوگ اس کی طرف نفرت سے دیکھتے۔ بات بات پر جھگڑنے لگتے۔ کبھی ماری پیٹ کی نوبت بھی آ جاتی۔

بنی اسرائیل کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک ہو رہا تھا۔
فرعون کے اقدامات نے بنی اسرائیل کو حقیر ضرور بنادیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ پھل پھول رہے تھے۔ وہ جب ان کی بڑھتی ہوئی تعداد اور خوش حالی کو دیکھتا تو فکر مند ہو جاتا تھا۔

اس کے مقررہ کردہ دونوں شہر تعمیر ہو چکے تھے۔ اب وہ سوچنے لگا تھا کہ کون سا قدم اٹھائے جس سے بنی اسرائیل کی طاقت بالکل ہی ختم ہو کر رہ جائے لیکن کوئی ترکیب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔
ایک روز فرعون نے خواب میں دیکھا کہ ایک آگ بیت المقدس کی طرف سے چلی آ رہی ہے۔ وہ آگ نہایت قریب پہنچ گئی اور اس نے مصر کے گھروں اور تمام قبیلوں (فرعون کی قوم) کو جلا ڈالا لیکن بنی اسرائیل کو آگ نہ پہنچی۔

وہ سو کر اٹھا تو سخت پریشان تھا۔ خواب سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ مصر پر کوئی آفت آنے والی ہے لیکن کب آئے گی، اس کا سبب کیا ہوگا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنے ملک کے کاہنوں، نجومیوں اور جادوگروں کو بلا بھیجا۔ جب یہ سب جمع ہو گئے تو اس نے یہ خواب ان کے سامنے رکھا اور ان سے تعبیر مانگی۔ ان لوگوں نے حساب کتاب لگا کر اسے بتایا۔
”ایک بچہ بنی اسرائیل میں ایسا پیدا ہوگا جو بڑا ہو کر اہل مصر کی ہلاکت کا سبب بنے گا۔ اہل مصر کی ہلاکت اس کے ہاتھوں ہوگی۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو بلکہ ضرور بتاؤ کہ وہ بچہ پیدا ہو چکا ہے..... نہیں تو کب ہوگا؟“
”ہم صرف اتنا بتا سکتے ہیں کہ یہ بچہ ابھی پیدا نہیں ہوا اور یہ بتا سکتے ہیں کہ ایک سال کے اندر اندر یہ بچہ اس دنیا میں آ جائے گا۔ صحیح تاریخ بتانا ہمارے بس میں نہیں۔“

”میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ بچہ ابھی پیدا نہیں ہوا۔ اب میں بنی اسرائیل کے کسی بچے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“
کاہن اور نجومی لرزتے کانپتے رخصت ہو گئے۔ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو اپنے پاس بلایا۔

”نجومیوں نے مجھے بتایا ہے کہ بنی اسرائیل اہل مصر کی ہلاکت کا سبب بنیں گے۔ یہ تعبیرن کر میں سخت پریشان ہوں۔“
”میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ تمام بنی اسرائیل کو تہ تیغ کر ڈالیں لیکن آپ نے میری تجویز کو قابل عمل نہ سمجھا۔“
”اے وزیر! تو نے ٹھیک کہا تھا۔ اب اس کا وقت آ گیا ہے لیکن تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ۔ نجومیوں نے بتایا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو ہماری ہلاکت کا سبب بنے گا۔ اے وزیر! اگر وہ بچہ دنیا میں آتے ہی قتل کر دیا جائے

”میں خود کو چھپالوں گی لیکن عورتوں کے ذریعے یہ بات پھیلے گی ضرور۔ جن کے بچے فرعون نے مار دیے ہیں وہ سوچتے رہتے ہیں کہ دوسروں کے بچے بھی کیوں بچیں۔ دوست دشمن سب ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ میں کیسے چھپاؤں گی؟“

”ہم جتنی احتیاط کر سکتے ہیں کریں گے۔ اس کے بعد اللہ ہمارا ناصر و مددگار ہے۔“

دن بھر کی مشقت کے بعد شوہر کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں لیکن یو کا بد کی نیند اچٹ گئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی ضرور تھی لیکن نیند آنکھوں سے نکل کر دور جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے اندیشے آرہے تھے۔ کبھی خود کو تسلی دے لیتی تھی کبھی خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ اسے اپنے خدا پر بھروسہ تھا لیکن بشری کمزوری بھی غالب آ جاتی تھی۔ اسی عالم میں اسے نیند آ گئی۔ وہ خواب میں بھی کچھ ایسے ہی مناظر دیکھتی رہی۔

صبح سو کر اٹھی تو یہ بستی اسے ظالموں کی بستی معلوم ہو رہی تھی۔ یہاں کوئی بھی مجبوری کر دے گا اور گماشتے اس کے پیچھے لگ جائیں گے۔ اس کے بچے کو مار دیں گے۔

اس نے شوہر کی ہدایت کے مطابق باہر نکلتا بند کر دیا تھا۔ کوئی عورت ملنے بھی آتی تو اپنے بدن کو خوب اچھی طرح ڈھانپ کر اس سے ملتی تھی تاکہ اس کے بدن میں ہونے والی تبدیلیوں کو عورتیں بھانپ نہ لیں۔

جب کئی مہینے گزر گئے تو عجیب بات اس کے مشاہدے میں آئی۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا جبکہ وہ پیٹ میں بچے کی حرکت کو محسوس کر رہی تھی۔ اس سے اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی حالت دوسروں پر ظاہر ہو۔ اللہ کی اس نشانی کے بعد اسے یہ بھی یقین آ گیا تھا کہ اللہ جس طرح اس کی حالت کو چھپا رہا ہے، اسی طرح اس کے بچے کی بھی حفاظت کرے گا۔

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی اور ولادت کا وقت نزدیک آ گیا۔ کسی دائی کو بلانا خطرناک ہو سکتا تھا۔ یو کا بد تنہا اس عمل سے گزری۔ خدا نے اسے نہایت خوب صورت اور غیر معمولی صحت مند بچہ عنایت کیا۔

یو کا بد نے اپنے آپ کو چھپا لیا تھا۔ حمل کی علامتیں بھی زیادہ ظاہر نہیں ہوتی تھیں لیکن اب تو معاملہ روز روشن کی طرح تھا۔ بیٹے کو کیسے چھپائیں۔ ایک کوٹھری میں بند ہو گئیں۔ اس کے باوجود یہ دھڑکا ہر وقت لگا رہتا تھا کہ اگر اس کے رونے کی آواز باہر چلی گئی تو قیامت آ جائے گی۔ ظالم فرعون اسے قتل کر دے گا۔

آپ اسی غم و فکر میں تھیں کہ اللہ کی طرف سے ان کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ ایک صندوق بنا کر اس بچے کو اس میں رکھ دیں اور صندوق کو کسی رسی سے باندھ دیں۔ بچے کو صندوق ہی میں رکھیں اور دودھ پلاتی رہیں۔ جب گھر میں کسی کے آنے کا خوف ہو تو صندوق دریا میں بہا دیں اور ڈوری کا سرا اپنے پاس کہیں باندھ کر رکھیں۔ جب لوگ چلے جائیں تو پھر واپس کھینچ لیں۔

وہ ایسا ہی کرتی رہیں۔ یہ بچہ دو تین مہینے کی عمر کو پہنچ گیا۔ انہوں نے بید اور سرکنڈوں کی مدد سے ایک صندوق بنایا تھا جس کے نیچے چکنی مٹی اور رال لگا دی تھی تاکہ پانی صندوق کے اندر نہ جائے۔

آپ کا گھر چونکہ دریا کے کنارے تھا اس لیے آسانی تھی۔ جب کسی کے آنے کا خوف ہوتا تھا تو اس صندوق کو دریا میں اتار دیتی تھیں اور ڈوری کا سرا گھر میں کسی جگہ باندھ دیتی تھیں۔ خطرہ ٹل جاتا تو ڈوری کھینچ کر صندوق کنارے پر لے آتی تھیں۔

”اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہو پھر جب تجھ کو ڈر ہو اس کا تو ڈال دے اس کو دریا میں اور نہ خطرہ کر اور نہ ممکن ہو۔ ہم پھر پہنچا دیں گے اس کو تیری طرف۔“ (قصص)

یو کا بد پر جو کچھ لقا ہوا تھا، وہ اس کے مطابق عمل کرتی رہیں۔ ایک مرتبہ کچھ عورتیں ان سے ملنے آئیں۔ انہوں نے بچے کو دریا میں ڈال دیا لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ رسی کا سرا اپنے پاس رکھنا بھول گئیں۔ کچھ دیر بعد خیال آیا تو اپنا سر پیٹ لیا۔ مامتا سے بھر ا دل بے قرار ہو گیا۔ عورتیں پوچھنے لگیں کہ ایسا کیا گم ہو گیا جو تم اتنی بے قرار ہو گئیں۔ قریب تھا کہ وہ اس راز کو ظاہر کر دیتی لیکن اللہ نے ان کا دل مضبوط کر دیا۔

”قریب تھی کہ ظاہر کر دے بے قراری کو اگر ہم نہ مضبوط کر دیتے اس کے دل کو تاکہ رہے یقین کرنے والوں میں۔“ (قصص)

دل کی اس مضبوطی کے باوجود یہ خیال پھر بھی دل کو ستا رہا تھا کہ دیکھا تو جائے بچہ کس کے ہاتھ لگتا ہے، کون اسے اٹھاتا ہے۔ کسی صورت قرار نہ آتا تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو آواز دی۔

”اے بیٹی! تو دریا کے کنارے کنارے چلتی رہ اور دیکھتی رہ صندوق کے ساتھ کیا گزرتی ہے۔ اسے کون اٹھاتا ہے۔“

جو گزرے مجھے آ کر بتانا۔“

حضرت موسیٰ کی ہمشیرہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ وقفے وقفے سے صندوق کی طرف دیکھتی جاتی تھیں لیکن اس طرح کہ کسی کو شک نہ ہو۔

دریائے نیل سے ایک نہر شاہی محل کی طرف نکالی گئی تھی۔ کچھ دور جا کر صندوق کا رخ شاہی محل کی طرف ہو گیا۔ لڑکی کا دل زور سے دھڑکا۔ ”یہ تو ہمارے دشمن کی طرف جا رہا ہے۔ اے اللہ! میرے بھائی کا خیال رکھنا۔ اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔“ اس نے اور تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ وہ کسی طرح فرعون کے محل تک پہنچنا چاہتی تھی۔ صندوق آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا جبکہ اس کے قدم تیز تھے۔

فرعون اپنی چیمپی ملکہ آسیہ کے ساتھ محل کے جھروکے میں بیٹھا تھا۔ یہاں سے دریائے نیل کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ کنیزیں اور باندیاں ادھر ادھر دوڑتی پھر رہی تھیں۔ فرعون اور آسیہ باتوں میں مصروف تھے۔

مفسرین قرآن ان کے بارے میں بتاتے ہیں کہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے کے مسلمان بادشاہ ریان کی پوتی تھیں۔ ایک قول کے مطابق یہ موسیٰ علیہ السلام کے سلسلے کی بنی اسرائیل خاتون تھیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ آپ کی پھوپھی تھیں۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ یہ مومنہ تھیں اور فرعون کو سجدہ نہیں کرتی تھیں۔

حضرت آسیہ کی دو اولادیں (یکے بعد دیگرے دو بیٹے) مرچکی تھیں۔ یہ اپنے بیٹوں کی یاد میں مغموم رہتی تھیں۔ فرعون آپ سے بہت محبت کرتا تھا اور ہر وقت ان کا دل بہلانے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی نیت سے انہیں یہاں لے کر آیا تھا کہ دریا کی سیر کر کے وہ لطف اندوز ہوں گی۔

اس وقت بھی وہ دریا سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اپنی دونوں اولادوں کو یاد کر رہی تھیں۔

”تم مغموم کیوں ہو۔ تم دو بیٹے کھوپکی ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہارا تیسرا بیٹا پیدا ہوگا اور وہ ضرور زندہ رہے گا۔“

”مجھے تو یہ وہم سا ہو گیا ہے کہ میرا تیسرا بیٹا بھی زندہ نہیں بچے گا۔“

”ایسی مایوسی کی باتیں نہیں کرتے۔ تمہیں دنیا کی ہر نعمت میسر ہے۔ پھر بھی مغموم رہتی ہو۔“

”میں ان نعمتوں کو لے کر کیا کروں گی۔ مجھے تو ایک بیٹا چاہیے تھا۔ مجھ سے ایک نہیں دو دو بیٹے چھن گئے۔“

”ضروری نہیں کہ دو کے بعد تیسرا بھی چھن جائے۔ اپنے دل سے یہ وہم نکال دو کہ تم اب ماں نہیں بن سکتیں یا جو بیٹا پیدا ہوگا، وہ بھی پہلوں کی طرح مر جائے گا۔“

یہ باتیں اتنا طول پکڑ گئی تھیں کہ فرعون اکتانے لگا تھا۔ وہ اپنی ملکہ کو جتنی تسلیاں دے رہا تھا اتنی ہی اس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملکہ کے دوسرے بیٹے کے انتقال کو آج ایک سال ہو گیا تھا۔ آج ہی کے دن اس کا بیٹا اس سے بچھڑا تھا۔

فرعون نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے اس کی توجہ دریا کی جانب مبذول کی اور اس کی تاریخ بیان کرنے لگا۔ حضرت آسیہ کچھ دیر کے لیے بہل گئیں اور دریا پر نظریں جمادیں۔ اچانک ان کی نظر اس صندوق پر پڑی جس میں حضرت موسیٰ کو لٹایا گیا تھا اور جھل کی طرف بہتا چلا آ رہا تھا۔

”وہ دیکھو پانی میں چھوٹا سا صندوق بہتا چلا آ رہا ہے۔“ پھر وہ ایک کنیز سے مخاطب ہوئیں۔ ”بچے جا کر دیکھ تو سہی۔ یہ کیسا صندوق ہے۔“

یہ حکم سنتے ہی ایک کنیز زینہ اتریں اور نہر کے کنارے کھڑے ہو کر صندوق کے کنارے پر آنے کا انتظار کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ صندوق کنارے سے لگ کر چلنے لگا۔ ایک کنیز نے ہاتھ بڑھا کر صندوق کو روک لیا، دوسری نے دوسری طرف سے ہاتھ لگایا اور صندوق کو باہر نکال لیا۔ صندوق کا ڈھکن اوپر سے بند تھا۔ پہلی نے چاہا کہ ڈھکن ہٹا کر دیکھے اندر کیا ہے۔ دوسری نے اسے روک دیا۔

”ہمیں صرف یہ کہا گیا ہے کہ نیچے جا کر دیکھیں یہ کیسا صندوق ہے۔ ہم نے دیکھ لیا، یہ بید اور سرکنڈوں سے بنا ہوا ہے۔ اس کے اندر کیا ہے، یہ دیکھنے کا ہمیں حق نہیں۔“

”تو پھر اسے ملکہ عالیہ کی خدمت میں لے چلو۔ وہی دیکھیں گی اس کے اندر کیا ہے۔ ہم بھی وہاں موجود ہوں گے۔ ہم بھی دیکھ لیں گے۔“

دونوں کنیزوں نے صندوق کو اٹھایا اور ملکہ کے قدموں میں لا کر رکھ دیا۔

”تو نے اسے کھول کر دیکھا..... کیا ہے اس میں؟“

”ہمیں یہ جرات نہیں ہوئی کہ آپ کی اجازت کے بغیر اس صندوق کو کھولتے۔“

”ہو سکتا ہے اس میں کوئی خزانہ ہو۔“ دوسری کنیز نے کہا۔

”اسے کھولو۔“ حضرت آسیہ نے حکم دیا۔

دونوں کنیزوں نے صندوق کھولا۔ حضرت آسیہ نے دیکھا کہ نبوت و رسالت اور جلالت کے انوارات کے ساتھ چمکتے دسکتے چہرے والا ایک انتہائی خوب صورت بچہ اطمینان سے لیٹا ہوا ہے۔ بچے پر نظر پڑتے ہی بچے کی سخت محبت ان کے دل میں جا گزری ہو گئی۔

فرعون کی نظر پڑی تو وہ بھی کچھ دیر کے لیے بچے کا حسن دیکھ کر مبہوت ہو گیا لیکن قریب کھڑے ایک مصاحب نے اس کی توجہ اپنی طرف کر لی۔

”دیوتاؤں کے دیوتا! یہ بچہ مجھے اپنے ناک نقشے سے اسرائیلی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ماں باپ نے اس کی جان بچانے کے لیے اسے دریا میں پھینک دیا ہوگا۔ آپ اسرائیلی بچوں کے قتل کا حکم دے چکے ہیں۔ کہیں یہ وہی بچہ نہ ہو جس کی نشاندہی شاہی خیم پہلے کر چکے ہیں۔ آپ اسے فوراً ذبح کرادیں۔“

مصاحب کی بات سن کر فرعون کے چہرے پر تبدیلی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ حضرت آسیہ کو تشویش ہوئی۔ انہوں نے دخل اندازی مناسب بھی اور فرعون سے مخاطب ہوئیں۔

”ہو سکتا ہے یہ بچہ عبرانی ہو لیکن یہ کیسے ثابت ہوگا کہ یہ وہی بچہ ہے جس کے بارے میں نجومیوں نے پیش گوئی کی تھی۔“

”یہ وہی بچہ نہ ہو لیکن میں اسرائیلیوں کے بچوں کو قتل کرنے کا حکم جاری کر چکا ہوں اور یہ بچہ اسرائیلی ہے۔ میں اسے قتل کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔“

”میں آپ کو ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ میں اسے بیٹا بنا لوں اور یہ ہماری تربیت میں رہے۔“

”یہ تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ تمہارا بیٹا کوئی بیٹا نہیں ہے۔“

”ہاں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ میں سمجھوں گی مجھے تیسرا بیٹا مل گیا۔“

”دنیا کیا کہے گی کہ فرعون اپنے قول سے پھر گیا۔“

”دنیا کچھ بھی کہے مگر میں اب اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اگر یہ مر گیا تو میں بھی مر جاؤں گی۔ یہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔“

”یہ تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا، میری آنکھوں کی نہیں۔ میں اپنے مصاحب کی رائے سے متفق ہوں۔“ حضرت

آسیہ نے فرعون کے تیور بدلے ہوئے دیکھے تو ”آپ“ سے ”تو“ پر اتر آئیں۔

”اس بچے کے قتل سے پہلے تجھے میرے قتل کا حکم جاری کرنا پڑے گا ورنہ میں دریا میں ڈوب کر اپنی جان دے دوں گی۔“

”ایسی ضد کیوں کرتی ہو۔ اگر اس نے ہمیں نقصان پہنچایا؟“

”یہ ہماری تربیت میں رہے گا۔ ہم سے محبت کرے گا۔ ہمیں اپنے ماں باپ سمجھے گا۔ یہ ہمیں کیوں نقصان پہنچائے گا

بلکہ یہ تو ہمارے لیے سودمند ثابت ہوگا۔“

فرعون، حضرت آسیہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ ان کی اس خواہش کو ٹال نہ سکا۔ جس وقت فرعون کے روتے میں نرمی آئی، خدا کی تقدیر دور کھڑی اس پر ہنس رہی تھی۔ ”اے جابر و ظالم بادشاہ! سن لے کہ عظیم ہے وہ ذات جس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور اس کی لکھی ہوئی بات کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اس نے اس بچے کو پالنے اور زندہ رکھنے کا تہیہ کر لیا ہے جس سے تو کانپتا پھرتا ہے جس کے سبب تو نے بے جا اور بے دردی سے بے شمار کلیوں کو ان کے کھلنے سے پہلے ہی قتل کروا دیا۔ قدرت کا کرشمہ دیکھ کہ وہ عظیم ذات اس بچے کو تیرے ہی گھر میں پرورش کروائے گی اور اس پر ہنس نہیں، عین تیرے بستر پر پرورش کرائے گی اور اس کی غذا بھی تیرے کھانے پینے میں سے ہوگی اور اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ اس لیے دکھائے گا تاکہ تو بھی اور تمام مخلوق بھی دیکھ لے کہ بے شک وہی آسمانوں اور زمینوں کا پرورش کرنے والا ہے اور ایسی طاقت و قوت والا ہے کہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔“

”اے ملکہ، اگر تیری یہی خواہش ہے تو اسے لے لے۔ اپنا بیٹا بنا اور اسے پال۔“

”نہیں، یہ صرف میرا نہیں۔ تیرا اور میرا دونوں کا بیٹا ہے۔“ ملکہ نے کہا اور آگے بڑھ کر بچے کو صندوق سے نکال کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”یہ تو میرا موٹی ہے۔“

قبیلہ زبان میں اس کے معنی ہوتے تھے، وہ جو پانی سے نکالا گیا ہو۔ عربی زبان میں یہی نام ”موسیٰ“ بن گیا اور تو یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر حضرت موسیٰ ملی، ہمشیرہ جو کنارے کے ساتھ چلتی ہوئی آئی تھیں اور سارا ماجرا اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھیں کہ کس طرح کنیزیں آئیں اور صندوق اٹھا کر محل میں لے گئیں۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں دیکھ سکتی تھیں لیکن یہ یقین ہو گیا کہ ان کا بھائی فرعون کے محل میں گیا ہے۔ وہ اگلے قدموں دوڑتی ہوئی آئیں اور سارا ماجرا والدہ کے سامنے بیان کر دیا۔ ماں یہ سن کر تڑپ اٹھیں۔ بیٹا بچھڑا تھا سو بچھڑا تھا، غضب یہ ہوا تھا کہ دشمن کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ بے قراری ایسی بڑھی کہ اس راز کو افشا کرنے کی ٹھان لی۔ سوچا کہ اپنے ہم قوموں کو بتائے کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ شاید کوئی اس کی مدد کو آئے۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں لیکن پھر بیٹھ گئیں۔ کوئی تھا جو ان کے دل کو مضبوط کر رہا تھا۔ ان کے دل میں ڈال رہا تھا کہ خدا نے مجھ سے میرے بچے کو جدا کیا ہے، وہی اس کی حفاظت کرے گا۔ وہی اسے مجھ تک لوٹائے گا۔ قرآن ان کے دل کی مضبوطی کی گواہی دے رہا ہے۔

”ادھر اس کی ماں کا دل اڑا جا رہا تھا۔ وہ اس کا راز فاش کر بیٹھتی اگر ہم اس کی ڈھارس نہ بندھا دیتے تاکہ وہ ہمارے وعدے پر ایمان لانے والوں میں سے ہو۔“ (سورۃ قصص)

انہیں کچھ دیر کے لیے اطمینان ہو گیا۔ انتظار کرنے لگیں کہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ قدرت ایسے انتظام کر رہی تھی کہ بچے کو ایک مرتبہ پھر ملا دے۔

حضرت آسیہ نے جب بچے کو صندوق سے نکال لیا اور خوب گلے سے لگا کر اپنا دل ٹھنڈا کر چکیں تو اچانک خیال آیا کہ بچہ نہ جانے کب سے بھوکا ہوگا۔ اب نہیں رو رہا ہے تو کچھ دیر بعد رونے لگے گا۔ اس کے لیے دودھ کا انتظام کیا جائے۔ حکم کی دیر تھی کہ دودھ پلانے والی عورتیں حاضر ہو گئیں۔ باری باری سب نے کوشش کر کے دیکھ لی لیکن بچے کے ہونٹ کسی چھانی تک جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

محل میں رات آگئی تھی۔ ہر طرف بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ بچہ دودھ پینے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ بچے جب بھوک سے بے چین ہوتے ہیں تو رو رو کر یا دولا تے ہیں کہ انہیں دودھ پلایا جائے لیکن کئی گھنٹے گزر چکے تھے، ان کے آنسوؤں نے دودھ کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔

بچے کا اطمینان الگ باعث تشویش تھا۔ کوئی کہتا تھا، بچہ ہم گیا ہے اس لیے نہیں رو رہا ہے۔ کوئی کہتا تھا اس پر کسی نے جادو کیا ہے۔

سب اپنی اپنی باتیں کر رہے تھے اور حضرت آسیہ سخت فکر مند تھیں۔ ان کے دو بیٹے انتقال کر چکے تھے۔ اب انہیں یہ وہم ہو رہا تھا کہ یہ بچہ ان سے منسوب ہو چکا ہے، کہیں یہ بھی نہ مر جائے۔ حکماً طلب کیے گئے، وہ اپنی کوشش کرتے رہے۔ نجومیوں کو بلا یا گیا ان کے علم کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے کوئی بھی یہ نہ بتا سکا کہ یہ وہی بچہ ہے جو فرعون کی ہلاکت کا باعث بنے گا۔ صرف یہ بتا سکے کہ بچے پر کسی نے جادو نہیں کیا ہے۔ دودھ کیوں نہیں پی رہا ہے، ہم یہ بتانے سے قاصر ہیں۔

بتاتے بھی کیسے۔ یہ خدائی راز تھے جن تک ان کی عقلیں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

بچے کے دودھ نہ پینے کی وجہ قرآن نے اس طرح بتائی۔

”اور ہم نے پہلے ہی بچے پر دودھ پلانے والیوں کی چھاتیاں حرام کر رکھی تھیں۔“ (سورۃ قصص)

رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح ہوتے ہی حضرت آسیہ نے محل کی دانیوں کو حکم دیا کہ وہ بچے کو ایک کپڑے میں لپیٹیں اور شہر اور بازار وغیرہ میں عورتوں کے پاس لے جائیں۔ شاید اسے کسی عورت کا دودھ پسند آجائے۔

ایک اداس صبح حضرت موسیٰ کے اپنے گھر میں بھی طلوع ہوئی۔ یوں کہ رات بھر اپنے بچے کی یاد میں تڑپتی جاگتی رہی تھیں۔ صبح ہوتے ہی اپنی بڑی بیٹی یعنی حضرت موسیٰ ملی، ہمشیرہ سے کہا کہ وہ فرعون کے محل کی طرف جائے اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ باہر کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ہو سکے تو محل کے اندر جا کر معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ ان کے بیٹے پر کیا گزری۔ وہ لڑکی گھر سے نکلی اور محل تک جانے کے لیے ایک بازار سے گزری۔ دیکھا کہ ایک جگہ لوگوں کی بھیڑ جمع ہے۔ وہ لڑکی بچی ہی تو تھی، کھیل تماشا سمجھ کر بھیڑ کی طرف لپکی۔ وہاں اس نے لوگوں کی باتیں سنیں۔

”فرعون کی بیوی نے کسی بچے کو گود لیا ہے۔“

”گود کیا لیا ہے۔ دریا سے نکالا ہے۔ بہتا ہوا چلا جا رہا تھا۔“

”سنا ہے کوئی اسرائیلی بچہ ہے۔“

”یہ تو ہمیں معلوم نہیں لیکن یہ معلوم ہے بچے نے دودھ پینے سے انکار کر دیا ہے۔ اسی لیے محل کی دایاں اس بچے کو لے کر نکلی ہیں کہ شاید کوئی عورت ایسی مل جائے جو اسے دودھ پلا سکے۔“

حضرت موسیٰ کی ہمیشہ کھڑی سن رہی تھیں۔ سمجھ گئی کہ یہ کس کی باتیں ہو رہی ہیں۔ بھیڑ کو چیرتی ہوئی آگے بڑھیں۔ بھائی پر نظر پڑی تو بے قرار ہو گئیں۔

”میں تمہیں ایسے گھر کا پتا بتاؤں جس کے لوگ اس کی پرورش کا ذمہ لیں اور خیر خواہی کے ساتھ اسے رکھیں۔“

دایاں یہ سن کر حیران ہو گئیں کہ یہ بچی کیسے اتنی بڑی ذمہ داری اٹھا رہی ہے۔

”تو کیسی اتنی بڑی بات کہہ رہی ہے اور تو کیسے اس گھر کا پتا جانتی ہے؟“

”میں یہ بات اس لیے کہہ رہی ہوں کہ بادشاہ ہم سے خوش ہو جائے اور ہمیں انعام دے۔“

”تو ہمیں کہاں لے جائے گی؟“

”اپنے گھر۔ میری اماں اسے دودھ پلائے گی۔“

دایاں کو تو تنکے کا سہارا چاہیے تھا۔ انہوں نے اس کی بات کو قبول کر لیا اور اس کے گھر کی طرف چلیں۔

حضرت موسیٰ کی والدہ بے چینی سے صحن میں ٹہل رہی تھیں اور بیٹی کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں کہ دیکھو وہ کیا خبر لاتی ہے۔ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ دیکھا کہ شاہی خدمت گار کھڑے ہیں۔ دو دایاں ہیں۔ ان میں سے ایک کی گود میں بچہ ہے۔ دل زور سے دھڑکا۔ یہی میرا بچہ ہو۔ خدا کرے زندہ ہو۔

حضرت موسیٰ کی ہمیشہ نے ماں کو الگ لے جا کر پوری بات بتائی۔ دایاں نے بچے کو یو کا بد کی گود میں ڈال دیا۔ وہ جب دودھ پلانے لگیں تو بچے نے دودھ پینا شروع کر دیا۔ کب کا بھوکا پیاسا تھا۔ خوب سیر ہو کر دودھ پیا۔

خدمت گاروں کی جان پر مبنی ہوئی تھی کہ وہ یہاں سے بھی ناکام لوٹے تو کہیں فرعون کا عتاب ان پر نہ ٹوٹے۔ بچے کو دودھ پیتے دیکھا تو جان میں جان آئی۔ یہ امید بھی بندھی کہ اب منہ مانگا انعام ملے گا۔ ان میں سے ایک محل کی طرف بھاگا تاکہ حضرت آسیہ کو خوش خبری سنا سکے۔

وہ محل میں داخل ہوا ہی تھا کہ محل میں دھوم مچ گئی۔ خدمت گار اکیلا آیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بچے کو کسی عورت کے پاس چھوڑ کر آیا ہے۔ دودھ پلانے والی کوئی عورت مل گئی۔

ابھی تک قیاس آرائیاں تھیں لیکن جب اس نے حضرت آسیہ کے سامنے تمام واقعات دہرائے تو سب کو یقین آ گیا۔ حضرت آسیہ نے خدمت گار کو حکم دیا کہ وہ واپس جائے اور بچے سمیت عورت کو محل میں لے کر آئے۔

حکم کی تعمیل میں کیا دیر تھی۔ یو کا بد کو حضرت آسیہ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ بنی اسرائیل کی ایک معمولی سی عورت کو عزت و احترام کے ساتھ محل میں لایا گیا تھا۔ اس وقت محتاج عبرانی عورت نہیں تھی بلکہ مصر تھی۔

فرعون اور اس کا وزیر ہامان بھی اس منظر کو دیکھنے کے لیے حضرت آسیہ کے پاس آ گئے۔ وزیر ہامان عبرانیوں کا سخت دشمن تھا۔ حضرت موسیٰ کی والدہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا حالانکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ عورت اس بچے کی حقیقی ماں ہے۔

”اے عبرانی عورت! اس بچے نے کسی عورت کا دودھ نہیں پیا۔ تجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ یہ تیرا دودھ پینے پر تیار ہو گیا؟“

”اے وزیر! میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ لوگ اس بچے کو میرے پاس لے کر آئے۔ میں نے انسانی ہمدردی کے تحت اسے دودھ پلایا اور اس نے پی لیا۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتی۔“

”کہیں تو ہی تو اس بچے کی ماں نہیں؟“

”ہاں، میں اس بچے کی ماں ہوں۔ اس لیے کہ اس نے اب میرا دودھ پی لیا۔“

”میں اس سے بھی پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اگر تیرے گھر میں کوئی چھوٹا بچہ نہیں تو یہ دودھ کیسا۔“

”اس لیے کہ میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا جسے فرعون کے آدمیوں نے مجھ سے جدا کر دیا جیسا کہ تم لوگوں کی عادت ہے کہ عبرانیوں کو زندہ نہیں چھوڑتے، ہاں جسے میرا خدائے زندہ رکھے۔“

ہامان حضرت آسیہ کی موجودگی میں فرعون سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس نے فرعون کو الگ بلایا اور اسے یو کا بد کی طرف سے بدگمان کرنے کی کوشش کی۔

”دیوتاؤں کے دیوتا! مجھے یہ عورت اس بچے کی ماں معلوم ہوتی ہے۔“

”وہ یہاں کیسے آ سکتی ہے؟“

”آپ نے دیکھا نہیں وہ بچہ اس کی گود میں کیسا مطمئن تھا۔ پھر یہ کہ بچے نے کسی عورت کا دودھ نہیں پیا اور سنا ہے اس عورت کا دودھ اس نے غٹا غٹ پی لیا۔“

”یہ شخص اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے ورنہ بچے تو کسی بھی عورت کا دودھ پی لیتے ہیں۔“

”نہیں، اسے اتفاق نہیں کہہ سکتے۔ یہ بچہ ہے ہی کچھ پراسرار۔ مجھے تو یہ وہی معلوم ہوتا ہے جس کے متعلق پیش گوئی کی گئی ہے۔“

”ہو سکتا ہے تو ٹھیک کہہ رہا ہو لیکن میں ملکہ کی ضد کے آگے مجبور ہوں۔“

”مجھے ڈر ہے کہ اس سے آپ کو نقصان نہ پہنچے۔“

”یہ شیر خوار بچہ آخر مجھے کیا نقصان پہنچائے گا۔“

”یہ ہمیشہ شیر خوار نہیں رہے گا۔ بھی جوان بھی ہوگا اور نجومی یہ کہہ چکے ہیں کہ یہ خداوند (فرعون) کی شان میں گستاخی کرے گا۔“

”ہامان، یہ مت بھولو کہ آسیہ کی خواہش کے مطابق اس کی پرورش محل میں ہوگی۔ یہ اچانک جوان نہیں ہو جائے گا۔ میں اس پر پوری نظر رکھوں گا۔ اگر کچھ نشانیاں ظاہر ہوئیں تو میں اسے کسی بھی وقت قتل کرادوں گا۔“

ہامان اس کے آگے کچھ نہ بول سکا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ فرعون تمام باتیں اپنی ملکہ سے بھی کرے گا۔ ملکہ کہیں... برافروختہ ہو کر اپنا غصہ اس پر نہ اتارے۔

فرعون ملکہ کے پاس واپس آیا تو حضرت آسیہ یو کا بد کو محل میں رہنے کے لیے مجبور کر رہی تھیں۔

”ہمارے بچے کو تمہارا دودھ اس آگیا ہے اس لیے اب تم اس کے ساتھ ہمارے محل میں رہو گی تاکہ تم ہر وقت اس کے سامنے رہو۔“

”ملکہ مصر! میرا یہاں رہنا بہت مشکل ہوگا۔ میرا شوہر اور میرے بچے پریشان ہوں گے۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر میں یہاں کیسے آ جاؤں؟“

”اگر ہم تمہارے شوہر اور تمہارے بچوں کے رہنے کا بندوبست بھی نہیں کر دیں؟“

”یہ میں کسی طرح بھی گوارا نہیں کروں گی کیونکہ اس طرح میرے ہم قوم مجھ سے بدگمان ہوں گے۔ وہ کہیں گے میں عیش و عشرت کی تلاش میں اس کے گھر جا کر رہنے لگی جو ہمارے بچوں کا دشمن ہے۔“ یو کا بد نے فرعون کی موجودگی کی پروا بھی نہیں کی اور جرأت ایمانی سے یہ بات کہہ دی۔

یہ سنتے ہی فرعون بھڑک اٹھا۔

”گستاخ عورت! تیری یہ مجال کہ تو ہمارے حکم کے برخلاف کرے۔ تجھے ہمارے محل میں رہنا ہوگا۔ اس وقت تک تجھے یہیں رہنا ہوگا جب تک بچے کا دودھ چھڑا نہ دیا جائے۔“

”آپ کسی اور عورت کا بندوبست کر لیں۔ مجھے تو یہ شرط منظور نہیں۔“ یو کا بد بے خوفی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اسے گرفتار کر لیا جائے۔“

حضرت آسیہ نے جب دیکھا کہ کھیل بگڑ رہا ہے تو درمیان میں آ گئیں۔ جو لوگ حضرت موسیٰ کی والدہ کو گرفتار کرنے کے لیے آگے بڑھے تھے، انہیں روک دیا اور فرعون سے مخاطب ہوئیں۔

”اس وقت بچے کی زندگی کا سوال ہے۔ یہ کسی عورت کا دودھ پینے کو تیار نہیں۔ اس وقت ہماری غرض ہے۔ اس عورت کی بات مان لی جائے۔ شاید بعد میں یہ محل میں رہنے کو تیار ہو جائے اور ہمارا موسیٰ ہماری نظروں کے سامنے رہے۔“

فرعون نے ایک مرتبہ پھر اپنی ملکہ کی بات مان لی۔

”اے عورت! تو اسے اپنے گھر لے جا اور دودھ پلا۔ ہم تجھے اس کی اجرت دیں گے۔“ حضرت آسیہ نے کہا۔

”مجھے اس کام کی اجرت درکار نہیں۔ مجھے یہ بچہ اچھا لگا ہے۔ میں اسے اپنا بیٹا سمجھ کر پالوں گی۔“

”تو نے سچ کہا، یہ بچہ ہے ہی اتنا پیارا۔“

”تم نے اس کا کیا نام بتایا؟ مجھے بتاؤ تاکہ میں اسے اسی نام سے پکاروں۔“

”میں نے اس کا نام موسیٰ رکھا ہے۔“

حضرت موسیٰ کی والدہ نے انہیں ساتھ لیا اور گھر چلی آئیں۔ اجاڑ گھر میں پھر سے بہار کا موسم آ گیا۔ مامتا کو قرار آیا تو سوچنے بیٹھ گئیں۔ انہیں یاد آیا کہ جب وہ مصریوں کی طرف سے اپنے بچے کے لیے پریشان تھیں تو انہوں نے ایک آواز سنی تھی۔ کوئی ان سے کہہ رہا تھا۔

”اس کو دودھ پلا۔ پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہوتا تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔“

”سبحان تیری قدرت۔ یہ وعدہ پورا ہوا۔ میرا بچہ اب میرے پاس ہے اور میری آنکھیں ٹھنڈی ہیں۔“

سورۃ القصص میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

”ہم موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس پلٹا لائے تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا تھا مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں مانتے۔“

حضرت موسیٰ کی بعثت سے قبل تک بنی اسرائیل کثرت پرست تھے۔ لاتعداد بتوں کے پرستار ہونے کی وجہ سے تین گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک خاندانی دیوتا، دوسرے تیرک دیوتا اور تیسرے قومی دیوتا۔ پہلے قبروں کی پوجا کرتے پھر مورتیوں کی پوجا شروع کر دی اور ہر خاندان نے الگ الگ دیوتا بنالیا۔

مصریوں کے زیر اثر ان میں حیوان پرستی بالخصوص بیل اور سانپ کی پرستش کا دستور بھی قائم ہو گیا تھا۔

حضرت موسیٰ کے والد حضرت عمران کا خاندان ان خرافات سے پاک تھا۔ وہ ابھی تک حضرت یعقوبؑ کے دین پر قائم تھے۔ اس لیے بھی کہ وہ حضرت یعقوبؑ کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

ان کا شجرہ نسب یہ تھا۔

عمران بن قانت بن لادنی بن یعقوب علیہ السلام۔

اور یہ گھرانہ اس لیے بھی بت پرستی سے پاک تھا کہ اس خاندان میں ایک جلیل القدر پیغمبر کو پیدا ہونا تھا۔ خدا کی قدرت یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ اس کا پیغمبر بت پرست گھرانے میں پیدا ہو۔ دوسری عورتوں کا دودھ نہ پینے میں بھی یہی مصلحت کارفرما تھی کہ ان کی پرورش میں بت پرستوں کا دودھ شامل نہ کیا جائے۔

حضرت موسیٰ اپنی حقیقی والدہ کے دودھ پر پلنے لگے۔ جیسے جیسے بڑھتے جا رہے تھے آپ کا چہرہ دکتے ہوئے چاند کی طرح ہوتا جا رہا تھا۔ جسم خوب تو مند اور توانا ہوتا جا رہا تھا۔

آپ کی والدہ آپ کی موجودگی سے مسرور ضرور تھیں لیکن جب یہ خیال آتا تھا کہ دودھ چھوٹنے کے بعد وہ ان سے جدا کر دیے جائیں گے تو اس ہو جاتی تھیں لیکن چونکہ اللہ کے وعدے پر مکمل یقین تھا اور اس کا مظاہرہ دیکھ چکی تھیں اس لیے جلد ہی صبر بھی آ جاتا تھا۔

اگر یو کا بد خوش تھیں کہ موسیٰ ان کے پاس ہیں تو حضرت آسیہ اس کے برعکس رنجیدہ تھیں۔ ان کا موسیٰ کچھ دنوں کے لیے ان سے دور چلا گیا ہے۔ وہ ایک ایک دن گن گن کر کاٹ رہی تھیں کہ کب دودھ چھوٹے اور کب وہ موسیٰ کو گل میں لے کر آئیں۔ فرعون کی بیوی تھیں۔ رعب سلطنت کا تقاضا تھا کہ ان کی سواری ایک اسرائیلی کے گھر میں نہ جائے۔ پھر بھی دن میں کئی بار خدمت گاروں کو بھیج کر موسیٰ کی خیریت دریافت کر لیتی تھیں۔ پھر گھنٹوں ان کی یاد میں گزار دیا کرتی تھیں۔

ان کی بے قراری اتنی بڑھی کہ دودھ چھڑانے کی عمر سے دو چار ماہ قبل ہی وہ حضرت موسیٰ کو اپنے گھر لے آئیں۔ اس دن محل میں شادیاں بچائے گئے۔ دیوتاؤں پر نذریں چڑھائی گئیں۔ کئی دن تک ایک بڑے میدان میں قبیوں (مصریوں) کو کھانے کھلائے گئے۔ اس جشن میں اسرائیلیوں کو آنے کی قطعی اجازت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ یو کا بد کو بھی نہیں بلایا گیا تھا۔ فرعون کی نظر میں بنی اسرائیل کے لوگ حقیر تھے۔ وہ ان کا دشمن تھا اور دشمنوں کو اپنے گھر نہیں بلایا جاتا۔

یو کا بد کے صبر کی انتہا تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو بیٹا نہیں کہہ سکتی تھیں۔ اس کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتی تھیں۔ حضرت موسیٰ

کے والد حضرت عمران نے دور دور سے فرعون کے محل کی سجاوٹ کو دیکھا اور گھرا کر بیوی کو بتایا تو بیوی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ ”وہ اتنا چھوٹا ہے کہ مجھے یاد بھی تو نہیں کر رہا ہوگا۔ اسے یہ معلوم بھی نہیں کہ میں اس کی ماں ہوں۔ وہ فرعون کے خاندان کا نہیں بنی اسرائیل سے تعلق رکھتا ہے۔ شاید یہ اسے کبھی معلوم نہ ہو سکے۔ یہ راز میں بھی کسی پر نہیں کھول سکتی۔ اگر فرعون کو معلوم ہو گیا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ مجھے اس کی زندگی عزیز ہے۔ کیا یہ خوشی کی بات نہیں کہ اس کی پرورش شہزادوں کی طرح ہو رہی ہے۔“

اس کی پرورش واقعی شہزادوں کی طرح ہو رہی تھی بلکہ اس کے ناز و نخرے شہزادوں سے بھی بڑھ کر اٹھائے جا رہے تھے۔ اللہ اپنا وعدہ پورا کر رہا تھا کہ یہ اللہ ہی کی قدرت تھی کہ ان کا دشمن انہیں اپنے بستر پر پال رہا تھا۔ قدرت نے اجنبیوں کے دل میں اس کی محبت ڈال دی تھی۔ جو دیکھتا تھا اسے پیار کرتا تھا۔ فرعون کا دل بھی اس کی طرف کھینچتا تھا لیکن رعب شاہی اسے روکتا تھا کہ وہ اسے گود میں اٹھائے پھر یہ کہ وہ اس کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کر چکا تھا کہ اس پر مہربانی کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں لوگ اس پر ہنس نہ پڑیں مگر ایک روز وہ مجبور ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ موسیٰ کو گود میں لے۔ اس کی فرعونیت اب بھی اسے روک رہی تھی۔ اس نے اس کے لیے بھی جواز نکال لیا۔ اس نے یہ ظاہر کیا کہ اسے تو موسیٰ کو گود میں لینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں، وہ اپنی ملکہ کو خوش کرنے کے لیے یہ عمل کرنا چاہتا ہے۔

”اگر تو اس سے خوش ہوتی ہے کہ میں ... تیرے موسیٰ کو گود میں لوں تو لا اسے میری گود میں دے۔ میں بھی اسے گود میں لے کر دیکھوں۔“

حضرت آسیہ نے یہ سنا تو ان کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے موسیٰ کی محبت فرعون کے دل میں ڈالی۔ اس نے حضرت موسیٰ کو فرعون کی گود میں دے دیا۔

حضرت موسیٰ کچھ دیر تو اس کی گود میں اطمینان سے بیٹھے رہے پھر آپ کی نظر اس کی ڈاڑھی پر گئی۔ فرعون کی ڈاڑھی مرصع تھی۔ بال بال میں موتی پروئے ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ نے (جیسی کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے) ہاتھ بڑھا کر ڈاڑھی پکڑ لی۔ بچوں کو ڈانٹو تو ڈاڑھی چھوڑ بھی دیتے ہیں لیکن حضرت موسیٰ کی گرفت بہت سخت تھی۔ فرعون کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ پھر اس نے حضرت موسیٰ کے رخساروں پر یکے بعد دیگرے کئی طمانچے رسید کر دیے۔ بڑی مشکل سے ڈاڑھی چھڑوائی گئی۔ ڈاڑھی چھڑاتے چھڑاتے حضرت موسیٰ کی منگھلی میں فرعون کی ڈاڑھی کے چند بال آ گئے تھے۔ فرعون نے حضرت موسیٰ کو اپنی گود سے اٹھا کر اس طرح پھینکا کہ اگر حضرت آسیہ پکڑ نہیں لیتیں تو وہ زمین پر گر جاتے۔

”تو نے کچھ دیکھا؟“ فرعون نے بلند آواز میں حضرت آسیہ سے کہا۔

”میں نے تو یہ دیکھا کہ بچے نے شرارت سے آپ کی ڈاڑھی پکڑ لی تھی جیسا کہ اکثر بچے کرتے ہیں۔“

”نہیں، اس نے میری شان میں گستاخی کی ہے۔ تجویموں نے بتایا تھا کہ جو اسرائیلی بچہ میری ہلاکت کا سبب بنے گا اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہوگی کہ وہ بچپن میں میری شان میں گستاخی کرے گا۔ یہ وہی اسرائیلی بچہ ہے۔ میں اس کے جوان ہونے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ میں اسے قتل کرادوں گا۔ ڈسنے والے سانپ کو زیادہ دیر نہیں پالا جاسکتا۔“

”آپ بچے کی اس طفلانہ حرکت پر کیوں برہم ہوتے ہیں۔“

”تم اسے اٹھاؤ اور یہاں سے چلی جاؤ۔ میں ہامان سے مشورہ کرتا ہوں۔“

”وہ آپ کو کوئی ضرور غلط مشورہ دے گا۔“

”اسی نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ بچہ ضرور کوئی ایسی حرکت کرے گا۔ اس کی بات سچ نکلی ہے۔ اب وہی بتائے گا اس بچے کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔“

حضرت آسیہ کو اس کے پاس سے اٹھ کر جانا پڑا۔ ان کے اٹھتے ہی ہامان کو طلب کر لیا گیا۔ فرعون نے ہامان کو پورا قصہ سنایا اور اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ موسیٰ نے اس کی شان میں گستاخی کی ہے۔

ہامان کا چہرہ فتح کے احساس سے سرخ ہو گیا۔

”کیا میں نے آپ سے پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ یہ وہی اسرائیلی بچہ ہے جس کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ اس کی پوری طرح نگرانی کریں گے اور اگر نشانیاں ظاہر ہوئیں تو آپ اسے ذبح کروادیں گے۔ آپ نے نشانی دیکھ لی۔ اب اسے قتل کرانے میں دیر نہ کریں۔“

”مجھے اپنی ملکہ کا خیال آ جاتا ہے۔ اس کے دو بیٹے مرچکے ہیں اور اب اس نے اس بچے ہی کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ اس بچے کو قتل کرانا ملکہ کے بیٹے کو قتل کرانا ہوگا۔“

”آپ غور فرمائیے، کہیں اس سازش میں.... ملکہ تو شامل نہیں۔ مجھے تو اس عورت پر بھی شبہ ہے جو اس بچے کو دودھ پلانے کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ وہی اس کی اصلی ماں تو نہیں۔“

”پھر تو ہمیں ملکہ کو بھی اس مقدمے میں شامل کرنا ہوگا۔“

”میں تو ان سے بہت ڈرتا ہوں۔ ان کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ان سے جو کچھ کہنا ہے میری غیر موجودگی میں کہیے گا۔ میں اپنی رائے دے چکا۔ میں اب بچے کو زندہ چھوڑنے کے حق میں نہیں۔“

ہامان کے جانے کے بعد فرعون حضرت آسیہ کے پاس آیا اور انہیں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”میں نے ہامان کے ساتھ مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اس اسرائیلی بچے کے قتل کا فرمان جاری کر دوں۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ بچہ اسرائیلی ہے؟“

”تمام واقعات پر غور کرو۔ کسی اسرائیلی نے اس کی جان بچانے کے لیے اسے صندوق میں بند کر کے پانی میں بہا دیا ہوگا۔ یہ صندوق بہتا ہوا ہمارے محل کی طرف آ گیا اور تم نے اسے نکلوا لیا۔ اس کا ناک نقشہ دیکھو، بالکل اسرائیلیوں کا سا ہے۔ تم نے یہ بھی دیکھا کہ اس بچے نے کسی کا دودھ نہیں پیا اور اس اسرائیلی عورت کا دودھ پیا۔ مجھے تو یہ بھی شک ہے کہ وہی عورت اس کی ماں بھی تھی۔ اس نے اسے دریا میں بہا دیا ہوگا اور دودھ پلانے کے بہانے اسے پھر اپنے گھر لے گئی۔“

”یہ اسرائیلی کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے تمام بچے تو قتل کرادیے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ یہی ایک بچہ ہے جو زندہ رہ گیا۔“

”آپ کے دل میں یہ بات بٹھادی گئی ہے کہ یہ بچہ اسرائیلی ہے اور یہ یقیناً ہامان کی حرکت ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے اور اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ اس نے آپ کی شان میں گستاخی کی تو یہ ایک طفلانہ حرکت تھی۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ بچے اکثر ایسا کرتے ہیں۔ یہ آپ کے احترام سے کیا واقف۔ اس کے نزدیک تو تمرہ (کھجور) اور جمرہ (چنگاری) دونوں برابر ہیں۔“

”اگر تو ٹھیک کہتی ہے تو میں ابھی اس کا امتحان کرتا ہوں۔ اگر اس نے انگارے کو دیکھ کر ہاتھ کھینچنا تو ضرور قتل کرادوں گا۔“

فرعون نے چند کھجور کے دانے اور چند انگارے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رکھوا دیے۔ ایک مرتبہ پھر اس نے اپنا قول دہرایا۔ اگر اس نے انگارے دیکھ کر ہاتھ کھینچنا تو ضرور قتل کرادوں گا۔

حضرت موسیٰ کا دودھ چھڑایا جا چکا تھا (کچھ مہینے قبل ہی سہی) اتنی عقل ضرور آگئی ہوگی کہ انگارے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں لیکن اللہ تعالیٰ کو ان سے کام لینا تھا۔ ان کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اٹھائی تھی۔ اگر وہ ہاتھ کھینچ لیتے تو یقیناً قتل کر دیے جاتے۔ حضرت موسیٰ نے ہاتھ بڑھایا اور ایک سرخ انگارے کو اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ سیکنڈ بھر کا کام تھا جو ہو گیا مگر زبان پر داغ پڑ گیا اور زبان موٹی ہو گئی۔ اس وقت سے زبان میں لکنت آگئی اور مسلسل گفتگو میں رکاوٹ ہونے لگی۔

حضرت آسیہ بچے کی تکلیف دیکھ کر ٹپ انھیں۔ فوراً گود میں اٹھالیا۔ حکیم تو موجود رہتے ہی تھے فوراً حاضر ہو گئے لیکن جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔

عام مفسرین کی اس نقل حکایت سے جدا انجارج مصری نے اپنی ایک قیاسی رائے بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

”جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریائے نیل میں سے نکال کر شاہی محل پہنچایا گیا تو دودھ پلانے کے لیے دایہ کی فکر ہوئی۔ شہر کی بیبیوں عورتیں آئیں مگر انہوں نے کسی کا دودھ منہ سے نہیں لگایا تو اس واقعے میں ضرور عرصہ لگا ہوگا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک عرصہ دودھ سے محروم رہے ہوں گے۔ ایسی حالت میں یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ بچے کی زبان موٹی ہو جاتی ہے اور بات کرنے میں رکاوٹ کا مرض پیدا ہو جاتا ہے لہذا حضرت موسیٰ کو بھی یہی صورت پیش آئی ہوگی۔“

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمن۔ قصص الانبیاء، ابن کثیر۔ توریت،..... ارض القرآن، سلیمان ندوی۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد۔

میں اس وقت دھیمی رفتار سے کار ڈرائیو کرتا ہوا

الاسکا کی بل کھاتی سڑک پر آگے بڑھ رہا تھا۔ میری منزل

الاسکا کے آخر میں واقع ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ میں برسوں

بعد اس جگہ جا رہا تھا۔ تاہم میری معلومات کے مطابق اس

قصبے کی آبادی آج بھی چند ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ ان

دنوں امریکا کے دوسرے شہروں میں موسم کافی حد تک گرم

اور مرطوب تھا۔ تاہم اس جگہ خشکی کا احساس ہو رہا تھا۔ موسم

بہت خوشگوار اور روان پرور تھا۔ پہاڑی راستے بھی کھلے

ہوئے تھے۔ جو کہ برف باری کے موسم میں آمدورفت کے

قابل ہی نہیں رہتے تھے۔ ایک طرف الاسکا کے وسیع و

عریض پہاڑی سلسلے موجود تھے جو گرمیوں کے موسم میں بھی

برف سے ڈھکے رہتے تھے۔ اس موسم میں دنیا بھر سے

سیاحت کے شوقین بڑی تعداد میں ادھر کا رخ کرتے تھے۔

میری کار کی دھیمی رفتار کی وجہ نہ صرف ٹریفک کا اثر دھام

تھا بلکہ سڑک کے اطراف میں گہری کھائیاں بھی تھیں جو کسی بھی

گاڑی کو نکلنے کے لیے منہ کھولے منتظر رہتی تھیں۔

اپنی دانت میں ذرا سی خطا کا خطرناک انتقام لینے والے ایک سنی کا قصہ

اصول پسندی اچھی عادت ہے مگر جب یہی عادت انتہا پسندی پر

پہنچ جائے تو انسان منتقم مزاج بن جاتا ہے۔ اگرچہ وہ اصولی

بات کر رہا تھا مگر مد مقابل لچک کا قائل تھا اور جب ذرا سی بھی

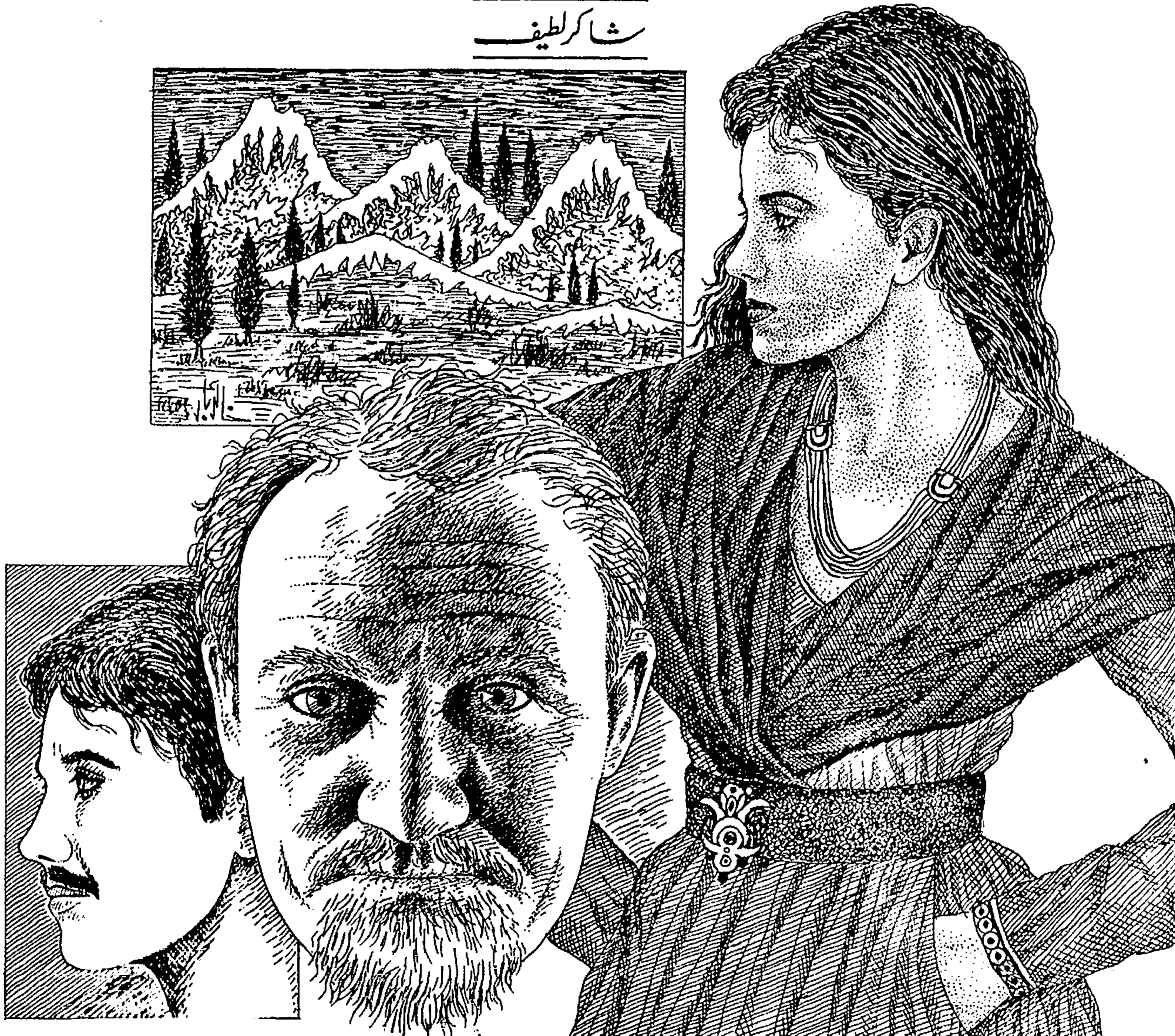
لچک محسوس نہ ہوئی تو اسے مجبوراً اصول کی خلاف ورزی

کرنا پڑی اور بس یہی ادا اس کے انتقام کو ہوا۔ لہذا یہی

انجام تو ہونا ہی تھا۔

سنکی

شا کر لطیف



میں نے اپنے آس پاس کے پہاڑی سلسلے کا جائزہ لیا۔ بظاہر یہ علاقہ اپنی خوبصورتی اور دلفریب قدرتی نظاروں کی وجہ سے سیاحوں کے لیے خاصی کشش کا حامل تھا مگر اس جگہ کو ایک خطرناک علاقہ بھی تصور کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ یہاں کے خطرناک جنگلی ریچھ تھے۔ ہر سال کئی سیاح ان خطرناک ریچھوں کا شکار بن کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے اور کچھ سیاح ان پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں کھو کر راستہ بھٹک جاتے اور آخر کار بھوک پیاس سے ہلاک ہو جاتے۔

ہزاروں کلومیٹر تک پھیلا یہ طویل پہاڑی سلسلہ اب تک سیکڑوں زندگیاں نگل چکا تھا اور بہت سے سیاحوں کی لاشیں بھی تلاش نہیں جاسکی تھیں۔

اس پہاڑی سلسلے میں غاروں اور سرنگوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا جس سے نکلنا کسی طور ممکن نہ تھا۔ اس جگہ موبائل فون کے سگنل بھی دستیاب نہیں تھے اسی لیے راستہ بھٹکنے والے کسی کی مدد بھی حاصل نہ کر پاتے تھے۔ غاروں اور سرنگوں کی اس بھول بھلیوں کو شیطان کی آنت کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ان غاروں میں داخلے پر بھی حکومت کی جانب سے پابندی عائد کی جا چکی تھی۔ تاہم ایڈ ونچر کے شوقین سیاح اب بھی ان سرنگوں میں داخل ہونے سے باز نہیں آتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ چوٹالے کر اندر داخل ہوتے تھے اور آگے بڑھتے وقت زمین پر نشانات لگاتے جاتے تھے۔ اس لیے واپس نکلنے میں بھی کامیاب رہتے تھے۔ زیادہ مشکل میں صرف وہ سیاح گرفتار ہوتے تھے جو ان سرنگوں میں ٹارچ کی روشنی میں بس آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ وہ اس بھول بھلیوں کے سحر میں کھوے جاتے اور جب ٹارچ کی روشنی میں اپنے عقب کا جائزہ لیتے تو انہیں بیسوں راستے نظر آتے۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا کہ وہ کون سے راستے سے گزر کر یہاں تک پہنچے تھے اور پھر ان کی لاشیں بھی دریافت نہ ہو پاتیں۔

قبے کے موڑ پر میں نے اپنی کار کو جیسے ہی دائیں طرف موڑا تو میری توقع کے عین مطابق ٹریفک کا دباؤ خاصا کم ہو گیا۔ یہ سڑک بالکل سیدھی تھی اور اطراف میں گہری کھائیاں بھی موجود نہیں تھیں اس لیے میں نے اپنی کار کی رفتار بڑھا دی۔ شام ہونے کو آئی تھی اور میں اندھیرا پھیلنے سے پہلے اپنی منزل پر پہنچنے کا خواہاں تھا کیونکہ یہاں کی سڑکوں پر روشنی کا کوئی معقول انتظام موجود نہیں تھا۔ مجھے بھوک اور پیاس کا احساس بھی پریشان کر رہا تھا۔ میں

مسلل چھ گھنٹے سے بغیر ر کے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس لیے اب میں متلاشی نگاہوں سے آس پاس کا جائزہ بھی لے رہا تھا تاکہ کسی اسٹور وغیرہ کے نظر آتے ہی اپنے لیے پانی اور بسکٹ وغیرہ خرید سکوں۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سڑک کنارے ایک چھوٹا سا اسٹور نمودار ہوا تو میں نے اسی کے سامنے اپنی کار روک دی۔

اسٹور کے کاؤنٹر پر کوئی موجود نہیں تھا۔ تاہم سائڈ پر ایک بوڑھا شخص کھڑا ہوا تھا۔ شاید وہ بھی کچھ خریدنے کے لیے وہاں آیا تھا۔ ”اسٹور کے مالک ایک ضروری کام سے سامنے گئے ہیں، کچھ ہی دیر میں واپس آ جائیں گے۔“ میری استفسار طلب نگاہوں کے جواب میں وہ بولا۔ میں نے جواباً بس اثبات میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ اس شخص نے بھی مزید کوئی بات نہ کی۔ تاہم دو تین منٹ گزرنے کے بعد مجھے ہلکی سی بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ نہ جانے اسٹور کا مالک کہاں گیا تھا۔ سڑک کے آس پاس تو کسی قریبی آبادی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ بادی النظر میں تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ کہیں دور گیا تھا۔ کچھ دیر مزید انتظار کے بعد میری ہمت جواب دے گئی۔ میں آگے بڑھا اور اپنے بٹوے سے چند ڈالر نکال کر کاؤنٹر پر رکھے اور پھر ایک طرف ریک پر رکھے بسکٹ اور پانی کی بوتل اٹھالی۔

”مجھے ذرا جلدی ہے۔“ میں نے مسکرا کر اس بوڑھے سے کہا اور پھر واپسی کے لیے مڑ گیا۔

”ٹھہریے!“ اس کی زوردار آواز نے مجھے فوراً ہی ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ ”اسٹور کے مالک کچھ ہی دیر میں آ جائیں گے۔ آپ کو ان کا انتظار کرنا چاہیے۔“

”مجھے کہیں جانے کی جلدی ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے پیسے کاؤنٹر پر رکھ دیے ہیں۔ آپ اسٹور کے مالک کو بتا دیجیے گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں جیسے ہی باہر کی جانب بڑھا اس کی زوردار آواز نے ایک بار پھر ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔

”اسٹور کے مالک مسٹر بونیم اپنی دکان میری نگرانی میں چھوڑ کر گئے ہیں اور میں آپ کو ان کی آمد تک کوئی چیز لے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ آپ نے جو کچھ خریدنا ہے ان کی موجودگی میں خریدیے گا۔“ اس بوڑھے کا لہجہ دو ٹوک تھا۔ میں نے پہلی بار بغور اس کی شخصیت کا جائزہ لیا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی عمر ساٹھ کے قریب ہوگی۔ الجھے ہوئے بال اور فرنیچر کٹ ڈاؤں جس کی تراش خراش کیے بھی کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ عجیب آدمی تھا خواخواہ اپنی بات پر

اڑ گیا تھا۔ شاید میرا واسطہ کسی سنگی ٹائپ آدمی سے پڑ گیا تھا اور مجھے اسے اس کی نفسیات کے مطابق ہی ڈیل کرنا تھا۔

”آپ نے بالکل اصولی بات کی ہے۔“ میں نے فوراً ہی پتیرا بدلتے ہوئے کہا۔ ”میں ان کی آمد کا انتظار کر لیتا ہوں مگر اس وقت مجھے پیاس اور بھوک ستا رہی ہے۔ اس لیے میں باہر گاڑی میں بیٹھ کر ان کا انتظار کروں گا۔ ساتھ ہی ساتھ میں تھوڑی سی بھوک بھی مٹا لوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں باہر کی جانب بڑھ گیا۔ میری توقع کے مطابق اس بار اس نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم اس کے چہرے پر ہلکی سی حیرت کے تاثرات عود آئے تھے شاید اسے میری طرف سے اس مثبت رد عمل کی امید نہیں تھی۔ جبکہ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں واقعی میں گاڑی میں بیٹھ کر اسٹور کے مالک کی آمد کا انتظار کرنے والا تھا جبکہ میرے اس رویے کا مقصد اس بوڑھے سے جان چھڑانا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے سیلف مار کر اسے اسٹارٹ کیا۔ تو وہ بوڑھا ایک لحظہ اسٹور سے باہر نکل آیا۔ ”رک جاؤ۔۔۔۔۔“ اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا مگر میں نے اس کی آواز سنی ان سنی کرتے ہوئے تیزی سے گاڑی گھمائی اور اسے مین روڈ پر لے آیا۔ مین روڈ پر آتے ہی میں نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی تاہم عقبی آئینے پر نگاہ پڑتے ہی میں چونک پڑا۔ مجھے وہ بوڑھا سڑک پر اپنی کار کے پیچھے باقاعدہ دوڑتے ہوئے نظر آیا۔ اس کی یہ حرکت مجھے بڑی عجیب لگی۔ وہ میری کار کے پیچھے اس طرح دوڑ رہا تھا، گویا میں اس اسٹور سے چوری کر کے بھاگا تھا۔ شاید میرا واسطہ واقعی میں کسی خطبی سے پڑ گیا تھا۔

میں نے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھایا، تو وہ عقبی آئینے میں آہستہ آہستہ معدوم ہوتا چلا گیا۔ مجھے اپنی منزل پر پہنچنے میں مزید آدھا گھنٹا لگا۔ ہلکی سی شکم پروری بھی ہو گئی تھی اس لیے اب میں خاصی حد تک پرسکون تھا۔

میں اس قصبے میں ایک طویل عرصے کے بعد لوٹا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس جگہ میری کچھ آبائی زمین موجود تھی اور میں اسے فروخت کرنے ہی یہاں آیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میں معلوم کر چکا تھا کہ قصبے میں ایک چھوٹا سا ہوٹل بھی موجود ہے۔ اگرچہ سیاح شاذ و نادر ہی اس طرف کا رخ کرتے تھے مگر پھر بھی اکاؤنٹ کا آجانے والے سیاحوں کی میزبانی کے لیے یہ ہوٹل۔۔۔۔۔ غنیمت تھا۔

میں نے اپنی کار ہوٹل کے چھوٹے سے پارکنگ ایریا میں کھڑی کی اور پھر ہوٹل کے اندر داخل ہو گیا۔ ہوٹل کے

کاؤنٹر پر موجود خوب صورت اور حسین ریسپنڈنٹ کو دیکھ کر میرے دل میں بھی وہی احساس پیدا ہوا جو عام طور پر نوجوان لڑکیوں کو دیکھ کر کسی بھی امریکی کے دل میں پیدا ہوتا تھا۔ ”میرا نام ڈیوڈ ہے۔ مجھے آپ کے ہوٹل میں ایک کمرہ اور کار ہے سنگل بیڈ۔“ میں نے تعارف کراتے ہوئے اپنا مدعا بھی بیان کر دیا۔

اس نے اپنے رجسٹر میں بتائے گئے کوائف کا اندراج کیا اور پھر مجھ سے ایڈوانس کرایہ وصول کرنے کے بعد کمرے کی چابیاں میرے حوالے کر دیں۔ ساتھ ہی کمرانمبر بھی بتا دیا۔ ”ایڈوانس کرایہ وصول کرنا ہماری مجبوری ہے کیونکہ بعض سیاح سیر کے بہانے نکلتے ہیں اور پھر واپس ہی نہیں لوٹتے۔“ وہ مسکراتے ہوئے پولی۔ اس کی شخصیت کی طرح اس کی مسکراہٹ بھی دل آویز تھی۔ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ واقعی میں چھا جانے والی شخصیت کی مالک تھی۔

”ویسے اگر میں آپ کو کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانے کی دعوت دوں تو کیا آپ کی یہ مکان اسی طرح قائم رہے گی؟“ دوسرے امریکی نوجوان کی طرح میں بھی تیزی سے پیش قدمی کرتے ہوئے استفسار کیا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ کو کمرال چکا ہے۔“ اس نے ہلکے سے غصے کے ساتھ کہا۔ کھانے کی دعوت پر اس کا جوابی رد عمل عام امریکی لڑکیوں سے خاصا مختلف تھا۔ میں چھ فٹ کا ایک کڑیل اور وجیہ نوجوان تھا اور اپنے کرخت نقوش کی وجہ سے صنف مخالف کے لیے خاصی کشش رکھتا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی کسی لڑکی نے میرے کھانے کی دعوت کو ٹھکرایا ہو۔ یہ کاؤنٹر گرل اس لحاظ سے خاصی منفرد تھی۔

”مجھے کمرال گیا ہے مگر اپنے سوال کا جواب نہیں ملا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے دوبارہ سوال کیا۔ اس کے لہجے کی برہمی میں اضافہ ہو گیا۔ ”بہتر ہے کہ آپ اپنے کمرے میں تشریف لے جائیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اپنے لہجے کی مٹھاس برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے یہ حق تو حاصل ہے کہ میں اپنی میزبان کا نام جان سکوں۔ ویسے آپ کو مس کہوں یا مسز؟“ ”آپ مجھے مس جینی کہہ سکتے ہیں۔“ پہلی بار جوابی رد عمل میں اس نے نرم لہجہ اختیار کیا۔

”یعنی میرا چانس ہے۔“ میں نے کہا اور پھر اس کا جواب سنے بغیر تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ کمرے میں موجود سہولیات کو مناسب تو نہیں کہا جاسکتا تھا تاہم پھر بھی ٹھیک ہی تھیں اور پھر اس دور افتادہ

قصبے میں اس قسم کا کراہل جانا ہی غنیمت تھا۔ میں رات کا کھانا کھائے بغیر ہی بستر پر دراز ہو گیا اور پھر مجھے معلوم نہیں تھا کہ رہائشی سہولت کے سوا اس چھوٹے سے ہوٹل میں سیاحوں کے لیے کچھ اور بھی انتظام کیا جاتا تھا یا نہیں۔ سفر کی وجہ سے مجھ پر خاصی تھکان طاری ہو رہی تھی اس لیے میں رات کے کھانے کا پروگرام ملتوی کرتے ہوئے جلد ہی دنیا د مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ تاہم جینی میرے خوابوں میں بھی مجھے تنگ کرتی رہی۔ گویا وہ ایک مختصر سی ملاقات میں ہی میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو تقریباً دس بجے کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور پھر اپنے کمرے سے نکل آیا۔ خلاف توقع کاؤنٹر پر جینی کو نہ دیکھ کر مجھے خاصی مایوس ہوئی۔ کاؤنٹر پر ایک بوڑھا شخص موجود تھا۔ ”ہیلو مسٹر دیوڈ! آپ اٹھ گئے۔“ اس نے خوش کن مسکراہٹ کے ساتھ میرے نام سے مجھے مخاطب کیا تھا تاہم مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس نے رجسٹر میں درج شدہ معلومات سے استفادہ حاصل کیا ہے۔

”کیا آپ کے ہوٹل میں ناشتے کا کوئی انتظام موجود ہے؟“ میں نے اس شخص سے سوال کیا۔ ”رات میں کھانا کھائے بغیر ہی سو گیا تھا اس لیے اب شکم میں چوہے دوڑنے کا آغاز ہو چکا ہے۔“

”جی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہمارے ہوٹل میں بہت کم سیاح آ کر ٹھہرتے ہیں۔ اس لیے ایسا کوئی انتظام یہاں موجود نہیں۔ تاہم ہوٹل کے باہر دائیں طرف صرف تین چار منٹ کی پیدل مسافت پر اس قصبے کا اکلوتا ریستورنٹ موجود ہے۔ وہاں سے آپ کو ناشتے سے لے کر رات کا کھانا تک مل جائے گا۔“

”شکریہ مسٹر.....؟“ میں نے استفسار طلب نگاہوں سے اسے دیکھ کر کہا۔

”مجھے جارڈن کہتے ہیں اور میں اس ہوٹل کا مالک ہوں۔“ اس نے تعارف کے ساتھ ساتھ اپنی حیثیت بھی بتلا دی۔

”اوہ.....“ میں نے بھی جواباً مسکرا کر کہا۔ ”غالباً رات کاؤنٹر پر موجود لڑکی آپ کی بیٹی تھی؟ شاید انہوں نے اپنا نام جینی بتایا تھا۔“ بات کرتے ہوئے میں نے ایسا انداز اختیار کیا جیسے یہ نام یاد کرنے کے لیے مجھے اپنے دماغ پر زور دینا پڑا تھا حالانکہ ایک ہی ملاقات میں یہ نام میرے دل پر لکھا جا چکا تھا۔

”جینی اس ہوٹل میں ملازمت کرتی ہے۔ وہ اس ہوٹل کی واحد ملازم ہے جو بارہ بجے کے بعد اپنی ڈیوٹی پر آتی ہے۔ اس وقت تک میں کاؤنٹر پر میزبانی کے فرائض سرانجام دیتا ہوں۔“ مسٹر جارڈن نے میرے مفرد ضمے پر بانی پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگرچہ وہ میری بیٹی نہیں مگر میں اسے اپنی بیٹیوں کی طرح ہی چاہتا ہوں۔“

مجھے اپنے مطلب کی معلومات مل چکی تھیں۔ میں نے ایک باپ پھر مسٹر جارڈن کا شکریہ ادا کیا اور ہوٹل سے باہر نکل آیا کیونکہ میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا اس لیے میں بھرپور ناشتا کرنے کے موڈ میں تھا۔ قصبے کے اکلوتے ریستورنٹ سے مجھے اپنے مطلب کا ناشتا مل گیا۔ کھن گے توس اور کافی کا ایک بڑا گ۔ انسان بھوکا ہو تو عام روٹین سے کھانے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ یہ ناشتا تو ویسے بھی مزیدار تھا۔ ابھی میں آدھا ناشتا ہی کر پایا تھا کہ میری میز کے سامنے ایک شخص آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی میں چونک پڑا۔ میں اس سکی انسان سے ہونے والی ملاقات ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرا دوبارہ بھی اس سے سامنا ہوگا۔ ”مسٹر ایڈی کیا آپ کو کچھ چاہیے؟“ اسی لمحے ریستورنٹ کی ویٹرس تیزی سے چلتی ہوئی وہاں آئی تو مجھے پہلی بار اس شخص کا نام معلوم ہوا۔

”نہیں.....“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اسے جواب دیا۔ ”یہ مسٹر میرے پرانے واقف کار ہیں اور میں ان سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کا جواب سن کر ویٹرس نے استفسار طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھا، تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرا اشارہ پا کر ویٹرس واپس کاؤنٹر کی طرف لوٹ گئی اور کاؤنٹر پر کھڑے شخص کے کان میں کھر پھس کرنے لگی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس نے کاؤنٹر مین سے کیا بات کی ہے تاہم اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ایڈی ان کے لیے کوئی پسندیدہ شخصیت نہیں تھا۔

ایڈی ہر چیز سے بے نیاز منسلک مجھے گھورے جارہا تھا۔ گویا مقصد اپنی آنکھوں سے مجھے پٹانا کرنا ہو۔ اس کے اس طرح گھورنے پر مجھے بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ اس لیے میں نے خود ہی بات شروع کی۔ ”دیکھو مسٹر ایڈی! مجھے کہیں جانے کی بہت جلدی تھی اور پھر تم نے بھی خوشخوہ کی ضد شروع کر دی تھی۔ اس لیے میں وہاں سے کھسک گیا کیونکہ تم تو مجھے جانے کی اجازت دینے والے نہیں تھے۔“

”حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری کار کے پیچھے

دوڑا تھا۔“ وہ برہم لہجے میں بولا۔ ”میں ایک بوڑھا شخص ہوں اور اس عمر میں مجھ سے بھاگا بھی نہیں جاتا۔“ ”دیکھو ایڈی!“ میں نے مفاہمت آمیز لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس اسٹور سے صرف پانی کی ایک بوتل اور چند بسکٹ ہی حاصل کیے تھے اور کاؤنٹر پر پیسے بھی رکھ دیے تھے۔ تمہارا مجھ سے گلہ بھی بجا ہوتا اگر میں پیسے دیے بغیر وہاں سے کچھ لے کر جاتا۔“

”مگر تم نے کہا تھا کہ تم گاڑی میں بیٹھ کر اسٹور کے مالک کی آمد کا انتظار کرو گے۔ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے اور ایڈی دھوکے بازوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔“ اس کی آواز اس بار ضرورت سے زیادہ بلند تھی۔ کاؤنٹر پر کھڑے شخص اور ویٹرس کی توجہ ہماری جانب مبذول ہو گئی۔ تاہم ان میں سے کوئی میری ٹیبل کے قریب نہیں آیا۔ شاید وہ اس بوڑھے سکی سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہ اتفاق تھا کہ اس وقت ریستورنٹ میں کوئی دوسرا گاہک موجود نہیں تھا۔

”آخر تم میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے؟“ میں نے اس بار بھی حتی الامکان اپنا لہجہ نرم رکھا۔ ”تم ایک چھوٹی سی بات پر مجھ سے الجھنے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”بکواس بند کرو.....“ ایڈی غراتے ہوئے بولا۔ ”تم نے ایڈی کو دھوکا دیا ہے اور میں تمہیں تنبیہ کر رہا ہوں کہ ایڈی کے ساتھ دھوکا دہی کا ارتکاب کرنے والے ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔“ اس کا لہجہ اور بات کرنے کا انداز تاؤ دلانے والا تھا۔ میری برداشت اب جواب دے گئی تھی۔ وہ خواخوہ میرے گلے پڑ رہا تھا۔ اس کی جارحانہ پیش قدمی کو روکنا اب ضروری ہو گیا تھا۔

”ایڈی.....“ میں نے سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”بہتر یہ ہے کہ یہاں سے اٹھ کر اپنی راہ لو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

”اچھا.....“ وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ”میں تو سمجھتا تھا کہ اس علاقے میں مجھ سے برا کوئی نہیں، بہر حال دیکھتے ہیں کہ تمہارے اس دعوے میں کہاں تک صداقت ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک غیر متوقع اور اشتعال دلانے والی حرکت کی۔ اس نے یک لمحے سامنے میز پر رکھا میرا کافی کا کپ اور توس کی پلیٹ زمین پر پھینک دی۔ کپ اور پلیٹ ایک چھنکے سے ٹوٹ گئی جبکہ میرا خون کھول اٹھا۔ میں ایک کڑیل نوجوان تھا۔ ایسے میں ایک مرل بوڑھے کا چہنچ بھرا انداز کب تک برداشت کر سکتا تھا۔ میرے ایک

ہی گھونے میں وہ کرسی سمیت الٹ کر زمین پر جا گرا۔ ”مسٹر! ہمارے ریستورنٹ میں جھگڑا مت کریں ورنہ میں پولیس کو کال کروں گا۔“ کاؤنٹر پر کھڑا شخص جو شاید اس ریستورنٹ کا مالک تھا، کاؤنٹر سے باہر نکل کر ہماری طرف آتے ہوئے درشت لہجے میں بولا۔ اس کی ساتھی ویٹرس بھی خاموشی سے ایک طرف کھڑی تھی تاہم اس کے چہرے پر بھی گھبراہٹ کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس دوران زمین پر میرے ایک ہی گھونے میں چاروں شانے چت ہونے والا ایڈی دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بڑی کینہ توز نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ تاہم میرے زوردار گھونے سے اس کے ہوش ٹھکانے آچکے تھے اور اس نے میری طرف بڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ اسی لمحے دروازے پر ابھرنے والی ایک زوردار آواز نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ ریستورنٹ کے دروازے سے اندر داخل ہونے والا وہ شخص خاصا لمبا ترنگا اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے خاصا نفیس لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ ”سارجنٹ ماٹھر! انا صاحب کا اور مسٹر ایڈی کا آپس میں جھگڑا ہوا ہے۔“ ویٹرس نے اس شخص کو مخاطب کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرا واسطہ ایک پولیس آفیسر سے پڑنے والا ہے۔ وہاں کی صورت حال بظاہر میرے حق میں نہیں جاتی تھی۔ ایڈی کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اگر وہ سارجنٹ کے سامنے مجھ پر تشدد کا الزام عائد کرتا تو میں وقتی طور پر مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ میں اب اپنی کرسی سے کھڑا ہو چکا تھا۔

سارجنٹ ماٹھر اب میرے قریب آچکا تھا۔ اس نے گہری نگاہ سے میرا جائزہ لیا اور پھر ایڈی سے مخاطب ہوا۔ ”تمہارے چہرے سے خون کیوں بہہ رہا ہے؟“

اس کا سوال سن کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی کیونکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ایڈی کیا جواب دے گا۔ میں اس جگہ نوارد تھا اور پولیس وغیرہ کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر اب تیرکمان سے نکل چکا تھا۔ میرا اٹھا ہوا ہاتھ ایڈی کے چہرے پر اپنا نشان ثبت کر چکا تھا۔ مگر میں کرتا بھی کیا اس سکی بوڑھے نے حرکت ہی ایسی کی تھی کہ میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ اب مجھے اپنے کیے کے نتائج تو بہر حال بھگتنا ہی تھے۔

”میرا پاؤں پھسل گیا تھا سارجنٹ اور منہ کے بل زمین پر گرنے کی وجہ سے چوٹ لگ گئی۔ اس شخص کے

ساتھ میرا جھگڑا محض تلخ کلامی تک ہی محدود تھا۔“ ایڈی کا سارجنٹ کو دیا گیا جواب سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ شخص واقعی میں گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں ماہر تھا۔ اس کا جواب سن کر سارجنٹ نے پُر خیال نظروں سے اسے دیکھا اور پھر بولا۔

”کیا ناشتا کرنے کا ارادہ ہے؟“

”نہیں تو.....“ ایڈی نے مسکرا کر جواب دیا۔ بہتے ہوئے خون کے ساتھ مسکراہٹ کی آمیزش نے اس کے چہرے کو خاصا عجیب بنا دیا تھا۔ میں فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کی موجودہ شکل کو خوفناک قرار دوں یا مضحکہ خیز۔

”اوکے تو پھر تم اس ریستورنٹ سے باہر جاسکتے ہو.....“ سارجنٹ مار تھرا کا لہجہ اس بار خاصا سخت تھا۔ اس کا حکم سن کر ایڈی نے ایک سرسری سی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور پھر خاموشی سے ریستورنٹ سے باہر نکل گیا۔ ”آپ دونوں بھی اپنا کام کریں۔“ اس نے ریستورنٹ کے مالک اور ویٹرس سے کہا تو وہ دونوں بھی خاموشی سے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئے۔

”میں نے تمہیں ایڈی کو گھونسا مارتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“ وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم نے ایسا کر کے ایک غیر قانونی حرکت کی ہے۔ اگر تمہیں اس سے کوئی پرالیم تھی تو تم پولیس سے شکایت کرتے، قانون کو ہاتھ میں لینے کی کیا ضرورت تھی؟“

”میں اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوں سارجنٹ۔“ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”دراصل اس نے حرکت ہی ایسی کی تھی کہ میں اشتعال میں آ گیا۔“

”اوکے!“ وہ میری وضاحت سے مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ ”شاید تم اس جگہ سیاحت کے لیے آئے ہو؟“

”جی ہاں۔“ میں نے اسے یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ میں یہاں اپنی آبائی زمین کی فروخت کے سلسلے میں آیا ہوں۔

”بہر حال، اب ایڈی سے محتاط رہنا۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”تم نے ایڈی جیسے آدمی سے مخاصمت مول لے کر کوئی دانشمندانہ اقدام نہیں کیا۔ شاید تم نے اس کو عام سا جھگڑا لوثا نپ آدمی سمجھ لیا ہے۔ حقیقت میں وہ ایک خطرناک اور اتنا پرست نفسیاتی مریض ہے اور اس پورے علاقے میں اسے ایک نیم پاگل اور سکی شخص کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس سے جھگڑا مول لینے والے ہمیشہ نقصان میں رہتے ہیں۔ وہ اپنے دشمنوں پر عقب سے چاقو کے ساتھ حملہ کرنے میں

خاصا بدنام ہے اور اس وجہ سے پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ جیل بھی کاٹ چکا ہے۔ ابھی ایک سال پہلے ہی جیل سے چھوٹ کر آیا ہے۔ اب اس پورے علاقے میں کوئی بھی اسے منہ نہیں لگاتا۔ وہ انتہائی کینہ پرور شخص ہے۔ تم سے بدلہ ضرور لے گا۔ اس لیے محتاط رہنا اچھا ہوگا اور اس جگہ سے جتنی جلدی رخصت ہو سکتے ہو، ہو جاؤ۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔“ سارجنٹ نے ایڈی کی شخصیت کی جو خوفناک منظر کشی کی تھی، وہ میرے لیے حیران کن تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں ابھی تک اسے ذہنی طور پر کھسکا ہوا کوئی عام سا جھگڑا ہی سمجھ رہا تھا مگر سارجنٹ نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں پر چاقو سے حملہ کرنے میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ میں نے اس کے منہ پر گھونسا مارا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ اگر سارجنٹ کی بروقت آمد نہ ہوتی تو وہ میری کسی وقتی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ایسا ہی کوئی حملہ مجھ پر بھی کر گزرتا۔

”سارجنٹ! اگر وہ اتنا ہی خطرناک ہے تو آپ اسے گرفتار کیوں نہیں کر لیتے؟ ایسے شخص کو تو جیل میں ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”میں کسی کو محض اس کے خطرناک ہونے کی وجہ سے گرفتار نہیں کر سکتا۔“ سارجنٹ مار تھرا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ اپنے سابقہ جرائم کی سزا بھگت چکا ہے اور اب جب تک وہ عملی طور پر قانون شکنی نہیں کرے گا، قانون کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ میرا مقصد صرف تمہیں ہوشیار کرنا تھا تاکہ تم اس سے محتاط رہ سکو۔ ویسے اگر وہ تمہیں دوبارہ تنگ کرے تو پولیس سے رجوع کر لینا۔ خود کوئی غیر قانونی حرکت نہ کرنا۔“ یہ کہتے ہوئے سارجنٹ مار تھرا نے مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر ریستورنٹ کے خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ موجودہ واقعے کے بعد میری بھوک اڑ چکی تھی۔ میں آدھا ناشتا کر چکا تھا اور اسی پر اکتفا کرتے ہوئے میں بل ادا کر کے ریستورنٹ سے باہر آ گیا۔

ہوٹل کی طرف واپس جاتے وقت میں اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہیں تھا۔ چلتے چلتے کبھی اچانک پلٹ کر پیچھے دیکھتا۔ جب سے سارجنٹ مار تھرا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سکی بوڑھا اپنے دشمنوں پر عقب سے حملہ آور ہوتا ہے، میرے دل میں ایک نفسیاتی خوف سایٹھ گیا تھا۔ میں ایک نوجوان تھا۔ اس بوڑھے ایڈی سے کہیں زیادہ طاقتور بھی تھا لیکن اگر وہ اچانک مجھ پر عقب سے حملہ آور ہوتا تو مجھے کسی ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار کر سکتا تھا۔ میں بے خبری

میں مار نہیں کھانا چاہتا تھا۔ اس لیے بہت زیادہ محتاط تھا۔ خلاف توقع ہوٹل پہنچتے ہی کاؤنٹر پر جینی سے سامنا ہوا تو ایڈی کا خوف کہیں تحلیل سا ہو گیا۔ ہوٹل کے مالک نے بتایا تھا کہ وہ بارہ بجے اپنی ڈیوٹی پر آتی ہے۔ اس لیے اس کی جلد آمد میرے لیے باعثِ حیرت تھی۔ شاید وہ بھی مجھ سے دوبارہ ملنے کے لیے بے تاب تھی۔ میرے دل میں خیال ابھرا میں جب الاسکا آیا تھا تو میرا ارادہ تھا کہ اپنا کام نمٹا کر جلد از جلد واپس لوٹ جاؤں گا مگر جینی کو دیکھنے کے بعد سے میرا دل چاہ رہا تھا کہ ہمیشہ کے لیے اس وادی میں ہی رہ جاؤں۔

”ہیلو جینی..... کیسی ہو تم؟“ میں نے جان بوجھ کر اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ہم ایک دوسرے کو زیادہ نہیں جانتے۔“ اس نے فوراً ہی میری پیش قدمی کو روک دیا۔

”مگر جاننے کی کوشش تو کر سکتے ہیں.....“ میں نے ڈھیٹ ہونے کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

میرا جواب سن کر اس کی ٹینگوں آنکھوں میں تذبذب کے آثار اُٹھ آئے۔ اس نے ایک گہری نگاہ سے میرا سر سے لے کر پاؤں تک جائزہ لیا اور پھر بولی۔

”اگر تم مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو تمہاری یہ کوشش ناکامی سے دوچار ہوگی۔ میں تمہیں پہلے بھی متنبہ کر چکی ہوں کہ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔“

”اگر تم ایسی ویسی لڑکی ہو تیں تو میں تمہاری طرف کبھی متوجہ نہ ہوتا۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”حقیقت تو یہ ہے کہ تم پہلی ہی نظر میں مجھے اچھی لگنے لگی تھیں۔“

”یہ بات مجھے پہلے بھی بہت سے لڑکے کہہ چکے ہیں۔“ وہ بے نیازی سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”تو میں کسی دانشور کی اس بات کا تہ دل سے قائل ہو گیا کہ عورت کا اصل حسن اس کی زلفوں میں ہی پوشیدہ ہوتا ہے مگر میں بات کو کچھ آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔“ میں نے نفیسی لہجے میں کہا۔ ”کیا خیال ہے آج تمہاری ڈیوٹی آف ہونے کے بعد قصبے کے ریستورنٹ میں ڈنر کیا جائے؟“ اسے ریستورنٹ میں ڈنر کی آفر دیتے وقت لمحہ بھر کے لیے میرے خیالوں میں ایڈی کا چہرہ گھوم گیا۔ ریستورنٹ کا پہلا تجربہ کچھ اچھا نہیں رہا تھا۔

میری بات سن کر جینی ایک بار پھر پُر خیال نگاہوں سے مجھے گھورنے لگی۔ شاید وہ نظروں ہی نظروں میں یہ

جانچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں اس کے بارے میں کس حد تک سنجیدہ ہوں۔ وہ کچھ دیر تک یونہی مجھے گھورتی رہی اور پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے، میں رات نو بجے اپنی ڈیوٹی آف کروں گی۔ تم آ جانا، ہم دونوں اکٹھے ہی ریستورنٹ جائیں گے مگر یاد رکھنا تمہاری حد سے بڑھنے کی کوئی بھی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوگی۔“

”تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو، میں ایک شریف انفس انسان ہوں اور تمہارے لیے اپنے دل میں خلوص کے جذبات رکھتا ہوں۔ میرا تمہارے ساتھ ڈنر کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس طرح ہم ایک دوسرے کو ذرا بہتر طریقے سے جان سکیں گے۔ میں نو بجے آ جاؤں گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

دوپہر کا کھانا کھانے جب میں کمرے سے باہر آیا تو جینی ایک کسٹر کے ساتھ ڈیل کر رہی تھی۔ میں نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا اور ریستورنٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس ریستورنٹ سے شکم پروری کرنا میری مجبوری بھی تھی کیونکہ اس قصبے میں اور کوئی ریستورنٹ موجود ہی نہیں تھا۔

رات نو بجے کے بعد میں نے جینی کے ہمراہ اسی ریستورنٹ میں ڈنر کیا اور پھر ڈنر کے اختتام پر اسے پروپوز بھی کر دیا۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق اس بار بھی جلد بازی سے کام لیا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ میرے پروپوز کرنے پر جینی کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا تھا۔ میں ایک آزاد منش انسان تھا اور ابھی تک اکیلا ہی زندگی بسر کر رہا تھا۔

تاہم جینی کے معاملے میں حقیقتاً سنجیدہ ہو چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکی تھی جس کے ساتھ پوری زندگی گزاری جاسکتی تھی۔ شاید اسی لیے میں نے اسے پروپوز کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

”اس کے لیے تمہیں میرے ڈیڈ سے بات کرنا ہوگی۔“ اس نے کہا۔ ”میں آج ان سے تمہارے بارے میں بات کر لوں گی اور کل تمہیں ان سے ملوانے بھی لے جاؤں گی۔ اگرچہ میرا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں مگر میں چاہتی ہوں کہ تم گاڑی پر میرے ساتھ وہاں جاؤ۔“

اس نے اپنے ڈیڈ کے علاوہ کسی اور کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس لیے میں نے پوچھ لیا۔ ”تمہارے ڈیڈی کے علاوہ تمہارے گھر میں اور کون کون ہے؟“

”کوئی نہیں.....“ وہ لٹی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میری ماں کو گزرے ہوئے خاصا طویل عرصہ ہو چکا ہے اور بہن بھائی کوئی ہے نہیں۔ میری پرورش میرے ڈیڈ نے ہی کی ہے۔“

”میں اس عظیم انسان سے ضرور ملنا چاہوں گا۔“ میں نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ”کل ہم دونوں تمہارے گھر ایک ساتھ ہی چلیں گے۔“ جینی سے بات کرتے ہوئے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرے ساتھ آئندہ کچھ عجیب ہونے والا تھا۔

اگلی رات تقریباً نو بجے میں جینی کو لے کر اپنی گاڑی پر اس کے گھر روانہ ہوا۔ اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا، گاڑی کا تو کھنٹھنکھن ہی کیا گیا تھا۔ جینی کی راہنمائی میں، میں چند منٹ میں ہی اس کے گھر پہنچ گیا۔

جینی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے ڈیڈ سے میرے بارے میں بات کر چکی ہے اور اس کے ڈیڈ بھی فوری طور پر مجھ سے ملنے کے خواہاں ہیں۔

جینی نے دروازے پر دستک دی..... کچھ ہی دیر میں دروازہ کھلا اور پھر ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر بھونچکا رہ گئے۔ یہ وہی سکی بوڑھا تھا۔ یہ ملاقات ہم دونوں کے لیے ہی غیر متوقع تھی۔ ”ڈیڈ یہ ہے ڈیڈ..... جس سے میں آپ کو ملوانا چاہ رہی تھی۔“ جینی نے اس سے میرا تعارف کروایا۔

”اوہ.....“ وہ اس طرح چونکا جیسے کسی ٹرانس سے باہر آیا ہو۔ ”مسٹر ڈیڈ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، مجھے ایڈی کہتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کا ماہر تھا۔ اس نے جینی پر بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ ہم دونوں کا خاصا تعارف پہلے ہی ہو چکا ہے۔

میں نے بھی کھیانے سے انداز میں ایڈی کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ یہ میرا اور اس کا پہلا گرگٹھی سے مصافحہ تھا۔ ایڈی نے میرا ہاتھ دبا کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ تاہم میں اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ اس لیے وہ مجھ پر اپنا دبدبہ قائم کرنے میں ناکام رہا۔ ”آؤ اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔“ اپنے مقصد میں ناکامی پر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ کر پسپائی اختیار کر لی۔

ہم تینوں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ”جینی! میں نے کچن میں کھانے کا تمام ضروری سامان رکھ دیا ہے۔ تم کچن دیکھو، میں اس دوران اپنے ہونے والے داماد سے کچھ باتیں کر لوں۔“ ایڈی نے کہا، تو جینی سر ہلاتی ہوئی کچن کی جانب بڑھ گئی جبکہ ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی وہ نگاہوں سے اوجھل ہوئی، ایڈی کے چہرے پر نرمی کے تاثرات یک لخت غائب ہو گئے۔ اپنی پتیلی تبدیل کرتے

ہی وہ اپنے اصل روپ میں آ چکا تھا۔ وہی روپ جس سے میں دل ہی دل میں خوفزدہ ہو چکا تھا۔ وہ اب اپنی عادت کے مطابق مجھے گھورے جا رہا تھا۔ اس کے اس طرح گھورنے پر مجھے اپنے اعصاب پر بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب تک میں کچھ بولوں گا نہیں، اس کے گھورنے کا عمل تسلسل کے ساتھ جاری رہے گا۔ مجھے ریسٹورنٹ میں اس کا عملی مشاہدہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔

”جو کچھ ہوا اسے ماضی سمجھ کر بھلا دو۔“ آخر کار میں نے ہی بات شروع کی۔ ”اگر تم چاہو، تو میں تم سے معافی مانگنے کو بھی تیار ہوں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب سے مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ تم جینی کے باپ ہو، میں دل ہی دل میں بے حد ندامت محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے واقعی تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔“

”بکواس بند کرو۔“ میرے مفاہمانہ و مصالمانہ لہجے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ”تم نے مجھے گھونسا مار کر میری تذلیل کی ہے اور میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر اپنی بے عزتی ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر میں نے اپنی تذلیل کا بدلہ نہ لیا تو یہ میری شکست ہوگی اور ایڈی کو موت قبول ہے مگر شکست قبول نہیں۔“

”میں نے کہا تھا کہ میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔“ میں نے بدستور نرم لہجے میں کہا۔ سار جنٹ مارتھ نے میرے سامنے اس کی شخصیت کی جو منظر کشی کی تھی، اس کے بعد میں بہت محتاط انداز میں گفتگو کو آگے بڑھا رہا تھا۔ میری حتی الامکان یہی کوشش تھی کہ میرے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکلے جس کی وجہ سے اس کی انا مجروح ہو۔ ”تمہیں جینی کی خوشیاں تو عزیز ہوں گی؟ اور پھر ہمارے درمیان ہونے والا جھگڑا اتنا غیر معمولی بھی نہیں کہ مفاہمت نہ ہو سکے۔“

”مجھے تمہاری معذرت سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔“ اس نے زہر خند لہجے میں جواب دیا۔ ”یاد رکھو میری زندگی میں تو تمہاری اور جینی کی شادی ممکن نہیں ہے۔ جینی میری بیٹی ہے اس لیے میرے فیصلے کا احترام بھی کرے گی۔ اگر میں نے اس کے سامنے تمہیں خوش آمدید کہا ہے، تو صرف اس لیے کہ میں فوری طور پر تمہیں انکار کر کے اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا۔ میں اسے آہستہ آہستہ قائل کر لوں گا کہ تم اس کے قابل نہیں ہو۔ یہ بات لکھ لو کہ میں جلد ہی تم سے حساب بے باقی کروں گا۔ تم نے میرے منہ پر گھونسا مارنے کی جسارت کی ہے۔ اسٹور والی بات شاید میں بھلا بھی دیتا مگر تمہارا یہ گھونسا زندگی بھر مجھے کسی سانپ کی طرح

ڈستار ہے گا۔ شاید تمہیں پتا نہیں کہ تم نے میرا ایک دانت بھی توڑ ڈالا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے باقاعدہ منہ کھول کر مجھے ٹوٹا ہوا دانت بھی دکھا دیا۔

”مجھے معاف کر دو۔“ میں نے اس بار پُر خلوص لہجے میں کہا۔ یقین کرو مجھے زندگی بھر اس بات کا دکھ رہے گا کہ میں نے اپنے ہونے والے سر کا دانت توڑ ڈالا۔“

”تمہارا سسر اور میں.....“ وہ ہذیانی انداز میں ہنسا۔ ”اپنی ان خوش فہمیوں میں ڈوب کر خواب دیکھتے رہو مگر یہ میرا قطعی فیصلہ ہے کہ جینی سے تمہاری شادی نہیں ہوگی۔“ وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر جینی کو کچن سے نمودار ہوتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

”کھانا تیار ہونے میں کافی وقت لگے گا۔ میں نے سوچا اس دوران آپ دونوں کو کافی پلا دوں۔“ یہ کہتے ہوئے جینی نے ہماری کرسیوں کی ایک سائڈ پر موجود چھوٹی سی ٹیبل پر کافی کے دو بڑے مگ رکھ دیے۔

”جینی! مجھے ڈیڈ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ یہ واقعی میں تمہارے لیے ایک اچھا لائف پارٹنر ثابت ہوگا۔“ اس بار ایڈی کے بدلے ہوئے لہجے پر مجھے حیرت نہیں ہوئی۔

”مجھے بھی یقین تھا ڈیڈ کہ آپ کو ڈیڈ پسند آئے گا۔“ جینی پُرسرت لہجے میں بولی۔

”ہاں اس کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ ہر کسی کو پسند آئے گا۔“ ایڈی کا لہجہ ذومعنی تھا۔ تاہم جینی کو محسوس نہ ہوا۔ ”ٹھیک ہے آپ دونوں کافی پیئیں۔ میں اس دوران کھانا تیار کرتی ہوں.....“ یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ کچن کی جانب بڑھ گئی۔ ایڈی خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

”جینی کتنی خوش دکھائی دے رہی ہے.....“ میں نے ایڈی کو قائل کرنے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا..... ”ایک اچھا اور مہربان باپ ہمیشہ اپنی اولاد کی خوشیوں کا خیال رکھتا ہے۔“

”میں ایک اچھا اور مہربان باپ بننے کا خواہش مند نہیں ہوں۔“ اس کا جواب سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ لمحہ بھر کے لیے دل میں آیا کہ اس کے باقی ماندہ دانت بھی توڑ ڈالوں۔ تاہم میں نے بڑی مشکل سے خود پر ضبط کیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر مجھے اشتعال دلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر میں اس کی چال میں آ کر اس جگہ کوئی دنگا فساد کرتا تو پھر اس کا مقصد آسانی سے پورا ہو جاتا۔ شاید وہ

تیار

ایک جوڑا ہنی مون منانے گیا تو ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ جب وہ جوڑا سیر کے لیے گیا تو کھانا باہر ہی کھا آیا اور واپس ہوٹل پہنچا تو منیجر نے انہیں کھانے کا بل پیش کر دیا۔

”مگر ہم نے تو یہاں کھانا کھایا ہی نہیں۔“ شوہر غصے سے بولا۔

”مگر کھانا تو تیار تھا۔“ منیجر بے نیازی سے بولا۔ اگلے دن وہ جوڑا پھر کہیں گیا اور چائے پی آیا تو منیجر نے چائے کا بل پیش کر دیا۔ ”مگر ہم نے تو چائے نہیں پی۔“ شوہر نے احتجاج کیا۔ جب وہ جوڑا واپس جانے لگا تو شوہر نے ہوٹل کے مالک کو جرمانے کا بل پیش کر دیا جس میں کہا گیا ان کے منیجر نے اس کی بیوی کو چھیڑا ہے تو منیجر نے کہا۔

”میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔“ ”مگر وہ تو بتا رہی تھی۔“ شوہر بے نیازی سے بولا۔

(مرسلہ: عبد الجبار رومی انصاری۔ قصور سٹی)

کسی طرح جینی کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ تاہم میں بھی دل ہی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کی کوئی چال کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ لہذا اس بار میں نے اس سے دوبارہ بحث نہ کی بس خاموشی سے کافی پی بیٹے لگا۔

جینی کا تیار کیا ہوا کھانا بہت مزے کا تھا۔ میں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے دوران ہم تینوں کے درمیان ہلکی پھلکی نوک جھوک بھی جاری رہی۔ جینی کے سامنے ایڈی نے پھر سے اپنی جون تبدیل کر لی تھی۔ اب وہ ایک شفیق اور مہربان باپ کا روپ دھار چکا تھا۔ وہ اس کے سامنے مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا، ایسا ظاہر کر رہا تھا، جیسے میں اسے بہت پسند آیا ہوں مگر میں اس کے دل میں پوشیدہ نفرت سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ کینہ پرور آدمی مجھ سے انتقام لینے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس بارے میں خود سے جینی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ ویسے بھی میں اسے یہ بتا کر اس کا دل

نہیں توڑنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کے باپ کا دانت توڑ ڈالا تھا۔ ”کیوں نہ کل ہم دونوں الاسکا کی سیر کو چلیں؟“ کھانا کھاتے ہوئے ایڈی نے اچانک مخاطب کیا، تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔

”یہ اچھی تجویز ہے....“ مجھ سے پہلے جینی بول پڑی۔ ”اس طرح آپ ذرا بہتر طریقے سے ایک دوسرے کو جان لیں گے اور ساتھ ساتھ آؤنگ بھی ہو جائے گی۔“ جینی کی بات سن کر میں بس مسکرا کر رہ گیا۔ میں ایڈی کی فطرت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی تجویز کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد کارفرما تھا اور یہ مقصد مجھ سے انتقام لینے کے سوا بھلا کیا ہو سکتا تھا۔

”تو پھر میں کل صبح جینی کے ساتھ ہی تمہارے رہائشی ہوٹل میں آ جاؤں گا۔ وہاں سے ہم تمہاری گاڑی پر ہی روانہ ہوں گے۔ میں تمہیں الاسکا کی خوب صورت وادی کے وہ حصے دکھاؤں گا جہاں عام طور پر کوئی نہیں جاتا۔ الاسکا کے قدرتی نظاروں سے بھرپور دیرمانے جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔“ ایڈی نے میری طرف دیکھتے ہوئے معصومانہ لہجے میں کہا تاہم اس کے لہجے میں چھپی ہوئی مکاری مجھ سے مخفی نہ رہ سکی۔

”ضرور.....“ میں نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ اگرچہ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی، مگر میں انکار کر کے اس کے سامنے یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں اس سے خوفزدہ ہوں۔ اب بات میری انا پر بھی آگئی تھی۔ تاہم میں نے ایک بار جینی کو بھی اس پروگرام میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ ”جینی! تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“

”آئی ایم سوری!“ وہ فوراً معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ ”میں ہوٹل کی ڈیوٹی چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ ہوٹل کے مالک مسٹر جاردن اس معاملے میں بہت سخت ہیں اگر میں ایک چھٹی کرلوں تو وہ تین دن کی تنخواہ کاٹ لیتے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ ایڈی باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”ہم دونوں ہی چلے جائیں گے۔“ اس کا انداز چیلنج بھرا تھا اور میں بھی اس کا چیلنج قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس لیے میں نے اس کی آنکھوں میں اس طرح دیکھا جیسے کوئی اپنے حریف کو دیکھتا ہے، میرے اس طرح گھورنے پر ایڈی کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی جبکہ میرے دل کی دھڑکن یک نخت تیز ہو گئی۔ میں اوپر سے جتنا بھی مضبوط نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ ایڈی ایک بھوت کی طرح میرے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ یہ

بات مجھے دل ہی دل میں پریشان کیے جا رہی تھی کہ ایڈی مجھے الاسکا کے کسی ویران علاقے میں کیوں لے کر جانا چاہتا تھا؟ اس کے ذہن میں میرے خلاف کون سا منصوبہ زیر گردش تھا؟ بہر حال اب میں جانے کی ہامی بھر چکا تھا اس لیے پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور پھر میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا جو آسانی سے اس کی کسی چال کا شکار ہو جاتا۔ بس مجھے اس سے تھوڑا سا محتاط رہنا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ایک بار پھر کافی کا دور چلا اور اس کے بعد میں جینی اور ایڈی کو الوداع کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ تاہم ہوٹل کے کمرے میں، میں رات دیر تک جاگتا رہا۔ ایڈی بدستور کسی آسیب کی طرح میرے اعصاب پر سوار تھا۔

میری چھٹی حس مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے کسی نامعلوم خطرے کا احساس دلارہی تھی مگر میں صحیح طرح ادراک نہیں کر پا رہا تھا کہ ایڈی میرے ساتھ کیا کیم کھیلنے والا ہے۔ سوچتے سوچتے میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور کچھ ہی دیر میں، میں گہری نیند میں چلا گیا۔ صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ میری آنکھ کھلی تو دس بج چکے تھے۔ میں اٹھ کر واش روم میں ٹھس گیا۔ نہانے کے بعد میں خاصا ہشاش بشاش ہو گیا۔ اب کچھ پیٹ پوجا کی ضرورت تھی۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ کاؤنٹر پر ہوٹل کے مالک مسٹر جاردن موجود تھے۔ میں ان سے ہیلو ہائے کرتا ہوا، ہوٹل کے کھن لگے تو س کھانے کے بعد جیب میں واپس ہوٹل پہنچا تو جینی، ایڈی کے ہمراہ وہاں آچکی تھی۔ مسٹر جاردن کاؤنٹر پر موجود نہیں تھے۔ اب ان کی جگہ جینی نے سنبھال لی تھی جبکہ ایک طرف وہ سکی ایڈی کھڑا تھا جس کی وجہ سے میں رات چین کی نیند نہیں سو پایا تھا۔ اس وقت وہ قدرے معقول لباس اور حلیے میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے کندھے سے ایک بیگ بھی لٹک رہا تھا۔

”چلیں!“ وہ مجھ سے دیکھتے ہی مسکرا کر بولا۔ اس وقت اس کا لہجہ بہت مشفقانہ اور نرم تھا، تاہم میں جانتا تھا کہ یہ اس ڈھونگی کا شخص ایک روپ ہے۔ اس کا حقیقی چہرہ تو کئی پردوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ جینی اپنے باپ کی اصل شخصیت سے بالکل بے خبر نہیں ہوگی تاہم وہ ایک بیٹی تھی۔ شاید اس لیے اپنے باپ کی کوتاہیوں سے جان بوجھ کر انجان بنی رہتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے

ہوئے کہا۔ ”ویسے ہم واپس کب تک آجائیں گے؟“ ”تم واپسی کی فکر مت کرو،“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہم شام تک واپس آجائیں گے۔“

”میں گاڑی نکالتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تاکہ چابیاں اور دیگر ضروری سامان ساتھ لے سکوں۔

کچھ ہی دیر میں ہم روانہ ہو گئے۔ میں گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ ایڈی میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر براجمان تھا۔ راستے میں ہم دونوں زیادہ تر خاموش ہی رہے۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد ہم الاسکا کے مخصوص پکنک پوائنٹ پر پہنچے مگر وہاں رکنے نہیں کیونکہ یہ ایڈی کا حکم تھا اور فی الحال میں اس سکی کے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور تھا۔ ایک گھنٹے کی مزید ڈرائیونگ کے بعد ایڈی نے مجھے کاررو کرنے کا کہا تو میں نے سڑک کے ایک طرف گاڑی روک دی۔ ”گاڑی سے باہر نکل آؤ۔“ اس نے اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے تحمانہ لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے پر مجھے غصہ سا آ گیا۔ میری برداشت اب جواب دیتی جا رہی تھی، تاہم اس بار بھی میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کی۔

پہنچے اتر کر میں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ ہمارے علاوہ وہاں کسی ذی روح کا نام و نشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ آگے ہی پکی سڑک بھی ختم ہو رہی تھی اور اس سے آگے پگڈنڈی نما کچا راستہ نمودار ہو چکا تھا، جہاں گاڑی ڈرائیو کرنا تو ناممکن ہی نظر آ رہا تھا۔

ایڈی سڑک کنارے ہی بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنا بیگ کھولا اور پھر شیشے کے دو گلاس اور اسکاچ کی بوتل نکال لی۔

”مجھے یقین ہے کہ تم پارسائی کا کوئی مضحکہ خیز دعویٰ نہیں کرو گے.....“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا، تو میں بھی کندھے اچکا تا ہوا اس کے ساتھ سڑک پر بیٹھ گیا۔ ”یہاں برف دستیاب نہیں اس لیے ویسے ہی کام چلانا پڑے گا۔“ اس نے میرے گلاس کو آدھا اسکاچ سے بھرتے ہوئے کہا اور پھر اپنے گلاس کے ساتھ بھی یہی عمل دہرایا۔ بغیر پانی کے اسکاچ..... میں نے حیرت سے اسے دیکھا تاہم اسے اپنے بیگ سے پانی کی بوتل نکالتے دیکھ کر فوراً ہی میری حیرت کا فور ہو گئی۔ اس نے اپنا اور میرا آدھا خالی گلاس پانی سے بھر دیا۔

ہم دونوں نے بیک وقت ہی اپنے گلاس منہ سے لگائے تاہم ہمارے پینے کے انداز میں واضح فرق تھا۔ جب تک میں نے اسکاچ کے چند گھونٹ ہی لیے تھے، وہ سکی

اپنا گلاس خالی کر چکا تھا۔ میں بے نوشی کے میدان میں نو وارد نہیں تھا تاہم پھر بھی پینے پلانے کے کچھ اصولوں اور ضابطوں کا قائل تھا۔ جب تک میں اس سیال کا آدھا گلاس ہی اپنے حلق میں انڈیل پایا تھا، وہ دوسرا پیگ بھی چڑھا چکا تھا۔ اس کی حد سے گزرنے کی ان عادات نے ہی شاید اسے سکی کا خطاب دلوایا تھا۔

”جانتے ہو کہ سیاح اس جگہ کا رخ کیوں نہیں کرتے؟“ وہ پُرشوق نگاہوں سے اپنے سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

”نہیں، تم خود ہی بتا دو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیونکہ ان پہاڑوں اور حد نگاہ تک پھیلے ہوئے جنگلات میں راستہ بھٹکنے کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ سیاح یا تو بھوک پیاس سے ہلاک ہو جاتے ہیں یا پھر یہاں کے خطرناک رینچوں کا شکار بن جاتے ہیں۔ اس جگہ موبائل سگنل بھی دستیاب نہیں اس لیے وہ کسی کی مدد بھی طلب نہیں کر پاتے مگر تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ میں پروفیسر تھا من کے بعد دوسرا شخص ہوں جو اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے۔“

”پروفیسر تھا من!“ مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ اس دوران میں اپنا اسکاچ کا گلاس خالی کر چکا تھا تاہم اس سے زیادہ پینے کی فی الحال تمنا نہیں تھی۔ اس لیے میں نے دوبارہ اسے اپنا گلاس بھرنے کا نہیں کہا تھا۔

”ہاں پروفیسر تھا من۔“ اس بار اس کا لہجہ عقیدت مندانہ تھا۔ ”یہ تقریباً بیس پچیس برس پرانی بات ہے۔ پروفیسر تھا من نامی ایک ریسرچر یہاں رہا کرتا تھا۔ وہ اس وادی میں گھوم پھر کر قیمتی جڑی بوٹیاں اور سونا تلاش کرتا تھا۔ وہ واحد شخص تھا جو اس بھول بھلیوں کے ہر راستے سے واقف تھا۔ اس کے ہمراہ اس کا دس سالہ بیٹا بھی ہوا کرتا تھا۔ پروفیسر تھا من اور اس کا بیٹا اس وادی کے ان حصوں تک بھی جا چکے ہیں جہاں آج تک کوئی ریسرچر نہیں پہنچ سکا۔ وہ باپ بیٹا اس وادی کے بہت سے مخفی رازوں سے واقف تھے۔“

”اس وادی کے ایک پہاڑی سلسلے کو تو شیطانی آنت کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، اس پہاڑ کے اندر غاروں اور سیکڑوں میل تک پھیلی ہوئی طویل سرتکوں پر مشتمل بھول بھلیاں ہیں جو سیاح اس کے اندر داخل ہو جاتے ہیں، وہ ان راستوں کے سحر میں کھو کر کہاں سے کہاں جا نکلتے ہیں اور

مرگ نکاہاں نمبر

کراچی
سرگزشت

ماہنامہ

کی جھلکیاں

جنوری 2018ء

چاند گرن

زویا اعجاز کے فسوں گرفتلم کا شاہکار، اس ہر دل عزیز شاعرہ کا احوال جس کے اشعار دلوں کی دھڑکن تیز کر دیتے ہیں

جاسوسہ

عبداللہ احمد حسن کے کلک قلم سے اس دوشیزہ کا زندگی نامہ جس کی رگوں میں دوڑتے خالص پٹھانی خون نے اسے بہادری کے معراج پر پہنچایا اور حکومت برطانیہ اسے ایک بڑا جنگی اعزاز دینے پر مجبور ہو گئی

قاتل بائونسیر

کبیر عباسی کا کرکٹ کے شوقینوں کے لیے انمول تحفہ، اس کھلاڑی کی داستانِ زیست جس نے کھیل کے میدان میں موت کو گلے لگایا

خودکش

وسیم بن اشرف کی ایک دلپذیر تحریر، اردو کے اس مقبول شاعر کے حالاتِ زندگی جو سر کرنے کی آرزو میں خودکشی کی بار بار کوشش کر رہا تھا

ننھی کلی

زردیں قمر لائی ہیں ایک دل دکھادینے والی روداد، اس ننھی کلی کی داستان جس نے نہایت صغیر سنی میں پاکستان کا نام روشن کیا

مرگ برگ

بشری شوکت کی ایک ایسی سچ بیانی جسے پڑھتے ہوئے آنسو نکل آئیں گے

ان کے علاوہ

طویل داستان ناسور مقبول سفر نامہ شمشال سے ٹورنٹو اور بہت سی دلچسپ حالاتِ زیست، سچ بیانیاں، سچ واقعات و سچ قصے، کبھی نہ بھولنے والی سرگزشتیں

ایک ایسا اشارہ جسے آپ مجاہد کر اگر محفوظ رکھیں گے، ایسے خاص نمبر صرف سرگزشت ہی پیش کر سکتا ہے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرا لیں

ہے۔ یہاں آنے والے بعض قدردانوں نے اس کی کتاب سے بہت استفادہ حاصل کیا جن میں، میں بھی شامل ہوں۔“ ایڈی باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ تیز رفتاری سے پیدل اپنا سفر بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ میں اس کی منزل سے ناواقف تھا، اس لیے خاموشی سے اس کے پیچھے چلتے پر مجبور تھا۔

”کیا تم کبھی پروفیسر سے ملے ہو؟“ میں نے ایک خیال کے تحت اس سے سوال کیا۔

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”جب میں اس وادی میں آیا تو وہ یہاں سے اپنے بیٹے کو لے کر جا چکا تھا۔ اس سے ملاقات نہ ہونے کا مجھے ہمیشہ افسوس رہا۔ ویسے چند سال پہلے اخبار میں اس کی موت کی خبر پڑھی تھی۔“

”ہمیں پیدل چلتے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ کئی جگہوں سے ہمیں خطرناک پہاری ڈھلوانوں اور تنگ گھاٹیوں سے بھی گزرنا پڑا تھا۔ نہ جانے وہ مجھے لے کر کہاں جا رہا تھا۔ اگر اس کا مقصد مجھے نقصان پہنچانا ہی ہوتا تو یہ کام وہ یہاں بھی کر سکتا تھا۔ مسلسل چلتے سے میری اور ایڈی کی سانسیں پھول چکی تھیں۔“ ایڈی! آخر ہم جا کہاں رہے ہیں؟“ آخر کار میں نے پوچھ ہی لیا۔

”میرے پیچھے پیچھے چلتے رہو۔ بس کچھ ہی دیر میں ہم اپنے منزل تک پہنچ جائیں گے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تو میں ہونٹ پیچ کر خاموش ہو گیا۔ تاہم مجھے زیادہ دیر چلتے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔ ایڈی ایک جگہ جا کر رک گیا تھا۔ ہمارے سامنے ایک بڑا پہاڑ موجود تھا جس میں جگہ جگہ غار نما سرنگیں نظر آ رہی تھیں۔

”میرے پیچھے آؤ۔“ اس نے کہا اور پھر اس پہاڑ کی ایک سرنگ کی جانب بڑھ گیا۔ میں بھی کندھے اچکا تا ہوا اس کے پیچھے چل پڑا۔ سرنگ کے دہانے پر پہنچ کر ایڈی نے اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے بیگ سے ایک نارنج نکالی اور پھر اس کی روشنی میں اس اندھیری سرنگ میں داخل ہو گیا۔

”ایڈی! اس پہاڑ کو تو عرف عام میں شیطانی آنت کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان سرنگوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر بہت سے سیاح اپنی زندگی سے ہاتھ دھو چکے ہیں، تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ اس کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

”میں بس تمہیں قدرت کے تراشے ہوئے یہ شاہکار راستے دکھانا چاہتا ہوں۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”تم بس میرے پیچھے چلتے رہو، یوں سمجھ لو کہ جینی سے شادی کے لیے

جب پلٹ کر دیکھتے ہیں تو انہیں اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ کہاں سے اندر داخل ہوئے تھے اور پھر موت ہی ان کا مقدر بھرتی ہے۔ اس بھول بھلیوں سے قسمت والے ہی باہر نکل پاتے ہیں۔ اب تو حکومت کی طرف سے بھی غاروں اور سرنگوں کے اس سلسلے میں داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ راستہ بھٹکنے کے اصل خطرے سے وہی سیاح دوچار ہوتے ہیں جو بغیر کسی منصوبہ بندی کے ان سرنگوں میں داخل ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آج بھی بہت سی لاشیں ان غاروں اور سرنگوں کے تاریک گوشوں میں گل سڑ رہی ہوں گی۔ بہر حال آؤ ذرا وادی کی خوب صورتی کا دیدار ہو جائے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے شراب نوشی کے لوازمات دوبارہ اپنے بیگ کے اندر ڈالے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے بھی خاموشی سے اس کی تقلید کی۔ اس نے اب پیدل آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے عقب میں چلتے ہوئے میں ابھی تک تذبذب کی کیفیت سے دوچار تھا۔ میں ابھی تک قطعی طور پر نہیں جان سکا تھا کہ وہ اس جگہ واقعی سیر کے لیے آیا تھا یا اس کے ذہن میں میرے خلاف کوئی انتقامی منصوبہ زیر گردش تھا۔

اس نے میرے برعکس اس کراچ کی خاصی مقدار اپنے حلق میں انڈیلی گھی اس لیے اس کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ نمایاں ہو گئی تھی۔ میں اب بھی اس خطی سے پوری طرح محتاط تھا۔ وہ اپنے دشمنوں پر عقب سے حملہ کرنے کے سلسلے میں شہرت رکھتا تھا جبکہ میں جان بوجھ کے اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ میں اسے اپنے عقب میں آنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کے کندھے سے لٹکے ہوئے بیگ میں سے نوشی کے لوازمات کے ساتھ ساتھ کسی خنجر کی موجودگی بھی خارج از مکان قرار نہیں دی جاسکتی تھی۔

”پروفیسر تھامسن، بہت عظیم انسان تھا۔“ ایڈی نے چلتے چلتے کہا۔ ”اس وقت کی حکومت نے اس کی خدمات سے استفادہ حاصل نہ کر کے سیاحوں کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی تھی۔ اگر اس کی مدد سے اس وادی میں نشانات وغیرہ لگائے جاتے تو بہت سے راستے بھٹکنے والوں کی جانیں بچ سکتی تھیں مگر افسوس اس کی ریسرچ کی جس طرح قدر کرنی چاہیے تھی، نہ کی گئی۔ شاید اسی وجہ سے وہ یہاں سے چلا گیا۔ بہت سے لوگ اب بھی اس وادی کے پہاڑوں میں سونے کی تلاش میں آتے ہیں۔ پروفیسر تھامسن نے اس وادی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی اور اس کتاب میں ان مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں سے سونا ملنے کی توقع کی جاسکتی

میں تمہارا امتحان لے رہا ہوں۔“

یہ غار نما سرنگ خاصی بڑی اور کشادہ تھی اس لیے ہمیں چلنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی تاہم میں صرف وہی جگہ دیکھ پاتا جہاں ایڈی ٹارچ کی روشنی ڈالتا تھا۔ میرے آس پاس گھپ اندھیرا ہی تھا۔ اس بند جگہ پر میری اور ایڈی کی پھولی ہوئی سانسوں کی سرسراہٹ بھی آسانی سے سنی جاسکتی تھی۔ اب اس ایک سرنگ کے اندر سیکڑوں سرنگیں نمودار ہو چکی تھیں۔ ایڈی کبھی کسی سرنگ میں داخل ہو جاتا تو کبھی اچانک اپنا راستہ تبدیل کرتے ہوئے کسی اور سرنگ میں داخل ہو جاتا۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت اس بھول بھلیوں میں چلتا رہا اور پھر ایک جگہ ٹھہر گیا۔ شاید اب اس کی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ وہ ایک سائڈ پر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

میں خاموشی سے اس کے پاس کھڑا استفسار طلب نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

”ڈیوڈ! کیا تم ادراک کر سکتے ہو کہ ہم کون سے راستے سے اس پہاڑی سرنگ میں داخل ہوئے تھے؟“ اس نے میرے عقب میں ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کے لہجے میں عجیب سا جنون محسوس ہوا۔ میں نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا۔ ایڈی ٹارچ کی روشنی اطراف میں گھماتا گیا۔ وہاں بیسیوں راستے نظر آرہے تھے۔ بادی النظر میں یہ تعین کرنا مشکل تھا کہ ہم کس راستے سے اس جگہ تک پہنچے ہیں۔

”مگر تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“ میں نے اس سے سوال کیا تو دوسرے ہی لمحے اس کا ہڈیانی قہقہہ غار میں گونج اٹھا۔

”یہ سرنگیں سیکڑوں میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔“ قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”سیاح اسی لیے تو اس بھول بھلیوں میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں کہ وہ واپسی کا راستہ نہیں ڈھونڈ پاتے۔ برسوں پہلے پروفیسر تھامسن نے سیاحوں کی مدد کے لیے اسی جگہ نشانات لگائے تھے جو اب معدوم ہو چکے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ایک ٹریپ ہے اور اب ہم بھی اسی ٹریپ میں پھنس چکے ہیں۔“

”میرے خیال میں ہمیں واپس چلنا چاہیے۔“ اس کی ذومعنی گفتگو سے مجھے بے چینی ہونے لگی تھی۔

”ضرور.....“ وہ ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”بشرطیکہ ہمیں واپسی کا راستہ معلوم ہو۔ شاید ابھی تک تم صحیح معنوں میں خطرے کا ادراک نہیں کر سکے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

”مطلب یہ کہ میرے دوست میں بھی سرنگوں کے اس منجد ہار میں پہلی مرتبہ داخل ہوا ہوں اور مجھے بھی نہیں معلوم کہ ہم کون سے راستے سے یہاں آئے تھے۔“

”مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟“ اس کے جواب سے میری حیرت دو چند ہو گئی تھی۔

”تا کہ تم سے انتقام لے سکوں۔“ اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے اس دنیا میں سب سے زیادہ عزیز اپنی بیٹی جینی ہے مگر اس سے بھی زیادہ عزیز مجھے اپنی انا ہے اور میں نے آج تک اپنی انا پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ تم نے میرے منہ پر گھونسا مار کر میری تذلیل کی تھی جس کا بدلہ تمہیں چکانا ہی پڑے گا۔ تم اس بھول بھلیوں میں بھٹک کر عبرتناک اور دردناک موت کا شکار ہو گے۔ اس پورے علاقے میں موبائل فون سگنل بھی دستیاب نہیں ہیں، اس لیے تم کسی کی مدد بھی طلب نہیں کر سکو گے۔“ بات کرتے ہوئے ایڈی کا لہجہ بہت بھیانک ہو گیا تھا۔

”ایڈی! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایک معمولی بات کی بنیاد پر اس حد تک چلے جاؤ گے اور پھر اس طرح تو تم خود بھی ان الجھے ہوئے راستوں میں بھٹک کر مارے جاؤ گے۔“

”مجھے موت قبول ہے مگر شکست نہیں۔“ وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ”مجھے سکی کے خطاب سے خواجواہ ہی نہیں نوازا گیا۔ میں نے اپنی زندگی کے پانچ برس جیل میں گزار دیے۔ محض اس لیے کہ کسی کی گالی برداشت نہ کر سکا تھا اور چاقو سے حملہ کر کے اپنی تذلیل کا بدلہ لیا۔ تمہارا جرم تو کہیں زیادہ ہے۔ تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے اور اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا ہی پڑے گا۔ رہ گئی یہ بات کہ اگر میں واپسی کے راستے سے ناواقف ہوں، تو میں بھی مارا جاؤں گا تو اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ میں نے یہ بات اپنی بیٹی جینی سے بھی چھپائی ہے کہ میں گلے کے کینسر میں مبتلا ہوں اور میرا یہ مرض اب لاسٹ اسٹیج پر پہنچ چکا ہے۔ میں ویسے بھی چند ماہ میں مرنے والا ہوں تو ابھی کیوں نہیں؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے یک لخت اپنی جیب سے کوئی شے نکال لی۔ ٹارچ کی روشنی دوسری طرف تھی تاہم پھر بھی میں یہ دیکھنے میں کامیاب رہا کہ وہ کوئی چھوٹی سی پلاسٹک کی بوتل تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، اس نے اس بوتل کا

ڈھکن کھولا اور اس کے اندر موجود سیال اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ میں پھرتی سے آگے بڑھا اور اس کے ہاتھوں سے وہ بوتل جھپٹ لی۔ اس نے میری آسانی کے لیے ٹارچ کی روشنی براہ راست اس چھوٹی سی بوتل پر ڈالی تو میرے رونکنے کھڑے ہو گئے۔ میں جس گمان کی بنا پر اس پر جھپٹا تھا، وہ درست ثابت ہوا تھا، وہ زہر تھا۔

”ایڈی! یہ تم نے کیا کر دیا۔“ میرے حلق سے لرزیدہ سی آواز خارج ہوئی۔ ”یہ تو زہر ہے۔“

میرے لب و لہجے کی کمزوری محسوس کرتے ہی اس کا فاتحانہ قہقہہ سرنگ میں گونج اٹھا۔ ”میں نے کہا تھا کہ مجھے موت قبول ہے مگر شکست قبول نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں کینسر میں مبتلا ہوں اور چند ماہ بعد ویسے بھی مرنے ہی والا ہوں۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں تم سے عبرتناک انتقام لینے کی خاطر اپنی زندگی کے یہ چند ماہ قربان کر دوں۔ میں چاہتا تو شراب پیتے وقت تمہارے گلاس میں بھی اس زہر کو ملا سکتا تھا مگر یہ تمہارے لیے بہت آسان موت ہوتی اور میں تمہیں آسان موت نہیں مارنا چاہتا۔ اب تم اس بھول بھلیوں کی دیواروں سے سرکرا کر مرو گے اور یہی میرا انتقام ہے۔ تم اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس بات پر پچھتاؤ گے کہ تم نے ایڈی پر ہاتھ اٹھانے کی جسارت کی تھی۔ ویسے اگر تم اس منجد ہار سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو پھر تمہیں انعام میں جینی بھی مل جائے گی۔“

اس کی آواز آہستہ آہستہ کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں سے ٹارچ پکڑی اور پھر اس کے چہرے پر روشنی ڈالی۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اب چند ساعتوں کا ہی مہمان رہ گیا ہے۔ ریٹینورنٹ میں ہونے والے جھگڑے کے بعد سارجنٹ مارتھرنے میرے سامنے ایڈی کی شخصیت کی جو منظر کشی کی تھی، شاید وہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ وہ انا کے خول میں بند ایک ایسا شخص تھا جو ذرا سی بات کو بھی اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیتا تھا۔ کوئی سکی اپنے جذبہ انتقام کی تسکین کے لیے اس حد تک جاسکتا ہے اس کا صحیح ادراک مجھے آج ہوا تھا۔ وہ کینسر کا مریض تھا، جلد ہی مرنے والا تھا۔ اس نے اپنی باقی ماندہ زندگی کو زہر کا مختصر کر لیا صرف اس لیے کہ وہ مجھے عبرتناک موت دے سکے۔

اس خبطی اور جنونی شخص کو موت قبول تھی مگر شکست قبول نہیں تھی اور موت کا وقت آ گیا تھا۔ اسی لمحے اس نے آخری پچکی لی اور پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ میں

انگشت بدنداں اور افسردہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ مرتے مرتے میری اذیت ناک موت کا بھی پورا پورا بندوبست کر گیا تھا۔ مجھ سے دشمنی میں ہر حد پار کر گیا تھا مگر اس کے باوجود مجھے اس کی موت کا شدید دکھ تھا کیونکہ میں اس کی طرح کوئی نیم یا گل یا سکی شخص نہیں تھا۔ میں کچھ دیر تک اس کے مردہ جسم کو دیکھتا رہا اور پھر ٹارچ کی روشنی میں واپسی کے راستے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے واپس جا کر جینی کو اس کی موت کی خبر دینا تھی اور پھر ریسکیو کے اہلکاروں کو ایڈی کی لاش اٹھوانے کے لیے ساتھ بھی لانا تھا کیونکہ اس کی لاش اٹھا کر اتنا طویل سفر کرنا میرے بس سے باہر تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ میں ہی میں ایک شارٹ کٹ راستے کی مدد سے اس بھول بھلیوں سے باہر نکل چکا تھا۔ ایڈی نے مجھے وہاں پھنسا کر بڑی خوب صورت چال چلی تھی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس کی چال میں آ کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا مگر میرے لیے یہاں سے نکلنا کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ میرا بچپن اسی وادی میں گزرا تھا۔ میں ایڈی کو بتانا چاہتا تھا کہ میں اسی پروفیسر تھامسن کا بیٹا ہوں، جس کے وہ میرے سامنے قصیدے پڑھ رہا تھا۔ میرا بچپن اپنے باپ کے ساتھ انہی بھول بھلیوں میں گھومتے ہوئے گزرا تھا۔ اگرچہ میں بیس برس بعد اس جگہ لوٹا تھا تاہم میرا ان پہاڑوں اور سرنگوں کے ساتھ یادوں کا بڑا مضبوط اور گہرا حلق تھا۔ اسی لیے اس کے الجھے ہوئے راستے میری یادداشت سے محو نہیں ہوئے تھے اور میں آسانی سے باہر نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔

ایڈی کی زندگی کے آخری لمحات میں، میں اسے حقیقت سے مطلع کر سکتا تھا مگر میں نے جان بوجھ کر اسے نہیں بتایا کہ میں پروفیسر تھامسن کا بیٹا ہوں اور اس جگہ کے راستوں سے واقف ہونے کی وجہ سے یہاں سے بہ آسانی نکل جاؤں گا۔ وہ فتح یاب ہو کر مر رہا تھا اور میں اس کی زندگی کے آخری خوش کن لمحات کو دکھ میں نہیں بدلنا چاہتا تھا۔ اس کے جینے کے اپنے اصول اور فلاسفی تھی۔ اسے موت قبول تھی مگر شکست قبول نہیں تھی اگر میں اسے حقیقت بتا دیتا تو وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں احساس شکست سے دوچار ہو جاتا۔ موت کی اذیت اس کے لیے قابل برداشت تھی مگر شاید شکست کی اذیت اس سکی کے لیے ناقابل برداشت ہوتی اور میں نے اس مرتے ہوئے شخص کو حقیقت سے مطلع کر کے شکست کے کرب سے دوچار نہیں کیا تھا۔



درمانده

ناہید سلطان اختر

جس طرح مقدر کی مہربانیوں کا انسان تصور نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح ستم ظریفی بھی کسی کے گمان میں نہیں ہو سکتی... حسن کی وہ شہزادی بھی جب دنیا میں آئی تو حسن و جمال اس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے تھے مگر تقدیر کے ہاتھ میں تلوار تھی شاید جس نے قدم قدم پر اسے ایک نیا زخم بخشا اور ساتھ ساتھ مرہم بھی لگاتی گئی... ہاں وہ ایسی ہی شہزادی تھی جس نے پانڈیوں سے بدتر زندگی گزاری اور ہر آزمائش پر پورا اترتے اترتے آخر میں ہر جگہ زخم کھاتی چلی گئی کہ یہی اس کی تقدیر تھی بس اس کا اپنا اگر کوئی تھا تو صرف حوصلہ اور تیز دھوپ میں اگر سایہ ملا تو صرف ماں کی دعائوں کا۔

پل پل بدلتے رہتے اور حنا زل رسیدہ موسموں

میں عسرتام کرنے والی ایک حینہ کی داستان



نام تو اس کا مہر النسا تھا جو اس کے باپ منیر احمد نے اس کی پیدائش کے چھٹے دن رکھا تھا۔
”کوئی اچھا سا نام رکھو جی۔“ اس کی ماں حمیدہ نے شوہر سے کہا۔
”نیک بخت! بہت اچھا نام ہے یہ..... تو اس کا مطلب جانتی ہوتی تو ایسا نہ کہتی۔“ آٹھ جماعتیں پڑھے منیر احمد نے اپنی خوب صورت بیوی کی کم فہمی پر اسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”مطلب ہی سے تو سارا لینا دینا ہوتا ہے..... اب دیکھتا تیرا نام حمیدہ ہے جس کا مطلب ہے جس کی تعریف کی گئی ہو۔ خاندان میں تیری تعریف کی جاتی ہے کہ نہیں؟ عورت ہو تو حمیدہ جیسی خوب صورت۔ تیری وجہ سے شملہ اونچا رہتا ہے میرا..... دائی اماں کہہ رہی تھی منیر احمد تیری بیٹی اپنی ماں کی طرح سوہنی ہے۔“ منیر احمد نے گدی لے پر سونی ہوئی بیٹی کو پیار سے دیکھا۔

”ہاں تو نام بھی اس کا ماں کی طرح سادہ سار رکھنا تھا نا جو ایک ہی دفعہ میں بولا جائے۔“
”مثلاً؟“

”مثلاً رشیدہ، فہمیدہ..... مہر النسا بڑا نام ہے۔“
”ٹھیک کہتی ہے۔“ منیر احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مہر النسا واقعی بڑا نام ہے..... جہانگیر کی ملکہ نور جہاں کا اصل نام تھا مہر النسا اور اس کا مطلب ہوتا ہے عورتوں کا سورج..... تو دیکھنا میری بیٹی سورج کی طرح چمکے گی۔“
”میں تو اسے مہرن بولا کروں گی۔“

”مہرن، مہر و جو مرضی آئے بولنا مگر اس کا نام ہوگا مہر النسا ہی۔“ منیر احمد نے کہا۔
”چلو جیسے تمہاری مرضی۔“ حمیدہ نے بیٹی کے لیے شوہر کے تجویز کردہ نام سے اتفاق کر لیا۔

پہلوی اولاد تھی۔ منیر احمد اور حمیدہ دونوں ہی کی خواہش تو یہ تھی کہ پہلی اولاد بیٹا ہو مگر اللہ کی مرضی بیٹی ہوئی۔
”کوئی بات نہیں..... اگلی بار سہی۔“ منیر احمد نے بیوی کو تسلی دی۔ منیر احمد کے کالے کلوٹے خاندان میں اس کی بیوی حمیدہ کی خوب صورتی کا ڈنکا بجاتا تھا۔ خوب صورت بیوی کا شوہر ہونے کے ناتے منیر احمد اپنا سینہ چوڑا کیے پھرتا۔ اپنے پرایوں میں دوسرے مرد اسے رشک سے دیکھتے۔ منیر احمد بیوی پر جان چھڑکتا تھا۔ بیوی من چاہی ہو تو مرد بیٹے کی خواہش سے بھی دستبردار ہو جاتا ہے اور یہ کون سی کوئی ان

دونوں کی آخری اولاد تھی۔ ابھی تو سلسلہ شروع ہوا تھا!
حمیدہ کے چلہ نہانے کے بعد دائی اماں نے اسے سوٹھ اجوائن کی دھونی دیتے ہوئے منیر احمد سے کہا۔ ”منیر احمد! یاد رکھنا تمہاری بیٹی اپنی ماں سے بھی زیادہ خوب صورت نکلے گی۔“
”ارے نہیں دائی اماں..... میری بیوی سے زیادہ خوب صورت کوئی نہیں ہو سکتی۔“
”شرط لگ جائے؟“
”بے شک۔“

”ان ہاتھوں نے.....“ دائی اماں نے اپنے ہاتھ پھیلا کر منیر احمد کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک دو نہیں بیسیوں بچے جنائے ہیں..... تجربہ ہے تجربہ۔ بچے کو دیکھ کر بتا دیتی ہوں بڑا ہو کر کالا نکلے گا کہ گورا۔ نین نقش کھڑے ہوں گے کہ بھدے..... تمہاری بیٹی حسینوں کی حسین ہوگی۔“

”سن رہی ہے نیک بخت۔“ منیر احمد نے مسکراتے ہوئے بیوی کو دیکھا۔
”سن رہی ہوں۔“ حمیدہ بولی۔ ”اللہ نصیب بھی حسین کرے۔“

چند ہی ماہ میں مہر النسا کے نین نقش واضح ہونے لگے۔ وہ نہایت خوب صورت بنی تھی۔ جو دیکھتا اسے پیار کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس کی رنگت گلابی تھی۔ آنکھیں بڑی، سیاہ اور غیر معمولی چمکدار، ناک ستواں، دہانہ چھوٹا، بال گہرے سیاہ اور چمکیلے۔ منیر احمد بچی کو بڑے فخر سے گود میں اٹھائے پھرتا اور اکثر بیوی سے کہتا۔ ”حمیدہ! دائی اماں واقعی سیانی ہے۔ اس وقت تو پتا بھی نہیں تھا کہ ہماری بیٹی ایسی خوب صورت نکلے گی۔“

”ابھی تو اور پیاری ہوگی میری مہرن۔“ حمیدہ بچی کو متا بھری نگاہوں سے دیکھتی۔

”اس کی شادی کے لیے تو لڑکا بھی بہت دیکھ بھال کر ڈھونڈنا پڑے گا..... اسی کی طرح خوب صورت۔“ منیر احمد کہتا۔
”لڑکے کی خوب صورتی نہیں شرافت اور کمائی دیکھنی چاہیے..... مرد کی خوب صورتی بغیر شرافت اور کمائی کے کس کام کی بھلا۔“

منیر احمد کو تسلی ہوتی کہ وہ اگر خوب صورت نہیں تھا تو کیا، شریف اور کماد تو تھا۔ گویا بیوی کے معیار پر پورا اترتا تھا۔
مہر النسا کو حمیدہ نے مہرن کیا کہنا شروع کیا، سبھی اسے مہرن کہنے لگے۔ حتیٰ کہ اسے مہر النسا نام دینے والا اس کا

درماندہ

باپ منیر احمد بھی۔
منیر احمد چاہتا تھا دوسرے بچے کی پیدائش میں زیادہ وقفہ نہ ہو مگر بندے کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، مرضی تو رب کی چلتی ہے۔ وہ چاہے دے، چاہے نہ دے۔ حمیدہ کے علاج معالجے اور گھریلو چٹکی بوٹیوں کے باوجود حمیدہ کے ہاں دوسرے بچے کی امید نہ بندھ سکی۔ اکلوتی ہونے کے ناتے مہرن ماں باپ کی آنکھ کا تارا بن گئی۔

منیر احمد کا ایک بھائی تھا اور ایک بہن۔ بھائی جس کا نام معین احمد تھا، منیر احمد سے چھوٹا تھا، بہن، زینت منیر احمد سے بڑی تھی۔ معین غیر شادی شدہ تھا اور بھائی بھادج کے ساتھ رہتا تھا۔ بہن اپنے گھر بار کی تھی۔ اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ معین نکما سونو جوان تھا۔ دس جماعتیں پڑھ کر اس کے دماغ آسمان کو پہنچے ہوئے تھے۔ نیک کر کوئی ایک ذریعہ معاش ہی نہ پکڑتا۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ جیب میں دو پیسے آتے تو جیب خالی ہونے تک انڈوں پر بیٹھ جاتا۔ کھانے پینے کی فکر بھی نہیں، بڑا بھائی تھا جس کی اپنی بیوی کو ہدایت تھی کہ معین کو کھلانے پلانے میں کبھی کبھو نہ دکھائے۔
مرے ماں باپ کی ارواح کو خوش رکھنے کے لیے منیر احمد چھوٹے بھائی کی سرپرستی کو اپنا فرض جانتا تھا۔ معین کا گھر بسانے کے لیے بھی کوشاں رہتا تھا مگر معین کا کوئی معقول اور مستقل ذریعہ معاش نہ ہونے کے باعث اب تک کہیں بات نہ بن سکی تھی۔ معین بلا کا سگریٹ نوش بھی تھا بلکہ منیر احمد کو تو شبہ تھا کہ وہ سگریٹ میں کوئی نشہ بھی ضرور استعمال کرتا تھا۔ معین کا اٹھنا بیٹھنا بھی اچھے یار دوستوں میں نہیں تھا۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ معین کی جیب میں پیسے ہوتے تو انہی کے ساتھ آوارہ گردی کرتا پھرتا۔ حمیدہ کو اس کے طور طریقے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے مگر شوہر کی وجہ سے برداشت کرتی اور چپ رہتی۔

منیر احمد کی بڑی بہن زینت اپنے ہی لوگوں میں بیاہی گئی تھی۔ اس کے شوہر کی کرپانے کی چھوٹی سی دکان تھی۔ دو کمروں کا مکان تھا۔ زینت کو منیر احمد سے بہت پیار تھا اور اس پر مان بھی۔ وہ اکثر کہتی ماں باپ کے بعد میرے میکے کا دروازہ منیر احمد کے طفیل کھلا ہوا ہے۔ منیر احمد اچھا بھائی تھا۔ بہن کو نہایت احترام دیتا۔ اس کے شوہر کی عزت کرتا اور اس کے بچوں سے بہت پیار کرتا۔ عید، بقرعید، تیوار، خوشی منیر احمد بہن بہنوں اور ان کے بچوں کو لینے دینے میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر مان رکھتا۔ زینت بھی پیچھے نہ رہتی۔ مہرن پر تو وہ جان چھڑکتی تھی۔ آئے دن اسے کچھ نہ

کچھ دیتی رہتی کبھی کوئی اچھی سی فراک، کبھی شلوار قمیص کا سوٹ، بھی کوئی کھلونا، کبھی کچھ اور۔ زینت نے مہرن کی پیدائش کے بعد منیر احمد سے کہا تھا، یہ میرے جاوید کی دہن بنے گی۔ جاوید نام تھا زینت کے بڑے بیٹے کا جو مہرن کی پیدائش کے وقت سات آٹھ برس کا رہا ہوگا۔

پھوپھی کی طرح مہرن سے اس کا چچا، معین بھی بہت پیار کرتا تھا۔ چھوٹی سی بھی تو اکثر اسے ساتھ لے کر گھمانے پھرانے کے لیے باہر نکل جاتا۔ اسے بسکٹ اور ٹافیاں دلواتا۔ گھر کے نزدیک واقع بچوں کے کھیل کے میدان میں وہ اسے دیر تک اپنی گود میں لیے بیٹھا رہتا۔ رات کو اکثر اسے اپنے ساتھ ہی لٹالیتا۔ اسے لوری سنا تا، اس کی نیند میں خلل نہ پڑنے دینے کی خاطر اپنے کمرے کا دروازہ بھیڑ لیتا۔ ذرا سی آہٹ پر چوکنہ ہو جاتا۔ سردی ہوتی تو وہ اسے اپنے لحاف میں دبا کر خود بھی سر سے پاؤں تک لحاف تان لیتا۔ حمیدہ بار بار آ کر کہتی۔ ”لاؤ معین! مہرن کو مجھے دے دو۔“ وہ لحاف کے اندر ہی سے جواب دیتا۔

”ذرا نیند پکی ہو جانے دو اس کی پھر دے دوں گا۔“
حمیدہ اصرار کرتی۔ ”دے دو نا معین! اوہ لحاف سے اپنا سر باہر نکال کر غراتا۔“

”کہہ دیا نا ذرا نیند پکی ہو لینے دو۔“ حمیدہ بحث میں نہ پڑتی۔ معین ذرا سی دیر میں بدتمیزی پر اتر آتا۔ بھائی سے ایک ایک کی دو دو لگاتا۔ اگرچہ منیر احمد اس کی شکایت پر حمیدہ سے کچھ نہ کہتا۔ حمیدہ اس کی من چاہی بیوی تھی مگر پھر بھی حمیدہ دیور کے منہ لگنے سے احتیاط کرتی اور دعا مانگتی کہ کہیں معین کے رشتے کی بات بنے تو اس مصیبت سے اس کی جان چھوٹے۔ ننھی مہرن بھی چچا کو مصیبت ہی سمجھتی تھی۔

مہرن چار سال کی ہوئی تو محلے کی مسجد میں اس کی بسم اللہ کی تقریب ہوئی اور دینی تعلیم کے لیے اسے مسجد بھیجا جانے لگا۔ امام مسجد جو محلے کے بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم دیتے، بال بچے دار شریف آدمی تھے۔ مسجد سے حق ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے مگر بچوں کو دینی تعلیم دینے کے سلسلے میں ان کا معاون جو کسی دور دراز مقام سے آیا ہوا نو جوان آدمی تھا مسجد ہی میں قیام پذیر رہتا۔ محلے کے گھروں سے اس کے لیے کھانا آ جاتا۔ بڑے ٹھاٹ کی زندگی تھی اس کی، نہ فکر معاش نہ فکر نان و نوش۔ ہر ہفتے نماز جمعہ کے بعد نمازی اس کی مٹھی میں اتنے پیسے دبا جاتے کہ خود بھی فراخی سے گزارنا آتے جاتوں کے ہاتھ گھروالوں کو بھی بھجواتا۔ مسجد میں دینی تعلیم کے لیے آنے والے بچوں کے

سینے سے لگا کر دھڑکن سننے کی کوشش کی مگر بغض ڈوب چکی تھی اور دل کی دھڑکن نثار دھڑکن بھی حیدہ نے منیر احمد کو اسپتال لے جانے پر اصرار کیا۔ کھینچ کھانچ کر منیر احمد کو اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ تو ختم ہو چکا۔“

حمیدہ جوانی میں بیوہ اور مہرن کم عمری میں یتیم ہو گئی۔ اپنے پرائیوں کا کہنا تھا حمیدہ کے ہنستے ہنستے گھر کو کسی بد نظر کی نظر لگ گئی تھی۔ منیر احمد ایک اچھا شوہر، اچھا باپ تھا۔ اپنی حیثیت کے مطابق اس نے بیوی اور بیٹی کو ہر طرح کا آرام دے رکھا تھا۔ مہرن کی وہ ہر خواہش، ہر فرمائش پوری کرنے کی کوشش کرتا۔ ایک محنتی اور ذمے دار مرد کی بیوی ہونے کی وجہ سے حمیدہ کی اپنے رشتے داروں اور ملنے جلنے والوں میں بڑی عزت تھی۔ منیر احمد زندگی سے کیا نکلا حمیدہ تو جیسے بے ردا ہو گئی۔ مہرن بھی باپ کی موت سے سہم سی گئی تھی۔ زندگی اپنی تمام تر احتیاجات اور مشکلات کے ساتھ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ رشتے دار بھی ہر مولیٰ اپنے پتوں پر بھاری کے مصداق تھے۔ ماں بیٹی کو تحفظ کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ حمیدہ گھر میں بیٹھی عورت تھی۔ ماں باپ کے گھر سے رخصت ہو کر سسرال آئی تو منیر احمد نے اس کی تمام ضرورتیں گھر بیٹھے پوری کیں۔ خود ہی گھر کا سودا سلف خرید کر لاتا۔ خود ہی مہمانداری اور غمی خوشی سے نمٹنے کی تدبیریں کرتا۔ وہ تو حمیدہ کے کپڑے بھی خود ہی خرید کر لاتا تھا۔ پہلے اسے دکھاتا پھر خود ہی درزی کو بھی سلنے کو دے آتا۔ مہرن کے لیے بھی کپڑے وہی خریدتا تھا۔ حمیدہ کو گھر سے باہر نکلنے کی زیادہ عادت نہ شادی سے پہلے ہی نہ شادی کے بعد رہی۔ شادی سے قبل میکے میں اس کی ضرورتیں والدین کے توسط سے پوری ہوتی تھیں۔ شادی کے بعد شوہر بھی ذمے دار اور فرض شناس ملا مگر اب اس کے انتقال کے بعد سر پر آ پڑی ذمے داریوں سے اسے مہرن کے کمزور سہارے کے ذریعے نمٹنا تھا۔

منیر احمد کے انتقال کے بعد حمیدہ عدت میں بیٹھی تو پتا چلا کہ مہرن جسے وہ اپنا کمزور سہارا سمجھ رہی تھی، اس کا سب سے مضبوط سہارا ثابت ہوئی۔ عزیز، رشتے دار تو چند دن شریک غم رہ کر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے اور وہ تسلیاں اور دلا سے بھول بھال گئے جن سے انہوں نے منیر احمد کے انتقال کے ابتدائی دنوں میں حمیدہ کا دل رکھنے اور ہمت بندھانے کی کوشش کی تھی۔ دور پار کے رشتے دار تو منیر احمد کی زندگی میں بھی شاذ ہی آتے تھے۔ قریبی رشتے دار بھی جیسے منہ چھپا کر بیٹھ گئے۔ حمیدہ کے والدین فوت ہو چکے تھے۔

حرم تار تار کر دی۔ حمیدہ کی سوتے سے اچانک آنکھ کھلی تو مہرن کو اس کی جگہ پر نہ پا کر وہ اٹھ بیٹھی ادھر ادھر دیکھا، غسل خانے میں جھانکا، صحن میں نظر دوڑائی اسے پکارا اور جواب نہ پا کر اس نے منیر احمد کو جھنجھوڑا۔

”کیا ہوا؟“ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”مہرن نہیں ہے۔“ حمیدہ نے لرزتی کانپتی آواز میں بتایا۔

”کیا؟“ چادر ایک طرف پھینک کر منیر احمد چار پائی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ باورچی خانہ، غسل خانہ، صحن سب جھان مارا، مہرن نہ ملی۔ بالآخر معین کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا دروازہ تاخیر سے کھلا۔ مہرن وہیں تھی اور معین کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ منیر احمد کو ایسا صدمہ اپنے ماں باپ کی موت سے بھی نہیں پہنچا تھا۔ بیٹی کا معاملہ تھا۔ اچھالنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا بلکہ ساری عمر کی بدنامی بیٹی کے نام کے ساتھ نکلتی ہو جانا تھی۔ اسے بڑا بھی ہونا تھا۔ شادی بھی ہونا تھی۔ کیا پتا کیسے لوگوں سے سابقہ پڑتا۔ بعض تو طعن و تشنیع سے ہی بندے کا کلیجا چھلنی کر دیتے ہیں، زندگی کو روگ بنا دیتے ہیں مگر منیر احمد کو بھائی سے ایسی نفرت ہوئی کہ اس سے بات چیت ترک کر دی۔ اس کی طرف دیکھنے کا روادار نہ رہا۔ بہن سے کہہ سن کر ایک غریب گھرانے میں معین کی شادی کرادی۔ ویسے تو خیر خود منیر احمد بھی کون سا کوئی امیر آدمی تھا یا لاکھوں میں کھیل رہا تھا، بس عزت سے گزارے والی بات تھی مگر معین کی شادی جس گھر میں ہوئی وہ تو بہت ہی گیارا گزرا تھا۔ لڑکی بھی واجبی سی شکل و صورت رکھتی تھی۔ ظاہر ہے معین جیسے ہڈ حرام کو ایسا ہی گھرانہ مل سکتا تھا۔ معین کی شادی ہوتے ہی منیر احمد نے اسے اپنے گھر سے بے دخل کر دیا۔ خس کم جہاں پاک!

☆☆☆

مہرن چھٹی جماعت میں تھی کہ منیر احمد کا ناگہاں انتقال ہو گیا۔ اچھا بھلا تھا۔ نہ کوئی بیماری، نہ بستر پر پڑا۔ ایک روز کام سے گھر واپس لوٹا تو بیوی اور بیٹی کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد طبیعت کچھ بوجھل محسوس ہوئی۔ باہر گیا اور سوڈا واٹر کی بوتل پی کر گھر واپس آیا۔ جی متلایا، پسینا آیا، ایسا کہ کپڑے بھیگ سے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ حمیدہ نے مہرن کو دوڑایا کہ پڑوس سے ہمسائے اور اس کی بیوی کو بلا لائے۔ جب تک ہمسائی اور اس کا خاوند آئے، منیر احمد کی گردن ایک طرف ڈھلک چکی تھی۔ ہمسائی کے میاں نے بغض ٹٹولی، اپنا کان منیر احمد کے

بچیوں کو بینڈ میں شمولیت کے لیے کیا قیمت دینی پڑتی تھی، یہ وہ بچیاں ہی جانتی تھیں۔

ایک روز وہ مہرن کو بھی کلائیوں میں باندھنے کے لیے نئے ربن دینے کے بہانے بینڈ روم میں لے گیا اور وہاں اس نے مہرن کے ساتھ کبھی غلط کرنا چاہا مگر وہ خوف سے ہاتھ چھڑا کر باہر کی طرف دوڑ پڑی۔ باہر نکل کر اپنی الماری سے نئے ربن نکال کر اس کی کلائیوں پر باندھے اور اس سے بولا۔ ”بینڈ میں رہنا ہے نا؟“

مہرن نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے۔“ پی ٹی ماسٹر نہایت خباثت سے مسکرایا اور مہرن کو نندی نظروں سے دیکھتے ہوئے چکار کر بولا۔ ”جاؤ..... شاباش..... مگر دیکھو کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ورنہ..... اسکول سے نام نکلوادوں گا تمہارا۔“

مہرن بینڈ روم سے نکل کر ہی نہیں چھٹی کے بعد گھر جا کر بھی بے اوسان رہی۔ مہرن اسکول سے نام نکلنے کے خوف سے اپنی ماں کو بھی پی ٹی ماسٹر کی اس حرکت کے بارے میں نہ بتاپائی۔ پی ٹی ماسٹر کے ساتھ اسے اسکول بینڈ سے خوف آنے لگا تھا۔ ڈرم کی آواز اس کے کانوں پر ہتھوڑے برساتی اور بانسری کی آواز سے اسے وحشت محسوس ہوتی۔ وہ پی ٹی ماسٹر کی حرکت کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہہ پائی مگر بھلا ہوا ایک بچی کا جس نے اپنے گھر میں پی ٹی ماسٹر کی قبیح حرکتوں کا بھانڈا اچھوڑ دیا۔ اس کے والدین کی طرف سے شکایت ہیڈ ماسٹر سے کو پہنچی۔ بینڈ میں شامل لڑکیوں سے پوچھ گچھ ہوئی اور اسکول کو بدنامی سے بچانے کے لیے پی ٹی ماسٹر کا تبادلہ لڑکوں کے ایک اسکول میں کر دیا گیا۔ خدا ہی جانے وہاں جا کر اس خبیث آدمی نے کیا گل کھلائے ہوں گے۔ مہرن کے اسکول کی بچیوں کو بہر حال اس سے چھٹکارا مل گیا تھا لیکن ان کے پھول جسموں پر جو گھاؤ لگ چکے تھے، ان کا اندام ممکن نہ تھا۔ انہیں تو ساری زندگی ان منہ بند زخموں کی ٹیسیں سہنا تھیں۔

☆☆☆

مہرن تیسری جماعت پاس کر کے چوتھی میں گئی تھی کہ انہی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے منیر احمد اور حمیدہ کو ناقابل بیان اذیت سے دوچار کر دیا۔ اس واقعے کے بعد منیر احمد دنوں نہیں مہینوں رات کو سو نہیں سکا تھا۔

معین ایک رات مہرن کو جبکہ وہ ماں باپ کے ساتھ کمرے میں سوئی ہوئی تھی، نہ جانے کیونکر اپنے کمرے میں لے گیا اور وہاں اس نے اپنے اور معصوم مہرن کے رشتے کی

ساتھ امام صاحب کے سامنے تو اس کا رویہ نہایت مہذبانہ اور شریفانہ ہوتا مگر ان کی نظر نیچے ہی وہ مسجد میں قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آنے والی لڑکیوں ہی سے نہیں، لڑکوں سے بھی معیوب زبانی اور جسمانی چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتا۔ بے چاری مہرن بھی اس کی اس خباثت سے محفوظ نہ رہ سکی۔ واردات کے بعد وہ اپنی خباثت کا شکار بچے یا بچی کو چھڑی دکھاتے ہوئے کہتا۔ ”یہ دیکھی ہے نا۔“ دوسرے بچوں کی طرح مہرن بھی چھڑی کے خوف سے اس دیوٹ کے خلاف ماں باپ کو کچھ نہ بتاتی۔

☆☆☆

مہرن پانچ سال کی ہو کر چھٹے میں لگ چکی تھی جب منیر احمد نے اسے گھر کے نزدیک ہی واقع ایک سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا۔ اسکول میں تمام کی تمام پیچہ زخواتیں تھیں، سوائے پی ٹی ماسٹر کے۔ پی ٹی ماسٹر ایک کیم مہم مرد تھا۔ اس کی گردن میں ایک ڈوری سے بندھی سیٹی لگی رہتی اور ہاتھ میں ایک چکنا گول ڈنڈا ہوتا۔ اس کا زیادہ وقت اسکول میں کھیل کے میدان میں گزرتا جہاں ایک گھنے درخت کے نیچے اس کی کرسی پڑی رہتی جس پر وہ ضرورتاً بیٹھ رہتا۔ بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہ اپنی گردن میں جھولتی سیٹی کو ہونٹوں کے درمیان دبا کر اتنی زور سے بجاتا کہ قبروں میں پڑے مردے بھی سہم کر اٹھ کھڑے ہوں۔ پی ٹی ماسٹر نے اسکول بینڈ بھی بنا رکھا تھا جس میں مڈل اور سیکنڈری جماعتوں کی بچیوں کے ساتھ پرائمری کی طالبات بھی شامل تھیں۔ چھوٹی جماعتوں کی یہ بچیاں اسکول بینڈ میں عموماً دف پامجیرے بجاتیں۔ بینڈ میں شامل بچیوں کا انتخاب یا اخراج پی ٹی ماسٹر کی صوابدید پر ہوتا۔ وہ جسے چاہتا رکھتا جسے چاہتا نکال باہر کرتا۔ لڑکیوں کے انتخاب میں اس کی اولین ترجیح خوب صورتی ہوتی۔ وہ خود کالا بھنگ تھا مگر بینڈ کے لیے گوری چٹی لڑکیاں منتخب کرتا۔ مہرن چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ اسکول کی سب سے زیادہ خوب صورت لڑکی تھی، بھلا اس کا انتخاب کیوں نہ ہوتا۔ مہرن اسکول بینڈ میں شامل ہو کر نہایت مسرور ہوئی۔ منیر احمد نے اسے اسکول یونیفارم سے ہٹ کر سفید شلوار قمیص بھی سلوادی۔ ہر ہفتہ مہرن پیر کے دن سفید شلوار قمیص کے ساتھ چیک دار جیکٹ اور اس پر سرخ رنگ کا وی دوپٹا اپنے شانوں پر آراستہ کر کے اسکول جاتی۔ پیر کے دن صبح اسکول اسمبلی میں بینڈ بجایا جاتا اور اسکول کی باقی بچیاں اٹن شن کھڑی بینڈ میں شامل بچیوں کو اپنی اپنی پر فارمنس دیتے نہایت رشک سے دیکھتیں لیکن بینڈ میں شامل اکثر

وقت تیزی سے گزرا۔ مہرن پر جوانی آنے لگی۔ مثل ہے کہ جوانی گدھی پر آئے تو وہ بھی حسین لگنے لگتی ہے۔ مہرن کو نورب نے نہایت فراخی سے حسن سے نوازا تھا۔ جوانی آئی تو حسن دو آتشہ ہو گیا۔ جسم گدرا گیا۔ چہرے کی رنگت گھناور ہو گئی۔ رخساروں کے ابھار دیکھ اٹھے۔ ہونٹ رسلے ہو گئے۔ آنکھوں کی آب دوچند ہو گئی۔ شوق میں چھوڑ دانی گئی ناک میں حمیدہ نے اپنی ناک کا کوکا اتار کر ڈالا تو قیامت ہی مچ گئی۔ وہ جدھر گردن گھماتی کوکے کا سفید نگینہ اس کے چہرے کی صورت بڑھا دیتا۔ سیاہ بال بالہ بن کر اس کے ماہتابی چہرے کو حسین تر بنا دیتے۔ حمیدہ کو اکثر منیر احمد کی بات یاد آتی۔ مہرن کا نام رکھتے ہوئے اس نے کہا تھا..... تو دیکھنا حمیدہ میری بیٹی سورج کی طرح چمکے گی۔ خوب صورت تو خود حمیدہ بھی کم نہیں تھی لیکن مہرن تو چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔ گدڑی میں لعل تھی، حسن بے مثال تھی۔ اسے دیکھ کر یہ خیال آتا تھا کہ محل نشین شہزادیاں شاید اسی جیسی ہوتی ہوں گی۔ قسمت کی بات تھی کہ وہ کسی محل کے بجائے ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ جب تک باپ زندہ رہا خیر تھی۔ اس کے بعد تو بے چاری حمیدہ کو مہرن کی اسکول کی قلیل ماہانہ فیس ادا کرنا بھی مشکل ہوتا۔ ہمدردوں کے مشورے پر اس نے مہرن کے اسکول میں عرضی گزار کر اس کی فیس بھی معاف کرائی تھی۔

مہرن کی پھوپھی نے اپنے بیٹے سے اس کا رشتہ مانگا تو حمیدہ کو کوئی عار ہوا نہ اس نے کوئی پنج لگائی۔ وہ اور مہرن دونوں ہی مرد سے ملنے والے تحفظ کے بنا زندگی گزار رہی تھیں۔ حمیدہ اسے زیادہ تعلیم دلوانے کے چکر میں بھی نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ قرآن مجید اس نے پڑھ لیا تھا اور اچھی طرح پڑھنا لکھنا سیکھ گئی تھی۔ انگریزی بھی تھوڑی بہت پڑھ لکھ ہی لیتی۔ حساب کتاب بھی اتنا تو آتا ہی تھا کہ اپنے گھر جا کر نظام اچھی طرح چلا سکتی تھی۔ اپنوں سے بہتر کون باہر والے تو دس شرطیں لگاتے سو مطالبے کرتے۔ پھوپھی کے گھر بیاہ کر جانا تو اپنے گھر سے رخصت ہو کر اپنے ہی گھر جانے والی بات تھی۔ پھوپھی کو سارے حالات کا علم تھا۔ اس نے تو اپنے بیٹے جاوید سے مہرن کا رشتہ مانگتے وقت بھانج کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے کہہ دیا تھا۔ ”تمہیں کوئی فکر، کوئی جتن کرنے کی ضرورت نہیں بھائی۔ میرے بھائی کی بچی ہے، اس گھر سے ایک سوئی لیے بغیر میں تو اپنے ہی گھر کے کپڑوں میں لے جاؤں گی اسے تمہارے گھر سے اپنے گھر۔“

”نہیں خالہ..... بالکل بھی نہیں۔“ حمیدہ نے سختی سے انکار کر دیا۔
”چچھتائے گی حمیدہ۔“
”اللہ مالک ہے خالہ۔“
”سوچ لے۔“

”سوچنا کیا..... مہرن کے ابا کے بعد میں کسی اور مرد کا خیال بھی نہیں لاسکتی اپنے دل میں.....“
”اکیلی تو بیٹی کو کیسے نمٹائے گی؟“
”جس اللہ نے بیٹی دی ہے وہی ہمت دے گا خالہ۔“
”اے بیٹی کو اس کے گھر بار کا کرنے کے لیے پیسا بھی چاہیے ہوتا ہے۔“
”وہی دے گا خالہ۔“

”برامت ماننا حمیدہ..... زمانہ خراب ہے..... تو بھی جوان اور خوب صورت، تیری بیٹی بھی خوب صورت..... درندے پھرتے ہیں باہر۔“

”ارے خالہ درندوں سے آدمی کہاں تک ڈرے..... درندے تو گھروں کے اندر بھی ہوتے ہیں۔“
ہمدرد حمیدہ کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے مگر وہ کسی کی نہ مانی۔ منیر احمد اس کی زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد ثابت ہوا۔ منیر احمد کے بعد گھر میں وہ رہ گئی تھی اور مہرن..... بس! منیر احمد کے انتقال کے بعد رشتے داروں نے کچھ دن تو ماں بیٹی کی دلداری کی پھر ایک ایک کر کے سب غافل ہو گئے۔ لے دے کے بس ایک منیر احمد کی بہن زینت ہی تھی جو بیوہ بھانج اور بیٹی کی خیر خبر لے لیتی تھی۔ رشتے داروں کی بے حسی دیکھ کر محلے والوں نے حسب توفیق دونوں ماں بیٹی کی اعانت شروع کر دی۔ کوئی جعرات کا کھانا مسجد میں بھجوانے کے بجائے ان ماں بیٹی کو بھجوادیتا تو کوئی صدقہ اور منت کے پیسے۔ کبھی کوئی ہمسائی سالن بھجوادیتی تو کبھی پڑوس سے بچی سبزی ترکاری آجاتی۔ مہرن دودھ لینے کے لیے یاسین کے باڑے جاتی تو اس کا نو جوان بیٹا یاسین دودھ ٹاپنے والی بیٹی سے آدھا پاؤ دودھ مہرن کے پیتل کے گلاس یا سلور کی دپٹی میں ڈالنے کے بعد تھوڑا سا اضافی دودھ علیحدہ سے ڈالتا اور مہرن کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے بطور خاص جاتا۔ ”یہ تیرے واسطے الگ ہے۔“ مہرن جھینپ جاتی۔ اہل محلہ کی ہمدردی اور اعانت سے ماں بیٹی دونوں ہی احساس کمتری اور شرمساری سے دوچار رہنے لگی تھیں۔

☆☆☆

تراشے ہوئے کپڑوں کو سلائی آسانی سے لگا لیتی تھی۔ محلے میں ایک کارخانہ تھا جہاں سے تراشیدہ کپڑے گھر بیٹھی عورتوں کو معمولی اجرت پر سلائی کے لیے دے جاتے۔ مہرن وہاں سے سلائی بھی لانے اور لے جانے لگی۔ چھوٹی سی عمر میں مہرن گھر کا مرد بن گئی تھی۔

☆☆☆

عدت کے بعد حمیدہ کو اس کے ہمدردوں اور بھی خواہوں نے دبی زبان سے عقد ثانی کا مشورہ دینے کے ساتھ اس سلسلے میں اپنی خدمات کی پیشکش بھی کی مگر حمیدہ تیار نہ ہوئی۔ منیر احمد کے بعد اس کے لیے کسی دوسرے مرد کا منہ دیکھنے کا تصور ہی محال تھا۔

”کیسے کاٹے گی حمیدہ تو پہاڑی جوانی۔“ اس کی ہمدرد ایک عمر رسیدہ بڑھیا نے اس سے کہا۔

”مہرن کے سہارے کاٹ دوں گی خالہ۔“ حمیدہ نے جواب دیا۔

”مہرن بیٹی ذات ہے۔ اسے اپنے گھر بھی جانا ہے۔ آج تیرے پاس ہے، کل نہیں ہوگی۔“

”کوئی بات نہیں..... اللہ تو ہوگا نا میرے ساتھ۔“ حمیدہ نے کہا۔

”ارے اللہ تو سبھی کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ نہ ہو تو اپنے پیاروں کے ساتھ ہی ہم بھی نہ مرجائیں رورو کے۔“

”پھر عم کیسا خالہ۔“
”عورت اکیلی نہیں رہ سکتی..... چاہے جوان ہو یا بڑھیا..... عورت کو سہارا چاہیے ہوتا ہے مرد کا..... چاہے وہ باپ کے روپ میں ہو، بھائی کے، شوہر کے یا بیٹے کے.....

مہرن بڑی ہوئی تو اسے گھر بار کا کرنے کے لیے بھی تجھے ایک مرد کا سہارا چاہیے ہوگا..... میری ماں تو کسی شریف آدمی کا ہاتھ پکڑ لے..... وہ جو کبوتروں کی چھتری والا گھر ہے اس میں ایک چھڑا رہتا ہے..... سنا ہے اس کی بیوی بہت عرصہ ہوا اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی، اپنے کسی لگے سگے کے ساتھ..... پھر لوٹی ہی نہیں۔ ایک ہی بیٹا تھا، ماں کے جانے کے بعد اس کے ہڑ کے میں بیمار پڑ گیا اور ایسا پڑا کہ بھلا چنگا ہی نہ ہوا..... مر گیا بے چارہ..... باپ نے اس کی موت کے بعد کبوتروں سے دل لگا لیا..... اب کبوتروں کا کاروبار ہی کرتا ہے..... سنا ہے لقا ایک نہیں بہتیرے..... لقوے کے مریضوں سے منہ مانگے دام لے کر بیچتا ہے..... آدمی سنا ہے بہت شریف ہے..... تو کہے تو میں اپنے من سے کہوں وہ بات چلائے۔“ من بڑی بی کے بیٹے کا پیار کا نام تھا۔

دو بہنیں تھیں، دونوں شادی شدہ اور دونوں ہی دوسرے شہروں کی باسی اور اپنی اپنی زندگی کے بکھیڑوں میں الجھی۔ ایک بھائی تھا ذہنی معذور۔ ماں باپ کے چھوڑے ہوئے دو کمروں کے مکان پر حمیدہ کے ایک چچا زاد بھائی نے حمیدہ کے ذہنی معذور بھائی کی دیکھ بھال کے بہانے قبضہ کر رکھا تھا۔ حمیدہ کا ذہنی معذور بھائی گھر کے ایک کونے میں پڑا رہتا۔ مکان پر قابض چچا زاد بھائی اور اس کے اہل کنبہ جب چاہتے اس بے چارے کو روٹی دیتے جب چاہتے باہر نکال دیتے۔ کسی نے رحم کھا کر کچھ کھانے پینے کو دے دیا تو خیر ورنہ وہ کبھی فٹ پاتھ پر ہی بسیرا کر لیتا، بھی ڈولتا ڈالتا گھر آجاتا جو اس کا ہوتے ہوئے بھی اس کا نہیں تھا۔

حمیدہ کی عدت کے دوران مہرن ہی بازار سے سودا سلف اور گھر کے قریب واقع بھینسوں کے باڑے سے دودھ لاتی رہی۔ پیتل کے گلاس میں آدھا پاؤ دودھ ماں بیٹی کی جائے کو بہت ہوتا۔ مہرن دودھ لینے کے لیے جاتی تو دودھ لینے کے لیے آئے دوسرے بچوں کے ساتھ باڑے میں بھوسے کے ڈھیر پر اونچ نیچ ضرور کھیل کر آتی۔ باڑے کا مالک یاسین تھا جس کے دو بیٹے تھے، بڑا امین چھوٹا یاسین۔ دونوں کی اس نے اپنی برادری کی لڑکیوں سے شادی کر رکھی تھی۔ امین دور کے گاؤں کو اپنی سائیکل پر دودھ سپلائی کرنے جاتا۔ یاسین آس پاس سے خود دودھ لینے کے لیے آنے والے گاؤں کو نمٹاتا۔ یاسین گاؤں، بھینسوں کی دیکھ بھال اور دودھ کی فروخت کے معاملات کی مجموعی نگرانی کرتا۔ اس نے تین ملازم رکھے ہوئے تھے جو جانوروں کو چارا دیتے۔ انہیں نہلانے کے لیے قریبی ٹالے پر لے جاتے، دودھ دوھتے، باڑے کی صفائی سھرائی کرتے اور گوبر سے ایلے تھاپ کر یاسین کے گھر والوں کو مفت کا ایندھن فراہم کرتے۔

حمیدہ کی عدت ختم ہونے تک مہرن گھر سے باہر کے تمام معاملات بخوبی سنبھال چکی تھی۔ آٹا کس دکان سے لانا ہے۔ چینی اور دالیں کہاں سے خریدنی ہیں۔ سبزی کس دکان سے اچھی ملتی ہے۔ گوشت کون سا قصائی اچھا دیتا ہے، یہ سب اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا۔ حمیدہ نے اپنے اور مہرن کے گزارے کے لیے گھر میں بڑیاں بنانا شروع کر دی تھیں۔ ان بڑیوں کی محلے کی دکانوں پر فراہمی اور ان کے فروخت ہو جانے کے بعد وصولی بھی مہرن کی ذمہ داری بن گئی۔ گھر میں سلائی مشین بھی جو حمیدہ کو جینز میں ملی تھی۔ حمیدہ کو کپڑوں کی تراش خراش تو نہیں آتی تھی، البتہ

”اور اب تو مہرن میرے گھر میں تمہاری امانت بن گئی۔“ حمیدہ بولی۔

”اللہ جلدی وہ دن لائے جب میں اپنی امانت کو اپنے گھر لے جاؤں۔“ پھوپھی نے مہرن کو فرط محبت سے گلے لگا لیا۔

”آمین آمین۔“ حمیدہ کے لہجے میں خشیت بھی تھی رقت بھی۔ بیٹی کو رخصت کرنے کے خیال سے اس کا دل ابھی سے اداس ہوئے جا رہا تھا۔

منگنی کے بعد اگلے دن مہرن نہایت شوق سے سیاہ ریشمی برقع اوڑھ کر اسکول گئی۔ سہ پہر کو دودھ لینے کے لیے باڑے گئی تو برقع اوڑھ کر اپنے چہرے پر جارحیت کی ایک نقاب ڈال کر گھر سے نکلی۔ مہین نقاب کے پیچھے اس کا گلابی چہرہ، زندہ پھلیوں کے مانند تھرتھکتی آنکھیں اور ریلے ہونٹ ایک رومانوی پراسراریت کا مظہر بنے ہوئے تھے۔ باڑے میں پہنچ کر بھی وہ اپنے چہرے پر نقاب گرائے کھڑی رہی۔ برقع اوڑھنا اور چہرے پر نقاب گرائے رہنا اس کے دل کو گدگداہٹ کا احساس دے رہا تھا۔ وہ خود کو بہت معتبر اور موثر محسوس کر رہی تھی۔ یامین نے اسے سب سے آخر میں دودھ دیا اور دودھ کا برتن اسے تھماتے ہوئے بولا۔ ”سنا ہے تیری منگنی ہو گئی ہے؟“

مہرن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”مٹھائی نہیں کھلائی تو نے اپنی منگنی کی۔“
”پھوپھی ایک ہی ڈبلائی تھیں، امی نے محلے میں بانٹ دی۔“ مہرن نے سادگی سے جواب دیا۔
”اوئے ہم بھی تو محلے دار ہیں۔ ہمیں بھی کھلائی تھی نا۔“
”امی سے بولوں گی۔“

”نہیں نہیں..... امی سے بولنے کی ضرورت نہیں..... رات گئی بات گئی..... اب اگر تیری امی نے مٹھائی بھجوائی بھی تو فائدہ..... تیری امی کو تو پہلے ہی خیال ہونا چاہیے تھا..... خیر چھوڑ تو یہ بتا اور کیا لائی تھی تیری پھوپھی تیرے واسطے؟“
”یہ برقع، جوڑا اور انگوٹھی۔“

”مٹھائی نہیں کھلائی نہ سہی مگر انگوٹھی تو دکھا۔“
مہرن نے اپنا انگوٹھی والا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔
”ہلکی سی ہے۔“ یامین انگوٹھی دیکھ کر قدرے حقارت سے بولا پھر اس نے مزید کہا۔ ”بے چارے غریب لوگ چار چھ ماشہ کی انگوٹھی ہی چڑھا سکتے تھے۔“
مہرن نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور یامین کی بات کا برا مان کر بولی۔ ”اچھی تو ہے۔“

جاوید، مہرن سے سات آٹھ سال بڑا تھا۔ دس جماعتیں پاس تھا۔ دواؤں کی ایک کمپنی میں لوڈر بھرتی ہوا تھا مگر اب پیکنگ کا کام کر رہا تھا۔ ہر ماں کی طرح زینت بھی بیٹے کے سر پر سہرا بندھا دیکھنے کی آرزو مند تھی، سو اس نے بیٹے کے لیے مرحوم بھائی کی انگوٹھی بیٹی کا رشتہ مانگ لیا تھا۔ حمیدہ نے فوراً ہاں کر دی۔ پھوپھی نے بڑے چاؤ سے مہرن کو انگوٹھی پہنا دی۔ شادی زینت کی انگوٹھی اور مہین بہن بھائیوں میں سب سے بڑی بیٹی عفت کی شادی تک موقوف رکھی گئی۔ عفت کی منگنی اس کے اپنے ہی دودھیالی گھرانے میں ہوئی تھی۔ لڑکا دینی میں کام کرتا تھا اور شادی سے پہلے اپنا زیر تعمیر گھر مکمل کروانا چاہتا تھا، بس اسی لیے عفت کی شادی میں دیر ہو رہی تھی۔ زینت کا ارادہ یہ تھا کہ ایک ہی ضیافت میں بیٹی کو رخصت کرے اور بیٹے کا ولیہ بھی نمشاوے۔ زینت کا گھرانہ بھی محدود وسائل والا گھرانہ تھا اور ایسے لوگ خرچ اخراجات کے معاملے میں اکثر ایک پنتھ دو کاج کا راستہ دیکھتے ہیں۔ حمیدہ کو جاوید سے مہرن کی شادی کے لیے عفت کی رخصتی کے انتظار میں کوئی قباحت نہ لگی۔ مہرن کی کون سی کوئی عمر نکلی جا رہی تھی۔

اسکول میں لڑکیوں کو پتا چلا کہ مہرن کی منگنی ہو گئی ہے تو انہوں نے نہایت رشک و حیرت کا اظہار کیا۔ مہرن کی سہیلیوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نہایت اشتیاق سے اس کی منگنی کی انگوٹھی دیکھی اور بہت تجسس سے اس کے منگیتر اور ہونے والی سسرال کے بارے میں اتنے سوال کیے کہ مہرن کو اپنا آپ انتہائی اہم اور معتبر محسوس ہونے لگا۔

منگنی کے موقع پر مہرن کی پھوپھی اس کے لیے منگنی کے جوڑے اور انگوٹھی کے ساتھ سیاہ لیڈی ملٹن کا برقع بھی لائی تھیں اور مہرن کو گھر سے باہر نکلنے وقت برقع اوڑھنے کا پابند کرنے کے ساتھ اسے زیادہ باہر نہ نکلنے کی تاکید بھی کر گئی تھیں۔ حمیدہ نے انہیں اطمینان دلایا۔ ”میں خود بھی اسے زیادہ باہر نہیں نکلنے دیتی ہوں اب..... اسکول یا پھر زیادہ سے زیادہ دودھ لینے کے لیے باڑے تک یا قریب کی دکان سے چھوٹا موٹا سودا سلف لینے کے لیے..... میں نے تو اب بڑیوں والا کام بھی ختم کر دیا ہے بس سلائی پر گزارا کرتی ہوں۔ وہ بھی اب کارخانے والے خود پہنچاتے اور لے جاتے ہیں۔“

”اچھا کرتی ہو بھابی..... زمانہ خراب ہے۔ کسی کا کچھ اعتبار نہیں۔“ مہرن کی پھوپھی نے کہا۔

رنگارنگ سلسلوں اور دلکش تحریروں کا مرقع دسمبر 2017 کا پُر لطف شمارہ



کراچی
ماہنامہ
آگینے

معروف رائٹر حیا بخاری کا خوب صورت ناولٹ..... محبت لفظ ہے لیکن.....

بنت سحر کا دلگداز ناولٹ..... جو دھڑکا وہ دل تھا.....

متنوع تحریر نگار سدرۃ المنتہی کا..... دل پزیر ناولٹ..... تیری چاہ سے

معروف افسانہ نگار اور آج کی

مصروف ترین ڈراما نگار سیما مناف

کی ہماری بزم میں خوشگوار آمد.....

غزالہ عزیز کے قلم کے جوہر..... بدلتے رشتے..... ناولٹ کی صورت.....

”آپ کی کوئی نادانی یا حماقت جس آج بھی نہی آتی ہو“ شائستہ زریں کا کھلکھلاتا سروے آپ کی خوش فوٹی کی نذر

طیبہ عنصر مغل، بشری سیال، شمائلہ دلعباد، ہالہ احمد،
غزالہ جلیل راؤ، ہما بیگ، عقیلہ حق و دیگر مایہ ناز راٹرز کی پر حیرت کہانیاں

لکھنے والے

مشائرت مستقل سلسلے، مستند معلومات اور دلنواز شاعری کے ساتھ، ساتھ خوش ذائقہ پکوان
اور حسن کی آرائش کے آزمودہ نسخے صرف آپ جیسے پُر ذوق قارئین کے لیے.....

”ہاں ہاں بھی بہت اچھی ہے..... تیری منگنی کی جو ہے۔“ یا مین طنز سے بولا۔ مہرن جانے کو مڑی۔
”تیرے جیسی لڑکی کو تو کوئی ہیرے کی انگلی ڈالنے والا بھی مل سکتا تھا۔“ یا مین بولا۔

مہرن نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔
”اے نے میری شادی نہ کر دی ہوتی تو میں تجھے ہیرے کی انگلی ہی ڈالتا۔“
”کیوں؟“ مہرن بولی۔

”تیرے سے شادی کرنے کے لیے اور کیوں۔“
”انی ہرگز بھی نہیں کرتیں کسی دودھ والے سے میری شادی۔“
”اے!“ یا مین بھڑک کر آنکھیں نکالتا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا اور سینہ ٹھونک کر بولا۔ ”اس پورے علاقے میں کسی اور کے پاس اتنا پیسا ہے؟“

مہرن سہم کر دبک سی گئی۔ گھر گئی تو ماں کو یا مین کی بات بتائی۔ ماں نے کہا۔ ”اب تو نہ دودھ لینے جانا، محلے کے کسی بچے سے منگوا لیا کریں گے۔“

☆☆☆

انہی دنوں حمیدہ کی ایک رشتے دار پروین نے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ٹنڈو آدم سے کراچی نقل مکانی کی اور حمیدہ کے محلے میں اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر واقع ایک مکان میں کرائے دار ہوئی۔ دو کمروں کا مکان تھا۔ چھوٹا سا باورچی خانہ، غسل خانہ اور برائے نام صحن۔ پروین سیدھی سادی سی قبول صورت عورت تھی۔ عمر میں حمیدہ کے برابر۔ پروین کا شوہر نعیم معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ کوئی مستقل روزگار نہ تھا۔ کبھی پھیری لگا کر روزی کما تا کبھی کسی دکان پر سودا تولنے کھڑا ہو جاتا۔ معاشی حالات اچھے نہ ہونے کے باعث نعیم بال بچوں کے ساتھ ٹنڈو آدم سے کراچی منتقل ہوا تھا۔ اس نے سنا تھا کراچی غریب پرورشہر ہے۔ ناداروں کا مائی باپ ہے۔ بھوکے بندے کو پیٹ بھرنے کو روٹی مل ہی جاتی ہے۔ محنت مزدوری سے، مسجد سے، کسی لنگر خانے سے اور کچھ نہیں تو امراء کے علاقوں میں کچرے کے ڈھیروں سے یا پھر کسی ریستوران یا ہوٹل کے باہر کچرے کے ڈبوں سے..... کھانے والے آدھا کھاتے تھے آدھا چھوڑ دیتے تھے بلکہ پسند نہ آنے پر ایک ”بامیٹ“ لے کر باقی سارا! کراچی میں کاروبار بھی بہت تھا۔ ہر طرح کا..... سیاہ بھی سفید بھی۔ محنتی آدمی کے لیے محنت مزدوری کی بھی کمی نہ تھی۔
پروین کا شوہر نعیم ٹنڈو آدم میں کبھی سبزی ترکاری کی

جھاڑی لگا یا کرتا تھا، کبھی محنت مزدوری کرتا، کبھی پھیری لگاتا تو کبھی کچھ اور کر کے بیوی بچوں کا اور اپنا پیٹ پالتا۔ چار بچے تھے۔ تین بیٹیاں، ایک بیٹا۔ غریب گھرانہ تھا، تنگدستی میں گزارہ کرتے۔ پروین صابر و شاکر اور شوہر پرست عورت تھی۔ ہر حال میں شوہر کی وفادار اور اطاعت گزار وہ دن کو رات کہے تو رات اور رات کو دن کہے تو دن۔ شوہر کی کمتر معاشی حیثیت کے باوجود وہ اس کی خوشنودی حاصل رکھنے کے لیے ہر جتن کرتی۔ پروین صوم و صلوة کی پابند تھی۔ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق وہ بچوں کی تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی۔ انہیں اچھے برے اور گناہ ثواب سے آگاہ رکھنے کی کوشش کرتی۔

پروین کا شوہر نعیم اپنی غربت کے باوجود رنگین مزاج آدمی تھا۔ پروین سے جو اس کی بہن کی منہ تھی، شادی ہونے سے قبل وہ کئی لڑکیوں سے چکر چلا چکا تھا۔ ایک دو کے گھر والوں نے تو اس کی خوب اچھی طرح ٹھکانی بھی کی تھی۔ پروین سے شادی کے بعد بھی اس کے کچھنوں میں کوئی فرق نہ پڑا، عورتوں سے نظر بازی اس کا محبوب مشغلہ رہا۔ عورتوں پر ڈورے ڈالنے کے لیے اپنی سنگھار پٹی کا پورا خیال رکھتا۔ گو اس کے پاس گنتی کے کپڑوں کے جوڑے تھے مگر ہمیشہ صاف ستھرے بے داغ کپڑے پہنتا۔ عطر بھی ضرور لگاتا۔ کوئی افسر چل رہا ہوتا تو ان دنوں سنگھار بڑھ جاتا۔

پروین اپنے کنبے کے ساتھ حمیدہ کے علاقے میں مقیم ہوئی تو حمیدہ سے رشتے داری کے سبب ان لوگوں کا حمیدہ کے ہاں آنا جانا ہو گیا۔ پروین کے چاروں بچے مہرن سے چھوٹے تھے۔ سب سے بڑی نسرین آٹھ نو سال کی تھی۔ اس سے سال بھر چھوٹی شاہین پھر بیٹا نعیم اور سب سے آخر میں فرحین۔ چاروں بچے کچلی ہی ملاقات میں مہرن کے شیدائی ہو گئے۔

نعیم نے پہلی بار مہرن کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پروین کے رشتے داروں میں ایسی ہیرا لڑکی بھی ہوگی۔ ایسی خوب صورت لڑکی اس نے پہلے بھی نہیں دیکھی تھی اور وہ بھی اتنے نزدیک سے کہ اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے وہ اپنی انگلیاں اس پر روکی انگلیوں سے مس کر سکتا تھا۔ بھی تو وہ کوئی چودہ پندرہ برس کی مگر اٹھان اچھی ہونے کے سبب بھی غضب کی! ”خالو! امی بول رہی ہیں چینی کم ہو تو ڈالو الینا۔“ مہرن جو مہمانوں کے آنے سے بہت خوش تھی، نعیم کو چائے کی پیالی تھاتے ہوئے چبکی۔

درمائدہ

اس کی معصومیت پر نعیم اسے دیکھتا ہی رو گیا۔ اس جیسی گلابی رنگت والی لڑکی یا عورت نعیم نے پہلے بھی نہیں دیکھی تھی۔ چائے کی پیالی کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے نعیم نے اپنی آنکھوں کے ڈھیلے اوپر چڑھا کر مہرن کو دیکھا۔ چائے کی ایک چسکی بھری اور پیالی ہونٹوں سے پرے کر کے مہرن کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بھئی واہ! چائے تو واہ واہ ہے!“

”واہ واہ چائے کیسی ہوتی ہے خالو؟“ مہرن مسکرا کر بولی۔
اس کی مسکراہٹ نے نعیم کے دل میں چاشنی بھردی۔
”واہ واہ چائے واہ واہ ہوتی ہے۔“ نعیم بولا۔
”اور واہ واہ کیا ہوتی ہے؟“

”بتاؤں گا کبھی۔“ نعیم کی ہوسناک نگاہیں مہرن کے جسم کے نشیب و فراز کا جائزہ لے رہی تھیں۔
”آؤ مہرن باجی! پہل دو ج کھیلے ہیں۔“ نعیم کی بڑی بیٹی نسرین نے مہرن کا بازو پکڑ کر اسے کھینچنے کی کوشش کی۔
”بڑی جلدی ہو رہی ہے تجھے پہل دو ج کھیلنے کی۔“
نعیم نے بیٹی کو آنکھیں دکھائیں اور مزید کہا۔ ”گھر، مجھے مہرن باجی سے بات کر لینے دے۔“

پروین اور حمیدہ باورچی خانے ہی میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں اور باتیں کر رہی تھیں۔
”مہرن! پڑھتی ہو؟“ نعیم نے تجسس لہجے میں پوچھا۔
”جی خالو۔“
”کہاں؟“

”ادھر پاس ہی گورنمنٹ اسکول ہے۔“
”کون سی جماعت میں؟“
”آٹھویں میں خالو۔“
”پڑھائی میں کیسی ہو؟“

”بس ٹھیک ہوں خالو..... پاس ہو جاتی ہوں۔“
”بس ٹھیک کیوں؟ میں اگر تمہارا پیچہ ہوتا تو تمہیں سب سے زیادہ نمبر دیتا۔“

مہرن کھلکھلا کر ہنسی۔ نعیم کو اس کی ہنسی میں بھی جادو لگا۔
”کتنا پڑھے ہو خالو؟“

”زیادہ نہیں چھ جماعتیں..... مگر تمہیں دیکھ کر میں چھ جماعتوں میں پڑھا بھی بھول گیا ہوں۔“
”ہیں!“ مہرن حیران ہوئی۔ ”مجھے دیکھ کر کیوں خالو؟“
”کیونکہ تم اتنی پڑھی لکھی جو ہو۔“
”ارے نہیں خالو..... امی بولتی ہیں آٹھویں جماعت تو

تعلیم کی چوکھٹ ہوتی ہے اور دسویں جماعت پہلی سیزم۔“
”چائے بڑی زبردست ہے۔“ نعیم نے چسکی لے کر یوں پٹخا رہا جیسے میٹھی چائے نہ پی رہا ہو بارہ سالے والی چاٹ کھا رہا ہو۔

”بتاتی ہوں امی کو جا کر۔“
مہرن نے نسرین کا ہاتھ پکڑا اور ہرنی کی طرح قلائچیں بھرتی منظر سے نکل گئی۔

”واہ بھئی واہ! کیا خوب صورت لڑکی ہے۔“ نعیم نے دل ہی دل میں سوچا۔
مہرن اور نسرین باورچی خانے میں جا پہنچیں۔ ”امی خالو بول رہے ہیں چائے بڑی واہ واہ ہے۔“ اس نے ماں سے کہا۔

حمیدہ مسکرا دی۔
”ہمارے میاں کو چائے بس کسی کسی کے ہاتھ ہی کی پسند آتی ہے۔“ پروین نے حمیدہ کو بتایا۔
”چلو شکر ہے پسند آگئی۔“

”حمیدہ! ہم یہاں کیوں بیٹھے ہیں! چلو انہی کے پاس چل کر بیٹھتے ہیں۔“ پروین کو نعیم کے اکیلے بیٹھے ہونے کا خیال آیا۔

”ہاں چلو..... کیا سوچتے ہوں گے تمہارے میاں کہ دونوں بہنیں مجھے اکیلا چھوڑ کر خود سر جوڑ کے بیٹھ گئیں۔“
حمیدہ نے تائید کی۔

دونوں باورچی خانے سے اٹھ کر کمرے میں نعیم کے ساتھ جا بیٹھیں۔ مہرن پروین کے بچوں کے ساتھ کھینچنے لگی۔ کمرے کی کھڑکی سے ان کی بھاگ دوڑ کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”مہرن بڑی ہو گئی مگر ہے ابھی بھی بچی..... دیکھو تو کیسے کھیل رہی ہے تمہارے بچوں کے ساتھ۔“ حمیدہ نے کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

”اتنی بڑی بھی نہیں ہوئی حمیدہ..... پندرہ سولہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔“ پروین بولی۔
”پندرہ سال کی عمر میں تو میری شادی بھی ہو گئی تھی پروین۔“ حمیدہ نے کہا۔

”تجھی تو تم خود بھی ابھی جوان ہو اور بیٹی تمہارے قد کو آن پہنچی۔“

”ہے میری مہرن بہت بھولی، بہت معصوم۔“
”اور ماشاء اللہ خوب صورت بھی!“
”اللہ کی دین ہے..... اپنے پرائیوں میں کئی گھر تھے

جنہوں نے اپنے بیٹوں، بھائیوں کے رشتے کے لیے نظر لگا رکھی تھی مہرن پر..... میں نے اس کی پھوپھی کو رشتہ دے دیا۔“

”بہت اچھا کیا..... اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں..... اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے۔“

”میں نے بھی یہی سوچ کر رشتہ دے دیا۔“

”لو کا کرتا کیا ہے؟“

”میٹرک پاس ہے۔ دوائیوں کی کمپنی میں ملازمت کرتا ہے۔ پرائیویٹ آگے پڑھ بھی رہا ہے۔“

”چلو اچھا ہے۔“

”میں نے یہی سوچا پروین کہ میری بچی کے سر پر نہ باپ نہ بھائی..... غیروں کا اعتبار نہیں ہوتا۔ پرانی بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ پھوپھی یہ تو سوچے گی کہ میرے بھائی کی اولاد ہے۔“

”بالکل بالکل..... بہت عقلمندی کی تم نے۔“

”لو ہم دونوں ہی بولے چلے جا رہے ہیں۔ نعیم بھائی چپ بیٹھے ہیں۔“ حمیدہ کو خیال آیا۔

”چلیں بھی اب آپ کی باری ہے۔“ پروین نے میاں کو دیکھا۔

”نعیم دھیرے سے کھٹکھار کر سیدھا ہو بیٹھا۔ چائے کی پیالی اس نے کھڑکی کی چوکت پر رکھ دی۔“

”حمیدہ بہن تمہارا ذکر تو سنا تھا میں نے پروین سے مگر ملاقات آج پہلی بار ہوئی ہے..... اب تمہارے محلے دار بھی بن گئے ہیں تو آنا جانا رہے گا۔“

”مجھے تو بہت خوشی ہوئی نعیم بھائی بلکہ اطمینان بھی ہوا کہ کوئی تو اپنا نزدیک آ کر بسا۔ ورنہ سب دور دور ہی ہیں۔ میرے میکے والے بھی دور، مہرن کے دوھیال والے بھی دور۔ بس عی خوشی میں ہی ملنا ہوتا ہے۔ لے دے کر بس مہرن کی پھوپھی ہیں بے چاری جو مہینا پندرہ دن میں چکر لگاتی ہیں..... خود مجھے کہیں زیادہ آنے جانے کی عادت نہیں..... مہرن کے ابا زندہ تھے تب بھی میں بہت کم کہیں آتی جاتی تھی..... اپنے گھر کے دھندوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔“

”فرصت نکالنا پڑتی ہے حمیدہ۔“ پروین نے حمیدہ کا زانو دبا یا۔

”حمیدہ بہن، ہمارے گھر آنے کے لیے تو تمہیں فرصت نکالنا ہی پڑے گی۔“ نعیم نے کہا۔

”انشاء اللہ آؤں گی۔“

تبھی مہرن پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ پروین کے چاروں بچے بھی اس کے آگے

پیچھے تھے۔

”اللہ امی اتنا مزہ آرہا ہے ان لوگوں کے ساتھ پکڑم پکڑائی کھیلنے میں۔“ مہرن نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے حمیدہ کو بتایا اور ماں کے پہلو میں براجمان ہو گئی۔

”تم چاروں نے تو آتے ہی مہرن باجی سے دوستی گانٹھ لی۔“ نعیم نے اپنے بچوں سے کہا۔

”ابا مہرن باجی بہت، بہت، بہت اچھی ہیں۔“ نسرین نے کہا۔

”ہاں بھی واقعی بہت اچھی ہیں مہرن باجی..... انہوں نے مجھے بہت اچھی چائے پلائی۔“ نعیم نے تائید کی۔

”وہ تو امی نے بنائی تھی خالو۔“

”لے کر تو تم آئی تھیں نا۔“

”ہاں لائی تو میں ہی تھی اور.....“ مہرن آنکھیں پٹ پٹا کر بولی۔

”آپ نے بولا تھا..... واہ واہ چائے!“ مہرن نہایت الٹھڑپن سے چبکی۔ نعیم جھینپ گیا۔

”میں نے امی کو بتا دیا تھا خالو کہ آپ بول رہے ہو چائے واہ واہ ہے۔“

”اچھا بس کر۔“ حمیدہ نے مہرن کو ٹوکا۔ ”زیادہ نہیں بولتے۔“

”چلو بھی ہم لوگ پھر کھیلتے ہیں۔“ مہرن نے پروین کے بچوں سے کہا۔

”بس اب ہم چلیں گے مہرن..... بہت دیر ہو گئی۔“ پروین بولی۔

”بیٹھیں نا خالہ۔“ مہرن ٹھنکی۔

”پھر آئیں گے۔“

”تم بھی آنا امی کو ساتھ لے کر ہمارے گھر۔“ نعیم نے دعوت دی۔

”اے ہاں حمیدہ..... یہ بتاؤ کوئی اسکول بھی ہے نزدیک! بچوں کا داخلہ کرانا ہے۔“ پروین نے پوچھا۔

”ہاں ہے نا..... مہرن کا اسکول۔“

”نزدیک ہے؟“ نعیم نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں بھائی نزدیک ہی ہے..... اللہ بخشے مہرن کے ابا تو کہتے تھے اسے ڈاکٹری پڑھاؤں گا..... اب اپنے گھر جا کر پڑھے یہ ڈاکٹری..... میں تو کہتی ہوں جتنی جلدی ہو یہ اپنے گھر جائے۔“ حمیدہ نے متا بھری نگاہوں سے اپنی لاڈلی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”خیر سے کب تک ارادہ ہے؟“ پروین نے پوچھا۔

”میں تو کہتی ہوں اس کی پھیپھو اپنی امانت جتنی جلدی لے جائیں اچھا ہے مگر ان کی بیٹی کی شادی کی وجہ سے ابھی

درمائدہ

کچھ دیر ہے۔ ان کا ہونے والا داماد اپنا گھر بنوا رہا ہے۔ اس کی پھیپھو چاہتی ہیں بیٹی جائے، بہو آئے۔“

مہرن نے شرمناک منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”ویسے حمیدہ بیٹی تمہاری ہے لاکھوں میں ایک۔“ پروین نے تعریف کی۔

”حمیدہ بہن خود کچھ کم ہیں کیا۔“ نعیم نے کہا۔ حمیدہ نے جھینپ کر دوپٹے سے منہ چھپا لیا۔

”ان کی تو خاندان بھر میں دھوم تھی۔“ پروین بولی۔

”ارے پروین اب کہاں..... مہرن کے ابا کے ساتھ میری تو صورت شکل، عیش آرام سب کچھ چلا گیا۔“ حمیدہ نے دل گرفتگی سے کہا۔

”ہاں بھی وہ تم اسکول کی بات کر رہی تھیں۔“ نعیم نے بیوی کو یاد دلایا۔

”بچوں کو داخلہ مل جائے گا نا؟“ پروین نے حمیدہ سے یوں پوچھا جیسے صاحب اختیار ہی تو تھی۔

”جا کر بات کر لو بڑی مس سے۔“

”کل چلیں گے اپن دونوں۔“ پروین نے میاں کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے..... مہرن کے اسکول میں داخلہ ہو جائے بچوں کا تو اچھا ہے۔ مہرن اور یہ لوگ اکٹھے چلے جایا کریں گے۔“

”فیس کتنی ہے حمیدہ؟“ پروین نے پوچھا۔

”تم سے کیا پردہ پروین..... مہرن کی فیس تو معاف ہے۔ ویسے وہ سرکاری اسکول ہے۔“

”چلو ہم خود معلوم کر لیں گے۔“ پروین نے کہا پھر روئے سخن میاں کی جانب کیا۔ ”انھیں نسرین کے ابا۔“

”نعیم اٹھ کھڑا ہوا۔“ آنا حمیدہ بہن۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں..... ضرور آؤں گی۔“ حمیدہ مہمانوں کو رخصت کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”اسے بھی لانا۔“ نعیم نے مہرن کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

”اے بھیا! اس کے بغیر تو میں کہیں آتی جاتی ہی نہیں..... اکیلی کو کس پہ چھوڑوں گھر میں۔“

”مجھے تو ڈر بھی بہت لگتا ہے۔“ مہرن بولی۔

”کس سے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”اکیلے ہونے سے۔ امی غسل خانے میں چلی جائیں تو میں غسل خانے کے دروازے پر کھڑی رہتی ہوں۔“

”ہاں، یہ ایسی ہی ڈر پوک ہے۔“ حمیدہ نے مہرن کے سر پر پیار سے چپٹ لگائی پھر کہا۔ ”اپنے پرایوں میں کہیں عی خوشی ہو تو میں اسے ساتھ لیے بنا نہیں جاتی..... اکیلا نہیں چھوڑتی اسے گھر میں۔“

”اچھا کرتی ہو۔“

”اب ہم لوگ یہاں ہیں نا حمیدہ بہن، تمہیں خود کو اکیلا سمجھنے کی ضرورت نہیں۔“ نعیم بولا۔

”خدا خوش رکھے..... کوئی اپنا بھی پاس آ کر بسا۔“

”انشاء اللہ اب آنا جانا رہے گا حمیدہ۔“ پروین نے کہا۔

”حمیدہ فرط مسرت سے پروین سے لپٹ گئی۔“ انشاء اللہ۔“

”امی اب تو ہم روز خالہ کے گھر جایا کریں گے۔“ مہرن چبکی۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں..... جگ جگ آؤ..... ملنے جلنے سے رشتے داروں میں محبت بڑھتی ہے۔“ پروین نے گرجوٹی سے کہا۔

”سچ کہتی ہوں پروین، رشتے داروں سے ملنے جلنے کو دل تو بہت چاہتا ہے مگر اول تو گھر کے دھندوں سے فرصت نہیں ملتی دوسرے کہیں جاؤ تو پہلے آدھ پون گھنٹا بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر ٹانگیں تھکاؤ..... اب ہمت نہیں ہوتی..... مہرن کے ابا کے بعد تو جیسے میں ڈھے ہی گئی ہوں۔“

”جانے والے کو کون روک سکا ہے حمیدہ۔“ پروین نے حمیدہ کے شانے پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے دلاسا دیا پھر مہرن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پیچھے رہ جانے والوں کے لیے ہمت کرنی پڑتی ہے۔“

”حمیدہ کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں..... میرے لیے تو میری دنیا اب مہرن ہی ہے..... دعا کرتی ہوں کہ یہ اپنے گھر جائے اور شادا باد رہے۔“

”مہرن شرمناک اپنے دوپٹے کا پلو اپنی چھٹکی پر لپیٹنے لگی۔

”اچھا اب اجازت ہے؟“ پروین نے کہا۔

”نعیم نے اپنی جیب سے چند مڑے مڑے نوٹ نکالے اور دس روپے کا ایک نوٹ مہرن کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لو بیٹا۔“

”رہنے دو بھیا۔“ حمیدہ نے کہا۔

”حمیدہ بہن! یہ تو اس کا حق ہے..... آخر کو خالو ہوں اس کا میں۔“ نعیم نے مسکرا کر مہرن کو دیکھا۔

”اللہ جیتا رکھے..... تمہاری کمائی میں برکت دے۔“ حمیدہ نے دعا دی۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بسٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 900 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ ہی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مینی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

براہ راست تحریریں فون نمبر 0301-2454188

سرکولیشن منیجر سید منیر حسین 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63 فیروز ٹریڈنگ ہاؤس اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

جو وہ دکھائی دیتا تھا۔ ہر گن پورا تھا۔ اس کا سب سے بڑا
عیب تو شہوت پرستی تھی۔ وہ تو اللہ نے اسے معاشی اعتبار
سے اس کی اوقات میں رکھا ہوا تھا اگر کہیں پیسے والا ہوتا تو
جانے کیا گل کھلا رہا ہوتا۔ شاید ہر رات ایک نئی عورت کے
ساتھ بسر کرتا۔

ٹنڈو آدم میں پروین کے اپنے پڑوس میں رہنے والی
نبیلہ جو سلائی سیکھنے اس کے پاس آیا کرتی تھی، نعیم نے کئی
مرتبہ اس سے زیادتی کی کوشش کی اور ڈرا دھمکا کر اسے
چپ بھی رکھا۔ پروین تو ڈرتی تھی کہ لڑکی کے ساتھ الٹا سیدھا
ہو گیا تو کسی کو منہ دکھانے کے نہ رہیں گے۔ خوش قسمتی سے
لڑکی کی چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوا اور وہ سسرال چلی گئی۔
ٹنڈو آدم میں ہی پروین کے محلے کی ایک نوجوان عورت بھی
جو اپنے شوہر سے ناچانی کے بعد ایک بچے کے ساتھ ماں
باپ کے گھر بیٹھی ہوئی تھی، پروین سے اس کی اچھی علیک
سلک تھی۔ اپنا دکھ سکھ سنانے اس کے گھر بھی آ جاتی۔ نعیم
اسے بہن کہتا تھا مگر عورت مرد کی نگاہوں کا مطلب بخوبی سمجھتی
ہے اسے بھی سمجھ آ گئی کہ اسے نعیم کیسی نظروں سے دیکھتا
ہے..... اس نے پروین سے بھی بات چیت ختم کر دی۔

شہوانی خواہش کی تسکین میں نعیم کو رشتوں کی حرمت
کا پاس بھی نہ تھا۔ پروین کی اپنی ہی بہن جو طلاق یافتہ تھی
اپنا نم بٹانے کو کچھ دنوں کے لیے بہن کے پاس آ کر رہی تو
ایک روز نعیم نے اسے بھی اپنی ہوس کا شکار بنا ڈالا۔ ماں
باپ حیات نہیں تھے طلاق کے بعد وہ بھائی بھانجے کے
ساتھ رہ رہی تھی۔ بھانجے بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ بہن کے
گھر سے بھائی کے گھر واپس آئے۔ بے چاری کا کافی عرصہ
ادھر ہی لنگی رہی۔ بھائی لینے آیا تو اس کی جان چھوٹی۔ بہن کا
گھر بگڑنے کے ڈر سے نہ اس بے چاری نے نعیم کے
کرتوت کا کسی سے تذکرہ کیا نہ پروین نے زبان کھولی۔

شوہر کی نیت خرابی کو بیوی سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ
سکتا۔ سو پروین بھی دیکھ رہی تھی کہ نعیم کی نیت اب مہرن پر
خراب ہوئی جا رہی تھی۔ اس بار اس کا طریقہ واردات بی
کے طریقہ شکار سے مشابہ تھا۔ پنچے دبائے، منہ میں رال
بھرے، آنکھوں میں کینگی کی حد تک ندیدگی لیے اور
چہرے پر معصومیت کا نقاب چڑھائے وہ دھیرے دھیرے
اس نو عمر لڑکی کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا..... اسے بیٹا بیٹا
کہتے ہوئے! چھی..... کتنا بڑا ڈراما تھا وہ..... مکار، کمینہ،
بے ایمان کہیں کا..... مہرن اس کی بڑی بیٹی نسرین سے کوئی
قرونوں بڑی تو نہیں تھی..... چند برسوں کا فرق تھا بس! مگر

چکھا چکھی میں مہرن کا آدھا پیٹ تو وہیں بھر جاتا،
گھر جانے لگتی تو پروین چھوٹے سے نفن میں حمیدہ کے لیے
بھی کچھ نہ کچھ ضرور بھجواتی۔ کبھی آلوؤں کا بھرتا، کبھی کھٹی
دال، کبھی کچھ نمکین، کبھی میٹھا۔ پروین کے میاں کی آمدن
زیادہ نہ تھی مگر شوہر اور بچوں کی خاطر پروین کم وسائل میں
بھی ہر روز ہنڈیا اچھی اور بدل بدل کر پکاتی۔ اس کے ہاتھ کا
قدرتی سواد سادہ کھانے کو بھی اشتہا انگیز بنا دیتا۔ پروین کا
کہنا تھا۔ ”غریب لوگ بس کھانا ہی تو کھاتے ہیں۔ وہ بھی
اگر سڑا بسا ہو تو جانور اور انسان کی زندگی میں کیا فرق.....
کھانا چاہے دال، چھنی ہی ہو ذائقہ دار ہونا چاہیے۔“

مہرن تو پروین کے ہاتھ کے پکے کھانوں کی رسیا ہو گئی
تھی۔ نعیم مہرن پر خصوصی التفات رکھتا۔ اسے بیٹا بیٹا کہتے نعیم
کا منہ سوکتا۔ اپنے بچوں کے لیے کوئی چیز لاتا تو مہرن کے
لیے بھی لانا نہ بھولتا۔ روزانہ نہ سبزی، ہر دوسرے دن وہ بیوی
اور بچوں کے ساتھ حمیدہ کے ہاں پہنچ جاتا اور اس پر اپنی اور
اپنے بال بچوں کی مہمانداری کا کوئی بوجھ نہ ڈالنے کی ہر ممکن
کوشش کرتا۔ مہرن کے لیے کوئی چیز لاتا تو اس کے اپنے گھر
نہ آنے کی صورت میں خود اسے دینے حمیدہ کے گھر جاتا۔
حمیدہ دامن پھیلا پھیلا کر نعیم کو دعائیں دیتی۔ وہ خوش تھی کہ
اس کی یتیم بچی کا باپ کی طرح خیال رکھنے والا فرشتہ صفت
انسان نعیم پہنچ دیا تھا، اللہ نے اس کے پڑوس میں۔

”پروین! تم بڑی خوش قسمت ہو کہ اللہ نے تمہیں اتنا
اچھا شوہر دیا ہے..... غریبی، امیری تو مقدر کا کھیل ہے.....
پیسے سے کیا ہوتا ہے۔ آج تیرے ہاتھ کل میرے پاس.....
ارے پیسا تو ہاتھ کا میل ہوتا ہے..... تمہارا میاں بہت اچھا
ہے۔“ حمیدہ، پروین سے کہتی۔

نعیم کتنا اچھا تھا، یہ پروین ہی جانتی تھی۔ اس کے دو
چہرے، دو روپ تھے۔ دوسروں کے سامنے تو وہ بڑا اچھا،
بہت مہذب اور شریف بن رہتا مگر اکیلے میں اسے بہانے
بہانے کچھ دیتا تھا۔ کبھی عمر میں اس سے دو سال بڑی
ہونے کا طعنہ، کبھی اس کی صورت شکل کو اللہ کی بخشی ہوئی
صورت کہنا۔ کبھی اس کے خاندان کو برا کہتا۔ کبھی گلی میں
صدائیں لگاتے فقیروں اور خواجہ فروشوں کو اس کا رشتے
دار ٹھہرا کر اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتا۔ نہایت کم
ظرف آدمی تھا وہ۔ پروین کے صبر و شکر اور تحمل مزاجی کی
وجہ سے گاڑی چل رہی تھی ورنہ کوئی بے صبری عورت ہوتی
تو نہ جانے کب کا یہ رشتہ ٹوٹ چکا ہوتا۔ ہاں ہی کے دانت
کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ نعیم درحقیقت وہ نہیں تھا

”بس تمہاری دعا چاہیے۔“
پروین، نعیم اور ان کے بچے خوش خوش رخصت ہوئے۔

☆☆☆

حمیدہ اور پروین کے گھرانوں میں قربت دن دو دن
رات چوگنی بڑھی۔ آپس میں لین دین بھی ہو گیا۔ حمیدہ کچھ
اچھا پکاتی تو ہنڈیا چولہے سے اتارتے ہی پروین کے ہاں
بھجواتی۔ پروین کے ہاں کچھ اچھا پکاتا تو نعیم بیوی سے کہتا۔
”اپنی بہن کے ہاں ضرور بھجوا دینا۔“

مہرن دن میں تین تین چار چار چکر پروین کے گھر
کے لگا لیتی۔ پروین کے چاروں بچوں کا ایک پاؤں اپنے
گھر میں ہوتا تو دوسرا حمیدہ کے گھر۔ کبھی پرانے کپڑوں سے
گڑیا گڈا بنا کر ان کا بیاہ رچایا جاتا، کبھی ہنڈکلیا پکائی جاتی۔
پروین کے بچوں کا مہرن کے اسکول میں داخلہ ہونے کے
بعد تو دانت کاٹی روٹی ہو گئی۔ صبح اسکول جانے کے لیے مہرن
اپنے گھر سے پروین کے گھر جاتی اور وہاں سے پروین کے
بچوں کے ساتھ اسکول جاتی۔ وقفے میں سب اسکول کے
میدان میں بیٹھ کر گھر سے لائی ہوئی روٹی بھانجی کھاتے۔
دو پہر کو چھٹی کے بعد گھر واپس لوٹتے ہوئے پروین کا گھر
پہلے پڑتا۔ پروین کے بچے مہرن کو اپنے گھر میں کھینچ لے
جاتے۔ مہرن بھی کھڑے کھڑے وہاں رکتی، کبھی کچھ دیر کو
بیٹھ بھی جاتی۔ پروین اسے لالچ دیتی۔ ”مہرن! آج بیسنی
پرائیڈ پکائے ہیں میں نے..... کھائے گی؟“

”ہاں ہاں خالہ کیوں نہیں۔“
پروین کے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر مہرن جلدی جلدی
نوالے توڑتی۔

”خالہ تم اتنا مزیدار کھانا کیسے پکا لیتی ہو؟“ مہرن
تعریف کرتی۔
”اللہ بخشے میری ماں بہت اچھا کھانا پکاتی تھیں، انہی
نے سیکھا۔“ پروین اپنی تعریف سن کر پھول جاتی۔
”میری امی کے ہاتھ میں بھی ذائقہ ہے مگر ایسا
نہیں۔“

”نہیں نہیں، وہ بھی بہت اچھا پکاتی ہیں۔“
”اچھا تو پکاتی ہیں مگر تمہارے ہاتھ کا کھانا بہت چٹپٹا
ہوتا ہے خوب، مرچوں والا۔“

”تیرے خالو کو تیز مرچیں پسند ہیں..... لے ذرا یہ
املی کی چٹنی تو چکھ۔“
مہرن چٹنی چکھتی! زوردار چٹخار بھرتی اور پروین
سے کہتی۔ ”واہ خالہ واہ بڑی مزیدار ہے۔“

ہوس کے غلام ان نزاکتوں اور اخلاقی قدروں کا کب پاس رکھتے ہیں۔ ان کا مقصود و منہا تو اپنی ہوس کی تسکین ہوتی ہے بس..... آئے دن آتی تو رہتی ہیں ایسے ہوس پرستوں کی درندگی کی داستانیں منظر عام پر۔

☆☆☆

دودھ فروش یا مین کو بھی پتا چل گیا کہ مہرن کی ایک خالہ اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ اسی محلے میں آجی تھی۔ نعیم کے گھر بھی اسی کے باڑے سے دودھ جانے لگا تھا۔ بلکہ حمیدہ بھی اب نعیم کے بچوں ہی سے اپنے گھر کا دودھ بھی منگوانے لگی تھی۔

یامین کو احساس ہو گیا تھا کہ مہرن اور اس کی ماں کا اب اس محلے میں ایک رشتے دار گھرانا بھی موجود تھا۔ مگر اس کے دل کی بے ایمانی بدستور اپنی جگہ موجود تھی، صبح کو مہرن کے اسکول جاتے وقت اور دوپہر کو اسکول سے اس کی گھر واپسی کے وقت وہ جان بوجھ کر اس کے راستے میں آن کھڑا ہوتا اور اسے ندیدی نگاہوں سے دیکھ جاتا۔ حالانکہ گھر میں اس کی نوجوان بیوی موجود تھی مگر اول تو یامین بد نظر دوم مہرن کی خوب صورتی، ناک میں تھنی پہنے ہمہ وقت سٹرسٹر کرتی رہنے والی یامین کی بیوی اور مہرن کا کیا مقابلہ تھا بھلا۔ مہرن کے چہرے پر بڑی سیاہ مہین نقاب کے پیچھے تو اس کا حسین چہرہ یوں جھلکتا تھا جیسے اندھیری رات میں سیاہ بدلیوں کی اوٹ میں چھپا چاند۔

موقع دیکھ کر یامین بھی کبھار مہرن کو مخاطب بھی کر لیتا مگر اب ذرا تمیز کے ساتھ۔

”ہاں بھی مہرن کیا حال ہے؟“

”ٹھیک ہوں۔“ مہرن بھی جواب دے دیتی کبھی جواب دیے بنا گزر جاتی۔ پروین اور نعیم کے ہونے سے مہرن کو بھی اب کافی حوصلہ رہنے لگا تھا۔ نعیم نے محلے کے بازار ہی میں سبزی کا ٹھیلہ لگا لیا تھا۔ منہ اندھیرے سبزی منڈی جاتا۔ علی الصباح اپنا ٹھیلہ تازہ بہ تازہ سبزیوں سے آراستہ کر لیتا۔ بارہ ایک بجے تک عام خریداروں کو اس سے جتنی سبزی خریدنی ہوتی خرید کر لے جاتے باقی ماندہ وہ ایک قریبی ہوٹل والے کو سستے داموں فروخت کر کے ٹھیلے پر ٹاٹ کو کستا پھر اسے ایک طرف کھڑا کر کے زنجیر ڈالتا اور تالا لگا کر گھر کی راہ لیتا۔ سہ پہر کو وہ لکڑی اور شیشے کے بنے بسکس میں آراستہ عورتوں کی آرائش و زیبائش کی چیزیں فروخت کرنے کے لیے دوبارہ بازار میں جا بیٹھتا۔ کبھی محلے کی گلیوں میں پھیری بھی لگا لیتا۔ ”ہار لے لو، بالی بندے لے لو، ناک

کی لوٹک لے لو..... چوڑیاں ہیں۔ بندیا ہے، کریم پوڈر ہے۔ مٹی، دنداسا لے لو..... سرخی لے لو۔“ وہ اپنی مخصوص لے میں صد لگاتا۔ محلے کی عورتیں اور لڑکیاں بالیاں اس کی صدا سن کر اپنے گھروں کے دروازوں، کھڑکیوں سے جھانکنے لگتیں۔ ”اے بھائی ذرا ادھر آنا۔“

نعیم پکارنے والیوں کے دروازوں پر جا بیٹھتا اور وہ بڑے اشتیاق سے اس کے شیشے کے بکسے میں آراستہ چیزیں دیکھنے لگتیں۔ نمونے کے طور پر کچھ چیزیں بکسے کے اوپری خانے میں آراستہ ہوتیں، اسٹاک نچلے خانے میں ہوتا۔

پروین خوش تھی کہ کراچی آ کر نعیم کا کام اچھا چل نکلا تھا۔ آمدنی میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ ٹنڈو آدم میں اتنی آمدن کب تھی بھلا۔ معاشی خوشحالی کے اثرات پروین کے بچوں کی صحت اور آئے دن گڑستی میں منت نئی چیزوں کے اضافے کی صورت دکھائی دینے لگے تھے۔ پروین کے گھر میں اب اکثر گوشت پکے لگا تھا۔ کبھی آلو گوشت، کبھی بھنڈی گوشت، کبھی بھنا گوشت، کبھی قیمہ ہری مرچ۔ نعیم نے دو تین نئے جوڑے سلوا لیے تھے جنہیں پہن کر وہ بڑے ٹھسے سے بازار میں اپنے ٹھیلے پر کھڑا ہوتا۔ پروین اس کے لباس کی دھلائی اور استری کا خاص خیال رکھتی۔ ”مرد کام کچھ بھی کرے، اس کا لباس اچھا ہونا چاہیے۔“ پروین کہتی۔

نعیم اپنے گھر کے لیے سودا سلف لاتا تو کبھی کچھ گوشت کی چند بوٹیاں، کبھی کوئی سبزی، کبھی دوٹھی دال، کبھی پاؤ بھر چاول، کبھی صابن کی ایک ٹی، کبھی کچھ اور حمیدہ کے ہاں بھجوا دیتا۔

”بیوہ عورت ہیں بے چاری، اللہ ہمیں ثواب دے گا۔“ وہ پروین سے کہتا۔

مہرن کو بھی وہ بُندوں کی جوڑی، کبھی چوڑیاں تو کبھی بال پنیں، کبھی بال باندھنے کے لیے ریشمی چٹیلے دے کر خوش کر دیتا۔

”نعیم خالو کتنے اچھے ہیں امی۔“ مہرن ماں سے کہتی۔

”وہ ہمارا خیال رکھتا ہے اسی لیے اللہ نے برکت دی ہے اسے۔“ حمیدہ کہتی۔

اسکول میں بھی مہرن اپنی سہیلیوں کے سامنے۔

”میرے خالو..... میرے خالو“ کی گردان کیے رکھتی۔ ایک روز نعیم نے اسے ایک قلم لا کر دیا جو پورے کا پورا سنہری تھا۔ اس کی ہم جماعتوں نے دیکھا تو کہا۔ ”کتنا خوب صورت پن ہے!“

”میرے خالو نے لا کر دیا ہے۔“

”ایک خالو مجھے بھی دلوادے ایسا۔“ مہرن کی ایک سہیلی نے شرارتاً کہا۔

”بازار میں تھوڑی ملتے ہیں خالو۔“ مہرن سادگی سے بولی۔

”بازار ہی میں تو ملتے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے کھڑے دیکھا تھا انہیں سبزی کے ٹھیلے پر۔“

مہرن کی ایک حاضر جواب سہیلی نے باقی سہیلیوں کی جانب دیکھ کر آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

زور کا قہقہہ پڑا۔ مہرن خفیف ہو گئی!

☆☆☆

پروین اور نعیم کو کراچی آئے پانچ چھ ماہ ہو چکے تھے۔ اس دوران شب معراج اور شب برات آئی تو پروین نے دونوں راتوں کو بچوں کے سو جانے کے بعد حمیدہ کے ہاں شب بیداری کی۔ حمیدہ اور پروین نہایت خشوع و خضوع سے رات بھر عبادت کرتی رہیں۔ مہرن بھی کبھی سوئی کبھی جاگتی رہی۔

”دعا مانگ لے اللہ سے کہ تیری شادی جلدی ہو۔“

پروین نے شب برات بیداری کے دوران مہرن سے مذاقاً کہا۔

”تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی پروین۔ میں بھی آج کی رات اللہ سے یہی دعا کر رہی ہوں۔“ حمیدہ بولی۔

”مجھے شادی نہیں کرنی امی! میں تو بس تمہارے پاس رہوں گی۔“ مہرن نے ماں سے لپٹ کر کہا۔

”ہشت!“ حمیدہ نے اسے پیار سے دھپ لگائی۔

”آج کی رات کوئی بد فال نہیں نکالتے منہ سے۔“

”تیری امی ٹھیک کہہ رہی ہیں مہرن..... اچھی اچھی دعائیں مانگ۔“ پروین نے مہرن کو سمجھایا۔

”ٹھیک ہے تو پھر میں دعا مانگوں گی کہ اللہ خالو کو ڈھیر سارے پیسے دے تاکہ وہ ہمیں بھی دیں۔“

”ہنگ!“ پروین نے کہا۔ ”تیرے خالو کو بھی تو اللہ ہی دیتا ہے، اللہ سے اپنے لیے مانگ۔“

”پروین تمہارے میاں کے لیے دعا نکلتی ہے دل سے۔ بہت خیال رکھتا ہے وہ ہم ماں بیٹی کا..... بہت اچھا شوہر دیا ہے اللہ نے تجھے۔“

”مجھ سے پوچھو۔“ پروین نے دل ہی دل میں کہا۔

ماہ رمضان میں پروین افطار کے وقت روزانہ ہی اپنے بچوں کے ساتھ حمیدہ کے ہاں کچھ نہ کچھ ضرور بھجواتی رہی۔ کبھی پکوڑے، کبھی آلو چھو لے کی چاٹ، کبھی دہی بھلے،

حرمائدہ

کبھی حلوا، کبھی پلاؤ۔

عید سے تین دن پہلے مہرن کی پھوپھی عیدی لے کر آئیں۔ حمیدہ نے بھی ہونے والے داماد کی عیدی تیار کر رکھی تھی۔ مہرن کے منگیتر کے لیے کرتہ شلوار اور کھٹے کے علاوہ اس کے گھر والوں کے لیے بھی حسب استطاعت چھوٹے چھوٹے تحائف اور اپنے ہونے والے داماد کی نقد عیدی بھی!

عید سے دو دن پہلے جاوید کی عیدی بھجوا دی گئی۔ حمیدہ کو پروین اور نعیم سے بہتر کوئی نہ لگا جس کے ہاتھ وہ بیٹی کی ہونے والی سسرال عیدی بھجواتی۔ مہرن کی پھوپھی نے دونوں میاں بیوی کی بہت آؤ بھگت کی۔ پروین بہت خوش خوش واپس لوٹی مگر نعیم نے کہا۔ ”حمیدہ بہن! لڑکا مجھے کچھ اکھڑ سا لگا ہے۔ مہرن کو بہت سنبھل کر چلنا ہوگا اس گھر میں۔“

”بھیا! شریف اور محنتی لڑکا ہے۔ سب سے بڑی بات اپنا ہے..... اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے۔“

”میری بچی کو تو کوئی اپنا بھی مارے تو میں اس کے ہاتھ توڑ دوں، خون پی جاؤں اس کا..... مہرن کو بھی میں اپنی بچی کی طرح سمجھتا ہوں۔“ نعیم نے کہا۔

”تم میری بن باپ کی بچی کے لیے اس طرح سے سوچتے ہو..... اللہ تمہیں خوش رکھے۔“ حمیدہ کے لہجے میں تشکر کا احساس تھا۔

پروین خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہی تھی اور کن آنکھوں سے نعیم کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت بن ٹھن کر مہرن کی ہونے والی سسرال گیا تھا اور تمام وقت اس کے منگیتر کو بڑی عجیب سے نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا۔ ویسے بھی وہ آج کل خاصا بنا ٹھنار بنے لگا تھا۔ جب بھی وہ ہر روز تازہ استری شدہ کپڑے پہننے لگتا، بالوں کی لٹ اپنے ماتھے پر گرائے رکھتا اور آنکھوں میں سرمہ لگانا ضروری سمجھتا نیز اپنے کپڑوں کو عطر ضرور لگاتا پروین سمجھ جاتی کسی نئے شکار کو لاسے پر لگا رہا تھا۔

چاند رات کو پروین اور نعیم اپنی تینوں بیٹیوں کو چوڑیاں پہنانے کے لیے بازار جانے لگے تو نعیم نے بظاہر ہمدردانہ لہجے میں پروین سے کہا۔ ”مہرن کو بھی ساتھ لے لو، یتیم بچی ہے۔ اسے بھی چوڑیاں پہنوا دیں گے۔“

”اس کی تو سسرال سے آئے ہیں ہاتھ بھر بھر مینا کاری چوڑیوں کے دوسیت۔“ پروین نے کہا۔

”وس آئیں، ہمیں مطلب نہیں..... ہمیں تو اپنا فرض پورا کرنا ہے۔ تمہاری بہن کیا سوچیں گی، اپنی بچیوں کو تو چوڑیاں پہنانے لے گئے، میری کو پوچھا تک نہیں..... راستے میں ان

کے گھر رک کر پوچھ لیں گے الہنا تو نہیں رہے گا۔“
”مرضی ہے۔“ پروین نے بے دلی سے کہا۔ اسے
مہرن پر اب نعیم کی عنایتیں کھٹکنے لگی تھیں۔
بازار جاتے ہوئے وہ مہرن کو ساتھ لے جانے کے
لیے حمیدہ کے گھر گئے تو حمیدہ نے بھی وہی بات کی جو پروین
نے کہی تھی۔ ”اس کی تو سسرال سے مہندی چوڑیاں آئی
رکھی ہیں۔“

”امی جانے دیں نا..... پھپھو والی چوڑیاں میں شام کو
جب پھپھو ملے آئیں گی تب پہن لوں گی۔“ مہرن کو بھی بازار
جانے کا شوق اٹھا۔

حمیدہ نے اسے باز رکھنے کے لیے آنکھیں دکھائیں
مگر اس نے منہ بتالیا اور پروین کی بیٹیاں بھند ہو گئیں اور
حمیدہ کی خوشامد کرنے لگیں۔ ”خالہ جانے دونا مہرن باجی کو
ہمارے ساتھ۔“

”ارے بیٹا! میں نے بتایا نا اس کی چوڑیاں آئی
رکھی ہیں۔“ حمیدہ بولی۔

”کوئی بات نہیں حمیدہ بہن! چوڑیاں تو میرے اپنے
بکسے میں بھی بچی رکھی ہیں۔ میں نے سوچا بچوں کو باہر سے
پہنا دوں۔ بچیاں ضد کر رہی ہیں تو بھیج دو مہرن کو ہمارے
ساتھ..... چوڑیاں بھلے سے نہ پہنے، ذرا چاند رات کی چہل
پہل دیکھ کر خوش ہی ہو جائے گی۔“ نعیم نے کہا۔
”نعیم کی بات حمیدہ رونہ کر سکی۔“

”اچھا جاؤ۔“ اس نے مہرن سے کہا پھر نعیم سے
بولی۔ ”لیکن بھیا ذرا جلدی واپس چھوڑ دینا اسے.....
کتورے میں مہندی کھلی رکھی ہے..... عید کے جوڑے کے
ساتھ اس کی پھپھو لائی تھیں۔ کہہ رہی تھیں پنجاب کی رچنی
مہندی ہے۔“

”ارے چھوڑو حمیدہ بہن..... میری مہندی سے
زیادہ رچنی نہیں ہوگی ان کی مہندی، میں پچاس پیکٹ
رمضان سے پہلے لایا تھا منڈی سے، سورمضان میں لے کر
آیا۔ سب بک گئے سوائے آخری دو پیکٹوں کے جو میں نے
گھر کے لیے رکھ لیے..... گرمی کی وجہ سے عورتوں نے عید کا
انتظار ہی نہیں کیا۔ روزوں ہی میں ہاتھ بیروں پر مہندی
لگاتی رہیں، جس نے لگائی دو اور کو بتایا کہ بڑی رچنی مہندی
ہے۔ پروین نے شام سے دونوں پیکٹ گھول کر رکھے
ہوئے ہیں، واپسی پر لگائیں گی یہ لوگ مہندی۔“ نعیم جو ماہ
رمضان میں بالی بندوں، سرخی پاؤڈر اور چوڑیوں کے ساتھ
خواتین کے استعمال کی اور دوسری چیزوں کے علاوہ خشک

مہندی کے پیکٹ اور مہندی کون بھی فروخت کرتا رہا تھا،
اپنی مہندی کی تعریف میں رطب اللسان ہوا۔
”خالہ! امی کو بڑی اچھی مہندی لگانی آتی ہے۔ مہرن
باجی امی سے ہی لگوائیں گی نا مہندی۔“ پروین کی بڑی بیٹی
نسرین نے کہا۔

”نہیں بیٹا..... یہ مہندی لگوانے بیٹھ گئی تمہارے گھر
تو دیر ہو جائے گی۔ کیسے آئے گی بھلا یہ اتنی رات کو اکیلی۔“
حمیدہ بولی۔

”کوئی مسئلہ نہیں، میں چھوڑ جاؤں گا۔“ نعیم نے اپنی
خدمات پیش کیں۔

”نہیں بھیا! اتنی رات کو تم کہاں آؤ گے؟“
”مہرن باجی رات کو ہمارے گھر ہی رک جائیں گی
خالہ۔“ نسرین نے مہرن کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔
حمیدہ جبرزد دکھائی دینے لگی۔ ”اور میں جو اکیلی ہوں
گی؟“ اس نے نسرین کی بات پر کہا۔

”ہاہ!“ نسرین نے اپنا منہ پھاڑ کر اس پر اپنا ہاتھ
ڈھانپ لیا پھر حمیدہ کو متعجب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
”اللہ! خالہ آپ اتنی بڑی ہو کر بھی ڈرتی ہو۔“
نسرین کو تنبیہ کرنے کو پروین نے اس کے سر پر
دھپ لگائی۔ ”چپ کر۔“
”دیر ہو رہی ہے جلدی چلو۔“ نعیم کے لہجے میں بے
تابی تھی۔

”جاؤں امی؟“ مہرن نے ماں سے اجازت چاہی۔
”جاؤ۔“ اس نے بادل نا خواستہ اجازت دے دی۔
جاتے ہوئے مہرن نے کہا۔ ”امی تم سو جاؤ..... مجھے
دیر ہو جائے تو تم فکر مت کرنا..... میں خالہ سے ہی مہندی لگوا
کر آؤں گی۔“

پروین کی بڑی دو بچیاں فرط مسرت سے تالیاں پیٹنے لگیں۔
”اور یہاں جو مہندی کھلی رکھی ہے؟“ حمیدہ نے
مہرن کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

”وہ تم اپنے نکوؤں میں لگا لینا نا حمیدہ بہن..... گرمی
جاتی رہے گی پیروں سے۔“ نعیم نے کہا۔

سب خوش خوش اکٹھے حمیدہ کے گھر سے نکلے۔ حمیدہ
انہیں رخصت کرنے دروازے تک آئی اور ان کے نکلنے ہی
اس نے چٹنی چڑھا دی۔

بازار میں بہت بھیڑ تھی لوگوں کی۔ مرد، عورتیں، بچے،
بوڑھے، جوان، کھوے سے کھواچھل رہا تھا۔ عورتیں اور
لڑکیاں بالیاں ٹوٹی پڑ رہی تھیں دکانوں پر..... لفٹے نو جوان

درمائدہ

”پروا نہیں..... جتنی بھی مہنگی ہوں۔“ نعیم کا
انداز حاتم طایانہ تھا۔
دکاندار نے سائز کا اندازہ کرنے کو مہرن کا ہاتھ اپنے
ہاتھ میں دبویچ لیا اور دونوں ہاتھوں سے دبا دبا کر دیکھنے لگا۔
”سوادو کا سائز ہے۔“

”چوڑی اچھی ہونی چاہیے۔“
”فکر مت کرو، حیدر آباد کی مینا کاری نکالتا ہوں۔“

دکاندار نے گتے کے ایک بکسے میں سبھی سنہری اور
سرخ مینا کاری والی چوڑیاں دکھائیں اور دام بتائے۔

”پسند ہیں؟“ نعیم نے مہرن کے بے حد نزدیک
جھک کر پوچھا۔

مہرن نے اثبات میں سر ہلایا۔
”پہنا دو..... آگے پیچھے کڑے بھی لگانا۔“

دکاندار نے مہرن کو تعریفی نظروں سے دیکھا اور اسے
چوڑیاں پہنانے لگا۔ نعیم دوسری عورتوں کو جگہ دینے کا انداز
اختیار کیے مہرن سے چپک۔ گیا۔ دکاندار مہرن کو چوڑیاں
پہناتے ہوئے زیر لب گفتگو کرتا رہا۔ چودھویں کا چاند ہو یا
آفتاب ہو۔ جو بھی ہو تم خدا کی قسم لا جواب ہو۔

مہرن چوڑیاں پہن چکی تو دکاندار کو ادائیگی کرنے
کے بعد پروین اور بچوں کی طرف واپس جاتے ہوئے نعیم
نے مہرن سے پوچھا۔ ”یہ والی چوڑیاں زیادہ اچھی ہیں یا
تمہاری پھپھو والی۔“

”یہ!“ مہرن نے نہایت لاابالی انداز میں اپنا بازو لہرایا۔
”بھئی! میں تو کھلے دل کا آدمی ہوں، پیسے کی پروا نہیں
کرتا۔ ہمیشہ اچھی چیز لیتا ہوں۔“

پروین تینوں بچیوں کو چوڑیاں پہنوانے کے بعد انہی
کا انتظار کر رہی تھی۔

”تم نے خود نہیں پہنیں؟“ نعیم نے پروین سے کہا۔
”گھر میں جو رکھی ہیں وہی پہن لوں گی۔“ پروین بولی۔
”دیکھو خالہ میری چوڑیاں۔“ مہرن نے اپنے

دونوں بازو پروین کے سامنے کیے۔
”نعیم دکان والے کو ادائیگی کرنے لگا۔“

”اچھی ہیں نا خالہ؟“ مہرن نے پروین سے اپنی
کلائیوں میں پہنی چوڑیوں کی بابت پوچھا۔

”بہت اچھی۔“
”مہنگی ہیں۔“ مہرن نے اترا کر بتایا۔

”اچھی ہیں تو مہنگی ہی ہوں گی۔“ پروین نے کہا۔
”تیری خالہ جل رہی ہے۔“ نعیم مہرن سے بولا۔

لڑکیوں اور عورتوں سے چھیڑ خانیاں کر رہے تھے گالیاں
کھا رہے تھے۔ نعیم اپنی بیوی اور بیٹیوں سے زیادہ مہرن
کے پیچھے پیچھے یوں چل رہا تھا جیسے وہ مہرن کا باڈی گارڈ ہی تو
تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ اس کے بہت قریب ہونے پر مہرن
چونک کر پلٹی اور سسٹی۔

”کیا ہوا؟“ پروین نے اس کے چونکنے اور پیچھے
پلٹ کر دیکھنے پر اس سے پوچھا بھی۔

”کچھ نہیں خالہ۔“ وہ ٹال گئی۔
”نعیم کی بازار میں تقریباً ہر دکاندار ہی سے پہچان تھی۔

وہ پروین، مہرن اور چاروں بچوں کو اپنے ایک شٹا سا چوڑی
والے کی دکان پر لے گیا۔ دکاندار سے علیک سلیک کی اور
نہایت چھجورے پن سے بولا۔ ”شیر بھائی! بیگم صاحبہ اور
بچیوں کو اچھی سی چوڑیاں تو پہناؤ۔“

”پسند کریں۔“ دکاندار نے کہا۔
”بتاؤ جی۔“ نعیم، پروین سے بولا۔

پروین چوڑیاں دیکھنے لگی۔
”تم لوگ پہنو، میں مہرن کو آگے دکان سے پہنوا کر
لاتا ہوں۔“ نعیم نے پروین سے کہا۔

پروین نے ہڑبڑا کر نعیم کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا
اور کہا۔ ”مہرن بھی یہیں سے پہن لے گی نا۔“
”اپنا کام کرو۔“ نعیم نے اسے آنکھیں دکھاتے
ہوئے دکاندار کے خیال سے دھیمی آواز میں کہا۔

پروین کا جی تو چاہا اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارے
مگر اسے اپنا گھر بسائے رکھنے اور بچوں کو در بدر نہ ہونے
دینے کی خاطر نعیم کے سامنے اکثر چپ ہو جانا پڑتا تھا۔

”شیر بادشاہ! تم بیگم اور بچیوں کو چوڑیاں پہناؤ میں
آ رہا ہوں۔“ نعیم نے دکاندار سے کہا۔

”ٹھیک ہے نعیم بھائی۔“
”آؤ مہرن۔“ نعیم نے مہرن کو اپنے ہمراہ چلنے کا
اشارہ دیا۔

مہرن پہلے شپٹائی پھر اس کے ہمراہ چل دی۔ نعیم نے
دکان سے ہٹتے ہی آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے
لیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر بولا۔ ”گم نہ ہو جاؤ
بھیڑ میں اس لیے پکڑ لیا ہے ہاتھ۔“

”نعیم مہرن کو چند دکانوں آگے ایک اسٹال پر لے گیا
اور مہرن کو چوڑیوں سے آراستہ اسٹال کے سامنے کھڑا کر کے
دکاندار سے بولا۔ ”استاد! سب سے اعلیٰ چوڑیاں نکالو۔“
”مہنگی ہوں گی۔“ دکاندار نے بتایا۔

”میں کیوں جلوں گی۔ مہرن تو میرے لیے بیٹی کی طرح ہے۔“ پروین نے کہا۔

چاند رات کی خوشی دوبالا کرنے کے لیے نعیم ان سب کو بازار میں واقع چاٹ اور جوس کی ایک دکان پر لے گیا اور انہیں ان کی پسند کے مطابق کسی کو چنا چاٹ، کسی کو وہی بھلے اور کسی کو نمکین تو کسی کو میٹھے گول گپے کھلائے اور جوس پلایا۔

مہرن کے گھر میں حمیدہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ جوان بیٹی خواہ کتنے ہی اپنوں کے ساتھ گھر سے باہر ہو ماں کی نظریں دروازے پر اور کان آہٹ پر لگے رہتے ہیں۔

بازار سے گھر واپس لوٹتے ہوئے پروین نے مہرن سے کہا۔ ”مہرن بہت رات ہو گئی ہے۔ تمہاری امی اکیلی ہیں گھر میں۔ اس وقت تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔ صبح سویرے آ جانا میں مہندی لگا دوں گی۔“

”پاگل ہوئی ہو۔“ نعیم نے پروین کو ڈانٹا۔ ”صبح وہ عید کے کپڑے پہنے گی کہ مہندی لگوا کر بیٹھے گی۔“

”گرمی کا موسم ہے صبح بھی لگوائے گی تو گھنٹے بھر میں سوکھ جائے گی۔ کون مہندی ویسے بھی جلدی سوکھ جاتی ہے۔ اسے اس کے گھر چھوڑنے چلتے ہیں۔“ پروین نے رسانیت سے کہا۔

”نہیں امی نہیں۔“ پروین کی بڑی بیٹی نسرین ٹھنک کر بولی۔ ”مہرن باجی کو اپنے گھر لے کر چلیں..... حمیدہ خالہ سے ہم لوگوں نے بول تو دیا تھا کہ دیر ہو گئی تو مہرن باجی کو ہم لوگ رات کو اپنے گھر ہی روک لیں گے۔“

”اور کیا۔“ نعیم نے جلدی سے تائید کی۔

”میں تو آپا حمیدہ کے اکیلے پن کی وجہ سے کہہ رہی ہوں اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ مہرن میں ان کی جان ہے۔ رات کو انہیں نیند ہی نہیں آئے گی اس کے بغیر۔“ پروین نے کہا۔

”مہرن سے پوچھ لو اس کی کیا مرضی ہے۔“ نعیم بولا۔

”اللہ مہرن باجی ہمارے گھر چلیں..... چاند رات ہے مزہ آئے گا۔“ نسرین نے مہرن کا بازو پکڑتے ہوئے محبت سے کہا۔

”امی پریشان ہوں گی نسرین۔“

”امی کیوں پریشان ہوں گی..... کوئی غیر گھر تھوڑی ہے تمہاری خالہ کا گھر ہے۔“ نعیم نے لقمہ دیا۔

”ٹھیک ہے خالہ میں آپ کے گھر ہی چلتی ہوں۔ مہندی لگوا کر گھر چلی جاؤں گی۔“

”ایک تو نج رہا ہے۔ صبح ہی جانا اپنے گھر۔“

”ٹھیک ہے خالو صبح چلی جاؤں گی۔“

گھر پہنچتے ہی لڑکیاں مہندی لگوانے بیٹھ گئیں۔ مہندی لگاتے لگاتے پروین کو ڈھائی پونے تین بج گئے۔ مہرن سمیت چاروں لڑکیاں مہندی لگواتے لگواتے ہی دو چار پائیوں پر سو گئیں۔ پروین جودن بھر گھر کی صفائی ستھرائی، عید کی تیاری اور بازار سے واپسی پر یکے بعد دیگرے چار بچیوں کے ہاتھوں پر مہندی لگا کر ٹھکن سے چور ہو رہی تھی برآمدے میں پڑی چار پائی پر بے خبر سوئے بیٹے کے ساتھ جالیٹی۔ ارادہ یہ تھا کہ کچھ دیر کو کمر سیدھی کر کے اٹھے گی اور شیر خور ماچو لیے پر چڑھا دے گی تاکہ صبح تک ٹھنڈا ہو جائے مگر تکان اتنی تھی کہ لیٹی تو آنکھ لگ گئی اور ایسی گہری نیند سوئی کہ اسے پتا ہی نہ چلا کب پو پھٹی اور تیرگی اجیارے میں ڈھل گئی۔

نیند سے بیداری کے بعد پروین نے سب سے پہلے اس کمرے میں جھانکا جہاں مہرن اور اس کی اپنی تینوں بچیاں سوئی ہوئی تھیں۔ اس کی اپنی بیٹیاں بے خبر سوئی ہوئی تھیں مگر مہرن کمرے میں نہ تھی۔ پروین اٹنے پاؤں پٹی، چھوٹا سا گھر تھا۔ دوسرے کمرے میں جھانکا نعیم بھی اپنے بستر پر نہ تھا۔ گھبرا کر اس نے باورچی خانہ، غسل خانے میں جھانکا اور دہلی کر رہ گئی..... نہ مہرن وہاں تھی نہ نعیم۔ کلیجا تھا سے کھڑی تھی کہ گھر کا بیرونی دروازہ کھلا اور نعیم گھر میں داخل ہوا۔

”مہرن کہاں ہے؟“ پروین نے پوچھا۔

”اس کو اس کے گھر چھوڑ کر آ رہا ہوں۔“ نعیم نے معصومیت سے جواب دیا۔

”اتنی صبح!“

”ضد کر رہی تھی اپنے گھر جانے کی۔“

”تم سے!“

”تو کیا تجھ سے..... تو تو گھوڑے گدھے بیچ کر سوئی ہوئی تھی۔“

”دن بھر کی تھکی ہوئی تھی۔ رات کو بازار جانا پڑا۔ بچیوں کو مہندی لگاتے لگاتے گھڑی کی سوئیاں ڈھائی سے بھی آگے نکل گئی تھیں۔ تم تو آتے ہی بستر پر پڑ گئے تھے میں بچیوں کو مہندی لگا کر سوئی تو ہوش ہی نہیں رہا۔ حمیدہ آپا جاگ گئی تھیں؟“

”ہاں جاگ ہی ہوئی تھیں۔“

”چلو اچھا ہوا مہرن سویرے سویرے گھر چلی گئی۔“

مہرن کے اتنی صبح اپنے گھر جانے کا سبب نعیم جانتا تھا یا پھر خود مہرن۔ رات کو پروین تو ٹھکن سے چور گہری نیند

درماندہ

سو گئی۔ نعیم کے دل کا شیطان پروین کے خراٹوں سے جاگا اور اس نے دبے پاؤں بچیوں کے کمرے میں جا کر گہری نیند سوئی مہرن کے منہ پر ہاتھ دھر کر اسے آواز نکالنے سے بے بس کر کے دوسرے کمرے میں لے جا کر اسے ڈرا دھمکا کر بے آبرو کر دیا۔

رقص الٹیس ختم ہوا تو مہرن شدید بیجانی کیفیت میں تھی۔ اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا، دانت بج رہے تھے، وہ کھٹی کھٹی آواز میں رو رہی تھی۔

”خبردار جو تو نے کسی سے ایک لفظ بھی کہا..... تیری اور تیری ماں کی گردنیں اتار دوں گا۔“ نعیم نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے دھمکی دی۔

”مجھے..... گھر..... جانا..... ہے۔“ وہ سرتاپا کانپ رہی تھی اور اس کے دانت مسلسل بج رہے تھے۔

”پہنچا دوں گا گھر لیکن تو نے کسی سے کچھ نہیں بولنا ہے..... اپنی امی سے بھی نہیں۔“ اس نے توقف کیا پھر ڈپٹ کر بولا۔ ”سمجھ رہی ہے نا میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ یاہر چار پائی پر سوئی پروین کے خیال سے نعیم اس سے کھٹی کھٹی آواز میں مگر نہایت جارحانہ تیوروں اور پوری دھمکی اور دھونس سے بات کر رہا تھا۔

مہرن نے جھکی جھکی نظروں کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

”پہلے تو اپنے یہ دانت بجانا بند کر پھر لے کر جاؤں گا تجھے تیرے گھر۔“ نعیم نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں اور انگوٹھے سے اس کا منہ بری طرح جکڑتے ہوئے کہا۔

مہرن سہم گئی اور اپنے جسم کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

نعیم دبے پاؤں اور نہایت آہستگی سے گھر کا خارجی دروازہ کھول کر مہرن کو اپنے ساتھ لیے گھر سے نکلا تھا اور راستے میں کبھی اس سے میٹھی میٹھی، تسلی آمیز اور کبھی دھونس اور دھمکی آمیز باتیں کرتا اسے اس کے گھر لے گیا تھا۔ حمیدہ نے پہلی ہی دستک پر یوں دروازہ کھول دیا تھا جیسے وہ دروازے سے ہی تو لگی کھڑی تھی۔

”آگنی میری بیٹی۔“ وہ مہرن کو دیکھتے ہی کھل اٹھی تھی۔

”اچھا آپا میں چلتا ہوں۔“ نعیم نے دروازے پر ہی کہا۔

”رات بھر جاگی ہوں۔ اس کے بغیر نیند ہی نہیں آئی مجھے..... جائے پیو گے بھیا تیار ہے۔“

”نہیں آپا بس چلتا ہوں جا کر نماز کی تیاری کرنی ہے۔“

”پروین بے چاری بھی صبح ہی اٹھ کر کاموں میں لگ گئی ہوگی۔“

”آں..... ہاں..... ہاں۔“ نعیم نے مہرن کو کن انکھیں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بچیوں کو مہندی لگا کر وہ بھی سو گئی تھی۔ بے چاری تھک جاتی ہے دن بھر کلوہو کے تیل کی طرح گھوم گھوم کے۔“

”اللہ ہمت دے..... خوش رکھے۔“

”چلتا ہوں..... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ..... اور عید مبارک بھی۔“

”تمہیں بھی..... اللہ تمہیں اپنے بچوں کی خوشیاں دکھائے۔“

جاتے جاتے نعیم نے مہرن کو نہایت گہری نگاہوں سے دیکھا۔ حمیدہ نے حسب عادت نظریں نیچی کر رکھی تھیں۔ نعیم کے جانے کے بعد وہ مہرن کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مہندی تو دکھا اپنی۔“

مہرن نے رو بوٹ کی طرح دونوں ہتھیلیاں ماں کے سامنے کر دیں۔

”ہاتھ دھوئے گی تو پتا چلے گا کیسی رچی ہے۔“ حمیدہ نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے ہونٹوں سے چومے اور بولی۔ ”کہتے ہیں جس لڑکی کے ہاتھوں پر مہندی اچھی رہے اس کی ساس بہت چاہتی ہے اسے۔“

مہرن چپ رہی۔

”چوڑیاں تو، تو نے بڑی اچھی پہنی ہیں۔“ حمیدہ نے اس کی کلائیوں میں پہنی چوڑیوں کو دھیر ج سے چھوا اور مہرن کو پیار سے دیکھتے ہوئے بے ساختہ چونکی۔ ”یہ کیا ہوا؟“

اس نے مہرن کے دائیں رخسار پر پڑے سیاہی مائل ننھے سے داغ کو اپنی انگلی سے چھوا۔ اس کے چہرے پر اور لمبے میں تشویش تھی۔

”کیا؟“ مہرن خود بے خبر تھی۔

”نیل سا ہے۔“

”پتا نہیں..... شاید چھرنے کا لٹ لیا ہو۔“

”چھرکا کا ٹاٹا ایسا تو نہیں ہوتا۔“

”شاید جوٹ لگ گئی ہو۔“

”جوٹ لگی اور تو ایسی بے ہوش کہ تجھے پتا ہی نہیں۔“

مہرن کے اظہارِ لاعلمی نے حمیدہ کی تشویش رفع کر دی تھی۔ اسے کیا خبر کہ اس کی بیٹی کیسی جوٹ کھا کر گھر آئی تھی۔ ایسی جوٹ جس نے اس کی آئندہ زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا۔

”جائے بنار کھی ہے میں نے..... ناشتا کر لے۔“

”اچھی دل نہیں چاہ رہا امی۔“

1987ء سے خدمت میں مصروف

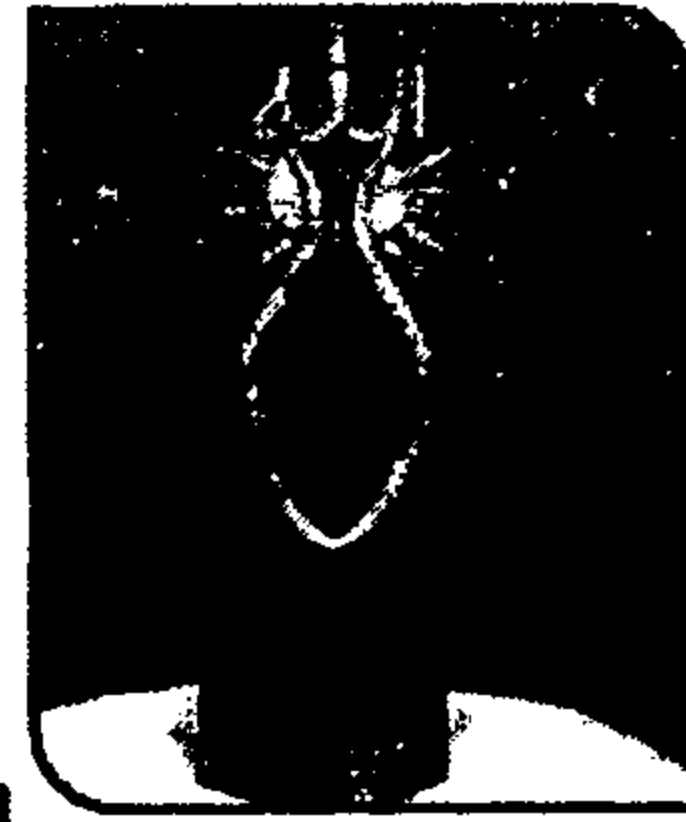
LEUCODERMA-VITILIGO

تما جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

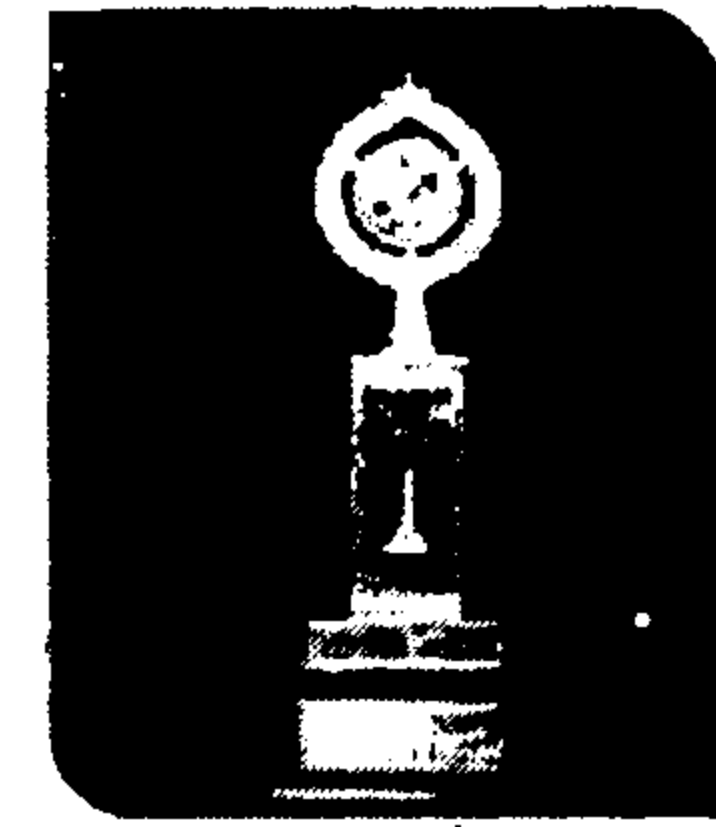
پھلہری
قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

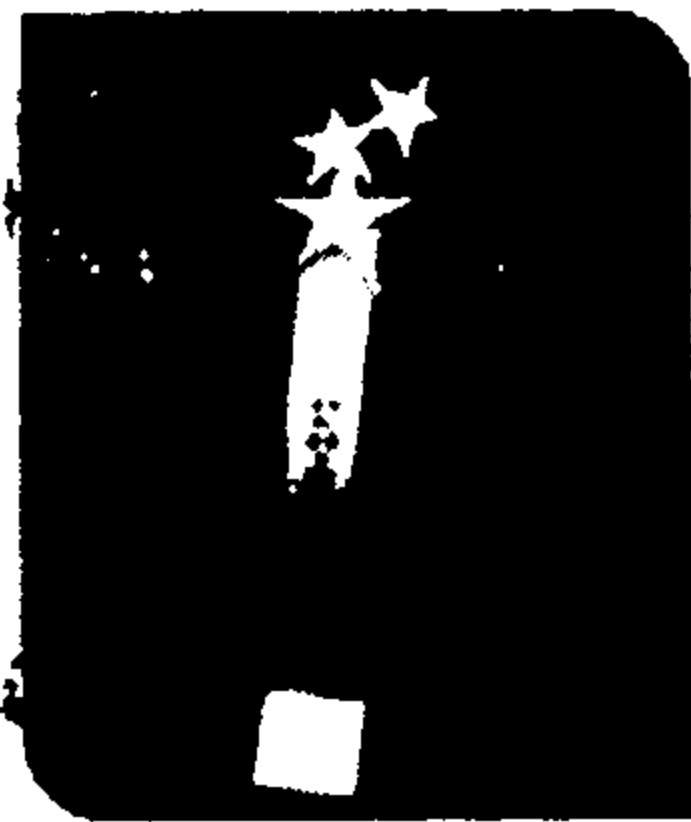
اجمل زیدی
کے دور کا پاکستان کا مستقل پیشہ ورانہ کلیم



ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD



AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA



AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT

اسلام آباد

ماہ ۸۸۲ سید البر ۲۰، پلاٹ G-31
سراچک (پلیٹ چوک) اسلام آباد
فون: 2854595 - 2255880 (051)
موبائل: 0300-8566188
فکس: 2281636

9- اپریل 30 تا مئی
9- اگست 30 تا ستمبر
9- دسمبر 30 تا جنوری

لاہور

گلف سینٹر

14- فروری 27 تا فروری

آفس: نمبر 16
فیروز پور روڈ، نزد چوک
نزد منہر پورٹ (آزاد پور)

14- جون 27 تا جون

14- اکتوبر 27 تا اکتوبر

موبائل: 0300-8566188

پشاور

ہیٹل لائیج

یکم فروری 11 تا فروری

بی ٹی روڈ نزد بھری چوک چارو شہر
فون: 2218215-9 (0521)

یکم جون 11 تا جون

یکم اکتوبر 11 تا اکتوبر

موبائل: 0300-8566188

ملتان

پیشہ ورانہ کلیم

13- مارچ 27 تا اپریل

رہبر سید سید محمد
فون: 4518061-62 (061)

28 جولائی 6 تا اگست

28 نومبر 7 تا دسمبر

4582803 (0300-8566188)

کراچی

پیشہ ورانہ کلیم

13- مارچ 27 تا مارچ

706، 7، ٹاور شاہراہ فیصل
زمری اسٹاپ ملز K.F.C کراچی

13- جولائی 27 تا جولائی

13- نومبر 27 تا نومبر

فون: 021-7012068-9

موبائل: 0300-8566188

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

میں ہوں گے۔“

”تیرا محلے کے کسی آدمی سے پردہ ہے کیا..... سب تجھے اپنے بچوں کی طرح سمجھتے ہیں۔“

”امی لڑکے بھی ہوتے ہیں گھروں میں۔ وہ تو مجھے اپنے بچوں کی طرح نہیں سمجھیں گے نا۔“

”اتنی عقلمند کب سے ہو گئی تو۔“ حمیدہ نے مہرن کو محبت سے دیکھا۔

”اچھا خالہ کے گھر تو دے آسویاں۔“

”میں نے کہہ دیا نا مجھے کہیں نہیں جانا۔“

”اتنی ترخ کیوں رہی ہے۔“ حمیدہ کو بھی غصہ آ گیا۔ ”مت جا..... پروین کے گھر سے بچے آئے تو انہی کے ہاتھ بھجوا دوں گی..... مجبوری ہے بھی ہمارے گھر سے تو جائے یا میں جاؤں..... ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے مجھ سے تو زیادہ کہیں آیا جانا نہیں جاتا۔ محتاج بنی گھر ہی میں بیٹھی رہتی ہوں۔“ حمیدہ خود کلامی کرنے لگی۔

مہرن تذبذب میں تھی۔ نہ گزشتہ رات کی ہیبت ناکی کو اپنے ذہن سے محو کر پار ہی تھی، نہ ماں کو اس اذیت سے آگاہ کرنے کا حوصلہ کر پار ہی تھی جس سے وہ دوچار تھی۔

دوپہر کو پروین نے بچوں کے ہاتھ بریانی اور شیر خور ما بھجوا یا تو مہرن ان کے آنے پر روزانہ کی طرح خوش نہ ہوئی۔ حالانکہ پروین کی بچیاں اور بیٹا جو عید کا سلام بھی کرنے آئے تھے مہرن پر اسی طرح واری ٹار ہوتے دکھائی دیے بلکہ بچیاں تو مہرن کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ گھر لے جانے پر بھی مصر رہیں۔

”میری پھوپھی آئیں گی مجھے امی کے ساتھ کام کروانا ہے۔“ مہرن ان کے اصرار پر یہی کہتی رہی۔

حمیدہ جانتی تھی مہرن کو اس کے ساتھ کتنا کام کروانا تھا۔ گھر صاف ستھرا پڑا تھا۔ پلنگوں پر دھلی چادریں بچھی تھیں۔ مہمانوں کے لیے برتن دھلے رکھے تھے، سویاں صبح سے تیار تھیں۔ مینجی سے بوٹیاں نکال کر اس نے پلاؤ دم دینے کے لیے مسالا.... بھی بھون لیا تھا اب بس چاول بھگو کر پلاؤ دم لگانا تھا۔ پروین کے بچوں کے آنے پر تو مہرن جھٹ پٹ ان کے ساتھ جانے یا گھر ہی میں کد کڑے لگانے کو تیار ہو جاتی تھی۔ آج ضرور کوئی بات تھی جو وہ ان سے سرد مہری برت رہی تھی۔

”جا تھوڑی دیر کو ہوا..... خالہ خالو کو عید کا سلام بھی کر آ۔“ حمیدہ نے کہا۔

”مجھے نہیں جانا۔“

”میں نے تیرے کپڑوں پر رات ہی استری کر دی تھی۔ ابھی تو نہادھو کر اپنے ہی گھر والا عید کا جوڑا پہن لے۔ شام کو جب پھوپھی آئیں گی تو ان کا والا جوڑا پہن لینا..... خوش ہو جائیں گی کہ ہمارا بھجوا یا ہوا جوڑا پہن رکھا ہے۔“

”اچھا امی۔“ وہ کسلمندی سے چار پانی پر بیٹھ گئی۔ پروین کے گھر میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح اس کے ذہن سے چمٹا ہوا تھا۔ کتنا بے بسی کر دیا تھا اس غیبت شخص نے اسے۔ وہ چیخا چلانا چاہتی تھی مگر اس نے اپنے موٹے موٹے مضبوط اور قوی ہاتھوں سے اس کا منہ دبوچ رکھا تھا اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اس اذیت کو وہ اب بھی محسوس کر سکتی تھی..... اپنے گھر کی آزاد فضا میں بھی! ماں جس سے وہ اپنے دل کی تقریباً ہر بات ہی شیر کر لیا کرتی تھی، اسے بھی چاہنے کے باوجود وہ گزشتہ رات پیش آنے والے واقعے کے بارے میں کچھ بتانے کی ہمت نہ کر پار ہی تھی۔ اول شرم دوم نفیم کی دھمکیوں کا خوف..... اسے گھر لاتے ہوئے راستے میں کتنی بکواس کرتا رہا تھا وہ..... تو کچھ بولی تو میں تیری سسرال جا کر کہہ دوں گا یہ خود آئی تھی میرے پاس..... لا حول ولا توفہ! کیسی بے شرمی کی بات تھی۔

نہانے کے لیے غسل خانے میں تھی تو غسل خانے کی دیوار پر کیل سے لٹکے چھوٹے سے بیضوی آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے اسے اپنا چہرہ بہت اجنبی سا لگا..... بجھا بجھا، پھیکا پھیکا سا..... ماں نے اس کے دائیں رخسار پر جس داغ کی نشاندہی کی تھی اسے دیکھتے ہی اسے اس نشان کا سیاق و سباق یاد آ گیا۔ اس داغ پر تنوکی سی کیفیت میں اپنی انگلی کی پور گھنے ہاندھیرے جنگل میں بھٹکتے ہوئے وہ اتنی دیر گرم صم سی آئینے کے سامنے کھڑی رہی کہ اسے پتا ہی نہ چلا کب اس کی آنکھوں میں سیل رواں اتر آیا۔

نہادھو کر نئے کپڑے پہننے اور بال سنوارنے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلی تو ماں نے اسے گلے لگا کر ڈھیروں دعائیں دیں۔ ”اللہ کرے میری بچی کو سکھ ہی سکھ ملے۔“ پھر اس نے کہا۔ ”میں نے سوٹیاں بنادی ہیں آس پاس کے دو چار گھروں میں دے کر خالہ کے ہاں بھی دے آ۔“

”میں نہیں جاتی امی۔“

”کیوں؟“ حمیدہ چونکی۔

”مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”تہو کا دن ہے۔ آج تو سب اچھا ہی اچھا لگتا ہے۔“

”نہیں..... میں نہیں جاؤں گی..... سارے مرد گھر

”کیوں؟“

”بس!“

”بس کا کیا مطلب!“ حمیدہ نے بیٹی کو ٹٹاہ میڑھی کر کے دیکھا پھر پروین کے بچوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔
”بھی کوئی بات ہوگئی ہے کیا تم لوگوں کے بیچ؟“

”نہیں تو خالہ۔“ نسرین نے فوراً جواب دیا۔
”پھر کیا بات ہے..... مہرن آج تمہیں رخ دے کر بات کیوں نہیں کر رہی؟“

”پتا نہیں خالہ۔“
”تو ہی بتا۔“ حمیدہ نے مہرن کو دیکھا۔
”تم تو ایک بات کے پیچھے ہی پڑ جاتی ہو امی..... بس کہہ دیا نا مجھے نہیں جانا۔“

”جواب تو تیری زبان کی نوک پر دھرا رہتا ہے۔ تیری پھوپھو سے کہوں گی لے جاؤ اسے اپنے گھر۔“
”تمہاری بس یہی ایک دھمکی..... اور دھمکی کہتے ہی مہرن کو نعیم کی دھمکیاں یاد آنے لگیں۔
”دھمکی مت سمجھ..... کسی روز غصہ آ گیا تو یہی کروں گی۔“

ماں کی بات مہرن کی سماعت میں نعیم کی دھمکیوں کے بیچ نثار خانے میں طوطی کی صدا کی طرح گم ہو کر رہ گئی۔
”اچھا خالہ ہم لوگ جا رہے ہیں۔“
”اچھا بیٹا۔“

پروین کے بچے مہرن کو ساتھ لے جائے بنا ہی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد حمیدہ نے مہرن کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔ ”کیا خالہ نے کچھ کہہ دیا؟“
مہرن نے نفی میں سر ہلا دیا۔
”خالو نے کچھ کہا؟“
وہ ہنسنے لگی۔

”سمجھ گئی اسی نے کہا ہے کچھ..... کوئی بات نہیں باپ کی جگہ ہے اتنا خیال بھی تو رکھتا ہے تیرا۔“
مہرن تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نعیم کی دھمکیاں اس کے ذہن سے یک لخت کا فور ہو گئیں۔ ”کوئی نہیں رکھتا وہ خیال..... وہ بہت خراب آدمی ہے۔“

حمیدہ کا ماتھا ٹھنکا۔
”کیا خراب ہے؟“ اس نے مہرن کو ٹٹویش سے دیکھا۔
”کچھ نہیں۔“ اس نے نظریں چرائیں۔
”بتا..... نا.....“ حمیدہ نے اسے جھنجھوڑا۔
مہرن کے ہونٹوں پر لرزش طاری ہوگئی اور وہ تشنجی

کیفیت سے دو چار دکھائی دینے لگی۔ حمیدہ بے چین ہوگئی۔
اس کے ذہن میں خدشات کے بگو لے اٹھنے لگے۔

”مہرن!“
”جی امی۔“
”بول کیوں نہیں رہی..... بتاتی کیوں نہیں..... خالو

نے کیا ایسا کہہ دیا تجھے جو تو اسے خراب کہہ رہی ہے۔“
مہرن نے ڈڈبائی آنکھوں سے ماں کو دیکھا اور اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپا کر کھٹی کھٹی آواز میں بولی۔ ”میں تو سو رہی تھی امی..... نسرین لوگوں کے ساتھ..... خالو اندھیرے کمرے میں آگئے اور میرا منہ دبا کر..... مجھے زبردستی اپنے کمرے میں لے گئے.....“ حمیدہ کو اس سے آگے سننے کا یارا نہ تھا مگر مہرن بولے گئی۔ حمیدہ چکر کر نیچے ڈھیر ہوگئی۔

”امی..... امی جی.....“ مہرن کو لگا اس نے ماں کو بتا کر غلطی کی تھی مگر اسے اپنے سینے پر دھرا بوجھ ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ ماں کو نہ بتاتی تو کسے بتاتی۔ اس ایک رشتے سے تو اس کے کئی رشتے بندھے تھے۔ وہ اس کی ماں ہی نہیں باپ اور دوست بھی تھی۔

حمیدہ بہت دیر یوں سو گوار بیٹھی رہی جیسے دوبارہ بیوہ ہوگئی ہو۔ مہرن نے اس کے منہ سے پانی کا پیالہ لگایا تو اس نے پیالہ پرے ہٹا دیا اور مہرن کو اپنے گلے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”مت روائی برابر والی خالہ سن لیں گی۔“ مہرن بولی۔
حمیدہ نے اپنی سسکیاں سینے میں گھونٹ لیں۔ کیا المیہ ہے غریب کھل کر ہنس تو سکتا ہی نہیں، دکھ میں کھل کر رو بھی نہیں سکتا۔ حمیدہ کو اپنی یتیم پن کی بے آبروئی کا جو دکھ تھا سو تھا، اس کے مستقبل کے خدشات زیادہ دامن گیر تھے۔ بے آبرو لڑکی کو کوئی جگرے والا ہی اپنے گھر کی آبرو بنانے کا حوصلہ کرتا ہے۔ مہرن کی ہونے والی سسرال اس کے مرحوم باپ کے کتنے ہی قریبی رشتے دار سہی اور مزاج کے لوگ تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنی عزت اور انا کا مسئلہ بنا لینے والے..... یہ تو بات ہی بہت بڑی تھی!

حمیدہ اچانک یوں زور سے کراہی جیسے ناقابل بیان کرب و اذیت میں ہو پھر اس نے ڈوبتی ہوئی نظروں سے مہرن کو دیکھا اور گھائل لہجے میں بولی۔ ”کسی سے اس بات کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”خالہ سے؟“ مہرن کا لہجہ سوالیہ تھا۔
”اس سے بھی نہیں..... دیواروں کے بھی کان ہوتے

درمندانہ

ہیں..... تیری پھوپھو کو بھنک بھی مل گئی تو وہ نہ جانے کیا کریں گی اور جاوید تو ہے ہی غصیلا۔“

”امی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ مہرن ماں سے پٹ گئی۔
”ان لوگوں کے آنے کا وقت ہو رہا ہے..... اٹھ..... ہاتھ منہ دھو..... کپڑے بدل..... پھوپھو والا جوڑا نکال کر پہن..... آتے ہی ہوں گے وہ لوگ۔“ حمیدہ نے مہرن سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”اور میری یہ نصیحت اپنے پلو میں باندھ لے بلکہ اپنی سات پشتوں کو نصیحت کر جانا کہ لڑکی ذات کورات تو رات دن میں بھی کسی کے گھر اکیلا نہ چھوڑا جائے۔ مرد پر شیطان آتے کوئی دیر نہیں لگتی۔“

مہرن نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

چار سو اچار بچے مہرن کی پھوپھی اور ان کے گھر والے عید ملنے آگئے۔ مٹھائی، پھل اور اپنے گھر کا پکا ہوا عید کا خصوصی کھانا مہرن کے لیے بطور خاص ایک ٹفن دان میں لے کر جاوید بھی ساتھ آیا تھا۔ مہرن کا اس سے پردہ تو نہ تھا لیکن جب سے رشتہ طے ہوا تھا دونوں ایک دوسرے سے بات کرتے جھجکنے لگے تھے۔ مہرن اس سے شرماتی اور وہ مہرن کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتا رہتا۔

پھوپھی اور ان کے گھر والوں کے آنے سے عید کی شام اچھی گزر گئی۔ مہرن اور حمیدہ کا دھیان اس ناخوشگوار واقعے سے کچھ دیر کے لیے ہٹا رہا۔ مغرب کی نماز کے بعد حمیدہ نے دسترخوان بچھا دیا۔ کھانا کھا کر مہمان خوش خوش اپنے گھر سدھارے۔

مہمانوں کے جاتے ہی حمیدہ کا دل پھر اس ناخوشگوار سانحے کی اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ اس کا بس چلتا تو نعیم کا خون پی جاتی۔ وہ دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتی رہی اور بار بار مہرن کو آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ اس کا دل دکھ رہا تھا۔ اپنی غلطی کا بھی رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا۔ پروین برامتی پھلے، اسے مہرن کورات کے وقت ان لوگوں کے ساتھ جانے کی اجازت ہی نہیں دینا چاہیے تھی۔ پروین سے اپنی رشتے داری کی مروت تھی تو خود بھی ساتھ گئی ہوتی۔ مہرن کو کسی قیمت پر رات کسی دوسرے گھر میں گزارنے کی اجازت نہ دیتی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا اور ہونے والی بات اتنی ہیبت ناک تھی کہ اس کا چرچا مہرن کا مستقبل تاریک کر سکتا تھا۔ گھر کی چار دیواری میں بیٹھی سیدھی سادی حمیدہ کو خاموشی سے زہر کا ٹھونٹ پی لینے ہی میں اس ہونی کی زہرناکی کا تریاق سمجھ میں آتا تھا۔

عشا کے بعد دروازے پر دستک ہوگئی۔
”کون؟“ حمیدہ نے دروازے سے کان لگا کر پوچھا۔
”آپا ہم ہیں۔“ پروین کی آواز سنائی دی۔

حمیدہ کا اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔ چند لمحے قیامت کی گھڑیاں بن کر گزرے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا دروازہ کھولے یا..... اس نے دالان میں کھڑی مہرن کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور دروازہ کھول دیا۔ پروین، نعیم اور چاروں بچے دروازے پر کھڑے تھے۔
”السلام علیکم حمیدہ آپا..... عید مبارک۔“ اس دیوٹ نے دروازے سے اندر آتے ہوئے کہا۔

”دوپہر سے آنے کا ارادہ کر رہی تھی مگر ایک کے بعد دوسرا کام..... فرصت ہی نہیں ملی پھر میں نے سوچا تمہارے مہمان آئے ہوں گے رات ہی کو جاؤں گی۔“ پروین نے حمیدہ سے گلے ملنے کے بعد کہا۔

”ہاں..... بس ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی گئے ہیں مہمان۔“ حمیدہ کے لہجے میں روزانہ کی سی گرجبوشی نہ تھی۔
”مہرن کہاں ہے؟“

”کمرے میں ہے..... شاید سو گئی ہو..... دن بھر میرے ساتھ کام کر داتی رہی تھی۔ میں نے کہا جا اب تو آرام کر لے۔“

”بچوں نے تو شام سے رٹ لگا رکھی تھی امی مہرن باجی کے گھر چلیں..... جاؤ دیکھو مہرن باجی سو گئی نہ ہو تو اسے باہر بلا لو۔“ پروین نے اپنے بچوں سے کہا۔
بچے کمرے کی طرف لپکے۔ مہرن جو کمرے کے دروازے سے لگی کھڑی تھی، بجلی کی سی سرعت سے پلنگ پر جالیٹی اور سو گئی بن گئی۔

”امی مہرن باجی تو سو رہی ہیں۔“ بچے کچھ دیر مہرن کو ہلا جلا کر اس کے نہ جانے پر بے نیل و مرام کمرے سے نکل آئے۔
”تم لوگ بیٹھو میں سو یاں نکال لاؤں۔“ حمیدہ اٹھنے کو ہوئی۔

”نہیں نہیں آپا اللہ کی قسم کچھ نہیں، پیٹ فل ہے سب کا۔“ پروین نے حمیدہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”نعیم جو خلاف معمول خاموش بیٹھا گرگ بار بار ادیدہ کی طرح اطراف کا جائزہ لے رہا تھا کھنکھار کر بولا۔“ اور سناؤ حمیدہ بہن سمجھانے والوں سے اچھی گپ شب رہی؟“
حمیدہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ نعیم کی آواز کانوں میں پڑنا بھی اسے قابل نفیرن لگا۔ کتنا بڑا دیوٹ تھا وہ کہ اپنی بد اعمالی پر منہ چھپا کر بیٹھنے کے بجائے اپنی نخوس

ایک بسکٹ

مالک (نوکر سے) ”جاؤ کر موچا چا بسکٹ لے کر آؤ.....“

نوکر گیا اور واپس ایک ہی بسکٹ لے کر آ گیا مالک غصے سے..... ”بے وقوف باقی کے بسکٹ کہاں ہیں؟“

نوکر بولا۔ ”مالک ایک بسکٹ گر گیا تھا۔ میں نے سوچا یہ تو آپ کھائیں گے ہی نہیں اس لیے میں نے وہ کھالیا اور ایک آپ مجھے دیتے ہیں اس لیے وہ بھی میں نے کھالیا۔ اگر میں آپ سے ایک بسکٹ مانگ لیتا تو آپ نے مجھے ضرور دینا تھا سو وہ بھی میں نے پہلے ہی کھالیا۔“

یہ سن کر مالک بھڑک اٹھا اور چلا کر بولا۔ ”آخر تو نے بسکٹ کھائے کیسے کر مو.....؟“

کرمونے آخری بسکٹ منہ میں ڈالا اور مزے سے کھاتے ہوئے بولا۔ ”مالک ایسے۔“

حق میں نہایت غنیمت جانا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ نعیم اب اس کے گھر آئے۔ بیوی بچے آتے تو اس کا آنا بھی لازم تھا۔ اس نے مہرن کو بھی سختی سے سمجھا دیا تھا کہ اب کبھی بھولے سے بھی پروین کے گھر نہ جانے۔

چنانچہ اب نہ مہرن اسکول آتے جاتے پروین کے گھر کا راستہ دیکھتی نہ پروین کے بچے حمیدہ کے گھر بار بار پھیرا لگاتے۔ دودھ لینے کے لیے یا سین کے باڑے بھی جاتے تو راستہ بدل کر۔ حمیدہ پھر اپنے ہمسائے کے بیٹے سے دودھ منگوانے لگی تھی۔ مہرن کو اب اسے کہیں بھی اکیلے پیچھے خوف آنے لگا تھا، تعلیم ضروری نہ ہوتی تو شاید وہ مہرن کو اسکول سے بھی گھر بٹھا لیتی۔

چھوٹی سی آبادی تھی۔ حمیدہ اور پروین کے گھرانوں میں کشیدگی اہل محلہ سے چھپی نہ رہی۔ ہمسائیاں دونوں گھرانوں کی عورتوں کو ٹٹولنے کی کوشش کرتیں۔

”کیا بات ہے آج کل تمہاری بہن کا آنا جانا کم ہو گیا؟“ حمیدہ سے پوچھا جاتا۔

”ہاں وہ بے چاری سارا دن اپنے گھر اور بچوں کے کاموں میں ہی لگی رہتی ہے۔“ حمیدہ نظریں چراتے ہوئے جواب دیتی۔

”بچے اور گھر تو پہلے بھی تھا۔“

”بچے بڑے ہوتے ہیں تو ماں باپ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔“

پروین سے کوئی پوچھتا۔ ”آج کل تمہاری بھانجی نہیں آتی جاتی دکھائی دیتی تمہارے بچوں کے ساتھ؟“

”بورڈ کا امتحان دے گی نا اس سال اپنی پڑھائی میں لگی رہتی ہے اور اس کی ہونے والی ساس نے بھی زیادہ باہر نکلنے پر پابندی لگا دی ہے۔“ پروین پوچھنے والی ہمسائی کو جواب دیتی۔

پروین کے بچے دودھ لینے کے لیے یامین کے پاس جاتے تو وہ ٹٹولتا۔ ”کیا بات ہے بھی خالہ کا برتن نہیں لائے۔“

”وہ خود منگوائیں گی۔“

”تمہاری کوئی ناراضگی ہو گئی ہے؟“

بچے ایک دوسرے کو دیکھتے پھر کہتے۔ ”نہیں تو۔“

لیکن یامین جانتا تھا کہ ایسا نہیں تھا۔ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہوتی تھی دونوں گھرانوں میں جو حمیدہ نے اپنی بہن کے بچوں کے بجائے پروین کے بیٹے سے دودھ منگوانا شروع کر دیا تھا۔ وہ تو یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ مہرن اب اپنی خالہ کے بچوں کے ساتھ اسکول جانے کے بجائے اکیلی

وہ بھی گلہ کر رہے تھے کہ مہرن نے ان سے اچھی طرح بات نہیں کی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں، وہ میرے ساتھ کام کر رہی تھی اور تمہاری بچیاں اسے اپنے ساتھ لے جانے کی ضد کر رہی تھیں۔“

”کوئی بات نہیں، ہم تو آپ کو اپنا سمجھتے ہیں اس لیے اتنا آنا جانا ہے۔“ پروین خفا خفا دکھائی دینے لگی اور حمیدہ نے اس کی خفگی کو مصلحت وقت کے تحت غنیمت سمجھا۔

”میں کون سا غیر سمجھتی ہوں پروین۔ تمہاری مرضی ہے آؤ نہ آؤ۔“

”ارے بھی عید کا دن ہے اچھی اچھی باتیں ہونی چاہئیں۔“ نعیم کا بولنا حمیدہ کو اپنی سماعت پر پھر ہتھوڑے کی ضرب لگا۔

”شیطان، مردود تو نے جس طرح میری اور میری بچی کی عید خراب کی ہے تجھے تو اللہ ہی سمجھے گا۔“ حمیدہ نے دانت کچکپاتے ہوئے سوچا۔

پروین قدرے اچھری اچھری سی رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

پروین طبعاً بڑی حساس اور اپنی غیرت کا پاس رکھنے والی عورت تھی۔ وہ لوگوں سے ہمیشہ برابری کی سطح پر تعلقات قائم رکھتی تھی۔ گر پڑ کر لوگوں سے ملنا خواہ اس کے کتنے ہی سکے کیوں نہ ہوں اسے پسند نہیں تھا۔ عید کے دن حمیدہ کی سرد مہری اور اکھڑ پن اسے ایسا برا لگا کہ وہ نہ صرف خود حمیدہ سے کچھ گئی بلکہ اس نے اپنے بچوں کا بھی حمیدہ کے گھر آنا جانا بند کر دیا۔ ”ہم تو اپنا سمجھ کر ملتے ہیں آپا حمیدہ کو بیٹی کی سرال کی زیادہ آتی ہے تو آئے..... ہماری بلا سے۔“

”ارے بھی اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض نہیں ہوا کرتے۔“ نعیم نے جو درون دل حمیدہ کی غیر متوقع سرد مہری پر کھٹکا ہوا تھا پروین سے کہا۔

”چھوٹی بات نہیں ہے..... تم نے دیکھا نہیں آپا حمیدہ نے اس روز ہمیں رخ دے کر بات ہی نہیں کی..... سو یوں کا بھی بس اوپری دل سے پوچھا۔“ حمیدہ کی بے رخی کی اصل وجہ سے بے خبر پروین نے میاں کو جتایا۔ جس طبقے سے وہ تعلق رکھتی تھی اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔

نعیم کا سمجھنا سمجھنا بھی حمیدہ کی طرف سے پروین کے دل میں آئی دراز کو نہ بھر سکا۔ دونوں گھرانوں میں کھنچاؤ پیدا ہو گیا۔ حمیدہ نے پروین کے کھنچاؤ کو اپنے اور مہرن کے

صورت کے ساتھ سامنے آ بیٹھا تھا۔ اس نے نعیم کو کوئی جواب نہ دیا۔

”آپا کل تم اور مہرن دوپہر کے کھانے پر ہمارے ہاں آ جاؤ۔“ پروین نے دعوت دی۔

”پروین آج کا کھانا ہی اتنا بچا رکھا ہے کہ ہم ماں بیٹی کو تیسری عید تک کو کافی ہوگا۔“

”مہرن خوش ہو جائے گی آپا۔“ نعیم بولا۔

حمیدہ کے جڑے آپ ہی آپ بھیج گئے۔ ”اس کی پھپھوتختی سے منع کر گئی ہیں اسے باہر آنے جانے کو۔“ حمیدہ نے کہا۔

”کیا ہمارے گھر بھی؟“

”ان کی امانت ہے بھی..... مجھے تو ان کے کہے کا بھرم رکھنا لازم ہے۔“

”آپا اپنی پابندیوں میں بھی مت آؤ..... شادی سے پہلے یہ حال ہے تو شادی کے بعد تو وہ لوگ مہرن کو گھر میں قیدی بنا کر ہی بٹھا دیں گے۔“ پروین بھی معترض ہوئی۔

”وہ ان کی چیز ہو گئی پروین جو مرضی آئے کریں۔“ حمیدہ نے سرد مہری سے کہا۔

”لیکن جب تک لڑکی ہمارے گھر میں ہے ہماری چیز ہے..... جہاں ہماری مرضی آئے لڑکی جائے۔“

”ایسا نہیں ہوتا پروین..... بیٹیوں کے معاملے میں ان کی سرالیوں کی سننا پڑتی ہے۔“ حمیدہ جو پروین سے ہمیشہ نہایت مروت، اخلاق اور بیٹھے لہجے میں بات کرتی رہی تھی، نعیم کی طرف سے اپنے دل کی رنجش کو نہ دبا سکی اور پروین کو جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ اکھڑ پن سے محفوظ نہ رہا۔

”ٹھیک ہے آپا جیسے تمہاری مرضی..... مہرن تمہاری بیٹی ہے جو مرضی آئے کرو۔“

”ارے تو پھر تم کیوں خواہنا گرم ہو رہی ہو۔“ نعیم بولا۔

اس کی آواز سن کر حمیدہ کے جڑے پھر بھیج گئے۔ مصلحت نہ ہوتی تو وہ نعیم کو اپنے گھر سے جوتے لگا کر باہر نکال دیتی۔

”چلو جی۔“ پروین جسے حمیدہ کی باتیں بری لگی تھیں، اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیٹھو..... آئی ہو تو تھوڑی دیر تو بیٹھو۔“ حمیدہ نے مروتا کہا۔

”نہیں..... بس اب چلیں گے..... میں بھی دن بھر کی تھکی ہوئی ہوں۔“ پروین نے سرد مہری سے کہا پھر بولی۔

”برامت ماننا آج دوپہر کو بچے تمہارے گھر سے ہو کر گئے تو

”امی منع کرتی ہیں۔“ مہرن کا جسم دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ رنگت خوف سے پیلی پڑ گئی تھی۔
”تو نے ان سے کچھ کہا ہوگا نا؟“ نعیم نے اس پر آنکھیں نکالیں۔
”نہیں نہیں..... میں نے کچھ نہیں کہا۔“ وہ متوحش ہو کر بولی۔

”تو پھر کیوں منع کرتی ہیں امی؟“
”پھوپھوتی ہیں اسے زیادہ باہر مت نکلنے دو۔“
”مجھے بھی پتا چل گیا نا کہ تو نے کسی کے سامنے زبان کھولی ہے تو زبان کھینچ لوں گا تیری..... اور اپنی ماں کو مت بتانا کہ میں ملا تھا تجھے ورنہ دونوں کو قتل کر دوں گا..... مجھی۔“
”نہیں بتاؤں گی..... نہیں بتاؤں گی۔“ وہ گھبرا کر بولی۔
نعیم اس کے راستے سے ہٹ گیا اور وہ خوف و ہراس کے عالم میں لمبے لمبے ڈگ بھرتی آگے بڑھ گئی۔ اس امر سے بے خبر کہ یامین کچھ فاصلے سے اس کے اور نعیم کے ٹاکرے کا منظر دیکھ چکا تھا۔

اسی روز اسکول سے اس کی واپسی کے وقت یامین بے محابا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا اور اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”صبح کو خالو تیرا بڑا گرم ہوتا دکھائی دے رہا تھا تیرے پر۔“

مہرن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”نہ..... بات کیا تھی جو وہ آنکھیں نکال رہا تھا تیرے پر۔“

”کچھ نہیں۔“ مہرن نے راستہ کاٹ کر نکلنا چاہا مگر یامین دوبارہ اس کے راستے میں آ گیا۔

”پتا کے جا۔“
”تمہیں کیا۔“

”اوئے ہم اس علاقے کے پرانے لوگ ہیں۔ تیرے اس خالو کو تو یہاں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ اگر یہ تم ماں بیٹی سے کوئی پھنڈا لگانے کی کوشش کر رہا ہے تو بتا..... طبیعت ٹیٹ کرادوں گا اس کی..... صبح میں دور کھڑا تھا اس لیے سن نہیں سکا کیا بول رہا تھا وہ۔“
”کوئی بات نہیں ہے۔“

”چل مان لیا..... جا..... جاشا باش..... پر کوئی مسئلہ ہو تو بتا دینا۔ تیری ماں کو وہ اکیلی بیوہ عورت نہ سمجھے..... کوئی مسئلہ ہے تو ہم ساتھ کھڑے ہیں اس کے۔“
یامین نے اسے گزرنے کو راستہ دیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے گھر کی طرف چل دی۔

گھر پہنچ کر اس نے ماں کو صبح کے وقت نعیم کے اپنی راہ میں آنے اور دوپہر کو یامین کے راہ میں آنے کھڑے ہونے کا قصہ سنایا تو وہ نہایت فکر مندی سے بولی۔ ”مجھے تو اب تیرے اسکول جانے سے بھی ڈر لگنے لگا ہے مہرن۔“
”کچھ نہیں ہوتا امی۔“ مہرن نے ماں کو فکر مند دیکھ کر تسلی دینے کی کوشش کی۔

”اللہ نہ کرے جو کچھ ہو۔ کل سے میں گلی کے کڑتک تیرے ساتھ چلا کروں گی اور جب پروین کے بچے اسکول جانے کے لیے آتے دکھائی دیا کریں گے تب تجھے آگے جانے کو کہوں گی..... اس کمینے کو اپنے بچوں کے سامنے تو تیرے آگے آتے کچھ لاج آئے گی۔“
”میں ان سے بات کروں؟“
”کن سے؟“

”پروین خالہ کے بچوں سے۔“
”وہ بات کریں تو..... کر لیتا، ان معصوموں کا کیا تصور۔“
اگلے دن سے یہی معمول شروع ہو گیا۔ گلی کے کڑتک حمیدہ بیٹی کے ساتھ جاتی۔ دونوں اس وقت تک کڑ پر کھڑی رہتیں جب تک پروین کے بچے دوسری گلی سے نکلتے دکھائی نہ دیتے۔ انہیں دیکھتے ہی حمیدہ مڑ جاتی اور ان کے نزدیک آنے پر مہرن ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ پروین کے بچے ایک دو دن چپ رہے پھر مہرن سے ان کی بات چیت شروع ہو گئی۔

☆☆☆
اس روز بھی حمیدہ حسب معمول مہرن کو گلی کے کڑتک پہنچا کر پروین کے بچوں کو دوسری گلی سے نکلتے دیکھ کر واپس پلٹ گئی تھی۔ پروین کے بچے نزدیک پہنچے تو مہرن ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اسکول تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا کہ ایک گاڑی ان کے نزدیک آ کر رکی۔ مہرن اور پروین کے بچے ایک ساتھ ٹھٹک گئے۔ گاڑی یامین چلا رہا تھا۔

”او مہرن تیری امی گلی سے جا رہی تھی اس کا ایک موٹر سائیکل سے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اسپتال لے گئے ہیں تیری امی کو..... جلدی سے گاڑی میں بیٹھ..... میں تجھے اسپتال پہنچاتا ہوں..... بہت خراب حالت ہے امی کی۔“ یامین نے اتنی پریشانی اور تشویش کے ساتھ یہ سب کچھ کہا کہ مہرن ہراساں ہو گئی۔ پروین کے بچے جو ساتھ تھے، اسے دیکھتے ہوئے خود بھی پریشان نظر آنے لگے۔

”بیٹھ بیٹھ..... جلدی سے بیٹھ۔“ یامین نے گاڑی کا دروازہ گاڑی میں بیٹھے ہی بیٹھے کھول رکھا تھا۔ وہ سخت

پریشانی کے عالم میں گاڑی میں بیٹھ گئی۔ یامین نے گاڑی دوڑادی۔

”امی کو اسپتال کون لے گیا ہے؟“
”بندے۔“

”امی ہوش میں تو تھیں؟“
”ہاں۔“

”چوٹ کہاں لگی؟“
”اندرونی۔“

”امی کو سانس تو آ رہی تھی نا؟“
”ہاں۔“

”کون تھا جس کی موٹر سائیکل سے ایکسیڈنٹ ہوا؟“
”بندہ ہی تھا۔“

”اپنے محلے کا؟“
”پتا نہیں۔“

”امی کو کچھ ہوگا تو نہیں؟“ مہرن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یامین نے اپنا ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر سے اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا اور تسلی دی۔ ”اوئے کچھ نہیں ہوتا تیری امی کو..... فٹ فاٹ ہے..... گھر میں جھاڑو برتن کر رہی ہوگی۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“
”تیرے سر کی قسم..... ہمارا پہلے جھوٹ بول رہا تھا، ورنہ تو گاڑی میں اتنی آسانی سے کیسے بیٹھتی۔“

مہرن ہڑبڑا گئی۔
”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”حیدر آباد۔“
”کیوں! وہ چوکی۔“

یامین نے گاڑی کی ونڈا سکرین پر سے نظر ہٹا کر ایک نظر اسے دیکھا اور اپنے سامنے لگے آئینے میں مہرن کے عکس کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تیری امی تو دودھ والے سے تیری شادی نہ کرتی پر یہ دودھ والا تجھ سے شادی ضرور کرے گا۔“

اب مہرن کو خطرے کا بھرپور احساس ہو چکا تھا۔
”مجھے واپس لے چلو۔“ وہ گڑگڑائی۔ ”اللہ کے واسطے۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”میری امی سچ سچ مرجائیں گی۔“

”کوئی نہیں مرتی تیری امی..... بے فکر رہ۔“
”خدا کے واسطے! نہیں کرو..... مجھے گھر لے چلو۔“

وہ روئے لگی۔

حرمائدہ

”چپ کر۔“ اس نے اپنی سیٹ کے نیچے ہاتھ کر کے پستول نکالا اور اس کا رخ مہرن کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ دیکھا ہے۔“
مہرن ڈر گئی۔

”زندہ رہنا ہے تو چپ کر کے بیٹھی رہ..... خبردار جو آواز نکالی۔“

مہرن سہم کر سمٹ گئی۔
یامین نے پستول دوبارہ سیٹ کی آڑ میں رکھ لیا اور بولا۔ ”وہ تیرا کنکلا پھوپھی زاد تجھے کیا دے گا..... میں تجھے رانی بنا کر رکھوں گا۔“

”امی مرجائیں گی میرے بغیر۔“
”تیرے بغیر میں مرجاؤں گا۔“

وہ سسکیاں بھرنے لگی۔
”چپ کرتی ہے یا نکالوں پھر پستول۔“

مہرن کی سسکیاں یک لخت ختم گئیں۔
☆☆☆

دوپہر کو پروین کے بچے اسکول سے گھر واپس لوٹے تو انہوں نے گھر کے دروازے پر ہی ماں کو خبر سنائی۔
”امی! حمیدہ خالہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔“

”کیسے؟“ پروین نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دہل کر کہا۔

”موٹر سائیکل سے۔“
”کب؟“

”صبح۔“
”تمہیں مہرن باجی نے بتایا؟“

”نہیں..... وہ تو دودھ والے یامین انکل کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اسپتال چلی گئی تھیں۔“

پروین نے حمیدہ سے اپنی ناراضگی ختم کر کے اس کی خیر خبر لینے کے لیے جانا ضروری سمجھا۔ اگر یامین گاڑی میں مہرن کو اپنے ساتھ اسپتال لے گیا تھا تو اس کا مطلب تھا حمیدہ زیادہ زخمی ہوئی تھی۔ لیکن حیرت تھی حمیدہ کی گلی سے کوئی نہیں آیا تھا اسے ایکسیڈنٹ کی خبر دینے حالانکہ سب جانتے تھے کہ وہ دونوں آپس میں رشتے دار تھیں۔ نعیم بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو کھانا کھانے گھر آیا تھا۔ اس نے بھی ایسی ویسی کوئی بات نہیں کی تھی۔

پروین بھگم بھاگ حمیدہ کے گھر پہنچی تو وہ بھلی چنگی گھر میں بیٹھی تھی!

☆☆☆

مہرن کا چھٹی کے بعد اسکول سے گھر واپس نہ آنا اور یامین کا اپنے گھر سے گاڑی سمیت غائب ہونا حملہ بھر کی ”گرم خبر“ بن گئی اور پروین کے بچوں کا بیان اس امر کی شہادت بن گیا کہ دودھ والا یامین مہرن کو اس کی ماں کے ایکسیڈنٹ کی خبر سنا کر اسے اپنے ساتھ بھگا کر لے گیا تھا۔ حمیدہ کو غش پر غش پڑ رہے تھے۔ خبر مہرن کی ہونے والی سسرال بھی جانچنی تھی اور جاوید نے تھانے میں مہرن کے اغوا کی رپورٹ بھی درج کر دادی تھی۔ اپنے پرائیوٹ میں بات پھیل چکی تھی۔

جاوید شدید صدمے میں تھا، یار، دوست، اہل محلہ، عزیز واقارب ہر ایک کی زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ ”کچھ پتا چلا؟“ مہرن کی بازیابی جاوید کے نزدیک موت اور زندگی کا مسئلہ بن گئی تھی۔

یامین کے گھر والے، اس کی بیوی اور سسرال والے بھی دم بخود تھے اور لوگوں سے منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔ نعیم کو نہایت بے شرمی اور ڈھٹائی سے حمیدہ کے گھر دوبارہ آمد و رفت کا موقع مل گیا تھا۔ حمیدہ اسے دیکھتی تو اس کا خون کھولنے لگتا مگر زبان سے اسے برا بھلا کہنے سے قاصر تھی۔

اخباروں میں خبر لگ گئی۔ اسکول میں ہلڑکی، ہرنچر، ہر ملازم کی زبان پر ایک ہی کلمہ تھا۔ ”مہر النساء اغوا ہو گئی۔“

”بے جاری غریب اور بیوہ ماں کی اکلوتی بیٹی تھی۔“ ”کبخت تھی بھی تو بہت خوب صورت۔“ ”شہزادی لگتی تھی۔“

جاوید کا ایک پاؤں گھر میں تھا، دوسرا تھانے میں اس کی جیب الگ خالی ہوئی جا رہی تھی۔ زینت اسے دیکھتی تو اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ صدمے سے جاوید کا چہرہ خنجر سا گیا تھا۔ اسے نہ کھانے پینے کا ہوش تھا، نہ اپنے کام پر جانے کا بس ایک ہی دھن تھی کہ کسی طرح مہرن کا پتا چل جائے۔ یہ جاوید کی عزت اور غیرت کا مسئلہ بھی تھا۔

☆☆☆

یامین گھر سے جیب بھر کر نکلا تھا۔ حیدر آباد پہنچ کر اس نے ایک ہوٹل میں کرا کر اے پر لیتے ہوئے مہرن کو اپنی بیوی ظاہر کیا۔ مہرن کو اس نے ڈرا دھمکا کر زبان بندی کر دی تھی۔

”کوئی پوچھے تو یہی بولنا ہے یہ میرا شو ہر ہے۔“ مہرن وحشت میں تھی۔ یہ کیا کیا تھا اس بد بخت نے اس کے ساتھ، ماں کے ایکسیڈنٹ کی جھوٹی خبر سنا کر اسے

متوحش کیا، گاڑی میں بٹھایا اور دوسرے شہر لے آیا اور اب کہہ رہا تھا کہ جو پوچھے وہ اسے اپنا شوہر بتائے۔ بار بار اس کا دھیان اپنے گھر اور ماں کی طرف جاتا۔ ”امی تو مر جائیں گی۔“ وہ دل گرفتہ ہو کر سوچتی۔

یامین اس سے کھلونے کی طرح کھیل رہا تھا اور اسے کھلی آنکھوں سے خواب دکھا رہا تھا۔

”میں تیرے سے شادی کر کے تجھے دینی لے جاؤں گا۔۔۔۔۔ ادھر میرا سگا ماموں رہتا ہے۔ مچھلیوں کا دھندا کرتا ہے۔۔۔۔۔ تو اور میں ادھر ہی رہیں گے۔“

مگر اس کی شادی تو جاوید سے ہونا تھی۔ اسے بار بار جاوید کا خیال آتا۔ سادہ اور شریف، پانچ وقت نماز کی پابندی نے اس کے چہرے کو کیسی جلا بخش رکھی تھی۔ بات کرتا تو نظریں نیچی کر کے اور نہایت تمیز سے۔۔۔۔۔ اور ایک یہ یامین تھا۔ گورا چٹا اور کسرتی ہونے کے باوجود چہرے پر پھنکار، گفتگو عامیانہ اور انداز و اطوار میں لفنگا پن! بہانے بہانے وہ اسے جاوید کا حوالہ دے کر چھیڑتا۔ ”تیرے اس پھوپھڑ زاد کا کیا ہوگا مہر؟“

وہ بنجرے میں بند پرندے کی طرح دل پھڑ پھڑا کر رہ جاتی۔

تین چار دن میں یامین نے اسے کھلانے پلانے، کھانے پھرانے اور شاپنگ کروانے پر ہزاروں روپے خرچ کر دیے۔ ”تیرا وہ کنگلا پھوپھی کا بیٹا تجھے اتنا عیش کرا سکتا تھا۔“ وہ جتنا مہرن کو اپنا دل ان آسائشوں سے اچاٹ محسوس ہوتا۔

☆☆☆

حمیدہ تین چار دن میں ادھ موٹی ہو گئی۔ ایک تو بیٹی کے جانے کا صدمہ اوپر سے پوچھنے والوں نے جان کھائی ہوئی تھی جو آتا ایک ہی سوال کرتا۔ ”کچھ پتا چلا؟“ حمیدہ نڈھال پڑی رہتی۔ ہر آہٹ پر چونکتی۔ دروازے پر دستک سن کر لپکتی کہ شاید مہرن آگئی ہو شاید اس کا کچھ اتا پتا چل گیا ہو۔۔۔۔۔ ہمسائیاں حمیدہ کی ہمدردی کو اس کے پیاس آ کر ٹیٹھٹیں تو اپنی اپنی بولنے لگتیں۔ حمیدہ بے بسی کی تصویر بنی سنے جاتی۔

جاوید اپنا کام چھوڑ کر سودائی بنا مہرن کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ بھی یہاں، بھی وہاں، بھی پولیس اسٹیشن کا چکر لگاتا بھی یامین کے باڑے جا کر غراتا۔ ”اس کیسے کا کچھ پتا چلا؟“

زینت نے کہا۔ ”تو کیوں باؤلا ہوا پھر رہا ہے۔ اب وہ واپس بھی آئی تو ہمارے کس کام کی۔ ذرا تو اپنی حالت تو

درمندانہ

دیکھ، مجھے تو تیری آنکھوں کے حلقوں سے ڈر لگ رہا ہے۔“ ”مجھے بس یہ پتا چل جائے کہ وہ مکینہ اسے اغوا کر کے لے گیا ہے یا مہرن کی اپنی بھی کچھ مرضی تھی۔“ ”یا۔۔۔۔۔ پتا چل جائے تو، تو کیا کرے گا، مہرن کی اپنی مرضی تھی یا نہیں ہمارے گھر آنے کے لائق تو وہ اب نہیں رہی۔“

”اس کتے کو قتل کر دوں گا میں۔“

جاوید کے تیوروں نے زینت کو ہولا دیا۔ ”نہ میرا بیٹا نہ۔۔۔۔۔ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا۔۔۔۔۔ وہ منحوس تو اپنی جان سے جائے گا میرا ٹھکانا کہاں ہوگا میرے لعل۔“

”بزدلوں کی سی باتیں مت کرو اماں۔۔۔۔۔ عزت گئی ہے ہماری۔۔۔۔۔ گھر سے باہر نکلتا ہوں تو لوگوں سے نظریں ملانا مشکل ہوتا ہے۔۔۔۔۔ کل رات کو نکلا ہوں تو پیچھے سے آواز آئی ابے! یہ ہے جس کی منگیتر کو دودھ والا بھگا کر لے گیا۔۔۔۔۔ بدنام تو میں بھی ہو رہا ہوں نا۔۔۔۔۔ شرمندگی مجھے بھی اٹھانی پڑ رہی ہے۔“

”کہہ دے بولنے والوں سے۔۔۔۔۔ منگیتر تھی مگر اب نہیں۔۔۔۔۔ مجھ سے تو اپنا پرایا جو پوچھ رہا ہے میں یہی کہہ رہی ہوں منگنی ختم۔“

”دیکھو اماں۔“ جاوید انگلی کھڑی کرتے ہوئے جتانے والے انداز میں بولا۔ ”اگر دونوں کی مرضی تھی تو منگنی نہیں دونوں ختم لیکن اگر وہ مہرن کو زبردستی بھگا کر لے گیا ہے تو منگنی ختم نہیں ہوگی، وہ ختم ہوگا۔“

”لوگ کیا کہیں گے۔۔۔۔۔ گند انہوں نے اپنے سر پر اٹھالیا۔“ ”لوگوں کی پروا مت کرو۔۔۔۔۔ بکواس کرنے دو انہیں۔۔۔۔۔

ہم یہ شہر ہی چھوڑ دیں گے۔“

”کہاں جائے گا۔“

”جہاں اللہ لے جائے۔“

”پاگل ہو گیا ہے تو۔“ زینت نے بیٹے پر آنکھیں نکالیں۔

”اماں تمہارے مرحوم بھائی کی بیٹی ہے وہ۔“

”ہوا کرے۔۔۔۔۔ اپنی عزت سے بڑھ کر مجھے کوئی بھی نہیں۔“

”میں بھی؟“

زینت کی آنکھوں میں متا کا احساس ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ ”ماں صدقے! تو، تو میری جان ہے۔“

☆☆☆

بجلی اور پلمبری کا کام جاننے کی وجہ سے جاوید کی اپنی کمپنی کے چند بڑے افسروں کے گھروں تک رسائی تھی۔ ان کے ذریعے جاوید نے مہرن کی بازیابی کے لیے متعلقہ

اہلکاروں پر دباؤ ڈلوایا۔ پولیس تلاش کرنے پر آئے تو مردوں کو قبروں سے کھوج نکالتی ہے۔ مہرن اور یامین بھی پکڑے گئے۔ مہرن کو یامین نے دباؤ میں لے رکھا تھا کہ اگر برا وقت آجائے تو اسے پولیس کو یہی بیان دینا ہوگا کہ وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ بھاگی تھی۔

تفتیش کے لیے پولیس نے یامین کا ریمانڈ حاصل کر لیا اور مہرن کو دارالامان بھجوانے کا حکم ہوا۔

عدالتی حکم نامے کے باوجود تھانے والوں نے مختلف موٹو گاڑیاں کھڑی کر کے مہرن کو اسی دن دارالامان بھجوانے کے بجائے رات کو تھانے ہی میں رکھا اور اس رات مہرن پر ایک نہیں کئی بار قیامت ٹوٹی۔

”اب تو تجھے پتا چل گیا نا کہ مہرن کی اپنی مرضی بھی تھی۔“ زینت نے بیٹے سے کہا۔

”اس سے زبردستی بیان دلوا یا گیا ہوگا اماں۔“ زینت سر پکڑ کر رہ گئی۔ جاوید کا دل مہرن کی طرف سے کیوں نہیں ہٹ رہا تھا!

☆☆☆

دارالامان کوئی دل خوش کن جگہ نہیں تھی۔ سناٹوں میں ڈوبی عمارت، اندر محبوس سی فضا، عمارت میں مقیم عورتوں کے اداس چہرے، ہر عمر کی عورتیں، خود مہرن کی عمر کی دولڑکیوں کے علاوہ وہاں دس گیارہ برس کی ایک لڑکی بھی موجود تھی جو اپنے سنگے باپ کی درندگی کا شکار ہونے کے بعد عدالت کے حکم پر وہاں مقیم تھی۔ بعض عورتوں کے ساتھ ان کے چھوٹے بچے بھی موجود تھے۔

دارالامان میں مقیم ہر عورت کی ایک کہانی تھی۔ اکثر مردوں کی ستائی ہوئی عورتیں، چند ایسی بھی تھیں جن کی آنکھیں بولتی تھیں۔

سرکاری ادارہ ہونے اور خطیر فنڈز کی فراہمی کے باوجود دارالامان میں مقیم عورتوں کو بنیادی سہولتیں بھی میسر نہ تھیں۔ وہ قید خانے کی طرح ادارے کی عمارت میں محبوس رہتیں اور ان کی نگرانی مجرموں کی طرح کی جاتی۔ بیماری کی صورت میں ایک رفاہی ادارے سے بھجوائی جانے والی دوائیں دے دی جاتیں یا پھر بیمار ہونے والی عورتوں کو اپنی جیب سے دوائیں منگوائی پڑتیں۔ ادارے میں مقیم عورتوں اور لڑکیوں کو صرف اپنے والدین، شوہر یا سرپرستوں سے ملنے کی اجازت ہوتی۔۔۔۔۔ تاہم نہ جانے کس اختیار کے تحت ایک اخبار کے نمائندے کو ادارے میں مقیم خواتین سے ملنے، ان کی کہانیاں سننے اور دارالامان میں ان کے قیام کا

حوالہ دیے بغیر ان عورتوں کی بیان کردہ کہانیوں کو اخبار میں چھاپنے کی اجازت تھی۔

مہرن اپنی غیر معمولی خوب صورتی کے باعث دارالامان میں آتے ہی ادارے سے متعلق ہر مرد و زن کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ لڑکیاں اور عورتیں اس سے اس کے دارالامان پہنچنے کی داستان سننے کی متقاضی ہوتیں۔ مہرن انہیں اپنی داستان کا فقط وہ حصہ توڑ مروڑ کر سناتی جو خود اس سے اور یامین سے متعلق تھا۔

لیکن مذکورہ اخباری نمائندے نے تو نہایت زیر کی سے اس کی داستان کے اگلے پچھلے تمام اوراق ہی کھنگال ڈالے۔ دارالامان آنے سے نکل تھانے میں اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامتوں تک مہرن نے اخباری نمائندے کو بھی کچھ تو بتا دیا!

مستطیل حاشیہ کے بیچ اس کی دلکش تصویر کے ساتھ ”مہرن کی کہانی“ کے عنوان سے اس کی کہانی قسط وار اخبار میں شائع ہونا شروع ہوئی تو سب سے پہلے اس کے چچا نے اپنے آپ سے منہ چھپایا۔

پھوپھی کو بھی غصہ آیا کہ مہرن اس کے واحد زندہ بھائی پر ایسی گھناؤنی الزام تراشی کر رہی تھی۔

”مجھے پتا ہوتا کہ میرے بھائی کی اولاد ایسی ذلیل، کمینہ ہوگی تو اس سے اپنے بیٹے کی منگنی تو دور کی بات میں اس کا نام اپنے بچے کے نام کے ساتھ کبھی نہ آنے دیتی۔“ پھوپھی نے کہا۔

”منہ دکھانے کا نہیں چھوڑا ہے اس نے مجھے۔“ چچا نے کہا۔

”تم نے بھلی پروا کی۔ وہ کمینہ خود کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہے بھلا۔“ پھوپھی نے کہا۔

مہرن کے اسکول کی اکثر استائیاں بھی ”مہرن کی کہانی“ کی اقساط بڑے ذوق و شوق سے پڑھ رہی تھیں۔ مہرن کی ہم مکتب ساتھیاں اور ان کے اہل خانہ بھی اس داستان کو نہایت شوق اور حیرت سے پڑھ رہے تھے۔ داستان میں اسکول کے پی ٹی ماسٹر کا تذکرہ چھڑا تو پی ٹی ماسٹر کے کردار سے آگاہ ٹیچرز اور مہرن کی ہم مکتب طالبات کو داستان کی سابقہ اقساط میں مہرن کے بیانات پر بھی یقین آنے لگا۔

”نعیم خالو“ کا باب واہو تو نعیم نہایت بھنایا ہوا حمیدہ کے گھر پہنچا۔ حمیدہ صدے سے نڈھال ایک بھلکی چارپائی پر نیم مردہ سی پڑی کرا رہی تھی۔

”دیکھا تم نے اپنی لاڈلی کو..... پہلے سگے چچا کے چیتھڑے نکھیرے اب مجھے بدنام کر رہی ہے..... لاحول ولا قوۃ۔ میں تو اپنی بیٹیوں کی طرح اس کی قدر کرتا تھا۔“

صدے سے نڈھال، بے اوسان حمیدہ بھوکی شیرنی کی طرح اٹھ بیٹھی اور نعیم کو زہرناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے نہایت حقارت سے بولی۔ ”شیطان، مردود تو بیٹیوں کی قدر کیا جانے..... کتے، دیوٹ میری معصوم یتیم بچی پر ہاتھ ڈالنے والا تو تو بھی ہے..... کینے نکل جا میرے گھر سے ورنہ جیج جیج کر محلے والوں کو تیری اصلیت بتا دوں گی۔“

”تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا حمیدہ آپا۔“ نعیم ڈھٹائی سے بولا۔

”مت لے اپنی ناپاک زبان سے میرا نام..... دفع ہو جا..... مجھے اپنی منحوس شکل نہ دکھانا کبھی..... میں تیرا فیصلہ اپنے اللہ پر چھوڑتی ہوں۔ یاد رکھنا جو تو نے کیا ضرور بھگتے گا۔“

نعیم منہ چھپاتا حمیدہ کے گھر سے بھاگا۔

”مہرن کی کہانی“ کی چار اقساط مہرن کی زندگی میں خالو کے مکروہ کردار پر مبنی رہیں اور کہانی نگار نے نہایت دردمند انداز میں لکھا۔ ”والدین احتیاط رکھیں کہ ان کے بچوں کی زندگی کسی ایسے رشتے دار کے ہاتھوں بھی روندی جاسکتی ہے جو دن کے اجالے اور عام زندگی میں بے حد شریف، معزز، پاک پوتر دکھائی دیتا ہو۔“

نعیم محلے کے بازار میں بیٹھ کر نہایت ڈھٹائی اور مکاری سے مہرن کے بیانات اور کہانی نگار کی خیال آرائیوں کو نرا جھوٹ قرار دے کر مہرن کو منہ بھر بھر گالیاں دیتا رہا۔

”پچی ہے حرامزادی..... زمانے بھر کی چھٹی ہوئی..... بھاگی اپنے یار کے ساتھ اور رسوا مجھ جیسے شریفوں کو کر رہی ہے..... جس بے حیائے سگے چچا کو نہ چھوڑا وہ کس کو بخشے گی بھلا..... تو بتو بہ!“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتا۔ ”ایسی آفت کی پرکالاؤں سے اللہ ہر شریف آدمی کی عزت محفوظ رکھے۔“

”مہرن کی کہانی“ میں خالو کے کردار پر حمیدہ کے علاوہ کوئی اور یقین کرتا یا نہ کرتا پروین کو پورا یقین تھا۔ عید کی رات مہرن کے اپنے گھر میں بچپوں کے ساتھ سوئی ہونے اور صبح سویرے بیدار ہونے پر مہرن کے اپنے گھر جاکھنے اور عید کی شام حمیدہ کی بے رخی اور مہرن کے سامنے نہ آنے کی کڑیاں ملاتے ہوئے وہ ”مہرن کی کہانی“ کے اس حصے کو آ منا صدقاً جان رہی تھی۔ اپنے شوہر کے کردار کو اس سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔ وہ تو ایسا خبیث تھا کہ جب اس نے

درماندہ

”مہرن کی کہانی“ کے اس حصے کی اس سے تصدیق چاہی تو وہ سینہ تان کر بے خونی سے بولا۔ ”ہاں..... قصور اس کی ماں کا تھا نا کیوں بھیجتی تھی وہ جوان لڑکی کو اکیلی تیرے گھر۔“

”خالہ تھی میں اس کی..... انہیں اعتبار تھا مجھ پر۔“

وہ نہایت واہیات انداز میں ہنس دیا اور پروین خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ کیسے دیوٹ مرد سے مقدر پھوٹا تھا اس کا۔ بچوں کی وجہ سے مجبور اور بے بس نہ ہوتی تو اس کے منہ پر تھوک کر نکل جاتی اس کی زندگی سے۔

تھانے میں گزری مہرن کی رات کی کٹھا کہانی نگار نے اپنے ذاتی تحفظ کے خدشات کے پیش نظر قدرے احتیاط سے قلمبند کی۔

آخری قسط میں مہرن نے ایسا انکشاف کیا جو حمیدہ کو زندگی کی قید و بند سے آزاد کرنے کے لیے ایک مہلک صدمہ ثابت ہوا۔ مہرن کے حاملہ ہونے کی خبر سن کر حمیدہ کا دل ساکت ہو گیا۔

دارالامان کی انتظامیہ نے قانونی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماں کی تدفین میں مہرن کی شرکت کا بندوبست کیا۔ سارا علاقہ مہرن کی ایک جھلک دیکھنے کو اٹھ آیا۔

”کیا اب بھی تو اس کے منہ پر نہیں تھو کے گا۔“ زینت نے بیٹے سے کہا۔

جاوید چپ رہا۔ وہ سارے الفاظ جن سے وہ ماں کے سامنے مہرن کا دفاع کیا کرتا تھا، کہیں گم ہو گئے تھے!

☆☆☆

سلاخوں کے پیچھے یامین کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ کہاں کی مہرن اور کہاں اس سے شادی کے وعدے وعید۔ گلے پڑی مصیبت سے گردن چھڑانے اور سلاخوں کی پابندی سے جھٹکارے کو اس نے باپ کے پاؤں پکڑ لیے۔ بھائی کی ٹھوڑی میں ہاتھ ڈالا، واسطے دیے، اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ سسرال والوں سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ مہرن کی طرف دوبارہ کبھی پلٹ کر بھی نہ دیکھنے کی یقین دہانی کرائی۔ مہرن کی کوکھ میں پلتے بچے کی ذمہ داری لینے سے منکر ہوا۔ غرض اپنی گلو خلاصی کے لیے اس نے ساری تدبیریں آزمائیں۔ باپ بھی کھاتی پیتی اسامی تھا، سسرال بھی خوش حال، باپ نے بیٹے کی خاطر اور سسر نے بیٹی کے منہ کو دیکھتے ہوئے پانی کی طرح پیسا بہایا اور یامین کی گلو خلاصی کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ بالآخر خمد یامین سلاخوں کے پیچھے سے باہر نکل آیا۔

مہرن کو عدالت نے اس کے سر پرستوں کے حوالے

کرنے کا حکم جاری کیا۔ ماں مر چکی تھی، جاوید اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا۔ پھوپھی نے دیکھا تو منہ پھیر لیا۔ بیٹے کو ڈانٹا پھٹکارا کہ اس ناشدنی کو اپنے گھر کیوں لے آیا۔ مہرن مجرم بنی سر جھکائے کھڑی تھی، پھوپھی کے گھر والوں نے بے نقط سنائیں۔ اپنے پرانے مہرن کو دیکھنے کے لیے پھوپھی کے گھریوں امداد آئے جیسے کوئی عجوبہ دیکھنے آئے ہوں۔

پھوپھی نے جاوید سے کہا۔ ”تو دنیا کو ہنسانے کے لیے اسے اپنے گھر کیوں لے آیا؟“

جاوید چپ رہا۔

”ایسیوں کی جگہ کوٹھوں پر ہوتی ہے۔ شریفوں کے گھروں میں نہیں۔“ بھی ٹارواری ہونے اور جھولی بھر بھر دعا کیں دینے والی پھوپھی کے یہ الفاظ مہرن کا دل چیر دینے کو کافی تھے۔

”کھانا تو دے دوا سے۔“ جاوید نے کہا۔

”زہر نہ دے دوں۔“ پھوپھی بولی۔

کھانا دیا بھی تو ایسے جیسے فقیروں کو دیا جاتا ہے۔ دوپہر سے شام تک مہرن ایک کونے میں منہ دیے بیٹھی رہی۔ ماں کی یاد اسے بری طرح ستا رہی تھی۔ وہ زندہ ہوتی تو شاید آج بھی اسے اپنی مہربان بانہوں میں سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیتی۔

رات ہوئی تو پھوپھی نے گھر کے چھوٹے کوٹھڑی نما کمرے میں دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”یہاں مرا ور صبح کسی آنے جانے والے کو اپنی منحوس صورت نہ دکھانا۔“ پھر بڑبڑاتی ہوئی پلٹی۔ ”اس کمبخت جاوید نے تماشا بنا دیا ہمیں..... اللہ جانے کیوں گند کی اس پوٹ کو اپنے گھراٹھا لایا۔“

مہرن خود حیران تھی کہ جاوید اسے اپنے گھر کیوں لے آیا تھا..... ایک موہوم سی امید اندھیروں میں ڈوبتے اس کے دل کو دھیمی سی روشنی دیتی۔ شاید..... شاید جاوید اس سے اب بھی محبت کرتا ہو..... اسے اب بھی اپنا لے..... اس کی کوکھ میں پلتے اس نا جائز وجود کو گوارا کر لے جس کے باپ کے بارے میں وہ خود بھی کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کہ کون تھا..... یامین..... یا پھر تھانے میں اس پر ٹوٹی قیامتوں میں سے کوئی! جاوید اس کی واحد اور آخری امید بن گیا تھا۔

کوٹھڑی کے فرش پر پڑے بد نما گدیلے پر پڑ کر مہرن یوں سو گئی جیسے طویل مسافت طے کر کے آئی ہو۔ رات نہ جانے کس پہر اس کی آنکھ کمرے کے بند دروازے پر ملکی سی ٹھٹھٹھاٹھ سے کھلی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ پہلے تو اس نے ٹھٹھٹھاٹھ ہی کو اپنی سماعت کے وہم پر محمول کیا لیکن جب دوبارہ ویسی ہی

پہلے اور بعد

شادی سے پہلے لڑکے کے بیڈروم میں پرفیوم، محبت نامہ، ہر نیٹ ورک کی سم، سی ڈی پلیئر، انٹر فریشز، سرہانے کے نیچے شاعری کی کتابیں رسالے، ڈائریاں، ناول وغیرہ۔

شادی کے بعد ڈسپین، جوشاندہ، قرضے کی درخواست، بجلی ٹیلی فون کے بل، اسپتال کا چھلکا، دوروز دیک کی عینکیں، میڈیکل رپورٹس، خالی ہوا۔

اور سرہانے کے نیچے کتاب ”موت کا منظر“

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بل ہزارہ)

دس فیصد

عدالت نے فیصلہ دیا کہ 90 فیصد سردار بے وقوف ہوتے ہیں۔ سرداروں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ جلسے، جلوس، ہڑتالیں، مظاہرے، شور شرابا..... عدالت نے دوبارہ فیصلہ سنایا کہ 10 فیصد سردار بے وقوف نہیں ہوتے، تب کہیں جا کر سرداروں کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

دفعہ کرو

پوری چھینک کا مطلب ہے کہ کسی نے آپ کو یاد کیا اور اگر چھینک راستے میں رک جائے تو اس کا مطلب ہے کہ کسی کو آپ کی یاد تو آئی مگر اسے دفع کرو کہہ کر ٹال دیا۔

جنت

جو بیویاں شوہروں سے ڈرتی ہیں، خدمت کرتی ہیں، وہ جنت میں جائیں گی اور جو ایسا نہیں کرتیں تو..... ان کی جنت دنیا میں ہی ہے۔

کامیابی

ماں کے پاؤں تلے جنت ہے اور باپ کے قدموں تلے چڑے کا وڈا چھتر جس کا بروقت استعمال آپ کی کامیابی اور کامرانی کی ضمانت ہے۔

(مرسلہ: جاوید اختر۔ پاکپتن شریف)

اس نے کہا۔

”آپ کو کہاں جانا ہے؟“ مہرن نے مردہ سی آواز میں پوچھا۔

اس نے اپنی منزل کا پتا بتایا۔

”اور آپ؟“

”پتا نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی تو مہرن رونے لگی۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“

”مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔“ عورت

نے اس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”کوئی ایسی جگہ ہے جہاں میں عزت سے رات گزار سکوں۔“

”گھر سے بھاگی ہو؟“

”نہیں۔“

”پھر؟“

”گھر گم ہو گیا ہے۔“

”گھر گم ہو گیا؟“ عورت نے اس کے الفاظ قدرے

تعجب سے دہرائے۔

”حیرت ہے!“

وہ چپ رہی۔ عورت نے اسے ان رفاہی اداروں کے نام بتانا شروع کیے جہاں بے سہارا عورتوں کو پناہ دی جاتی تھی۔

”نزدیک کوئی ہے؟“ مہرن نے پوچھا۔

”ہاں ہے نا..... روڈ کر اس کرو..... بائیں جانب چلتی جاؤ..... کوئی بیس پچیس منٹ کی واک کے بعد تمہیں ایک بورڈ لگا نظر آئے گا..... اس پر ادارے کا نام موجود ہوگا اور نیچے لکھا ہوگا..... بے سہارا عورتوں کی پناہ گاہ۔“

”شکریہ..... بہت بہت شکریہ۔“ مہرن کو امید کی کرن دکھائی دی۔ وہ ابھی اور اس نے اس عورت کے بتائے ہوئے راستے پر تیز تیز قدم بڑھانے شروع کر دیے۔ شام کے گلجے سائے میں وہ مذکورہ ادارے جا پہنچی۔ خوش قسمتی سے ادارے کی کرتا دھرتا خاتون ابھی اپنے آفس ہی میں موجود تھیں۔ انہیں پناہ کی تلاش میں آنے والی لڑکی کی اطلاع بہم پہنچائی گئی۔ انہوں نے مہرن کو اپنے آفس میں بلا لیا۔ جذباتی طور پر مہرن اس وقت بالکل ٹوٹی ہوئی تھی۔

”کہاں سے آئی ہو؟“ اس کے سامنے ریوا لونگ

جاوید اس کے نزدیک جا کھڑا ہوا۔ کہنی کے بل اپنے بائیں پہلو پر بڑی مہرن نے اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھا۔

جاوید نے بڑی حقارت سے اس کے وجود کو اپنے پاؤں سے ٹھوکر ماری اور بولا۔ ”غلطی تیری ہو یا نہ ہو، تو اب میرے قابل نہیں رہی..... بلکہ کسی بھی شریف آدمی کے!“

”آخ تھو“ کر کے اس نے فرش پر تھوکا اور مہرن کو فرش پر پڑا چھوڑ کر کمرے سے چلا گیا۔ مہرن کو یوں لگا جیسے وہ اس کے منہ پر تھوک گیا تھا۔

جتنی ذلت مہرن کو اس کے ”آخ تھو“ کرنے سے محسوس ہوئی تھی اتنی ذلت تو اس نے پرے مردوں کے ہاتھوں اپنی بے حرمتی پر بھی محسوس نہیں کی تھی۔

یہ کیسا انصاف تھا۔ غلطی دوسروں کی تھی اور جاوید سزا اسے سنا گیا تھا۔

دارالامان میں مقیم عورتیں جب ایک دوسرے کو اپنی پتا سناتے بیٹھتیں تو نوری نامی ایک عورت اکثر کہتی۔ ”یہ مردوں کی دنیا ہے۔ ہم عورتوں کو اپنے حصے کی ہی نہیں مردوں کے حصے کی سزا بھی بھگتنی پڑ جاتی ہے۔“

نوری کی بات کا پورا مطلب آج مہرن کی سمجھ میں آیا۔

نوری بڑی سیاتی اور زمانہ شناس عورت تھی۔ اسی نے

ایک دفعہ کہا تھا۔ ”عورت سو پرے مردوں کے ہاتھوں اپنی

ذلت پر اتنا دکھ نہیں محسوس کرتی جتنا ایک شریف مرد کی طرف

سے ٹھکرائے جانے پر۔“

نوری کی اس بات کا مطلب بھی مہرن کو آج ہی سمجھ آیا۔

نوری کہا کرتی تھی۔ ”اچھا مرد عورت سے یا تو محبت

کرتا ہے یا نفرت۔“ جاوید، اس سے اپنی نفرت کا اظہار

کر کے جا چکا تھا۔ اب اس کے گھر میں ٹھہرے رہنے کا کیا

جواز تھا مہرن کے پاس!

☆☆☆

صبح منہ اندھیرے وہ دبے پاؤں پھوپھی کے گھر سے

نکل کھڑی ہوئی۔ وہ کہاں جا رہی تھی، کیوں جا رہی تھی

اسے کچھ علم نہ تھا۔ منزل کھو گئی تھی۔ اسے نہ جانے کب تک

بھٹکتا تھا۔ گھنٹوں وہ پیدل ہی سڑکوں پر ماری ماری پھرتی

رہی۔ بھوک الگ ستارہ تھی، یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ دن

ڈھل گیا تو رات کہاں بسر کرے گی۔ اس بے سائبانی سے

تو دارالامان ہی بہتر تھا۔ پریشان حال ایک بس اسٹاپ پر

شیڈ تلے بیٹھی تھی کہ ایک نوجوان خاتون بیگ ہاتھ میں

لٹکائے اس کے ساتھ آ بیٹھی اور اس نے از خود ہی اس سے

بات شروع کر دی۔ ”بس یہاں بہت دیر سے آتی ہے۔“

ہلکی سی کھٹکناٹھ ہوئی تو وہ کھڑی ہو گئی۔

دروازے سے کان لگا کر اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”کون؟“

”میں!“ جواب آیا۔ اس آواز کو تو وہ لاکھوں، کروڑوں آوازوں کے شور میں پہچان سکتی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آ گیا اور اس نے دروازے کی چٹختی چڑھادی۔ مہرن کا دل یکبارگی دھڑکا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھا۔ مہرن اگلے قدموں پیچھے ہٹی۔ وہ سرعت سے اس کی طرف لپکا اور اس نے پوری قوت سے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔ مہرن کے منہ سے سسکاری نکلی اور اس کے دل میں پھیلی مدھم سی روشنی

یکا یک گھپ اندھیروں میں ڈوب گئی۔

”چپ..... بالکل خاموش..... ذرا آواز نہیں۔“

جاوید نے اپنے ہونٹوں پر انگلی دھرتے ہوئے اسے آنکھیں دکھائیں اور اپنا ہاتھ اس کے سر کے پیچھے لے جا کر اس کی چٹیا نہایت شدت سے اپنے ہاتھ میں جکڑ لی۔ بال کھینچنے سے

مہرن کے منہ سے پھر سسکاری نکلی۔

”میں نے کہا نا آواز نہیں۔“ جاوید دانت پیستے

ہوئے غرایا۔

”تکلیف ہو رہی ہے۔“ مہرن رونے لگی۔

”اور تو نے جو تکلیف پہنچائی ہم سب کو..... اخباروں

میں خاندان کو تنگ کر کے۔“ جاوید نے اس کی چٹیا کو بل

دے کر بالوں کو زور سے کھینچا۔

”مرگئی!“ مہرن شدت تکلیف سے بلبلائی۔

”ابھی کہاں!“ جاوید نے اسے حقارت سے دیکھا۔

”معاف کر دو۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑائی۔

”اتنی آسانی سے۔“

”میری غلطی نہیں تھی۔“

”جس کی بھی تھی..... سزا تجھی کو بھگتنا ہوگی۔“ اس نے

نہایت درشتی سے کہا۔

وہ رونے لگی۔

جاوید اس کی چٹیا کو دوبار لے کر اس کا چہرہ اپنے

چہرے کے اتنے نزدیک لے آیا کہ ان کی پیشانیاں ایک

دوسرے سے مس کرنے لگیں۔ وہ اس کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا، کچھ دیر وہ اسی طرح کھڑا رہا۔

مہرن کا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ یکا یک جاوید نے

اسے زور سے دھکا دیتے ہوئے اس کی چٹیا چھوڑ دی وہ

دیوار سے ٹکرائی اور اپنے بائیں پہلو پر فرش پر جا گری۔

چیز پر بیٹھی پروقاری خاتون نے پوچھا۔

وہ بلک بلک رونے لگی۔ آنسوؤں کا سیلاب تھا تو اس نے اپنی داستان سنانا شروع کی۔ خاتون کے دفتر کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ مہرن کو ادارے میں پناہ مل گئی۔

مہرن کو اٹھارہ سال کی ہونے میں ابھی ڈیڑھ ماہ باقی تھا کہ اسی رفاہی ادارے میں پناہ کی زندگی گزارتے ایک بچہ اس کی گود میں آ گیا۔

”اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔“ ادارے کی کرتادھر تا خاتون نے چند ماہ بعد کہا۔

”نہیں میڈم..... میں شادی نہیں کروں گی۔“ اس نے صاف انکار۔

”کیوں؟“

”بس۔“

”زندگی ایسے کب تک گزارو گی مہر النساء..... ساری زندگی تو تم یہاں نہیں رہ سکتیں..... تم جوان ہو، خوب صورت ہو..... تمہارا اپنا گھر اور زندگی کا ساکھی ہونا چاہیے۔“

”مرد سب ایک جیسے ہوتے ہیں میڈم۔“ مہرن اب سیانی عورتوں کی سی باتیں کرنے لگی تھی۔

”ہاں“ میڈم کی حس مزاح پھڑکی۔ ”مرد واقعی سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ دو کان، دو آنکھیں، دو ہاتھ، دو پاؤں، ایک ناک، ایک منہ۔“

”مرد سب خراب ہوتے ہیں۔“ مہرن ان کے مذاق سے ذرا محظوظ نہ ہوئی۔

”ایسا نہیں ہے مہر النساء۔“ اسے سنجیدہ دیکھ کر میڈم نے بھی سنجیدگی اختیار کر لی۔

”دنیا میں اچھے، برے ہر طرح کے مرد ہوتے ہیں اور یہی حال عورتوں کا بھی ہے..... تمہیں پتا ہے میرے پاس آنے والی سبھی عورتیں مظلوم نہیں ہوتیں، بعض نے..... صرف لبادہ اوڑھ رکھا ہوتا ہے مظلومیت کا..... اندر سے پوری ہوتی ہیں.....

یہی حال مردوں کا ہے..... یہ آپ کی قسمت ہے کہ آپ کا واسطہ کیسے مرد سے پڑتا ہے..... یقین کرو مجھے تو زندگی میں سبھی مرد بہت اچھے ملے..... میرے دادا، والد، بھائی، شوہر، بیٹا، داماد اور

اس ادارے کو آگے بڑھانے میں ساتھ دینے والے میرے رفقاء کار..... میری ساری قوت انہی مردوں کے دم سے ہے..... میں اپنی تمام کامیابی کا کریڈٹ انہی کو دیتی ہوں۔“

”آپ کی قسمت اچھی ہے میڈم۔“

”تمہاری بھی ہو سکتی ہے۔“

”اب کیا ہوگی..... اب تو بگڑ گئی۔“ اس نے دل

گرفتگی سے کہا۔

”انسان کو کبھی بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ حالات سے ہارنے کے بجائے زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے..... ہمارے ارد گرد بے شمار ایسی لڑکیاں ہیں جنہوں نے مخالف حالات سے لڑ کر نہ صرف اپنی بلکہ اپنے ارد گرد موجود لوگوں کی زندگی بھی بہتر بنائی..... خیر ہم تمہاری شادی کی بات کر رہے تھے۔“

”میڈم! کون کرے گا مجھ سے شادی..... ایک ایسے بچے کی ماں سے جس کے باپ کا بھی پتا نہیں۔“ حالات کی تپاخیزی مہرن کے لہجے میں درآئی تھی۔

”ساجد کے بارے میں کیا کہتی ہو؟“

”ساجد!“ مہرن نے چونک کر میڈم کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... ہمارا ڈرائیور..... بیوی اس کی فوت ہو چکی، بچہ کوئی ہے نہیں۔“

”لیکن میڈم.....“

”ہاں بولو..... رک کیوں گئیں؟“

”وہ تو کافی عمر کا ہے۔“

”اڑتیس سال کا ہے۔“

”کالا بھی بہت ہے۔“

میڈم نے ایک گہری سانس کھینچی پھر اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”تمہارے اعتراضات بجا ہیں مہر النساء لیکن..... کبھی کبھی ہم انتخاب کا حق کھودیتے ہیں..... ہمیں صرف سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ ساجد کی اور تمہاری عمر میں فرق کا احساس ہے مجھے..... اس کا رنگ بھی کالا ہے مگر اس کی شرافت کی ضمانت دے سکتی ہوں میں تمہیں، بارہ سال سے ہمارے ادارے میں ملازم ہے بھی

اس سے کوئی ایسی ویسی شکایت نہیں ہوئی۔“

”سخت مزاج بھی لگتا ہے۔“

میڈم دھیرے سے مسکرائیں۔ ”مرد کا سخت مزاج اگر وہ بے رحمی اور بدتمیزی تک نہ جائے تو گھر کا نظام صحیح چلنے کے لیے اچھا ہے۔“

”اس کا کیا ہوگا؟“ مہرن نے اپنی گود میں لیٹے بچے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

”مجھے یقین ہے ساجد اسے اپنائے گا اور اگر اسے اعتراض ہو تو تمہارا بیٹا اس ادارے کا بیٹا بن کر رہے گا..... ہم اسے پڑھا لکھا کر ایک اچھا انسان بنائیں گے۔“

”اچھا مرد بھی میڈم..... اور اسے عورت کی عزت کرنا ضرور سکھائیے گا۔“

درماندہ

میڈم کا ہاتھ مہرن کے شانے پر جا ٹھہرا۔ ”انشا اللہ! مرد کو عورت کی عزت کرنا سکھانا ہم ماؤں کا ہی تو کام ہے۔“ مہرن کی آنکھیں گہرے پانیوں میں ڈوب گئیں!

☆☆☆

ساجد تو فوراً راضی ہو گیا۔ مہرن جیسی خوب صورت لڑکی سے شادی کا وہ بس خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے بچے کو اپنانے پر بھی آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ مہرن میڈم کے ادارے سے ساجد کے گھر منتقل ہو گئی۔ ساجد کے چھوٹے سے گھر میں دیوار پر ننگے آئینے میں اپنے وہند لے کر دیکھتے ہوئے مہرن کو اسکول میں بیت بازی کے لیے رہا ہوا ایک شعر یاد آ گیا۔

زندگی اتنی رانگاں تو نہ تھی۔ جانے کس نگر میں بھول آئی۔

ساجد زیادہ پڑھا لکھا آدمی تو نہیں تھا مگر ادارے میں نکاح پڑھائے جانے کے بعد مہرن کو بچے سمیت اپنے گھر لانے کے بعد اس نے مہرن سے کہا۔ ”اللہ کی کتاب میں لکھا ہے مرد اور عورت ایک دوسرے کا لباس ہیں..... لباس کا کام اور فائدہ کیا ہوتا ہے بھلا؟“

”بدن ڈھانپنا۔“

”بہت اچھے!“ اس نے مہرن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا۔ ”ہمیں بھی ایک دوسرے کو لباس کی طرح ڈھانپنا ہے..... ایک دوسرے کی خوبیوں پر نظر رکھنی ہے.....

ہمیں بس اپنی آگے کی زندگی کی طرف دیکھنا ہے..... میں تم سے بھی نہیں پوچھوں گا پہلے کیا ہوا، کیا نہیں..... آج سے یہ بچہ میرا ہے۔“ اس نے اپنے گدیلے پر بے خبر سوئے بچے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔ ”سلمان ساجد۔“

☆☆☆

برسوں بیت چکے۔ ساجد کے ساتھ مہرن کی بڑی اچھی بھگ گئی۔ دو بچے بھی ہوئے ساجد سے مہرن کے ہاں، ایک بیٹا ایک، بیٹی۔ مہرن کے پہلے بیٹے کو ملا کر تین بچے۔

ساجد غریب مگر شریف آدمی تھا۔ مہرن کے ساتھ اس نے تیس سال گزارے مگر ان تیس برسوں میں اس نے بھی ایک بار بھولے سے بھی مہرن کے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ کبھی اس کا ماضی کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

کبھی کوئی طعنہ نہیں دیا۔ کبھی اس کی تضحیک نہیں کی۔

ساجد امیر آدمی نہیں تھا۔ معمولی حیثیت کا آدمی ایک رفاہی ادارے کا وین ڈرائیور مگر اس نے مہرن کی ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ اس کے بولے بٹا ہی اس کی خواہشات پوری کیں۔

ساجد نے مہرن کو عزت دی۔ محبت دی، اس کا احترام کیا۔ اپنے بچوں کی پیدائش سے قبل وہ مہرن کو اس کے بیٹے سلمان کی نسبت سے سلمان کی ماں کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ اپنے بیٹے کی پیدائش کے بعد وہ اسے ”بچوں کی ماں“ کہہ کر مخاطب کرنے لگا تھا۔ اس نے سلمان اور اپنے بچوں میں کبھی تفریق نہیں کی۔ ساجد کی اعلیٰ ظرفی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس نے سلمان کو اپنی نسبت دی۔

ساجد واقعی بہت اچھا آدمی ثابت ہوا تھا۔ وہ، وہ آدمی تھا جس نے مرد ذات پر مہرن کا اعتماد بحال کیا، جس نے دارالامان کی سیانی، سمجھدار اور زمانہ شناس عورتوں کی اس رائے پر مہر تصدیق ثبت کی کہ دنیا میں اچھے مردوں کی بھی کمی نہیں۔ یہی بات اس رفاہی ادارے کی میڈم نے بھی کہی تھی، اس سے جس نے اسے اس وقت اپنے ہاں پناہ دی تھی، جب اسے ہر دروازہ اپنے اوپر بند محسوس ہوا تھا۔

ساجد نے اسے تحفظ دیا۔ اپنے گھر کا، اپنے نام کا، اس کے دل میں اس احساس کو جا گزیں کیا کہ اچھے مرد کا ساتھ عورت کی بگڑی زندگی کا نقشہ بھی سنوار سکتا ہے اور.....

بر ظاہر شریف مرد..... غیرت اور انا کے نام پر عورت کو بغیر کسی خطا کے بھی سزا دیتا ہے۔

ساجد ہی تھا جس کی ہمسری نے مہرن کو یہ نتیجہ اخذ کرنے کی بصیرت دی کہ مرد کی اچھائی اس کی اچھی شکل و صورت، اعلیٰ تعلیم، اونچا مرتبہ، امارت و دولت بڑا گھر اور قیمتی گاڑی سے نہیں بلکہ اس کے کردار سے پرکھی جاتی ہے۔

پرکھ کی اس کسوٹی پر ساجد سو فیصد پورا اترتا تھا!

تیس سال مہرن کو عزت اور سکون کی زندگی دے کر ساجد عدم کا مسافر ہوا مگر اس کی یادیں آج بھی دبے پاؤں مہرن کے ساتھ چلتی ہیں۔ اس کا ساتھ نصیب نہ ہوتا تو کون جانے زندگی کس طور اور کس اور گزرتی!

ساجد کا ساتھ ملنے کے بعد مہرن نے پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ رشتے دار، اقربا، دوست، شناسا سب کو بھول گئی تھی وہ اور شاید ان سب نے بھی اسے حرف غلط سمجھ کر اپنی اپنی زندگی سے حذف کر دیا تھا۔ وہ اگر اپنی اپنی زندگی میں شاداں و فرحان تھے تو مہرن بھی ناشادہ تھی۔ اپنے بچے اسے اپنی متاع حیات اور کل کائنات محسوس ہوتے تھے اور وہ اپنی اس کائنات میں ہی گم رہنا چاہتی تھی۔

مگر بڑی عجیب بات تھی، ایک جیسے حالات، یکساں ماحول اور یکساں تربیت کے باوجود سلمان کبھی بھی جی دکھا جاتا تھا۔ فرحان اور شہلا مہرن سے کہتے۔ ”امی سلمان

بھائی کبھی کبھی اتنی عجیب حرکتیں کیوں کر جاتے ہیں!“
مہرن سب جانتے بوجھتے بھی انجان بن جاتی۔ ”پتا
نہیں بیٹا وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔“

ختم کا اثر تو آتا ہی ہے۔ ساجد سے پہلے مہرن کا
سابقہ کسی اچھے مرد سے کب پڑا تھا۔ اس کی تربیت کے
باوجود ختم کا اثر مکمل طور پر ختم نہ ہو سکا۔

ان بچوں کی وجہ سے ہی مہرن کبھی بھولے سے بھی
اپنے ماضی میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرتی۔ اس کے لیے دنیا
اور زندگی اپنے ان تین بچوں کے دم سے تھی اور بس!

☆☆☆

مہرن کا چچا ایک عجیب و غریب جلدی مرض کا شکار ہو کر
فوت ہوا۔ اس کے پورے جسم پر گلٹیاں سی بن گئی تھیں جن
سے مواد رستار ہتا اور اس کے جسم سے کچے گوشت کی بساند
آتی۔ بیوی بچے اسے جلدی امراض کے اسپتال میں داخل
ہونے کو کہتے تو وہ ہڈیاں بکنے لگتا۔ گھر آنے جانے والے اس
سے ملنے سے گریز کرتے۔ بیوی بچے بھی ناک و بار کر اس کے
کمرے میں جاتے۔ مر اتو گھر والوں نے شکر ادا کیا۔

☆☆☆

جہاں اللہ کی بے آواز لاشی نے بے شمار لوگوں کا محاسبہ کیا،
وہیں جاوید کو بھی ایک ایسی لڑکی شریک حیات کے طور پر ملی جس
نے اپنے کزن کے جنونی عشق میں مبتلا ہو کر نہ صرف اپنی عصمت
گنوائی بلکہ انتہائی حقارت سے بھی ٹھکرا دی گئی مگر انجانے ہونے کی
وجہ سے بے خبری میں جاوید اسے اپنے گھر کی رونق بنالایا۔ یہ اور
بات کہ ایسی باتیں زیادہ عرصہ چھپی نہیں رہ سکتیں اور جب جاوید اور
اس کی والدہ پر یہ بم گرا تو احساس ہوا کہ شاید انہوں نے مہرن
کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کر ڈالی تھی۔

خدا مغفرت کرے پروین اپنی ذات سے اچھی
عورت تھی مگر باپ کی بد اعمالی بھی تو اکثر اولاد کے لیے
عذاب کا سبب بن جاتی ہے۔ واناؤں کا کہنا ہے بندوں کے
اعمال کے اثرات تین نسلوں تک جاتے ہیں۔

نعیم کی بڑی بیٹی کو بلڈ کیسز ہوا۔ آخری دنوں میں وہ اتنی
اذیت میں تھی کہ نعیم نے اس کے سر ہانے کھڑے ہو کر اس کی
مشکل آسان ہونے کی دعا مانگی۔ جوان اولاد کو مرتے دیکھنا
کچھ کم تکلیف دہ تو نہیں ہوتا۔ مرنے والی نے اپنے پیچھے دو بچے
چھوڑے جو اب سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر رہنے پر مجبور تھے۔
بچھلی بیٹی کا ریپ ہوا۔ یونیورسٹی سے گھر آ رہی تھی کہ اس
کے اپنے تین کلاس فیلوز اسے زبردستی گاڑی میں ڈال کر ایک فلیٹ
میں لے گئے اور وہاں اسے زیادتی کا نشانہ بنایا۔ لڑکی نے تیسری

منزل پر واقع اسی فلیٹ کی بالکونی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔
نعیم کی تیسری اور سب سے چھوٹی بیٹی انہوں ہی میں بیاہی
گئی۔ شادی کے دوسرے برس اس کے ہاں بیٹا ہوا۔ نعیم کا داماد بیٹے
کی ولادت سے پندرہ منٹ قبل بیوی کے لیے کوئی ضروری دوا
خریدنے باہر گیا۔ میڈیکل اسٹور سے دوا خرید کر واپس آ رہا تھا کہ
ایک ٹرالر اس کی بائیک کو اس سمیت روندتا ہوا اوپر سے گزر گیا!

نعیم جو، اب چٹے سرو والا بوڑھا پھونس ہے تسبیح کے
دانے گھماتے ہوئے اکثر اس حادثے کو یاد کرتا ہے۔ وہ
بوجھل آواز اور گھائل لہجے میں کہتا ہے۔ ”بیٹی نے جب میرا
گر بیان پکڑ کر دیوانوں کی طرح چیختے ہوئے مجھ سے کہا ابو!
مجھے بتاؤ تو ایسا ظلم کیوں ہوا میرے ساتھ؟ تو میں کانپ کر رہ
گیا۔ بیٹی کا دکھ باپ سے سہا نہیں جاتا۔“

نعیم کو کون یاد دلانے کہ مہرن بھی تو کسی کی بیٹی ہی تھی۔
حمیدہ نے اس کا دکھ کیونکر سہا ہوگا۔ کیا اس ماں کی بد وعائیں
رانگاں چلی جاتیں؟

نعیم کا اکلوتا بیٹا غلط صحبت کا شکار ہو کر جوانی ہی میں داغ
مفارقت دے گیا تھا۔ اسی کے صدمے میں پروین بھی گئی۔

☆☆☆

یامین کا وہ حساب ہوا کہ چور چوری سے جائے ہمارا
پھیری سے نہ جائے۔ مہرن والے قصے کے بعد بھی
تھوڑی تھا۔ وہی موج مستی، لڑکیوں اور عورتوں سے نظریں نہ
اور باپ کی کمائی بے دریغ لٹا اس کا مشغلہ رہا۔ باپ کے
مرنے کے بعد بازاری عورتوں کو گھر لانے لگا تھا۔ چھوٹے سالے
کو ایک روز تاؤ آیا تو اس نے یامین اور داد عیش دیتی ایک
بازاری عورت کو یامین کے گھر ہی میں قتل کرے کام کا برا انجام!

☆☆☆

سو مہرن کی کہانی کا ہر کردار مکافات عمل سے دو چار ہوا۔
مہرن آج بھی ادارے کی میڈم کی بات اپنے پلو میں
باندھے ہوئے ہے۔ ”مرد کو عورت کی عزت کرنا سکھانا ماؤں ہی
کام کا ہے۔“ سو وہ اس نصیحت کو مسلسل اپنے بچوں کے حق میں
آزمائے جاتی ہے اس یقین کے ساتھ کہ ایک روز سلمان بھی ختم کے
اثر سے ماورا ہو کر اس کی تربیت کا سر بلند کر دے گا! عزت چاہے
عورت کی ہو یا مرد کی برابر ہی ہوتی ہے مگر افسوس کہ پرانی عورت کو
پیروں تلے کھینچنے والا مرد اپنی فتح سمجھتا ہے جبکہ قدرت عورت کے
روپ میں اس کی اپنی فتح کو اسی کے پیروں تلے پکڑا رہی ہوتی ہے
بات تو صرف سمجھ کے پھیر کی ہے۔ جانے عورت کو بازاری سمجھنے
والے مرد کب قدرت کے اس فلسفے کو سمجھیں گے۔